
گھر کے ہر فرد کے لیے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
جنوری 2015
سال نو مبارک
WWW.PAKSOCIETY.COM
نگہت سیما اور رفاقت جاوید کے
سال نو کے لیے انجم انصار کا انوکھا خوبصورت ناولٹ

مدیرۂ اعلیٰ: عذرا رسول
مدیرہ: انجم انصار
معاون: آمنہ حماد

اداریہ

سلسلے وار ناول

ناولٹ

مکمل ناول

منی ناول

افسانے

خصوصی مضامین

مستقل عنوانات

پبلشر و پرنٹر: ذیشان رسول مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

سالِ نو مبارک

شعبہ اشتہارات
منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789 نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
نمائندہ لاہور سید افراز علی نازش 0332-4214400 رانا اے حمید 0323-2895528
ماڈل: مہوش .... میک اپ: روز بیوٹی پارلر .... فوٹو گرافر: موسیٰ رضا



جلد 42 • شمارہ 10 • جنوری 2015 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •
پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com



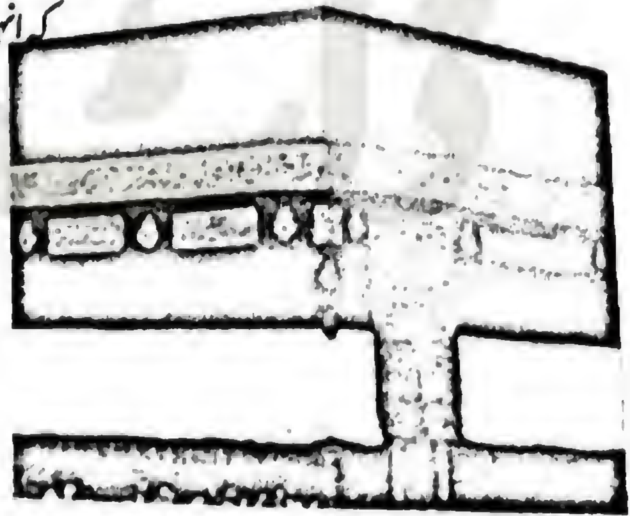
۱۲ ربیع الاول وہ مقدس و متبرک دن ہے جب پاکستانی قوم سمیت پوری ملت اسلامیہ اس انسان کامل کی ولادت باسعادت کا جشن مناتی ہے۔ جس کا اسوہ حسنہ پوری انسانیت کے لیے منارہ نور ہے، جس کی ذات سراپا رحمت ہے، جس کی سیرت کا ہر، ہر پہلو چشمۂ ہدایت ہے اور جس کی آمد کی اطلاع حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک تمام انبیائے کرام دیتے رہے۔ اللہ کے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کی اس دنیا میں تشریف آوری انسانیت کی فصل ربیع کا وہ آغاز تھا جس نے شرک، جہالت، گمراہی، ظلم اور استحصال کے موسم خزاں کا استیصال کیا...... اس اعتبار سے نہ صرف ان کی ولادت کا دن بلکہ پورا ماہ ربیع الاول پوری انسانیت کے لیے جشن بہاراں کے ایام ہیں۔

مگر جس طرح مشیت الٰہی سے اس ذات پاک ﷺ جو وجہ تخلیق کائنات ہے کی دنیا میں آمد کے لیے سیارگان فلک کو طویل انتظار کرنا پڑا اسی طرح دنیا کو محسن انسانیت کے فیضان کے حقیقی اور مکمل ادراک میں وقت لگے گا...... صدیوں کے سفر کے بعد جب غنچے سے کلی اور کلی سے پھول بننے کا عمل مکمل ہوگا تو پوری دنیا رحمت اللعالمین کے پیغام کی خوشبو کو اس کی بھرپور کیفیت کے ساتھ محسوس کرنے لگے گی مگر آج بھی کون ہے جو اس حقیقت سے انکار کر سکے کہ توحید کے اس سب سے بڑے پیغام بر نے ہی انسان کو زمین پر اللہ تعالیٰ کا نائب ہونے کی نوید دی اور اسے بتایا کہ سورج، چاند، ستارے، سیارے، دریا، آگ، پانی، درخت، ہوا تمام مظاہر فطرت اور تمام عناصر اسی ذات واحد کے خادم اور تابع فرمان ہیں۔ اس لیے خدائے وحدہ لاشریک کے سوا کسی کے آگے سجدہ ریز ہونا انسان کو زیبا نہیں...... تو آئیں آج ہم پکا عہد کریں کہ شرک سے بچیں گے اور سنت رسول ﷺ پر ہمیشہ چلنے کی کوشش کریں گے کہ اسی میں ہماری فلاح مضمر ہے۔

مدیرہ
انجم انصار

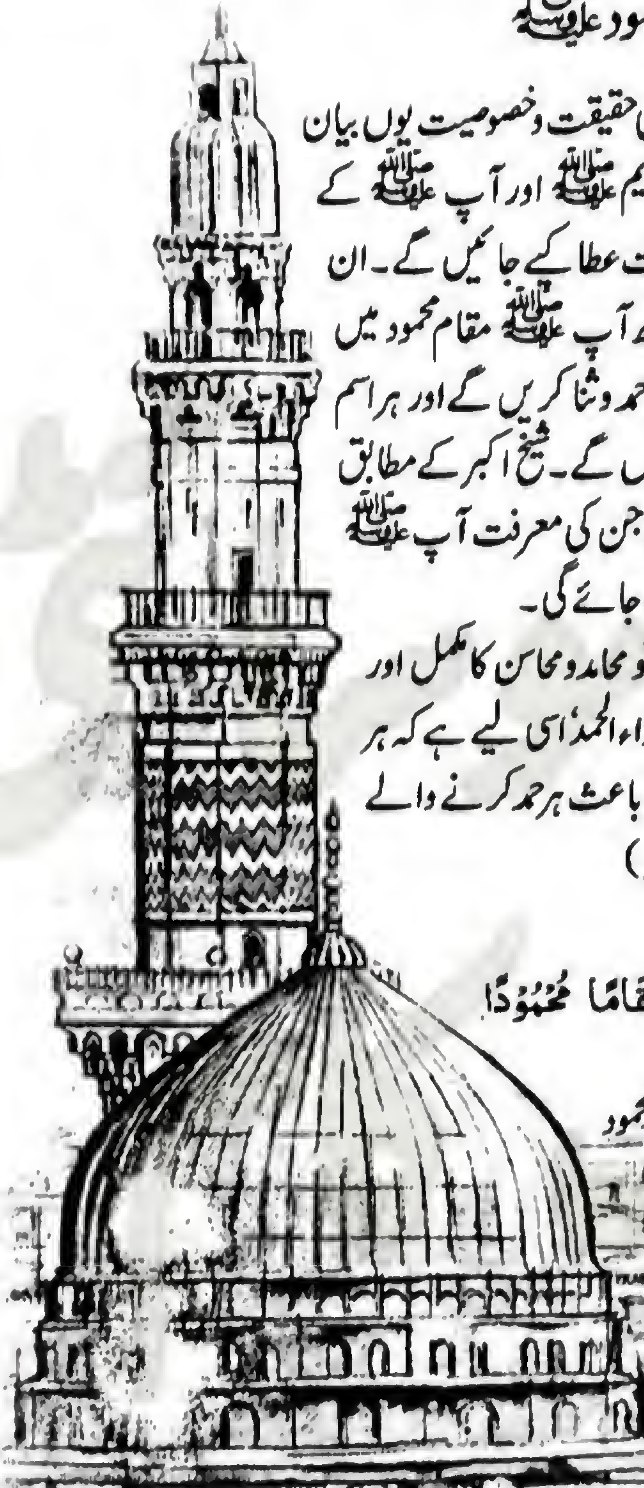
دین کی باتیں

(انہی حرکات کی سزا میں) بنی اسرائیل سے جو لوگ کافر تھے انہیں داؤدؑ اور عیسیٰؑ بن مریمؑ کی زبانی لعنت کی گئی یہ اس کے سبب سے جو انہوں نے نافرمانی کی اور وہ (ہر معاملے میں) حد سے گزر جاتے تھے (۷۸) اور کسی برے کام سے جس کو انہوں نے کیا باز نہ آتے تھے بے شک برا ہے وہ (کام) جو کرتے تھے (۷۹) آپ ﷺ ان میں سے بہت لوگوں کو دیکھو گے کہ کافروں سے دوستی کرتے ہیں بے شک برا ہے وہ کام جو ان کے لیے ان کے نفسوں نے پہلے کیا ہے (نتیجتاً) یہ کہ اللہ نے ان پر غضب کیا اور عذاب میں وہ ہمیشہ (گرفتار) رہیں گے (۸۰) اور اگر یہ لوگ اللہ پر اور (اپنے) نبی پر اور اس چیز پر جو (نبی) کی طرف نازل کی گئی تھی ایمان رکھتے تو کافروں کو ہرگز (اپنا) دوست نہ بناتے ولیکن ان میں کے اکثر لوگ بدکار ہیں (۸۱) (اے نبی ﷺ) بے شک تم سب لوگوں سے زیادہ مسلمانوں کا دشمن یہود کو پاؤ گے اور مشرکوں کو اور بے شک سب سے زیادہ مسلمانوں کی محبت سے قریب ان لوگوں کو پاؤ گے جو یہ کہتے ہیں کہ ہم نصرانی ہیں یہ اس سبب سے کہ ان میں سے کچھ لوگ عالم ہیں اور کچھ تارک الدنیا اور اس سبب سے کہ وہ غرور نہیں کرتے (۸۲) اور یہ لوگ جب اس چیز کو سنتے ہیں جو (ہمارے) رسول کی طرف نازل کی گئی ہے تو (اے شخص) تو ان کی آنکھوں کو دیکھتا ہے کہ آنسو بہاتی ہیں یہ سبب اس کے کہ انہوں نے حق پہچان لیا کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لائے تو، تو ہم کو شہادت دینے والوں کے ساتھ لکھ لے (۸۳) اور ہمیں کیا (چیز مانع) ہے جو ہم اللہ پر اور اس امر حق پر جو ہمارے پاس آیا ہے ایمان نہ لائیں حالانکہ ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا پروردگار ہم کو نیک لوگوں کے ساتھ (جنت میں) داخل کرے گا (۸۴)



(سورۂ مائدہ آیت نمبر ۷۸ تا ۸۴)

سیدنا محمود ﷺ



۳: شیخ اکبر محی الدین عربی مقام محمود کی حقیقت وخصوصیت یوں بیان کرتے ہیں۔'' کہ شفیع المذنبین رسول کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے وارثوں کو حمد کے سات جھنڈے بروز قیامت عطا کیے جائیں گے۔ ان جھنڈوں میں منقوش اسمائے حسنیٰ کے ساتھ آپ ﷺ مقام محمود میں کھڑے ہو کر رب ذوالجلال کی شان میں حمد وثنا کریں گے اور ہر اسم میں اللہ تعالیٰ سے شفاعت کے خواستگار ہوں گے۔ شیخ اکبر کے مطابق ان اسمائے حسنیٰ کی تعداد سولہ سو چونسٹھ ہے جن کی معرفت آپ ﷺ کے علاوہ کسی اور کو بروز قیامت الہام نہیں کی جائے گی۔

شیخ صاحب کے مطابق 'لواء الحمد' تو محامد ومحاسن کا مکمل اور کامل...... ارفع واعلیٰ مرتبہ ہے اس کا نام 'لواء الحمد' اسی لیے ہے کہ ہر نوع کے محامد کی جامع ہے اس لیے اس کے باعث ہر حمد کرنے والے کی بھی حمد بیان کی جائے گی۔ (فتوحات مکیہ)

۲: القرآن، محمود:

۱۔ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (۷۹) بنی اسرائیل

ترجمہ: قریب ہے کہ خدا تم کو مقام محمود میں داخل کرے۔

۲: محمود۔ (پسندیدہ) سراہا گیا تعریف کیا گیا۔

۱۔ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ (۳) القلم

ترجمہ: اور بے شک آپ ﷺ کے لیے بے انتہا اجر ہے۔

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی ﷺ سے اقتباس



اعتبارِ وفا

نگہت سیما

یہ سچ ہے کہ محبت میں وقت کا وزن نہیں ہوتا۔۔۔ گفتگو کا وزن نہیں ہوتا، ہر طرف تو کیا دل و دماغ تک پر ایک بے وزن سی کیفیت محسوس ہوا کرتی ہے۔۔۔ کہ دل و دماغ کو کوئی دوسری بات سُجھائی تک نہیں دیتی۔
ایسے حالات میں کسی بھی انسان کے پاؤں جمے نہیں رہتے اور وہ ہر وقت لڑھکتا رہتا ہے۔
مگر خود کو سنبھال کر متوازن رکھنا ہی محبت کا اصل پلیٹ فارم ہے۔۔۔ لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس بے وزنی کے اصول کو بھی محسوس کر لیا جائے۔۔۔ اور مان لیا جائے۔۔۔ کہ محبت کا اوّلین قانون اعتبار ہے۔۔۔ اور وفا کے غُنچے وہیں کِھلتے ہیں۔۔۔ جس گلشن میں اعتبار کا بیج بویا جاتا ہے۔

گلاب چہروں پہ دُھول کتنی مسافتوں کی جمی ہوئی ہے
چراغ آنکھوں میں جانے کتنے سفر کے جالے تنے ہوئے ہیں
نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی حصّہ
کہاں کا ذکرِ سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تو رُکے ہوئے ہیں

قسط 5





بابر نے یک دم واش روم سے باہر نکلتے ہی اس کے ہاتھ سے فون لے لیا۔
''کسی عنبرین کا ہے۔'' ایمل نے بتاتے ہوئے اس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔ ''پر کون ہے یہ؟''
''اوہ...... ہاں۔'' بابر نے چونک کرفون آف کر کے پاکٹ میں رکھا۔''ہاں آفس کی ایک ورکر ہے۔''
''آپ بات کر لیتے، کیا پتا ضروری بات کرنی ہو۔'' ایمل کا لہجہ نارمل تھا۔
''میں نے سیٹ بک کروانے کے لیے کہا تھا۔ وہی بتانے کے لیے فون کیا ہوگا جبکہ نذیر صاحب نے پہلے ہی مجھے بتا دیا ہے۔'' اس نے سرسری سے انداز میں باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے مگر پھر مڑ کر ایمل کی طرف دیکھا۔''میں نے کہا تھا میرا بیگ گاڑی میں رکھوادو۔''
''میں نازو کو ہی بلانے جارہی تھی کہ آپ کا سیل بج اٹھا اور......''
''اچھا چلو چھوڑو، مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' اس نے مڑ کر بیگ خود ہی اٹھالیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔
ایمل بھی اس کے ساتھ ہی بیڈروم سے نکلی تھی اور اس کے پیچھے ہی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ بابر کا موبائل ایک بار پھر بج اٹھا تھا لیکن بابر نے فون اٹینڈ نہیں کیا...... اور سیڑھیاں اتر کر لاؤنج میں بیٹھی ارتفاع کے پاس جا رکا... مسکرا کر کچھ کہا اور پھر انگلیوں سے اس کا گال سہلاتا ہوا لاؤنج سے نکل گیا۔ ایمل چند لمحے سیڑھیوں کے پاس رکی۔ ارتفاع کی نظریں جھکی ہوئی تھیں، وہ جان بوجھ کر اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ ایمل کچھ دیر یونہی سیڑھیوں کے پاس کھڑی سوچتی رہی اسے ہر صورت ارتفاع کو سمجھانا تھا کہ کہیں وہ صرف اس کی ضد میں اپنا نقصان نہ کر بیٹھے۔ وہ بے شک یونیورسٹی میں پہنچ گئی تھی لیکن اتنی سمجھدار کہاں تھی کہ لوگوں کو سمجھ سکے۔ وہ خود جتنی سادہ دل اور شفاف ذہن رکھتی تھی ہر ایک کو ایسا ہی سمجھتی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ دنیا اس جیسی نہیں ہے۔ یہاں لوگ چہروں پر ماسک چڑھائے پھرتے ہیں بظاہر کچھ اور اندر سے کچھ۔
''ارتفاع بیٹا......'' وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی ارتفاع کے پاس آئی۔
ارتفاع نے رخ موڑ لیا۔
''مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''
''پلیز میں اس وقت آپ سے بات نہیں کرنا چاہتی۔'' اس نے رخ موڑتے ہوئے کہا۔''آپ کو جو بھی کہنا ہے پھر کبھی کہہ دیجیے گا۔'' اتنا خشک، اتنا روکھا لہجہ...... ایمل ششدر رہ گئی۔
''ارفی......'' ایمل کے لبوں سے نکلا لیکن وہ ایک دم اٹھی اور افنان کو بلاتی ہوئی اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ ایمل وہیں ساکت کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

وہ بہت شاندار اور لگژری فلیٹ تھا جس کی ایک بالکونی میں عنبرین کرسی پر نیم دراز کسی فیشن میگزین کا مطالعہ کر رہی تھی۔ عنبرین ایک چالیس بیالیس سال کی پُرکشش اور دلکش عورت تھی۔ چونکہ اپنا بہت خیال رکھتی تھی۔ باقاعدگی سے پارلر جاتی تھی اور جب کبھی احساس ہوتا کہ اوور ویٹ ہو رہی ہے فوراً جم جوائن کرتی۔ اس عمر میں بھی وہ بے حد اسمارٹ تھی اور اپنی عمر سے دس سال چھوٹی ہی نظر آتی تھی۔ یکایک وہ میگزین رکھ کر کھڑی ہوگئی۔ کلائی موڑ کر وقت دیکھا اور پھر بالکونی کا دروازہ کھول کر اپنے بیڈروم میں آگئی۔ کچھ دیر یونہی ٹہلتی رہی پھر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر کچھ دیر اپنا جائزہ لیا اور میک اپ تازہ کرنے لگی۔ لپ اسٹک لگانے کے بعد ایک بار پھر اس نے تنقیدی نظروں سے خود کو آئینے میں دیکھا۔ وہ بلاشبہ قیامت ڈھا رہی تھی۔ شانوں تک

بکھرے بالوں میں اس نے ایک بار پھر برش مارا اور پھر ڈریسنگ ٹیبل سے پرفیوم کی بوتل اٹھا کر خود پر اسپرے کیا اور ابھی بوتل واپس ڈریسنگ پر رکھی ہی تھی کہ ڈور بیل ہوئی۔ وہ تیزی سے بیڈ روم سے نکل کر لابی میں آئی اور بے قراری سے دروازہ کھولا۔ وہ جانتی تھی آنے والا کون ہے۔ آنے والے نے اندر قدم رکھتے ہی اس کے سجے سنورے سراپے پر نظر ڈالی۔

''تم تو بالکل ٹھیک اور فریش نظر آ رہی ہو جبکہ تم نے ایمر جنسی کا کہہ کر مجھے پریشان کر دیا اور پھر تمہاری آواز سے بھی لگ رہا تھا کہ تم خدانخواستہ سخت بیمار ہو۔''

''ہاں تو ایمر جنسی ہی تھی ناں بابر......!'' عنبرین نے اس کے ہاتھ سے بیگ لیتے ہوئے اٹھلا کر کہا تھا۔

''کیا ایمر جنسی تھی؟'' بابر اس کے ساتھ بیڈ روم میں آ گیا تھا اور اب بیڈ پر بیٹھا نثار ہونے والی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''تمہارے لیے اداس ہو رہی تھی میں۔'' عنبرین کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''اس طرح نہ بلاتی تو کیا تم آتے، تمہیں پتا ہے تم ایک ماہ پہلے آئے تھے۔''

''کیا کروں! پچھلے دنوں بزنس کی بے تحاشا مصروفیت رہی۔ ورنہ ایک لمحے کے لیے بھی تمہارا خیال ذہن سے نہیں نکلتا۔ آج بھی تمہارا فون ملنے پر ایک ضروری میٹنگ کینسل کر کے آیا ہوں۔ بہت گھبرا گیا تھا میں جب تم نے کہا تھا فوراً آ جاؤ ورنہ پچھتاؤ گے۔'' وہ ہولے سے ہنسا۔ ''بھول گیا تھا میں کہ تم بہت بڑی اداکارہ ہو۔'' وہ جوتوں سمیت ہی بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔

''تم...... اگر نہ آتے تو آج تو تمہیں واقعی پچھتانا پڑتا بابر۔''

''یار ایسی دھمکیاں مت دیا کرو، میرا دل بڑا کمزور ہے۔''

''یہ دھمکی نہیں ہے۔'' عنبرین کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

''مثلاً کیا کرتیں تم......'' بابر کے مسکراتے لب بھنچ گئے۔

''مثلاً کچھ بھی......'' عنبرین اسے ہی دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا تاثر ضرور تھا جس نے بابر کو چونکا دیا۔

''اس فلیٹ سے میری لاش بھی مل سکتی تھی۔ ایک خط کے ساتھ اور......''

''کیا فضول باتیں کر رہی ہو رینو۔'' بابر نے اسے ٹوک دیا۔ ''اتنے دنوں بعد ملے ہیں تو کچھ اچھی، اچھی باتیں کرو۔ بلکہ پہلے کچھ تگڑی سی چائے پلاؤ، یعنی چائے کے ساتھ کچھ اور بھی...... تمہارے فون نے مجھے ڈھنگ سے ناشتا بھی نہیں کرنے دیا...... جانتی ہو میں اپنی بھانجی کی شادی چھوڑ کر آیا ہوں۔ کل رات اس کے مایوں کا فنکشن تھا۔ دو دن بعد اس کی مہندی، بارات اور پھر ولیمہ ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا۔ تم صرف دو دن کے لیے آئے ہو؟'' وہ کمرے سے باہر جاتے، جاتے رکی۔

''نہیں، تین دن کے لیے...... مہندی میں شرکت نہیں کروں گا۔ آپا کو فون کر کے معذرت کر لوں گا لیکن بارات اور ولیمے میں شرکت ضروری ہے۔''

عنبرین نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر کچھ کہے بغیر باہر چلی گئی۔ بابر نے اپنا فون پاکٹ سے نکالا جو وائبریٹ کر رہا تھا۔

''ہاں، ہیلو کیا بات ہے امی؟'' اس نے فون آن کر کے کہا۔

''آپ پہنچ گئے؟''

''ہاں بس ابھی پہنچا ہوں، تمہیں فون کرنے ہی والا تھا۔''

آپ کہاں ہیں؟'' ایمل پوچھ رہی تھی۔

''میں سیدھا آفس ہی آیا ہوں یہاں کا کام نبٹا کر ہی کہیں جاؤں گا۔ شاید ہوٹل میں جاؤں یا پھر عامر کے گھر......''

''آپ گھر کیوں نہیں چلے جاتے۔''

''کس کے گھر؟'' بابر کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''اپنے گھر بھئی......ممی، ڈیڈی کے گھر......وہ آپ کا بھی تو گھر ہے ناں......''

''وہ میرا گھر نہیں ہے ایمل، وہ تمہارا اور تمہارے ممی، ڈیڈی کا گھر ہے۔ میرا کوئی حق نہیں ہے اس گھر پر... بلکہ تمہارا بھی گھر اب وہ نہیں ہے بلکہ اب یہ گھر تمہارا ہے جو میں نے تمہیں دیا ہے۔''

''پلیز بابر، ممی آپ کو بہت یاد کرتی ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ ڈیڈی کے ساتھ آپ کا کیا مسئلہ ہے۔ آپ نے کبھی بتایا نہ ڈیڈی نے......لیکن اب ڈیڈی بہت بیمار ہیں اور ممی پریشان ہیں۔ آپ پلیز گھر ضرور جائیے گا......ممی بہت اداس ہیں، لاسٹ ٹائم بھی جب آپ لاہور گئے تو اُن سے ملے بغیر چلے آئے تھے۔''

''یار میں جب بھی لاہور آتا ہوں ممی سے ملنے جاتا تو ہوں...... ہاں وہاں رہتا نہیں ہوں...... ہاں لاسٹ ٹائم میں...... بہت بزی تھا، ممی سے ملنے نہیں جا سکا تھا اور شاید اس بار بھی نہ جا سکوں...... کیونکہ مجھے دو دن بعد واپس آنا ہے۔ نہ آسکا تو آپا ناراض ہوں گی۔''

''اور یہ دو دن آپ ممی کے پاس ہی رک جائیں تو انہیں حوصلہ ہوگا۔ ڈیڈی کی طبیعت بہت خراب رہنے لگی ہے اور وہ پراپر علاج بھی نہیں کرواتے۔''

''تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ انہیں علاج پر تو مجبور نہیں کر سکتا۔''

''بابر، ممی کا فون آیا تھا۔ وہ چاہتی ہیں کہ ہم ان کے ساتھ رہیں۔ اور اصولاً تو ہمیں ان کے ساتھ ہی رہنا چاہیے تھا۔ اس عمر میں تنہائی بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔''

''اچھا لیکچر مت دو۔'' وہ بیزار ہوا۔ ''میں بہتر جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ وقت ملا تو چلا جاؤں گا ممی سے ملنے۔''

''بابر......'' اس نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔ ''میں سوچ رہی ہوں شادی کے بعد کچھ دنوں کے لیے لاہور آجاؤں...... یوں بھی ایک سال ہوگیا ہے مجھے لاہور آئے ہوئے۔''

بابر، ایمل کا میکے جانا پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ اکٹھے آتے اور چند دن رہ کر چلے جاتے تھے۔ یا چھ سات ماہ بعد ممی، ڈیڈی اس سے خود ہی ملنے آجاتے لیکن اب ایک سال سے نہ تو ڈیڈی آئے تھے اور نہ ہی وہ خود آسکی تھی۔ ہاں ممی دو دن کے لیے آئی تھیں اور پھر مل کر واپس چلی گئی تھیں۔

''نہیں نہیں بچوں کی کلاسز ہو رہی ہیں، پڑھائی کا حرج ہوگا۔'' بابر نے فوراً کہا۔

''میں اکیلی آجاؤں گی......بس کچھ دنوں کے لیے ممی، ڈیڈی کو دیکھ لوں گی تو تسلی ہو جائے گی۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگا تھا جیسے ممی کچھ چھپا رہی ہوں مجھ سے......شاید ڈیڈی کی طبیعت زیادہ خراب ہو۔'' وہ روہانسی ہوگئی تھی۔

''او کے...... میں ابھی آفس سے اٹھ کر سیدھا گھر جاتا ہوں ڈیڈی کی طبیعت اگر زیادہ خراب ہوئی تو بتادوں گا۔ ممی کا تو تمہیں پتا ہی ہے ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتی ہیں اور تم بھی پریشان مت ہو۔ ہاں آپا کا فون تو نہیں آیا تھا؟''

''نہیں......'' ایمل نے آہستگی سے کہا۔

''او کے...... پھر میں شام تک تمہیں کال کروں گا۔'' اس نے فون بند کر دیا۔

ایمل کے ڈیڈی کے ساتھ اس کا کوئی خاص مسئلہ تو نہیں ہوا تھا۔ بس چھوٹی سی بات کا ایشو بنا کر اس نے ایمل کے سامنے ناراضی کا اظہار کیا تھا تاکہ جب وہ آئے تو اسے گھر نہ رہنے کا بہانہ مل جائے سو جب بھی وہ لاہور آتا تھا ایمل سے یہی کہتا تھا کہ وہ ہوٹل میں قیام کرے گا۔ ہاں ممی، ڈیڈی سے ملنے جاتا رہے گا۔

عنبرین ٹرالی گھسیٹتی ہوئی اندر لائی۔ ٹرالی میں بہت سارے لوازمات تھے جو اس نے پہلے سے تیار کر رکھے تھے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کا فون سن کر وہ ضرور آئے گا اور وہ آ گیا تھا۔

''ارے واہ...... اتنا کچھ......!'' بابر نے مسکرا کر عنبرین کی طرف دیکھا اور پلیٹ میں نگٹس اور کباب رکھے۔

''کسی سے فون پر بات کر رہے تھے۔'' عنبرین کی نظریں اس کے پاس ہی بیڈ پر پڑے سیل فون پر تھیں۔

''ہاں، گھر فون کیا تھا ارفی کو اپنے پہنچنے کی اطلاع دی تھی۔'' اس نے کیچپ پلیٹ میں ڈالا۔

''میرا خیال تھا ہم گھومنے کے لیے کہیں جائیں گے۔ پچھلی بار تم نے کہا تھا کہ بھوربن چلیں گے ہفتہ بھر کے لیے...... اور اب صرف دو تین دن......؟''

''ہاں، کہا تو تھا لیکن اب ظاہر ہے ایمرجنسی میں آنا پڑا۔''

''تو تم بتا دیتے کہ شادی ہے تمہاری بھانجی کی...... اٹینڈ کر کے آ جاتے۔''

''کیا تم نے کچھ بتانے کا موقع دیا تھا؟'' وہ مسکرایا۔ ''ہوش وحواس تو اڑا دیے تھے تمہارے فون نے۔''

عنبرین کی آنکھوں میں لمحے بھر کے لیے تفخر کا احساس ابھرا لیکن دوسرے ہی لمحے معدوم ہو گیا۔

''مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں بابر......'' عنبرین خلافِ معمول سنجیدہ تھی۔

''ہاں تو باتیں بھی کر لیں گے ابھی مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔ شام کو تیار رہنا ڈنر باہر کریں گے۔''

''تم میرے فون پر آئے تھے پھر یہ کام کہاں سے آ پڑا۔''

''کام تو زندگی کے ساتھ ہیں میری جان۔''

اور عنبرین ایک گہری سانس لے کر چائے بنانے لگی۔



رواحہ اور عظام کو گئے نہ جانے کتنی دیر ہو گئی تھی وہ وہاں ہی لاؤنج میں اخبار گود میں دھرے بیٹھے تھے اور ٹی وی بھی چل رہا تھا لیکن نہ تو وہ ٹی وی دیکھ رہے تھے اور نہ ہی اخبار پڑھ رہے تھے خدا بخش دوبارہ آ کر دور سے انہیں دیکھ گیا تھا، وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے اور خدا بخش جانتا تھا کہ جب وہ یوں کھوئے، کھوئے اپنے آپ میں گم بیٹھے ہوتے ہیں تو اُن کے ذہن میں کیا ہوتا ہے اور وہ کہاں گم ہوتے ہیں اور ماضی کے کون سے اوراق پلٹ رہے ہوتے ہیں۔ ایسے میں وہ انہیں ڈسٹرب نہیں کرتا تھا۔ جانتا تھا یہ یادیں ہی تو انہیں زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ یادیں جو تکلیف دہ بھی تھیں اور خوشگوار بھی...... اس وقت بھی وہ چپ بیٹھے ماضی کی انہی

یادوں میں کھوئے ہوئے تھے اور کبھی ان کا خیال ان لوگوں کی طرف چلا جاتا جو کسی حیاتی دادا کو ڈھونڈنے آئے تھے۔ انہوں نے رواحہ اور عظام سے ان کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن وہ مضطرب ضرور ہوئے تھے۔ ''عظام کے والد سے ضرور ان لوگوں کا ذکر کرنا چاہیے...... کیا خبر...... کیا خبر وہ بھید بھرے لوگ عظام کے والد کے دشمن ہوں اور بہانے سے عظام کو کھوجتے آئے ہوں۔ رواحہ آجائے تو اس سے عظام کے والد کا نمبر لے کر ضرور ان سے بات کرتا ہوں...'' وہ دل ہی دل میں فیصلہ کر کے مطمئن سے ہو گئے اور خدا بخش کی تلاش میں نظر دوڑائی۔ وہ آس پاس نہیں تھا لیکن کچن سے اس کے گنگنانے کی آواز آرہی تھی۔ خدا بخش کو گانے کا بہت شوق تھا حالانکہ نہ تو اس کی آواز اچھی تھی اور نہ ہی وہ ڈھنگ سے سُر لگا پاتا۔ ان کے لبوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی اور وہ ایک بار پھر ماضی میں کھو گئے۔ پتا نہیں ان دنوں وہ کیوں ماضی کو اتنی شدت سے یاد کر رہے تھے۔ شاید اس لیے کہ رواحہ بڑا ہو گیا تھا اور رواحہ کو دیکھ کر کوئی اور بھی شدت سے یاد آجاتا تھا یا شاید اس لیے کہ رواحہ بہت سوال کرنے لگا تھا وہ جب بھی فارغ ہوتا اپنی ماں اور ننھیال کے متعلق سوال کرنے لگتا تھا۔ اور کئی بار عہد کرتا کہ وہ اپنی پڑھائی مکمل کر کے ایک بار تو ضرور اپنے نانا، نانی کو کھوجنے نکلے گا۔

''میری ماما کیسی تھیں؟'' وہ پوچھتا۔

''بہت پیاری......''

''کیا میں کچھ، کچھ ان جیسا ہوں؟''

''ہاں......'' وہ بغور اسے دیکھتے۔ ''تمہاری آنکھیں اور تمہاری یہ ناک تو بالکل چندا جیسی ہے۔''

''سچ......!''

وہ خوش ہو جاتا اور وہ حیران سے اسے تکتے رہتے۔ اس کی آنکھیں اور ناک بالکل اس جیسی تھیں اور آنکھ کے نزدیک کونے میں ناک پر ننھا سا تل...... وہ حیرت زدہ سے اسے دیکھتے رہتے اور وہ آئینے میں خود کو دیکھ، دیکھ کر خوش ہوتا رہتا۔

''اور میں آپ کے بھی جیسا ہوں ناں کچھ، کچھ...... میرا قد، میرا قد تو بالکل آپ پر گیا ہے۔'' وہ مسکرا دیتے۔

''ماما، ہوتیں تو بہت خوش ہوتیں مجھے دیکھ کر کہ میری آنکھیں اور ناک ان جیسی ہے۔''

''ہاں بالکل اس جیسی......''

وہ ان کے سامنے آکھڑی ہوتی، مسکراتی، پلکیں جھپکاتی اور اس کی آنکھوں میں جیسے سورج کا سارا سنہرا پن اتر آتا۔ رواحہ کی آنکھیں بھی خوشی میں یونہی سونا لٹاتی تھیں تو شاید آج کل ماضی اس لیے بھی انہیں شدت سے یاد آتا تھا کہ رواحہ انہیں یاد دلاتا تھا لیکن یہ بھی تو سچ تھا کہ وہ بھولے ہی کب تھے...... محبتیں بھی بھلائی جاسکتی ہیں بھلا اور چندا سے تو انہوں نے محبت کی تھی۔ ایسی محبت کہ جب دل محبت کے احساس سے دھڑکا تو نارسائی نے ساتھ ہی دل کی زمین پر قدم رکھا تھا۔ محبت اور نارسائی ایک ساتھ دل میں اتری تھیں۔ محبت کی میٹھی، میٹھی کسک کے ساتھ نارسائی کا دل کو چیرتا، کاٹتا غم بھی تھا۔ وہ بہت دن تک بابا سے چھپا نہیں پائے تھے کہ انہیں چندا سے محبت ہو گئی ہے۔ بابا کے علاوہ بھلا کون تھا جس سے وہ دل کی بات کہتے۔

''بابا مجھے لگتا ہے جیسے مجھے محبت ہو گئی ہے۔'' اس روز وہ بابا کی گود میں سر رکھے کارپٹ پر بیٹھا تھا اور بیڈ پر بیٹھے بابا اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہے تھے۔ وہ بھی کبھی یوں ہی ماؤں کی طرح اس سے لاڈ کرتے

اور وہ لاڈ اٹھواتا تھا۔

''اچھا..... اسی لڑکی سے جو مونا کے گھر کی سیڑھیوں پر ٹکرائی تھی؟''

اور اس نے اعتراف کیا تھا وہی لڑکی اور اسے لگتا ہے کہ وہ اس کے بغیر..... اس نے لب بھینچ لیے تھے۔

''صرف دو دن کی ملاقات میں.....؟'' وہ مسکرائے تھے اور انہوں نے اس کے بالوں کو ہولے سے کھینچتے ہوئے شعر پڑھا تھا۔

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ تیرا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

وہ اردو ادب کے اسٹوڈنٹ نہ تھے۔ سائنس کے خشک مضمون پڑھاتے تھے لیکن اقبال اور غالب کو انہوں نے گھول کر پی رکھا تھا بلکہ حافظ اور سعدی بھی انہیں ازبر تھے۔

''یہ سچ ہے بابا..... مجھے لگتا ہے کہ وہ میری زندگی میں نہیں ہوگی تو زندگی میرے لیے بے معنی ہو جائے گی اور بابا میرے لیے زندگی بے معنی ہو گئی ہے۔'' وہ بابا کے سامنے رونا نہیں چاہتا تھا لیکن آنکھیں پھر بھی نم ہو رہی تھیں۔ اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے داب لیا کہ کہیں نارسائی کا کرب آہ بن کر لبوں پر نہ آ جائے۔

''ارے کیوں میری جان..... آپ کہو تو ہم ابھی چندا کو اپنی بہو بنا کر گھر لے آئیں۔'' اُن کے لبوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔'' حالانکہ چند دن پہلے تک آپ جلد شادی کی مخالفت کر رہے تھے.....'' اور اس نے تڑپ کر اُن کی طرف دیکھا تھا۔ نم آنکھوں میں سرخی تھی۔

''بابا..... وہ۔'' آنسو کا گولا سا جیسے حلق میں پھنس گیا تھا۔

''اس کی منگنی ہو چکی ہے، مونا نے بتایا ہے مجھے..... لیکن میں اس کا خیال دل سے نکال نہیں پا رہا۔ مجھے لگتا ہے جیسے میرے اردگرد موجود زندگی بالکل پھیکی اور بے رنگ ہو گئی ہے، میں خود کو سمجھا، سمجھا کر تھک گیا ہوں لیکن دل ہے کہ سمجھتا ہی نہیں۔'' وہ بری طرح ہونٹ کچلنے لگا تھا اور بابا جو لمحہ بھر پہلے مسکرا رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں خوش کُن سی شرارت چمک رہی تھی یک دم سنجیدہ ہو گئے تھے۔

''اگر وہ تمہارا نصیب ہوئی تو ضرور.....'' انہوں نے ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھے تھے۔

''اگر وہ میرا نصیب نہیں ہے تو اس کا خیال کیوں میرے دل میں آیا۔ بابا کیوں پہلے کبھی کسی کو دیکھ کر میرے دل میں ایسا خیال پیدا نہیں ہوا تو پھر اس کے لیے کیوں بابا.....؟'' اس نے بابا کی بات کاٹ دی تھی اور ان کی گود سے سر ہٹا کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور زخمی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''دل تو ہر اچھی چیز کی طرف لپکتا ہے بیٹا۔'' وہ یک دم بہت اداس ہو گئے تھے۔ ''کسی معصوم بچے کی طرح لیکن ہر چیز اس کے لیے نہیں ہوتی۔ لاحاصل خواہشوں سے دستبردار ہونا ہی اچھا ہوتا ہے۔ ورنہ یہ ساری عمر رُلاتی ہیں۔ ٹھیک سے جینے نہیں دیتیں۔ ہو سکتا ہے اللہ نے آپ کے لیے کچھ بہت اچھا آپ کے نصیب میں لکھا ہو۔ چندا سے بھی اچھا ہم سفر.....'' انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا اور ہولے، ہولے سر تھپکنے لگے تھے۔

''بھلا چندا سے بھی کوئی اچھا ہو سکتا ہے؟'' اس لمحے اس نے سوچا تھا۔'' جس کی بے نیازی میں عجیب سا سحر ہے۔ اور وہ جب مسکراتی ہے تو اس کی بھوری، بھوری سنہری آنکھوں میں ہزاروں سورج اتر آتے ہیں۔ پھر بھی اس نے خود کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی اور بابا کی خاطر اپنے لبوں پر مسکراہٹ سجالی تھی جو اس کے

لیے پریشان رہنے لگے تھے اور جن کی نظریں ہر لمحہ اسے کھوجتی تھیں اور اس کا دل بہلانے کے لیے وہ کچھ نہ کچھ کرتے رہتے تھے۔ بابا کی روٹین لائف کو اس نے ڈسٹرب کر دیا تھا۔

''میں خوش ہوں بابا...... میں نے اسے بھلا دیا ہے، اب اس کا خیال مجھے تنگ نہیں کرتا بابا۔''

وہ انہیں یقین دلاتا لیکن اس دل کا کیا کرتا جس میں وہ پوری شان سے براجمان مسکراتی رہتی...... بظاہر اس نے اپنے دل کو رضامند کر لیا تھا کہ وہ اس کا نصیب نہیں لیکن جب بی ایس سی کا رزلٹ آیا تو اس نے فزکس کے بجائے انگلش لٹریچر میں اپلائی کیا۔

بابا حیران ہو رہے تھے لیکن کہا کچھ نہیں تھا۔

وہ اسے اپنی زندگی میں شامل نہیں کر سکتا تھا لیکن دیکھ تو سکتا تھا۔ دل کے اپنے ہی تقاضے تھے اور دل نے کب دماغ کی سنی تھی۔

اور یوں وہ، مونا اور چندا پنجاب یونیورسٹی میں ایک ہی ڈپارٹمنٹ کے طالب علم تھے۔

وہ مونا کی دوست تھی اور یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کی چندا سے بات چیت نہ ہوتی جبکہ دونوں ہی ذہین تھے اور پروفیسرز کے پسندیدہ بھی...... جلد ہی تکلف کی دیواریں گر گئیں۔

وہ گھنٹوں شیکسپیر کے ڈراموں، کیٹس، شیلے اور بائرن کی شاعری پر بحث کرتے۔ اس کے اپنے ہی نظریات تھے اور اپنے ہی اصول تھے۔ وہ اکثر دوسروں کی آرا سے اتفاق نہیں کرتی تھی۔ وہ حافظ، سعدی اور اقبال کو ان پر ترجیح دیتی تھی۔ اسے شیکسپیر بھی کچھ خاص پسند نہیں تھا...... وہ حیرت سے اس کی باتیں سنتا...... حیران ہوتا لیکن اختلاف نہ کرتا اور پھر پتا ہی نہیں چلا وہ کب، کیسے ایک دوسرے کے قریب آ گئے...... گفتگو، شیلے، کیٹس حافظ اور اقبال سے ہٹ کر بھی ہونے لگی۔ ایک دوسرے کی پسند ناپسند، دلچسپیاں، مشغلے بھی زیرِ بحث آنے لگے۔ کبھی کبھی اس کے سامنے بیٹھے بات کرتے وہ کھو جاتا، اداس ہو جاتا، کاش یہ منظر ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی میں مقید ہو جاتا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھی یوں ہی اپنی سنہری آنکھوں سے سنہری افشاں بکھیرتی پلکیں جھپک، جھپک کر باتیں کرتی رہے اور زندگی بیت جائے۔ وہ حیران ہو کر اسے دیکھتی اور ٹوکتی بھی۔

''اے...... کہاں کھو گئے ہو؟''

''کہیں بھی نہیں۔'' وہ چونک کر کہتا...... اور اسے دیکھے جاتا۔ بس کچھ دنوں کی بات ہے۔ سال بھر اور پھر وہ اسے نہیں دیکھ سکے گا۔ اس کی آواز نہیں سن سکے گا...... وہ کیوں اس کی طرف کھنچا چلا آیا۔ جبکہ مونا نے بتایا تو تھا...... وہ جانتا تھا کہ...... اور...... اور اس نے تو بابا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ چندا کا خیال دل سے نکال دے گا...... بلکہ یقین بھی دلایا تھا کہ چند دنوں کی بات ہے، وہ جو ہلکا سا ملال ہے دل میں وہ بھی نہیں رہے گا۔ لیکن وہ تو اور زیادہ اس کے اندر سرائیت کرتی جا رہی تھی۔

''کبھی کبھی تم بونگے سے لگنے لگتے ہو، ہے ناں......؟'' وہ مونا کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسی تو مونا کی نظریں اس سے ملتیں، وہ تو جانتی تھی ناں۔

''نہیں چندا، میرا بھائی تو اتنا ڈیسنٹ ہے، بونگا کہاں ہے؟''

''اچھا......'' وہ نچلے ہونٹ کا دایاں کونا دانتوں تلے دبا لیتی لیکن اس کی آنکھیں ہنس رہی ہوتیں۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے بالکل بونگا لگ رہا تھا۔''

''خبردار وہ ہمارے ڈپارٹمنٹ کا سب سے ذہین لڑکا ہے۔'' وہ دونوں کی باتیں سنتا رہتا اور دل جیسے نیچے

ہی نیچے کہیں پاتال میں ڈوبتا جاتا...... وہ کوئی بہانہ کر کے ان کے پاس سے اٹھ جاتا لیکن پھر چند دن بعد دل کو بہلا لیتا۔

''محبت کا مطلب حصول تو نہیں ہے۔ محبت تو بس محبت ہے...... بس محبت کیے جاؤ دل میں بٹھائے رکھو۔ پوجے جاؤ...... وہ سامنے ہو تب بھی محبت کرو۔ سامنے نہ ہو تب بھی چاہے جاؤ۔ بغیر کسی صلے کے، بغیر کسی لالچ کے... لیکن محبت میں صلہ اور لالچ تو نہیں ہوتا۔''

وہ خود ہی سوال جواب کرتا رہتا تھا۔ ''محبت میں خواہش ہوتی ہے محبوب کے قرب کی اس کی رفاقت کی۔ لیکن رفاقت نہ بھی ملے تب بھی محبت مرتی نہیں...... زندہ رہتی ہے۔ اس کی محبت بھی زندہ رہے گی۔ ہمیشہ اس کے دل کو روشن کرتی رہے گی۔''

ان دنوں بابا اسے چپکے، چپکے تکا کرتے تھے۔ جیسے کھوجتے ہوں...... وہ ہمیشہ کی طرح یونیورسٹی کی ہر بات بابا سے آ کر کرتا۔ چندا کی باتیں بھی ہوتیں...... اس کی ذہانت، اس کی برجستگی اس کے نظریات کا ذکر کرتا...... لیکن اس روز کے بعد پھر اس نے بابا سے اپنی محبت کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بابا دکھی ہوں گے۔ اس نے بابا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ وہ لاحاصل خواہشوں سے دستبردار ہونے والے فلسفے کو قبول کر چکا ہے لیکن بابا شاید جانتے تھے۔ وہ اپنے دل کا بھید پہلے کب بابا سے چھپا سکا تھا لیکن اب کے وہ سمجھتا تھا کہ اس نے اپنا بھید چھپا لیا ہے لیکن بابا تو اس کے اندر جھانک کر اس کے دل کی ہر کیفیت سے آشنا ہو جاتے تھے تب ہی تو اس روز وہ اس سے کہہ بیٹھے تھے۔

''آپ نے اپنی زندگی کو زیادہ مشکل نہیں بنا لیا جانم۔'' وہ بظاہر کتاب پر نظریں جمائے بیٹھے تھے لیکن کن انکھیوں سے اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔

''مشکل......؟'' اس نے بے حد حیران ہو کر بابا کو دیکھا تھا۔

''یار کسی دن چندا سے تو ملواؤ۔'' انہوں نے یک دم بات پلٹ دی تھی اور اس نے سوالیہ نظروں سے بابا کی طرف دیکھا تھا۔

''وہ تمہاری کلاس فیلو ہے اور بقول تمہارے، تمہاری گروپ فیلو بھی...... یعنی دوست اور وہ مونا سے ملنے اوپر آتی بھی رہتی ہے تو کیا سوچتی ہو گی کہ کبھی تم نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت نہیں دی۔''

''پتا نہیں بابا کیوں چندا سے ملنا چاہتے تھے؟'' وہ نہیں جانتا تھا۔

''بابا مجھے مناسب نہیں لگا۔ گھر میں کوئی عورت نہیں ہے ناں......''

''ہوں......'' انہوں نے سر ہلایا تھا۔

''اگر اسے بھی نامناسب لگے تو ٹھیک ہے۔ ویسے تمہیں دعوت تو دینی چاہیے ناں......''

بابا کے دل میں کیا تھا وہ نہیں جانتا تھا لیکن دوسرے ہی دن یونیورسٹی میں اس نے اسے دعوت دے ڈالی جب وہ سنڈے کو مونا کے گھر آنے کا پروگرام بنا رہی تھی۔ دونوں مل کر نوٹس بنانا چاہتی تھیں۔

''میں بھی مونا کے گھر کے گراؤنڈ فلور پر رہتا ہوں اگر وقت ملے تو اُدھر بھی چکر لگانا۔''

''کوئی ایسے بھی دعوت دیتا ہے مونا پھر تم کہتی ہو تمہارا بھائی بونگا نہیں ہے۔'' وہ ہنس رہی تھی۔

''پھر کیسے دعوت دی جاتی ہے، تم ہی بتا دو۔'' وہ یک دم خوش ہو گیا تھا۔

''چلو جیسے بھی دی۔ ہم دعوت قبول کرتے ہیں لیکن پھر کبھی کسی کو اتنی بے دلی سے دعوت مت دینا۔ ویسے

آپس کی بات ہے تم دعوت نہ بھی دیتے تو میرا ارادہ .... تمہارے گھر آنے کا تھا۔ تمہارے بابا کی باتیں سن، سن کر مجھے ان سے ملنے کا اشتیاق ہو رہا تھا۔ تمہیں تو توفیق نہیں ہوئی کہ اپنے بابا سے ملواتے۔ میں نے مونا سے کہا تھا کہ مجھے بابا سے ضرور ملوائے۔ مجھے ایسے سیلف میڈ، شفیق، انٹلیکچوئل لوگ بہت پسند ہیں...... اور مونا کہتی ہے تمہارے بابا سراپا محبت وشفقت ہیں۔''

اور پھر وہ بابا سے ملنے آئی تھی۔ بابا کو وہ اچھی لگی تھی۔ بہت ہی اچھی لیکن اس سے مل کر وہ اسے چپ، چپ اور اداس، اداس سے لگے۔

''کیا ہوا بابا...... آپ کو چندا کیسی لگی؟'' اس کے جانے کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

''وہ تو بہت پیاری اور بہت اچھی نیچر کی بچی ہے لیکن جس طرح ہر اچھی چیز ہم حاصل نہیں کر سکتے وہ ہماری دسترس سے دور ہوتی ہے، ہماری رسائی سے پرے...... اسی طرح یہ......''

''لیکن میں نے کب کہا بابا کہ میں اسے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ بابا کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

''میں تو آپ کے سمجھانے پر لاحاصل خواہشوں سے دستبردار ہو چکا ہوں۔'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی تھی لیکن مسکرا نہیں سکا تھا اور بابا نے اسے اس طرح دیکھا تھا جیسے کہہ رہے ہوں ''کیا واقعی......'' اور وہ خود جانتا تھا کہ لاحاصل کی خواہش کم نہیں ہوئی بلکہ تناور ہو گئی ہے لیکن وہ بابا کو دکھی نہیں کرنا چاہتا تھا اور انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ مطمئن ہوئے تھے یا نہیں لیکن پھر انہوں نے اس موضوع پر بات نہیں کی تھی۔

وہ بابا کو اچھی لگی تھی تو اسے بھی بابا اچھے لگے تھے۔ وہ جب بھی مونا کی طرف آتی، بابا سے ملنے ضرور آتی اور بابا سے باتیں کرتی۔ اِدھر اُدھر بکھری ہوئی چیزیں ترتیب سے رکھتی جاتی۔ وہ اس کے دل کے اندر کھبتی چلی جاتی۔ کاش یہ منظر ہمیشہ کے لیے یہاں ہی ٹھہر جائے۔

''تمہارے بابا سے باتیں کرنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ ان کی باتیں جیسے دل میں کھب جاتی ہیں۔ کاش وہ ہماری یونیورسٹی میں پڑھاتے ہوتے۔'' وہ اظہار میں بخل نہیں کرتی تھی یوں بھی وہ دل کی ہر بات برملا کہہ دیتی تھی۔

''لیکن وہ فزکس کے ٹیچر ہیں۔'' مونا یاد دلاتی۔

''اوہ...... ہاں تو میں فزکس ہی پڑھ لیتی۔ ان کے اسٹوڈنٹس بہت لکی ہیں۔''

اس کا آنا اور بابا کو سراہنا اسے خوش کرتا تھا۔

''لیکن یہ عارضی ہے سب وقتی ہے۔ ایک روز اس کی شادی ہو جائے گی۔ وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ مصروف ہو جائے گی۔'' اس پر قنوطیت طاری ہو جاتی اور پھر کئی، کئی دن وہ بے حد افسردہ رہتا۔ ان دنوں بھی اس پر قنوطیت طاری تھی وہ بے طرح اداس تھا۔ وقت جیسے پر لگا کر اڑا جا رہا تھا۔ کوئی دن کی بات تھی وہ اپنی، اپنی ڈگری ہاتھوں میں لیے اپنی، اپنی راہ پر سدھار جائیں گے اور پھر صرف یادیں رہ جائیں گی اور یادیں بھی ایسی جو ہمیشہ دل میں ایک کسک بن کر زندہ رہیں گی۔ اگر اس کے دل میں محبت پیدا ہوئی تھی تو کیا تھا اگر وہ اس کا نصیب بھی بن جاتی۔ وہ کتابی محبت کا قائل نہ تھا...... اس نے محبت کی تھی تو رفاقت کی خواہش بھی اس محبت سے جڑی ہوئی تھی اور اپنی محبت کی رفاقت اس کا نصیب نہ تھی یہ روزِ اول سے اسے پتا تھا پھر بھی وہ خود کو اس کی محبت سے باز نہیں رکھ سکا تھا۔ اس روز سر ریاض نہیں آئے تھے اور وہ تینوں نہر کے کنارے بیٹھے تھے۔ مونا کے ہاتھ میں چپس کا فل سائز پیکٹ تھا۔ وہ دونوں نہ جانے کس بحث میں الجھی زور شور سے باتیں کر رہی

تھیں اور ساتھ، ساتھ چپس بھی کھا رہی تھیں اور وہ بے دھیان سا بیٹھا زمین پر اگی گھاس کو اکھیڑ رہا تھا۔ جب مونا نے چپس کا پیکٹ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا تھا۔

''بھائی آپ کا کیا خیال ہے؟''

''کیسا خیال......؟'' اس نے چونک کر مونا کی طرف دیکھا تھا۔

''یہی محبت کے متعلق......''

''محبت......؟'' اس نے چندا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں جانے کیسی حسرت تھی کہ ایک لمحے کو وہ ساکت سی ہو کر اسے ہی دیکھنے لگی تھی لیکن پھر پیکٹ سے چپس نکال کر کترتے ہوئے بولی۔

''ہاں محبت......''

''محبت کیا ہے؟'' اس نے سوچا تھا' کرب، نارسائی، دکھ، دل کو چھیلتا، کاٹتا ہوا درد......اس کے لیے تو محبت اپنے پلو میں نارسائی کا درد باندھ کر لائی تھی تو محبت کیا تھی۔ دردِ مسلسل......''

''محبت درد کی صورت......'' اس نے چپس کھاتی چندا کی طرف دیکھا تھا۔

اور امجد اسلام امجد کی نظم ذہن کے بند کواڑ کھول کر لبوں پر آ گئی تھی۔

''گزشتہ موسموں کا استعارہ بن کے رہتی ہے
شبانِ ہجر میں روشن ستارہ بن کے رہتی ہے
منڈیروں پر چراغوں کی لویں جب تھرتھراتی ہیں''

''اوں ہوں......'' چندا نے یک دم ٹوکا تھا۔

''محبت کی یہی تعریف ہے کہ......
ازل سے ہے محبت ماورالفظوں کی مالا''
وہ مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتی فاخرہ بتول کو سنا رہی تھی۔
''مگر یہ بھی حقیقت ہے محبت سوچ کے آکاش پر بادل کی صورت میں
سدا پرواز کرتی ہے
کبھی بارش کی بوندوں میں سمٹ کر دل کی دھرتی پر
اترتی ہے بکھرتی ہے
ادا لے کر صبا سے یہ، گلابوں سے مہک لے کر
حسیں آنچل بناتی ہے۔''
وہ بے حد خوب صورت انداز سے نظم سنا رہی تھی۔ وہ اس کے لہجے کے زیروبم میں ڈوبا ہوا تھا۔
''اسی آنچل سے پھر خوابوں کے کچے گھر سجاتی ہے
محبت آزماتی ہے
یہ خوشبو ہے، ہمیشہ پھول کی سانسوں میں ہوتی ہے''
''بہت خوب لیکن میرے خیال میں محبت کی تعریف کی ہی نہیں جاسکتی......محبت ہے تو بس ہے۔'' مونا نے پیکٹ کو اپنی ہتھیلی پر الٹا تھا اور اب چپس کا چورا کھا رہی تھی۔
''ویسے۔'' اس نے ہاتھوں کو اپنے دوپٹے کے کونے سے رگڑ کر صاف کیا۔ اور اب چندا کی طرف دیکھ رہی تھی۔
''تم......کیا تم بھی محبت کرتی ہو......میرا مطلب ہے اپنے منگیتر سے۔''
''وہاٹ منگیتر......؟'' چندا کی آنکھوں میں حیرت تھی۔
''تمہارا منگیتر......وہی تمہارا کزن جو تمہارے گھر میں رہتا ہے۔'' مونا اسے ہی دیکھ رہی تھی۔
''ہاں، وہ میرا کزن ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں ہے کہ وہ میرا منگیتر بھی ہے۔''
''لیکن تمہاری ممی نے مجھے بتایا تھا کہ تم دونوں کا رشتہ طے ہو چکا ہے۔'' اب کے مونا کی آنکھوں میں حیرت تھی۔
''ربش......'' اس نے برا سا منہ بنایا تھا۔ ''زہر لگتا ہے وہ مجھے اور میں نے ممی، ڈیڈی دونوں کو بتا دیا ہے کہ مجھے اس سے تو ہرگز شادی نہیں کرنی اور ڈیڈی کو تو کوئی اعتراض بھی نہیں ہے لیکن ممی کا موڈ کچھ دن ضرور خراب رہا......بلکہ......'' وہ ہولے سے ہنسی۔ ''وہ تو اب بھی کبھی کبھی مجھے کنونس کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔''

وہ اور پتا نہیں کیا، کیا کہہ رہی تھی۔ اس نے سنا ہی نہیں۔ اس کے اردگرد تو جیسے رنگ ہی رنگ بکھر گئے تھے۔ روشنیاں ہی روشنیاں تھیں اور جیسے آسمان سے پریاں اتر کر اس کے اردگرد آس پاس رقصاں تھیں۔

''کیا دنیا اتنی ہی خوب صورت ہے؟'' اس نے سوچا تھا۔ ''یا آج اسے خوب صورت لگ رہی تھی۔'' یکا یک نارسائی اپنا بوریا بستر باندھ کر اس کے دل سے رخصت ہو گئی تھی اور وہاں صرف محبت

تھی، جس کے آنچل میں جگنو تھے، تارے تھے، تتلیاں تھیں اور پھول تھے اور جس کے پلو سے خوب صورت امیدیں بندھی تھیں۔ اس روز وہ گھر آیا تو خوشی اس کے کھنکتے لہجے سے چھلکتی تھی اور چمکتی آنکھوں سے جھانکتی تھی۔

بابا نے عینک کے شیشوں کے پیچھے سے اسے دیکھا تھا۔ اپنے بے حد لاڈلے بیٹے کو جس کی آنکھیں سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا تھا ہنسنا بھول گئی تھیں۔ جس کے لہجے سے کھنک رخصت ہوگئی تھی اور افسردگی کا سرمئی سا غبار، ہمہ وقت اس کے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیے رکھتا تھا۔ وہ محبت اور محبت کے ساتھ نارسائی کے کرب سے گزر رہا تھا تو کیا اس نے اس درد کو سہنا سیکھ لیا۔ اس کرب سے سمجھوتا کرلیا یا پھر نارسائی باقی نہیں رہی۔ یقیناً کسی امید نے اس کا دامن تھاما تھا۔

''ہاں بابا، آج میں بہت خوش ہوں، بے حد......'' ان کی استفسار کرتی آنکھوں کے سارے سوال جیسے اس نے ازخود پڑھ لیے تھے۔ ''مجھے لگتا ہے جیسے میرے ساتھ پوری کائنات رقص میں ہے۔''

اور وہ عینک اتار کر بہت اشتیاق سے اسے دیکھنے لگے تھے تب اس نے خود سے سب کچھ بتادیا تھا لیکن اسے لگا جیسے بابا زیادہ خوش نہیں ہوئے۔ ہاں سوچ میں ڈوب گئے تھے۔

''بابا جان......'' اس نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ ''آپ کیا سوچ رہے ہیں؟''

''سوچ رہا ہوں بار بار امیدوں کا ٹوٹنا آدمی کو توڑ دیتا ہے۔ کوئی بہت زیادہ امیدیں وابستہ نہ کرلینا جانم، وہ بڑے لوگ ہیں، ہمارے اور ان کے اسٹیٹس میں بہت فرق ہے۔''

''بابا جان......'' وہ ہولے سے ہنسا تھا اور ان کے پاس بیٹھتے ہوئے ان کے ہاتھ تھامے تھے۔

''ابھی تو میں نے خود کو یہ باور کرایا ہے کہ راستے بند نہیں کھلے ہیں اور میں راستے کے آغاز پر کھڑا خوش ہوکر دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں راستے تو صاف ہیں۔ اب میرا نصیب کہ میرے قدموں کو یہ راستے قبولتے ہیں یا لوٹا دیتے ہیں...... آپ میرے لیے دعا کریں گے ناں بابا جان! مجھے نارسائی سے بہت ڈر لگتا ہے، مجھے کھودینے سے خوف آتا ہے۔ میں لوزر نہیں بننا چاہتا۔'' اب پتا نہیں یہ بابا جان کی دعاؤں کا اثر تھا یا اس کے اپنے جذبے صادق تھے کہ محبت اس کی انگلی تھام کر چلنے لگی تھی۔ وہ دونوں جیسے ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے۔

''مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا...... بلکہ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کسی روز میں تمہارے لیے ایسے سوچوں گی۔'' ایک روز نہر کے کنارے ساتھ، ساتھ چلتے ہوئے اظہار نے لفظوں کا جامہ پہنا تھا۔ ''اور مجھے لگے گا کہ اگر زندگی کے سفر میں تم میرے ہم سفر نہ ہوئے تو میری سانسیں بند ہوجائیں گی۔'' اور پھر وہ ہولے سے ہنسی تھی۔

''یہ محبت بھی کیا چیز ہے۔ اچانک یلغار کرتی ہے اور پھر جسم وجاں پر قابض ہوتی چلی جاتی ہے۔''

''صاحب......'' خدا بخش نے ان کے بالکل قریب آکر انہیں بلایا تھا اور یہ خدا بخش کی عادت تھی کہ جب وہ بہت دیر تک یونہی اردگرد سے بیگانہ ہوکر بیٹھ جاتے تھے تو وہ انہیں اس فیز سے باہر لے آتا تھا۔ وہ اسے دیکھنے لگے۔

احہ بابا تو لنچ باہر ہی کریں گے۔ جواد صاحب اور عظام صاحب کے ساتھ...... آپ کے لیے کیا

''کچھ نہیں خدا بخش...... ناشتے کے لیے لایا گیا سامان ہے ناں اتنا کچھ تو بچا ہوا ہے۔ نہاری یا پائے گرم کر لینا۔'' خدا بخش کو بتا کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور خدا بخش نے انہیں اپنے بیڈروم کی طرف جاتے دیکھا تو بڑبڑایا۔

''اور اب بیٹھ جائیں گے البم کھول کر۔'' انہوں نے خدا بخش کی بڑبڑاہٹ تو سنی تھی لیکن مڑ کر اسے نہیں دیکھا تھا۔ خدا بخش سے بھلا کیا چھپا تھا۔ وہ تو ان کے... ہر، ہر پل کا راز داں تھا۔ ان کی خوشیوں کا ساتھی...... اور ان کے دکھوں کا ساتھی...... اپنے بیڈروم میں آ کر دروازہ لاک کر کے انہوں نے بہت احتیاط سے اپنا اٹیچی کیس بیڈ کے نیچے سے نکالا تھا۔ بیڈ کے نیچے اٹیچی کیس وغیرہ رکھنے کی جگہ بنی ہوئی تھی پھر اسی احتیاط کے ساتھ سب کپڑوں کے نیچے سے انہوں نے ایک البم نکالی تھی اور اب بیڈ پر بیٹھے البم گود میں رکھے ایک، ایک صفحہ بہت احتیاط سے پلٹ رہے تھے۔

☆☆☆

''تم اور میں زندگی کا سفر ایک ساتھ طے کرتے یہی چاہا تھا ہم نے اور اس چاہت کی اتنی بڑی سزا کیوں ملی فرحی......؟'' ثمر حیات کارنس پر کہنیاں ٹیکے فرحی کی تصویر سے مخاطب تھا۔

''وہ رات...... کاش وہ رات ہماری زندگی میں نہ آتی۔'' ایک گہری سانس لے کر وہ کارنس کے پاس سے ہٹ کر بیڈ پر بیٹھ گیا تھا وہ رات جیسے اپنی پوری سفاکی کے ساتھ اس کے سامنے تھی۔

وہ فرحی کا ہاتھ پکڑے اندھا دھند بھاگے جا رہا تھا۔ بائیک نے تو چند قدموں کے بعد ہی ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ کتنے دنوں سے بائیک گھر میں کھڑی تھی۔ وہ گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اسے علم نہیں تھا کہ پٹرول ہے یا نہیں...... جس طرح فرحی اچانک آئی تھی اس نے کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی چھین لی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ان کے ہاتھ لگنے کا مطلب دونوں خاندانوں کی بے عزتی، اس نے پولیس کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا۔ شکر ہے کہ پولیس والے پیدل ہی تھے اور ان کے پاس کوئی سواری نہیں تھی۔ اگر وہ ان کے ہاتھ لگ جاتے تو خدا جانے وہ کیا سلوک کرتے...... اگر بائیک دھوکا نہ دیتی تو وہ اب تک ان کی پہنچ سے دور نکل چکے ہوتے۔

''فرحی سنو......'' اس کے ساتھ، ساتھ بھاگتے ہوئے اس نے فرحی سے کہا تھا۔ ''اگر میں ان کے ہاتھ لگ گیا تو تم رکنا نہیں اِدھر اُدھر بھاگ کر، کہیں چھپنے کی کوشش کرنا...... اور کہیں سے فون کر کے اپنے ڈیڈی کو بلا لینا۔''

''یا اللہ فرحی کی عزت و آبرو کو محفوظ رکھنا۔'' وہ دل ہی دل میں دعا مانگتے ہوئے فرحی کا ہاتھ تھامے ایک تنگ گلی میں گھس گیا تھا۔ گلی میں اندھیرا تھا۔ اس گلی میں اسٹریٹ لائٹ سرے سے تھی ہی نہیں یا اس وقت جل نہیں رہی تھی۔ چلتے، چلتے اسے ٹھوکر لگی تھی شاید کوئی اینٹ یا پتھر گلی کے عین درمیان میں پڑا ہوا تھا۔ وہ یک دم جھکا تھا لیکن پھر فوراً ہی سیدھا ہوا تھا...... دائیں طرف سے ایک گھر کا دروازہ کھول کر کچھ لوگ بھاگتے ہوئے باہر نکلے تھے۔ دروازہ کھلنے پر ذرا دیر کو گلی میں روشنی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا وہ تین افراد تھے۔ چہروں پر نقاب ڈالے ہوئے۔ ایک نے مڑ کر باہر سے دروازہ بند کیا تھا۔ ایک لمحہ لگا تھا ثمر کو صورتِ حال سمجھنے میں۔ وہ تیزی سے فرحی کا ہاتھ تھامے بائیں طرف والی گلی میں مڑ گیا تھا۔ ساتھ ہی فائر کی آواز کے ساتھ فرحی کی چیخ سنائی دی تھی وہ ایک لمحے کے لیے رکا تھا۔

''مجھے گولی لگ گئی ہے ثمر......'' وہ سسکی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ یونہی فرحی کا ہاتھ تھامے پھر دوڑنے لگا

تھا۔ پیچھے گلی سے چور، چور کی آوازیں بھی بلند ہوئی تھیں اور گلی میں دوڑتے قدموں کی آواز کے ساتھ فائرنگ کی آواز بھی سنائی دینے لگی تھی۔ آپس میں فائرنگ کا تبادلہ ہورہا تھا۔ اس کے پیچھے آنے والے پولیس کے افراد کا سامنا غالباً ڈاکوؤں سے ہوگیا تھا۔

''یا اللہ مدد فرما!'' وہ دل ہی دل میں دعا مانگتا ایک اور گلی میں مڑ گیا تھا اور پھر اسے ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ گلی بند تھی۔ گلی کے سرے پر کسی مکان کی بیک سائڈ تھی۔ اس نے کچھ دیر کے لیے دیوار سے ٹیک لگائی تھی اور فرحی کی طرف دیکھا تھا۔ اس گلی کے شروع میں ایک مکان کے گیٹ پر مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ وہ قدرے اندھیرے میں کھسک گیا۔'' کیا وہ ہنگامہ ختم ہونے تک یہاں ہی کھڑے رہیں۔ لیکن اگر وہ لوگ ادھر آنکلے تو......'' تب ہی دائیں طرف ایک گھر کے چھوٹے گیٹ کو کھول کر کوئی باہر نکلا تھا۔ شاید چوکیدار تھا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر سیدھا آگے بڑھ گیا تھا۔ یقیناً وہ صورتِ حال جاننے کے لیے اس گلی میں جارہا تھا۔ جہاں سے اب صرف اونچا، اونچا بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

''ثمر......'' فرحی کی آواز بہت آہستہ تھی۔ ''میں شاید مرنے لگی ہوں۔''

''نہیں۔'' اس نے چونک کر فرحی کی طرف دیکھا۔ ''ہمت کرو فرحی......'' اور اس کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے گھر کی طرف بڑھا جس کے ذیلی گیٹ سے وہ شخص نکل کر گیا تھا اور گیٹ نیم وا تھا۔ اس کی نظریں نیم وا گیٹ پر تھیں۔ ساتھ والی گلی میں کسی کے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی تو وہ تیزی سے فرحی کا ہاتھ پکڑے گیٹ کے اندر داخل ہوگیا۔ اسے لگا جیسے فرحی گرتی جارہی ہو اس کے ہاتھوں پر فرحی کی گرفت کمزور ہوگئی تھی۔

''فرحی......'' اس نے بے چینی سے اسے آواز دی۔

لیکن اس کے گھٹنے مڑتے جارہے تھے۔ اس نے سہارا دے کر فرحی کو نیچے بٹھایا۔ اب وہ دونوں گیٹ کے ساتھ موجود دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ دائیں طرف لان تھا اور بائیں طرف پورچ میں گاڑی کھڑی تھی۔ مدھم روشنی میں اس نے دیکھا فرحی کی آستین خون سے تر ہورہی تھی اور اس کی آنکھیں بند ہورہی تھیں۔

''فرحی......فرحی......'' وہ دیوانہ وار اسے پکارنے لگا گرد و پیش سے بے خبر ہوکر...... وہ جہاں بیٹھے تھے وہاں روشنی مدھم تھی اگرچہ پورچ کی لائٹ جل رہی تھی لیکن گیٹ کے ساتھ لان میں موجود گھنے درختوں کی وجہ سے ان تک بہت کم روشنی آرہی تھی۔

''فرحی......'' وہ اس کا ہاتھ تھامے رونے لگا تھا۔ تب ہی اندرونی گیٹ کھلنے کے ساتھ ہی برآمدے کی تیز لائٹ جل اٹھی تھی۔ گیٹ سے کوئی شخص ہاتھ میں ریوالور لیے باہر آیا تھا۔

''کون ہو تم......؟'' اس نے برآمدے میں کھڑے، کھڑے ہی انہیں دیکھ لیا تھا۔

''شیر خان۔'' ساتھ ہی اس نے آواز دی تھی۔

''سر......'' اس نے ایک ہاتھ سے فرحی کو سہارا دیتے ہوئے دوسرا ہاتھ بلند کیا تھا۔

''سر ہمیں مدد کی ضرورت ہے، پلیز ہماری مدد کریں۔''

تب ہی کوئی شخص گیٹ کھول کر اندر آیا۔ غالباً یہ وہی تھا جو کچھ دیر پہلے گیٹ سے باہر گیا تھا۔ اس کے پاس بھی گن تھی۔

''شیر خان اتنی دیر کہاں لگا دی تم نے؟'' وہ شخص انہیں نظر انداز کر کے شیر خان سے پوچھ رہا تھا۔

''صاحب میں شور سن کر باہر نکلا تھا۔ اُدھر پچھلی گلی میں ڈاکا پڑا ہے۔ تین ڈاکو تھے، بھاگ گئے لیکن ایک پولیس والے کو پھڑکا دیا۔ پولیس والے غالباً معمول کی گشت پر تھے۔''

خوف سے اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

''سر......'' اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''انہی ڈاکوؤں کی گولی میری ساتھی کو لگی ہے۔ پلیز اسے اسپتال لے جانے میں ہماری مدد کریں۔ بہت خون نکل چکا ہے۔''

''شیر خان گیٹ لاک کردو۔'' اس شخص نے پہلے شیر خان سے کہا اور پھر اس کی طرف دیکھا۔

''اسے اندر لے آؤ۔''

''فرحی......فرحی۔'' اس نے فرحی کا بازو پکڑ کر ہلایا لیکن وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ تب اس نے جھک کر فرحی کو اٹھالیا اور اس شخص کے پیچھے، پیچھے اندرونی گیٹ سے داخل ہو کر لاؤنج میں آیا تھا اور اس شخص کے اشارے پر اس نے فرحی کو صوفے پر لٹا دیا۔

''پلیز دیر مت کریں۔ آپ کے پاس گاڑی ہے، ہمیں کسی اسپتال میں پہنچادیں۔'' اس نے فرحی کا دوپٹا پھاڑ کر اس کے بازو پر باندھا تھا۔

''تم کیا سمجھتے ہو کہ اسپتال والے فوراً ہی تمہاری ساتھی کی مرہم پٹی کرنے لگیں گے۔ پہلے پولیس کو رپورٹ کریں گے پھر مریضہ کو ہاتھ لگائیں گے اور جب تک پولیس آئے گی تب تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔''

وہاں ہی کھڑے، کھڑے اس نے کسی کو آواز دی تھی۔ ایک دبلا پتلا سا لڑکا کہیں سے نکل کر لاؤنج میں آیا تھا۔

''جلدی کراوئے گلّے، جا کر اس دلدار کے بچے کو جگا۔ کہنا سامان لے کر آئے گولی نکالنی ہے۔''

''یا اللہ میں کیا کروں......'' وہ بے بسی سے فرحی کو دیکھ رہا تھا۔

''فرحی، فرحی آنکھیں کھولو۔ اپنے گھر کا نمبر بتاؤ تاکہ تمہارے گھر اطلاع دے سکوں۔''

اس نے کبھی فرحی کو فون نہیں کیا تھا۔ کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ یوں بھی فرحی نے بتایا تھا فون ڈیڈی کے کمرے میں ہوتا ہے اور لاؤنج میں ایکسٹینشن ہے۔ آخری ملاقات میں فرحی نے اس کا نمبر لے لیا تھا اور کہا تھا کہ جب موقع ملے گا وہ خود ہی فون کرلیا کرے گی۔

دلدار نامی شخص آگیا تھا اور فرحی کا معائنہ کررہا تھا۔

''گولی اندر نہیں ہے۔ بازو کے گوشت کو چیرتی ہوئی نکل گئی ہے۔ اللہ نے کرم کیا ہے۔ ہڈی بچ گئی ہے۔ خون زیادہ بہنے اور دہشت سے بے ہوش ہیں۔'' وہ بتا کر پھر سے فرحی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اس نے بینڈیج کردی تھی اور انجکشن بھی لگا دیا تھا۔

''یہ کب تک ہوش میں آجائے گی؟'' اس نے دلدار سے پوچھا تھا۔

''میں نے جو انجکشن لگایا ہے اس میں نیند کا اثر بھی ہے۔ صبح تک آرام سے سوتی رہیں گی۔''

''اوہ......نہیں......'' وہ کراہا اور بے بسی سے ہاتھ ملے۔

''گھر میں میری ماں، میرے انتظار میں جاگ رہی ہوگی۔ اور اُدھر صبح سے پہلے فرحی گھر نہ پہنچی تو قیامت آجائے گی۔''

’’گھر سے چوری چھپے باہر رکھنے والا پہلا قدم ہی عورت کو پاتال میں گرا دیتا ہے۔‘‘ اماں کی آواز اس کے کانوں میں آئی تو وہ گھبرا کر فرحی کو پھر آوازیں دینے لگا۔ وہ شخص بہت گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ دلدار کو اس نے جانے کا اشارہ کیا تھا۔

’’فرحی......فرحی اٹھو......‘‘ وہ اسے جھنجوڑنے لگا۔ ’’سونا نہیں، پلیز اٹھ جاؤ ہمیں ہر صورت گھر جانا ہے۔ تمہارے گھر......فرحی......‘‘

’’نوجوان اُدھر آرام سے بیٹھ جاؤ اور تفصیل سے سب کچھ بتاؤ۔‘‘ اس شخص نے اپنے سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

’’سر......‘‘ اس نے بے بسی سے سوئی ہوئی فرحی کی طرف دیکھا اور سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔

’’اگر فرحی صبح سے پہلے گھر نہ پہنچی تو قیامت آجائے گی۔ اس کے ڈیڈی اور بھائی بہت سخت ہیں جناب......‘‘

’’صبح تو ہو چکی جوان۔‘‘

’’نہیں۔‘‘ اس نے سامنے کلاک پر نظر ڈالی...... پانچ بجنے والے تھے۔ وہ دو بجے گھر سے نکلے تھے اور اب تقریباً تین گھنٹے گزر چکے تھے۔

’’سر پلیز ہماری مدد کریں۔ فرحی کو ہر صورت گھر پہنچنا چاہیے۔‘‘ خدا کے لیے سر......‘‘ اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

’’تمہاری ماں بھی تو تمہارے انتظار میں جاگ رہی ہوگی۔ تمہارے گھر میں فون ہے۔‘‘

’’جی......لیکن......‘‘ فون تو کئی دنوں سے ڈیڈ پڑا تھا۔ اماں نے کتنی بار کہا بھی تھا کہ وہ خود فون کے آفس جا کر بات کر لے۔ کمپلینٹ کا تو کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ ابا نے کئی بار کروائی تھی اور وہ آج کل پرٹالتا رہا تھا کیونکہ وہ بچھڑ جانے اور کھو دینے کے کرب سے گزر رہا تھا۔

’’دیکھو شاید ٹھیک ہو گیا ہو۔‘‘ اس شخص کی نظریں اسی پر تھیں۔

’’لیکن فون اگر ٹھیک ہوتا تو......‘‘ اسے یاد آیا۔ فرحی نے کہا تھا کہ اس نے اسے فون کرنے کی کوشش کی تھی وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ کیا فیصلہ کر چکی ہے لیکن فون ڈیڈ تھا...... کاش فون ڈیڈ نہ ہوتا تو وہ اسے فون پر ہی منع کر دیتا، گھر چھوڑنے سے پہلے سمجھا دیتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ کیا پتا فون ٹھیک ہو گیا ہو...... کوئی معجزہ ہو گیا ہو اور رات بھر میں فون کام کرنے لگا ہو۔ تب وہ اماں سے کہے گا کہ وہ اس وقت فرحی کے گھر جا کر بتائیں کہ وہ زخمی ہے اور......

وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس شخص نے فون اسٹینڈ کی طرف اشارہ کیا تو وہ ایک امید کے ساتھ فون کی طرف بڑھا اور کانپتے ہاتھوں سے نمبر ملایا۔ ایک بار نہیں کئی بار مایوسی نے اس کے دل کو جیسے جکڑ لیا تھا۔ اب تو ابا بھی جاگ چکے ہوں گے اور نماز کے لیے مسجد چلے گئے ہوں گے۔ اماں نے ضرور میرے متعلق بتا دیا ہوگا یا شاید کوئی بہانہ بنا دیا ہو کہ طبیعت خراب ہے ورنہ رات ہی تو اس نے ابا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ صبح ان کے ساتھ دکان پر جائے گا اور یہ کہ وہ فجر کی نماز کے لیے اسے بھی اٹھا دیں......فون خراب تھا اور کوئی معجزہ نہیں ہوا تھا۔ بھلا معجزے اس جیسے انسانوں کے ساتھ کہاں ہوتے ہیں۔ وہ ریسیور کریڈل پر ڈال کر لرزتے قدموں سے مڑا تھا۔ رات بھر جاگنے اور پریشانی سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرے پر وحشت ٹپک رہی تھی۔ وہ

اس شخص کے قریب آ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

''سر باہر آپ کی گاڑی کھڑی ہے، پلیز ہماری مدد کریں۔ اپنے ڈرائیور سے کہیں ہمیں فرحی کے گھر پہنچا دے۔ پھر چاہے جو بھی فرحی کے ڈیڈی چاہیں مجھے مار ڈالیں لیکن مجھے سورج نکلنے سے پہلے فرحی کو اس کے گھر پہنچانا ہے یا پھر فون کر کے ایمبولینس منگوا دیں۔ میں فرحی کو لے جاؤں گا اور آپ کا یہ احسان زندگی بھر میں نہیں بھولوں گا۔ پلیز......'' آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے تھے۔

''حوصلہ اور صبر کرو جوان۔'' اس شخص نے ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھا۔

''آپ کی بھی بچیاں ہوں گی، بہنیں ہوں گی، آپ جانتے ہیں ناں ایک لڑکی کی عزت اس کے اور اس کے گھر والوں کے لیے کتنی قیمتی متاع ہوتی ہے۔''

''ریلیکس، اٹھو، اٹھ کر بیٹھو بلکہ منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤ۔ میں ناشتا بنواتا ہوں، ناشتا کرو پھر کچھ سوچتے ہیں۔'' اس نے کھڑکیوں کی طرف دیکھا جہاں دبیز پردے پڑے تھے۔ شاید باہر صبح کی روشنی پھیل چکی تھی۔ اور پھر فرحی کی طرف دیکھا جو صوفہ کم بیڈ پر بے سدھ پڑی تھی اگر وہ ہوش میں ہوتی تو وہ اسے لے کر نکل جاتا۔ ایک منٹ بھی نہیں رکتا اور نہ اس شخص کی منت کرتا، یہ شخص جس کے چہرے پر کسی قسم کا تاثر نہیں جھلکتا تھا۔ اگر وہ اس کی آنکھوں کی طرف دیکھتا تو حیران رہ جاتا۔ اس کی چھوٹی، چھوٹی آنکھوں سے بلا کی مکاری جھلکتی تھی اور اس شخص کو اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے میں کمال کا ملکہ حاصل تھا۔ وہ کسی گل کو آواز دیتا لاؤنج سے نکل گیا تھا اور وہ ایک بار پھر فرحی کو آوازیں دینے لگا تھا۔

''فرحی پلیز آنکھیں کھولو، پلیز ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ ابھی وقت ہے ہمارے پاس۔'' اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا اور پھر چونک کر ہراساں نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تھا۔ فرحی کا ہاتھ جل رہا تھا اسے بہت تیز بخار تھا۔

''یا اللہ کیا کروں۔'' اس نے بے بسی سے ہاتھ ملے۔ ''فرحی کو یہاں ہی چھوڑ کر خود چلا جاؤں۔ اور اماں کو ساتھ لے کر فرحی کے گھر جاؤں لیکن کیا اس اجنبی شخص پر اعتبار کر سکتا ہوں۔ کیا خبر......نہیں میں فرحی کو یہاں ہرگز اکیلا نہیں چھوڑ سکتا ہوں۔'' اس نے فرحی کی جلتی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ تب ہی گل نامی شخص لاؤنج میں آتا دکھائی دیا۔

''صاحب اُدھر اس طرف واش روم ہے۔'' قریب آ کر اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

''ہاں ٹھیک ہے لیکن تمہارے صاحب کہاں ہیں مجھے ان سے بات کرنی ہے۔''

''وہ......'' اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ وہ شخص اِدھر ہی آ رہا تھا۔

''سر......'' وہ تیزی سے اٹھ کر اس کی طرف لپکا۔

''وہ فرحی......فرحی کو بخار ہو گیا ہے۔ بہت تیز بخار......وہ جل رہی ہے۔ بخار سے پلیز وہ......آپ اسی ڈاکٹر کو بلا دیں پلیز جسے پہلے بلایا تھا۔''

اس شخص نے مڑ کر گل نامی شخص سے کچھ کہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہی رات والا شخص دلدار آ گیا تھا۔ اس نے فرحی کا بخار چیک کیا تھا اور گل کو ٹھنڈا پانی لانے کو کہا تھا۔

''انفیکشن تو نہیں دلدار......''

''نہیں باس......خون نکلنے اور دہشت سے بخار تیز ہو گیا ہے۔ اگر ٹمپریچر کم نہ ہوا تو پھر دیکھیں گے کیا کرنا ہے۔'' گل ٹھنڈا پانی اور کپڑے کی پٹی لے آیا تھا بنا کچھ کہے اس نے ملازم سے فوراً لے لیا اور فرحی کے

قریب نیچے کارپٹ پر بیٹھ کر اس کے سر پر پٹیاں رکھنے لگا۔
''بخار کم ہو جائے تو یہ پٹیاں رکھنا بند کر دینا۔'' دلدار نے اسے تاکید کی تھی اور پھر وہ تینوں ہی لاؤنج سے چلے گئے تھے۔
''یا اللہ فرحی کا بخار اتر جائے، یا اللہ یہ ہوش میں آجائے۔'' وہ دل ہی دل میں دعا کرتے ہوئے اس کے ماتھے پر پٹیاں رکھ رہا تھا۔ جب وہ شخص پھر واپس آیا تھا۔
''تم ایسا کیوں نہیں کرتے جوان خود چلے جاؤ اس کے گھر اور اطلاع دے آؤ...... رات کو تمہیں پتا نہیں چلا ہوگا...... یہ سمن آباد کا علاقہ ہے اور اسٹریٹ نمبر......''
''نہیں...... میں اس طرح فرحی کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔'' بے اختیار اس نے اس کی بات کاٹی تھی۔
''اعتبار نہیں ہے ہم پر......؟'' وہ مسکرایا تھا۔
''خیر...... اس کا بخار کم ہو جائے تو ناشتے کے لیے آجانا۔'' وہ اسی طرح واپس مڑ گیا تھا۔ وہ اس کی پیشانی پر پٹیاں رکھنے لگا۔ پھر پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی تھی اسے احساس نہیں ہوا تھا کہ ایک فرحی نے پیشانی سے پٹی ہٹا کر آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ کچھ دیر یونہی خالی، خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر یک دم اٹھنے کی کوشش کی۔ اس نے سہارا دے کر اسے اٹھایا اور جیسے گزری رات کا ہر منظر اس کی آنکھوں کے سامنے زندہ ہو گیا۔ کچھ دیر وہ ہونٹ کاٹتی رہی پھر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی پہلے آہستہ، آہستہ پھر اونچا، اونچا زور، زور سے۔
''فرحی پلیز اٹھو...... ہمیں جانا ہے۔ ابھی اسی وقت......''
''ہم کہاں ہیں؟'' فرحی نے روتے، روتے سر اٹھایا تھا۔
''اسی گھر میں جہاں ہم چھپنے کے لیے داخل ہوئے تھے۔''
''یہ کس کا گھر ہے؟'' فرحی خوفزدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔
''سوچنے کا وقت نہیں ہے فرحی...... اٹھو دیر ہو جائے گی۔'' لیکن دیر تو ہو چکی تھی۔ وہی ملازم گل شاید فرحی کے رونے کی آواز سن کر آیا تھا۔ اس نے کھڑکی سے پردہ ہٹایا تو کھڑکی کے شیشوں سے دھوپ چھن، چھن کر اندر آنے لگی۔ دونوں نے ایک ساتھ کھڑکی کی طرف دیکھا۔ پوری رات گزر چکی تھی۔ فرحی کے آنسو اب خاموشی سے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔
''صاحب کہہ رہے ہیں منہ ہاتھ دھو کر ناشتا کر لیں۔'' پردے ہٹا کر گل نے ان کی طرف دیکھا تو اس نے سر ہلا دیا۔
''فرحی پلیز حوصلہ کرو۔ اٹھو...... فریش ہو جاؤ۔ چند منٹ کی دیر یا سویر سے ابھی کیا فرق پڑنے والا ہے۔ بس ہم ابھی نکل جاتے ہیں۔ جب ہم ساری حقیقت انہیں بتائیں گے تو وہ ضرور تمہیں معاف کر دیں گے۔ نہیں بلکہ پہلے تم فون کر لو۔ بتا دو انہیں کہ تم زخمی ہو اور......''
''فون......'' فرحی نے خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ''نہیں اب تک تو سب کو پتا چل چکا ہوگا کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ ممی، ڈیڈی، بھائی، آپی سب کو...... مجھے خود ہی جانا ہوگا۔ مجھے بتانا ہوگا جا کر... کہ میں نے غلطی کی تھی لیکن میں لوٹ رہی تھی بلکہ میں کہہ دوں گی میں صرف تمہیں ملنے گئی تھی...... لیکن نہیں میں نے تو اپنی ٹیبل پر خط بھی لکھ کر رکھ دیا تھا۔'' اس کا ذہن ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا۔

وہ ایک بار پھر رونے لگی تھی۔ وہ بے بسی سے اسے روتے دیکھ رہا تھا۔ ملازم پھر انہیں بلانے آیا تھا۔

''صاحب ناشتے پر انتظار کر رہے ہیں۔''

''نہیں، ہمیں ناشتا نہیں کرنا، ہمیں گھر جانا ہے ابھی اسی وقت......'' فرحی کھڑی ہوگئی تھی اس نے اپنی پھٹی ہوئی خون آلود آستین کو دیکھا۔ جسے رات دلدار نامی شخص نے زخم کی بینڈیج کرنے کے لیے پھاڑ دیا تھا۔ اس نے اپنے دوپٹے سے سارے جسم کو اچھی طرح ڈھانپا۔

''ابھی بات صرف گھر تک ہی ہوگی۔ پھیلی نہیں ہوگی۔ ممی نے شاید میرا خط پڑھ لیا ہو۔ شاید نہ پڑھا ہو...... وہ مجھے ڈانٹ ڈپٹ کر شاید قبول کرلیں۔ ثمر لیکن اگر بات پھیل گئی تو......''

''ٹھیک ہے چلو......'' اس نے فرحی کو سہارا دینے کے لیے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''رکو......'' وہ شخص ڈائننگ روم سے باہر نکلا تھا۔

''باہر آس پاس کی ساری گلیوں میں پولیس ہے۔ کچھ دیر انتظار کرلو۔ ابھی شیر خان نے کچھ دیر پہلے بتایا ہے۔''

''لیکن پولیس نے ہمیں کیا کہنا ہے، ہم نے کیا، کیا ہے؟'' اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

''تم نے کچھ نہیں کیا...... یہ تم کہہ رہے ہوناں لیکن پولیس کا کہنا کچھ اور ہے۔'' اس شخص کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''یہ دیکھو......'' اس نے اخبار اس کی طرف بڑھایا۔

''چار ڈاکوؤں کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ تین ڈاکو گھر کے اندر گھسے تھے جبکہ عورت اور ایک ڈاکو باہر روڈ پر کھڑے تھے جب پولیس کے دو گشتی سپاہیوں نے للکارا تو وہ دوڑ کر اندر گلی میں گھس گئے۔''

''نہیں، یہ جھوٹ ہے بالکل غلط ہے، ہم ان کے ساتھی نہیں تھے۔ ہم تو......'' وہ چیخ پڑا تھا۔

''میں جانتا ہوں تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن پولیس نے اپنے ساتھی کی موت کا بھی تو انتقام لینا ہے...... اور پولیس...... خاص کر ہماری پولیس، تم تو جانتے ہو .... وہ تو گونگوں کو بھی بلوا دے ایک بے گناہ کو مجرم بنانے میں اسے کتنی دیر لگے گی۔''

فرحی کا رنگ مزید زرد ہو رہا تھا وہ جیسے گرنے لگی تھی۔ اس نے بے اختیار اسے سہارا دیا تھا۔
''تم چاہو تو اپنے گھر فون کرلو۔'' وہ شخص فرحی کی طرف دیکھ رہا تھا۔
''ہاں، ہاں فرحی تم اپنے گھر فون کرلو۔ تمہارے بھائی تو آرمی میں ہیں ناں...... وہ تمہیں آ کر لے جائیں گے۔ تم میری فکر نہ کرنا۔ میں کسی طرح نکل جاؤں گا۔ بس تم بعد میں ہمارے گھر فون کر دینا۔'' وہ ایسے کہہ رہا تھا جیسے سب کچھ ایسا ہی ہوگا اور ابھی فرحی کے گھر سے کوئی لینے آجائے گا۔
فرحی نے کانپتے ہاتھوں سے نمبر ملایا تھا۔ کافی دیر بعد کسی نے فون اٹھایا تھا۔
''بھابی......'' فرحی کی آواز لرز رہی تھی۔ ''یہ میں ہوں فرحی......''
''ہماری عزت کا جنازہ نکال کر اب کس لیے فون کر رہی ہو...... مرگئی ہو تم ہمارے لیے۔''
''پلیز بھابی، میری بات سنیں، میں زخمی ہوں میرے ساتھ حادثہ ہوگیا ہے۔ میں گھر سے نکلی ضرور تھی لیکن میں واپس آرہی تھی۔ مجھے احساس ہوگیا تھا کہ میں نے غلط کیا، بس آپ ...''
دوسری طرف سے فون بند ہوگیا تھا۔
اس نے کئی بار فون کیا۔ لیکن کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا پھر شاید کسی نے ریسیور نیچے رکھ دیا تھا۔ اس نے بے بسی سے ثمر کی طرف دیکھا۔
''بھابی نے میری بات نہیں سنی...... وہ میری بات سننا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ تو...... وہ تو یوں بھی مجھ سے خار کھاتی تھیں کہ بھائی اور ڈیڈی مجھ سے اتنا پیار کیوں کرتے ہیں۔'' وہ ایک بار پھر رونے لگی تھی اونچا، اونچا، زور، زور سے۔
''بی بی آپ روئیں مت...... میں آپ کو گھر لے چلوں گا اور آپ کے والدین سے بات کروں گا۔ وہ یقیناً آپ کو معاف کر دیں گے۔'' اس شخص کے سپاٹ چہرے پر پہلی بار کوئی نرم تاثر ابھرا تھا۔ ''لیکن پہلے آپ منہ ہاتھ دھو کر آئیں اور کچھ نہیں تو صرف جوس کا ہی ایک گلاس پی لیں۔ آپ کا بہت خون بہہ چکا ہے۔''
''ہاں فرحی تم جوس لے لو پھر کچھ کرتے ہیں۔'' اس نے فرحی سے کہا تھا اور اس شخص کی طرف متشکر نظروں سے دیکھا۔
''سر ہم آپ کے از حد ممنون ہوں گے مجھے یقین ہے فرحی کے والدین آپ کی بات مان لیں گے۔'' اس شخص نے سر ہلایا اور انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا تھا۔
فرحی کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ ثمر نے اسے سہارا دیا تھا لیکن ڈائننگ چیئر پر بیٹھنے سے پہلے ہی وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ ایک بار گل پھر دلدار کو بلا کر لایا تھا۔
''بی، پی بہت لو ہے۔'' دلدار نے بی پی چیک کرنے کے بعد اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ خاموش کھڑا بیڈ پر بے ہوش پڑی فرحی کو دیکھ رہا تھا۔
''غالباً صدمے اور پریشانی سے بے ہوش ہوگئی ہیں۔'' اس شخص نے اس کی طرف دیکھ کر اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔
''یہ کب تک ہوش میں آجائے گی؟'' اس نے دلدار سے پوچھا تھا۔
''کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' دلدار نے اس کی نبض چیک کرتے ہوئے کہا۔ تو وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔ اس بار وہ اس شخص کے کہنے پر اسے اٹھا کر گیسٹ روم میں لایا تھا۔

''پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔'' دلدار نے کھڑے ہوتے ہوئے اسے تسلی دی۔
''کچھ دیر بعد بی پی نارمل ہو جائے گا تو ہوش میں آجائیں گی۔''
''دلدار ٹھیک کہہ رہا ہے نوجوان، تم ناشتا کرلو۔ کپ کا ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔'' اس شخص نے باہر جانے کے لیے قدم بڑھایا لیکن وہ وہیں مضطرب سا کھڑا فرح کے زرد چہرے کو دیکھ رہا تھا پھر جیسے اس نے کھڑے، کھڑے فیصلہ کیا۔
اسے جانا ہی ہوگا۔ خود اکیلے، وہ فرحی کے ہوش میں آنے کا انتظار نہیں کرسکتا...... اُسے اعتبار کرنا ہی ہوگا...... اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔
''سر میں فرحی کے گھر جارہا ہوں...... آپ فرحی کا خیال رکھیے گا۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔
''تم مجھ پر اعتبار کرسکتے ہو جوان۔'' اس شخص نے اس کا کندھا تھپتھپایا تھا۔ ''لیکن میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم کچھ دیر انتظار کرلو۔ فرحی ہوش میں آگئی تو میں خود......''
''نہیں سر پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے، مجھے پہلے ہی چلے جانا چاہیے تھا۔ رات کے وقت ہی نکل جانا چاہیے تھا۔''
''لیکن تم اس وقت مجھ پر اعتبار نہیں کرسکتے تھے۔'' وہ مدھم سا مسکرایا۔
''حالانکہ تمہیں اس وقت بھی مجھ پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔'' وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس گھر میں اس نے کسی عورت کو نہیں دیکھا تھا۔ دلدار، گل نامی ملازم، یہ شخص اور باہر گیٹ پر موجود شیر خان۔
''میری کوئی بیٹی نہیں ہے لیکن اس وقت تم سمجھنا کہ تم میری بیٹی کو میرے حوالے کر کے جارہے ہو۔'' اس نے ایک بار پھر متشکر نظروں سے اس شخص کی طرف دیکھا اور فرحی پر ایک نظر ڈالتا تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس شخص نے گل سے کچھ کہا تھا۔ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر وہ گیٹ تک آیا تھا۔ گیٹ کے پاس بیٹھے شیر خان نے گیٹ کھول دیا تھا۔ اس نے گیٹ سے باہر نکل کر دیکھا۔ گلی تقریباً سنسان تھی صرف ایک لڑکا کندھے پر اسکول بیگ لٹکائے جارہا تھا۔ لڑکے نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دبا دبا سا جوش تھا۔
''یہ ساتھ والی گلی میں پولیس ہے۔ رات کو اُدھر بیگ صاحب کے گھر ڈاکا پڑا۔ اور ڈاکوؤں نے ایک پولیس والے کو مار دیا۔ اُدھر بیگ صاحب کے گھر میں بھی پولیس ہے۔''



اس نے خالی، خالی نظروں سے لڑکے کی طرف دیکھا تھا جو اس پر اپنی اطلاع کا اثر نہ دیکھ کر مایوس سا ہو گیا تھا۔

''بس اسٹاپ نزدیک ہے کیا؟'' اس نے لڑکے سے پوچھا تھا۔

''ہاں جی بس یہ دو گلیاں ہیں پھر روڈ آجاتی ہے اور پھر کچھ فاصلے پر ہی اسٹاپ ہے۔''

''اس اسٹاپ سے ماڈل ٹاؤن کی وین مل جاتی ہے ناں......'' وہ اس کے ساتھ، ساتھ ہی چل رہا تھا۔ جب اچانک نکڑ سے دو پولیس والے اس کے سامنے آ گئے تھے۔

''اے رکو، کون ہو تم......؟''

''ٹھک، ٹھک......'' کوئی دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ ثمر حیات نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر کارنس پر پڑی فرحی کی تصویر کی طرف...... وہ گود میں چھوٹے سے چند ماہ کے بچے کو لیے مسکرا رہی تھی۔

''فرحی ہمارا بچہ......'' اس نے ہونٹ بھینچ لیے تھے اور دل میں کروٹیں لیتے درد کو برداشت کرنے کی کوشش کی تھی تب ہی دوبارہ دستک ہوئی تھی۔

''آجاؤ۔'' ایک گہری سانس لے کر اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔

''عظام صاحب آ گئے ہیں۔'' ملازم نے دروازے کے پاس کھڑے، کھڑے ہی اطلاع دی۔ ''اپنے کمرے میں چلے گئے ہیں فریش ہونے کو اور یہ بھی کہہ رہے تھے کہ اگر آپ سو رہے ہوں تو ڈسٹرب نہ کروں۔''

''نہیں......اسے بتاؤ میں اس کا ویٹ کر رہا ہوں۔''

''آپ نے ابھی تک لنچ بھی نہیں کیا۔ عظام صاحب کہہ رہے تھے وہ لنچ کر کے آئے ہیں۔ آپ کے لیے کھانا لگا دوں؟'' اس نے سامنے کلاک کی طرف نظر ڈالی۔ چار بج رہے تھے۔ ماضی میں کھو کر وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔

''نہیں، مجھے بھوک نہیں ہے۔'' ملازم ابھی تک کھڑا تھا۔

''کیا بات ہے عزیز؟'' اس کے لہجے میں نرمی تھی۔

''وہ......آپ نے صبح بھی ڈھنگ سے ناشتا نہیں کیا تھا تو کچھ کھا لیتے تھوڑا سا۔''

یہ عزیز اور ممتاز خان دونوں ہی بہت عرصے سے اس کے ساتھ تھے مخلص اور وفادار......

''چائے کے ساتھ کچھ لے لوں گا فی الحال دل نہیں چاہ رہا......تم نے کھا لیا تھا اور ممتاز خان کو بھی بھجوا دیا تھا؟''

''گارڈز کو تو بھجوا دیا تھا لیکن میں نے اور ممتاز خان نے نہیں کھایا۔ آپ کھا لیتے تو......''

''یار کھا لیا کرو تم لوگ......میرا انتظار نہ کیا کرو۔'' اس نے ایک شفقت بھری نظر عزیز پر ڈالی تھی۔ ''اور ہاں سنو... عظام کو بتا دینا میں جاگ رہا ہوں۔'' عزیز سر ہلا کر چلا گیا تو وہ عظام کا انتظار کرنے لگا۔ عظام کو آنے میں کچھ دیر ہوئی تو وہ مضطرب سا ہو کر لاؤنج میں چلا آیا......اور عظام بھی تو اس کا یونہی انتظار کرتا ہو گا اور پھر اسی طرح بے چین ہوتا ہو گا۔ انتظار کا ایک پل گزارنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ جبکہ وہ برسوں سے اس کا انتظار کر رہا ہے۔ اس نے لاؤنج میں ٹہلتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف دیکھا اور پھر اس کے قدم سیڑھیوں کی طرف

اٹھنے لگے۔

بیڈروم کا دروازہ کھلا تھا اس نے کھلے دروازے سے دیکھا عظام آنکھیں موندے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ اس نے ٹانگیں بیڈ سے نیچے لٹکائی ہوئی تھیں اور ابھی جوتے بھی نہیں اتارے تھے۔ لمحہ بھر رک کر اسے دیکھنے کے بعد اس نے قدم اندر رکھے اسے یاد نہیں تھا کہ کتنے سالوں کے بعد وہ اس کے کمرے میں آیا تھا۔

''عظمی۔'' اس کے قریب جا کر اس نے آہستہ سے کہا۔ عظام یک دم سیدھا ہوا اور کھڑا ہو گیا۔

''پاپا، میں آ رہا تھا نیچے۔''

''تھک گئے ہوناں......؟'' ثمر حیات کے لہجے میں ایک باپ کی شفقت و محبت چھلکی تھی۔

''نہیں تو پاپا...... تھکا تو نہیں ہوں، بس یونہی ذرا دیر کو لیٹ گیا تھا......'' وہ شرمندہ ہوا۔

''بیٹھ جاؤ میری جان۔'' دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر اس کی پیشانی چومتے ہوئے ثمر حیات نے کہا اور اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''پاپا آپ ایک ہفتہ یہاں ہی رہیں گے ناں پاکستان میں۔'' وہ جیسے ایک بار پھر خود کو یقین دلانا چاہتا تھا اور اس کی بے یقینی پر ثمر حیات کا دل نادم ہوا لیکن وہ ہولے سے ہنسا۔

''تمہیں یقین کیوں نہیں آتا۔ میں پورا ایک ہفتہ کہیں نہیں جاؤں گا اور ہم باپ، بیٹا خوب مزے کریں گے۔'' عظام مسکرایا اور اس مسکراہٹ نے جیسے اس کے پورے چہرے کو روشن کر دیا تھا۔ پتا نہیں...... یہ مسکراہٹ وہ کہاں سے چرا لایا تھا۔ اتنی خوب صورت، اتنی روشن مسکراہٹ...... اس نے سوچا۔

''پتا نہیں کیوں دل کو دھڑکا سا لگا ہے کہ ابھی آپ اپنی کسی بزنس کال پر اٹھ کر چل دیں گے۔''

''کہیں نہیں جاؤں گا میری جان...... کچھ بھی ہو جائے۔ چاہے سارا بزنس تباہ ہو جائے۔ اس بار میں اپنے بیٹے کے ساتھ کیا وعدہ ضرور پورا کروں گا...... پر اس......''

''پاپا......'' عظام کا دل بھر آیا۔ ''آپ اتنی محبت کرتے ہیں مجھ سے۔''

''اس سے بھی کہیں زیادہ جتنا تم تصور کر سکتے ہو۔ میں نے سب کھو کر تمہیں پایا ہے۔ تم میری واحد متاع ہو۔'' ثمر حیات کی آنکھوں میں کوئی آنسو چمکا لیکن وہ مسکرایا۔ ''مجھے پتا ہے تم مجھ سے ناراض ہو، میں تمہیں کبھی بہت سارا وقت نہیں دے سکا۔ ہمیشہ خود سے دور رکھا۔ ایک وقت آئے گا جب تم اپنے باپ کی مجبوریوں کو سمجھ پاؤ گے۔ پھر بھی مجھے معاف کر دینا بیٹا۔ میں ایک باپ کے فرائض ٹھیک طرح سے نبھا نہیں سکا۔''

''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں پاپا۔'' عظام نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگایا۔

''میں کبھی آپ سے ناراض نہیں ہوا۔ میں تو بہت چھوٹی عمر سے ہی آپ کی مجبوریوں کو سمجھتا تھا۔ میں نے کبھی آپ سے گلہ کیا پاپا؟''

''ضروری تو نہیں تھا میری جان کہ تم زبان سے گلہ کرتے، تمہاری خاموشی، تمہاری سنجیدگی، تمہاری اداسی ہر دفعہ جب میں تم سے ملتا تو مجھ سے گلہ کرتی۔ لیکن یقین کرو، تمہارا باپ بہت مجبور تھا۔''

''پاپا پلیز آپ اس طرح کی باتیں مت کریں مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ جو وقت گزر گیا، گزر گیا...... اب ہم ساتھ ہیں اور آپ نے کہا تھا بہت جلد سارا بزنس سمیٹ کر پاکستان واپس آ جائیں گے ہمیشہ کے لیے۔''

''ہاں بہت جلد عظام میں اب تھک گیا ہوں۔ تم پڑھائی کے بعد اپنا بزنس سیٹ کرنا جو بھی چاہو...... اور

میں بس آرام کروں گا۔ تمہاری شادی ہوگی اور پھر تمہارے بچے اس خزاں ہوتی زندگی میں بہار لے آئیں گے۔ میں تو بس اپنے پوتے، پوتیوں کے لاڈ اٹھاؤں گا۔ کوئی اچھی سی لڑکی تمہاری نظر میں ہو تو بتانا۔ میرا مطلب ہے اگر کسی کو پسند کرتے ہو تو...... ورنہ میں نے خود ہی تمہاری شادی کروا دینی ہے۔ پھر گلہ نہیں کرنا کہ آپ نے ظالم سماج کا کردار ادا کیا۔'' وہ مسکرایا تھا ایک چاند سا چہرہ تصور کے پردے پر جھلملایا تھا کہ اس نے آج تک کسی لڑکی کو اس نظر سے نہیں دیکھا اور آج ہی وہ لڑکی پہلی نظر میں ہی دل میں کھب گئی تھی اور اب دل میں ہلچل مچا رہی تھی۔ اس لڑکی میں کچھ انوکھا تھا شاید ورنہ اس کی یونیورسٹی میں ایک سے ایک طرح دار لڑکی تھی لیکن کبھی کسی نے اس طرح اسے اٹریکٹ نہیں کیا تھا۔ جس طرح اس لڑکی نے۔

رواحہ کی مطلوبہ بکس ایک دو شاپس کھنگالنے کے بعد بھی جب نہ ملیں تو جواد نے بتایا کہ کلب روڈ پر...... movenpick ہوٹل کے سامنے اسی نام کی...... بک شاپ پر اس نے یہ کتابیں دیکھی تھیں۔ رواحہ اپنی مطلوبہ کتابیں نکال رہا تھا۔ وہ اچھی کتابوں کا رسیا تھا۔ جواد اور رواحہ کتابیں دیکھ رہے تھے اور وہ ایک میگزین کی ورق گردانی کر رہا تھا جب وہ اس کے قریب آ کر کھڑی ہوئی تھی۔ سفید کاٹن کے ٹخنوں تک لمبے فراک میں ملبوس وہ اردگرد سے بے نیاز کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے لڑکے سے پوچھ رہی تھی کہ اس نے پچھلی بار جن کتابوں کی لسٹ دی تھی کیا وہ آ گئی ہیں۔

''یس میم...... میں نے آپ کی کتابیں رکھ دی تھیں۔'' لڑکا فوراً ہی کاؤنٹر کے پیچھے سے غائب ہو گیا، غالباً وہ اس لڑکی کی مطلوبہ کتابیں لینے گیا تھا۔

''موراں میں یہاں ہوں۔'' لڑکی نے گردن موڑ کر کسی کو آواز دی تھی۔

اور عظام کی نظریں اس پر پڑی تھیں ایک لمحے کو وہ مبہوت سا ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ وہ سترہ، اٹھارہ سال سے زیادہ عمر کی نہیں لگتی تھی لیکن اتنی عمر کی لڑکیوں کا چہرہ اتنا سپاٹ اور آنکھیں اتنی بے تاثر تو نہیں ہوتیں...... لیکن یہ لڑکی اس کا چہرہ کتنا سپاٹ تھا ہر تاثر سے خالی۔ وہ پاس کھڑے عظام سے بے نیاز سامنے سے آتی موراں نامی خاتون کو دیکھ رہی تھی۔

''کہاں رہ گئی تھیں تم......؟'' اس کے لہجے سے غصہ جھلکتا تھا لیکن چہرہ اور آنکھیں پھر بھی سپاٹ ہی تھیں۔

''وہ...... میں......''

''کیا یہ بہت مغرور ہے اپنے حسن سے آگاہ......'' عظام کے دل میں خیال آیا تھا اور اسی لمحے اس نے ایک اچٹتی سی نظر عظام پر ڈالی تھی اور پھر کاؤنٹر کی طرف رخ موڑ لیا تھا...... اور لڑکے سے کتابوں کا بنڈل لے کر چیک کرنے لگی تھی۔ عظام ایسا نہیں تھا کہ کوئی سرسری سی نظر اس پر ڈالے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کئی لڑکیوں کے دل کی دھڑکن اور چاہ ہے لیکن خود اسے کسی سے دلچسپی نہیں تھی لیکن یہ لڑکی اس نے تو پہلی نظر کے بعد اس پر دوسری نظر ڈالی ہی نہیں تھی۔ عظام میگزین کی ورق گردانی کرتے ہوئے گاہے گاہے اس پر بھی نظر ڈال لیتا تھا۔ اس نے کتابیں چیک کرنے کے بعد بل پے کیا...... تب ہی موراں نامی خاتون نے قریب آ کر قدرے اونچی آواز میں کہا تھا۔

''وہ جی بجل بی بی میں اُدھر......'' لڑکی نے مڑ کر ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔

''کتابیں اٹھا لو۔'' لہجے میں تحکم تھا۔

''کسی بہت ہی اعلیٰ خاندان کی لگتی ہے۔ مغرور اور بے نیاز.....'' اور غرور اس پر جچتا تھا۔
وہ اسی طرح غرور سے گردن اونچی کیے اردگرد سے بے نیاز موراں کے ساتھ چلتی ہوئی بک شاپ سے نکل گئی تھی۔
اگر وہ ایسی نہ ہوتی اتنی بے نیاز اور مغرور تو شاید اتنی انوکھی بھی نہ لگتی۔ اس نے عظام ثمر حیات پر ایک دفعہ نظر کرنے کے بعد دوسری بار نہیں ڈالی تھی۔
عظام ثمر حیات..... جسے دیکھنے کے لیے لڑکیاں اکثر جان بوجھ کر اس کے راستے میں آکھڑی ہوتی تھیں۔
''سجل.....'' اس نے دل ہی دل میں دُہرایا۔ ''لگتا ہے یہ نام اسی کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔''
''کس سوچ میں پڑ گئے ہو جانو..... کیا بہت ساری لڑکیاں ہیں کہ فیصلہ کرنا..... مشکل ہو رہا ہے۔'' اس نے عظام کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مسکرایا۔
''نہیں تو پاپا.....'' وہ جھینپ گیا۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔''
''واقعی.....؟'' ثمر حیات نے اسے بغور دیکھا۔
وہ لڑکی جو بک شاپ میں ملی تھی نہ جانے کون تھی، کہاں رہتی تھی..... پھر زندگی میں کبھی اس سے ملاقات ہونی بھی تھی یا نہیں..... وہ تو اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔
''واقعی.....'' وہ سر جھٹک کر مسکرایا۔ ''لیکن ابھی میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔ پاپا پہلے تو میری تعلیم مکمل ہوگی..... پھر میں اور آپ اکیلے رہیں گے۔ کچھ عرصے میں آپ سے خوب لاڈ اٹھواؤں گا، رواحہ کی طرح۔ وہ آگئی تو خواہ مخواہ آپ کی محبتوں میں میری حصہ دار بن جائے گی۔''
اتنی محبت کرتا ہے عظام اس سے کہ اس کی محبت میں اسے اپنی بیوی کی شراکت بھی قبول نہیں۔ ثمر حیات کا دل گداز ہوا تھا۔
''تمہاری تعلیم ختم ہونے تک ہی میں سب کچھ سمیٹ پاؤں گا۔ اتنا وقت تو لگ جائے گا بیٹا..... لیکن تعلیم ختم ہوتے ہی میں نے بہولانی ہے۔ اس دوران اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند آگئی تو ٹھیک ورنہ.....''
''شادی تو آپ کی ہی پسند سے ہوگی پاپا۔'' تصور میں اس اجنبی لڑکی کا سراپا پھر لہرایا تھا۔ لیکن ایک اجنبی لڑکی کے متعلق بھلا وہ کیا کہہ سکتا تھا۔ ثمر حیات نے بہت فخر اور محبت سے اسے دیکھا۔
اللہ نے اسے عظام دیا تھا اور اگر عظام نہ ہوتا تو فرحی کے بعد اس کے پاس جینے کا کیا جواز رہ جاتا تھا۔ یہ عظام ہی تو تھا جس کی خاطر اس نے اپنے اندر جینے کی امنگ پیدا کی تھی اور سوچا تھا کہ وہ عظام کی خاطر زندہ رہے گا لیکن کیا اس نے عظام کے باپ ہونے کا حق ادا کیا تھا..... صرف پیسہ، دولت دے کر اور آسائشیں مہیا کر کے حق ادا ہو جاتا ہے؟
''عظمی بیٹا مجھے معاف کر دینا، میں تمہیں وقت نہیں دے سکا۔ جب، جب تمہیں میری ضرورت محسوس ہوئی ہوگی میں تمہارے پاس نہیں تھا۔''
''پاپا.....'' عظام نے بے اختیار اس کا ہاتھ لے کر اپنے ہاتھوں میں دبایا۔ ''آپ پھر وہی باتیں کرنے لگے پاپا۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔
''پلیز پاپا آپ ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ آپ دنیا کے سب سے اچھے باپ ہیں۔ مجھے آپ پر فخر ہے۔

میں مغرور ہوں کہ میں آپ کا بیٹا ہوں، یہ ٹھیک ہے مجھے ہر لمحہ، ہر قدم پر آپ کی اور ماما کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ جب بچوں کے ماما، پاپا ان سے ملنے آتے تو میں حسرت سے انہیں دیکھتا تھا چھپ، چھپ کر میں رات کو اپنے بستر میں گھس کر روتا بھی تھا۔ آپ کو اور ماما کو یاد کر کے لیکن میں آپ سے کبھی ناراض نہیں ہوا۔ مجھے کبھی آپ سے شکایت نہیں ہوئی۔ مجھے پتا تھا کہ میرے پاپا بہت مصروف آدمی ہیں۔''

''میری جان......'' ثمر حیات نے اسے گلے لگالیا اور بہت دیر تک بھینچے رکھا اور پھر خود سے الگ کرتے ہوئے مسکرایا۔

''پورے ایک ہفتے کا پروگرام ترتیب دے لو۔ میں تمہارے ڈسپوزل پر ہوں پورا ایک ہفتہ۔''

عظام نے سر جھکاتے ہوئے نم پلکوں کو انگلیوں سے پونچھا جبکہ ثمر حیات نے دروازے کے پاس جا کر پہلے عزیز کو آواز دی اور پھر اچانک کچھ یاد آنے پر انٹر کام پر ہی اسے ہدایت دی۔

''چائے اوپر عظمی کے کمرے میں ہی لے آؤ...... میں آج اپنے بیٹے کے کمرے میں ہی چائے پیوں گا۔'' اس نے مڑ کر عظام کو دیکھا تو وہ اپنے والٹ میں موجود وہ تصویر دیکھ رہا تھا جس میں ثمر حیات، فرحی اور فرحی کی گود میں ایک چھوٹا بچہ تھا اور یہی تصویر انلارج کروا کے گھر میں مختلف جگہ لگی ہوئی تھی۔ کاش وہ بھی یہاں ہوتا اس تصویر میں ماما، پاپا کی گود میں...... کاش نانو، مجھے اپنے ساتھ نہ لے گئی ہوتیں تو وہ بھی ماما کی گود کی گرمی اور قربت پا سکتا تھا۔ اس نے والٹ بند کر کے تکیے کے نیچے رکھ دیا اور ثمر حیات کی طرف دیکھا جو اب اس کی کمپیوٹر چیئر پر بیٹھ گیا تھا۔

''ہاں تو کیا سوچا، یہ دن کیسے گزاریں گے۔ کیا کہیں گھومنے کا پروگرام بنالیں۔ شمالی علاقہ جات کی طرف؟''

''پتا نہیں پاپا، مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ بس ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے، باتیں کریں گے...... میں تھوڑی دیر کے لیے یونیورسٹی جایا کروں گا...... پھر کبھی چھٹیوں میں گھومنے جائیں گے...... آپ مجھے دادا جان اور دادی جان کے متعلق بتائیں۔ رواحہ کے بابا اپنے بابا جان کی بہت باتیں کرتے ہیں۔ آپ کے بابا کیسے تھے کیا وہ آپ سے بہت پیار کرتے تھے رواحہ کے دادا جان کی طرح......'' وہ اشتیاق سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ثمر حیات کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔

''میرے ابا ایک سیدھے سادے نمازی، پرہیز گار بندے تھے۔ اور ان کی کپڑے کی دکان تھی چھوٹی سی...... میں اکلوتا تھا اور ظاہر ہے وہ مجھ سے محبت بھی کرتے تھے لیکن انہوں نے کبھی لفظوں میں اظہار نہیں کیا تھا نہ انہیں کبھی کچھ کہنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ میں جانتا تھا میرے اماں، ابا کو مجھ سے محبت ہے اور اماں...... ان کی تو ہر نگاہ کی جنبش سے ان کی محبت کا اظہار ہوتا تھا۔ ہر وقت میری فکر، میرا خیال...... میں جس وقت کالج سے آتا وہ اس وقت توا چولھے پر رکھتی تھیں تاکہ روٹی گرم، گرم ہو۔ اماں کے ہاتھ کے جیسے بنے پھلکے میں نے پھر کبھی نہیں کھائے۔ مجھے کالج سے ذرا بھی دیر ہو جاتی تو وہ پریشان ہو جاتی تھیں۔'' وہ جیسے تصور میں انہیں دیکھ رہا تھا جب عظام کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''وہ ہوتیں تو مجھ سے بھی محبت کرتیں، میرے بھی لاڈ اٹھاتیں ہیں ناں پاپا؟'' وہ اسی اشتیاق اور تجسس سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''ہاں۔'' ثمر حیات کا جی چاہا وہ دھاڑیں مار مار کر روئے اماں ابا اتنی ہی شدت سے یاد آئے تھے اسے۔

دروازے پر دستک ہوئی اور پھر عزیز ٹرے اٹھائے اندر آیا۔ ٹیبل پر ٹرے رکھتے ہوئے اس نے ثمر حیات کی طرف دیکھا۔

''صاحب وہ ممتاز بھائی نے کہا ہے وہی اس روز والا آدمی آیا تھا۔ مقبول نام کا..... ممتاز بھائی نے کہہ دیا کہ صاحب ملک سے باہر ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' ثمر حیات نے سر ہلایا۔ ''چائے بنا دو۔''

پھر ایک دم جیسے چونکا۔ ''کیا..... کیا نام بتایا تھا تم نے؟''

''مقبول صاحب.....''

''مقبول بٹ۔'' اس نے جیسے ذہن پر زور دیا اور اس کے اندر کچھ کلک ہوا تھا۔ ''مقبول بٹ.....'' اس نے دُہرایا۔ ''اپنا یار بالا..... مقبول بٹ.....''

''لیکن وہ یہاں کہاں اور اسے میرا پتا کیسے ملا..... نہیں اسے بھلا کیسے معلوم ہو سکتا ہے میں یہاں ہوں..... لیکن مقبول.....'' اس نام کے تو صرف وہ ایک ہی بندے کو جانتا تھا..... ''مقبول بٹ عرف بالا..... بلکہ وہ بالا ہی تو تھا اسے یاد نہیں تھا کہ کبھی کسی دوست نے اسے مقبول کہہ کر بلایا ہو۔''

وہ ایک دم اٹھا اور تیزی سے باہر نکلا۔ عظام نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔

اور پھر تقریباً بھاگتے ہوئے سیڑھیاں اتر کر اسی تیزی سے لاؤنج سے گزرتا ہوا اندرونی دروازہ کھول کر پورچ میں سے بھاگتا ہوا ممتاز خان کو آواز دیتا گیٹ تک آیا تھا۔

''ممتاز خان کدھر ہے چاچا؟'' اس نے گیٹ کے پاس موجود گارڈ سے پوچھا۔

''کیبن میں ہے باس۔'' گیٹ کے پاس ہی ممتاز خان کا کیبن تھا۔ کیبن اتنا بڑا تھا کہ اس میں ایک سنگل بیڈ اور ایک چھوٹی سی ٹیبل تھی سائڈ میں ایک پیڈسٹل فین تھا اور ایک چھوٹا ٹی وی بھی رکھا تھا۔

اس نے کیبن کا دروازہ کھولا ممتاز خان جو لیٹا ہوا تھا ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''ممتاز خان.....''

''یس باس.....''

''وہ شخص..... وہ شخص مقبول اس نے کیا کہا تھا۔ کوئی پیغام.....؟''

''نو باس..... کوئی پیغام نہیں..... بس اتنا کہا تھا کہ جب آپ واپس آئیں تو بتا دوں مقبول بٹ آیا تھا۔''

''اوہ گاڈ.....!'' اس نے ایک ہاتھ کا مکا بنا کر دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مارا۔

''وہ شخص پیدل آیا تھا گیٹ تک۔ غالباً بس یا ویگن سے آیا ہوگا..... کیا خبر ابھی تک اسٹاپ پر کھڑا ہو۔''

ممتاز خان نے جان لیا تھا کہ وہ شخص ثمر حیات کے لیے کچھ نہ کچھ اہم ضرور رہا ہوگا۔

''اوہ ہاں.....'' وہ چونک کر کیبن سے باہر نکلا اور پھر گیٹ کھول کر باہر نکل گیا..... ممتاز خان اس کے پیچھے، پیچھے ہی تھا..... وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا اسٹاپ تک آیا تھا۔ لیکن اسٹاپ ویران تھا۔ ایک بوڑھی عورت کھڑی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اور سڑک دور، دور تک سنسان پڑی تھی۔

☆☆☆

ایمل کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی کچن سے باہر نکلی ہی تھی کہ افنان نے لاؤنج میں قدم رکھا۔

''السلام علیکم.....'' افنان نے ہاتھ میں پکڑی فائل صوفے پر رکھی اور ماں کی طرف دیکھا۔ ''آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔ خیریت ہے ناں.....''

''ہاں خیریت ہے۔''

''آپ ٹھیک ہیں ناں......؟''افنان نے پھر پوچھا۔

''ہاں ٹھیک ہوں......''ایک بجھی بجھی سی مسکراہٹ ایمل کے لبوں پر بکھر گئی اور وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

''نہیں، آپ ٹھیک نہیں لگ رہیں۔''وہ اس کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

''ٹھیک ہوں بیٹا بس شادی کے فنکشنوں نے تھکا ڈالا ہے۔''

''پتا نہیں لوگ شادیوں پر اتنا دھوم دھڑکا کیوں کرتے ہیں۔ سادگی سے بھی شادی ہو سکتی ہے۔''افنان نے تبصرہ کیا۔

''ہاں ہو تو سکتی ہے۔''ایمل نے ایک گہری سانس لی۔

''نانا جان کا کوئی فون آیا...... کیسے ہیں اب وہ؟''افنان کو لگا تھا جیسے یہ صرف تھکن نہیں ہے۔ کوئی اور بات بھی ہے جس کی وجہ سے ایمل اتنی نڈھال ہو رہی ہے۔

''ممی کا فون آیا تھا۔ ڈیڈی سے بات نہیں ہوئی تھی، وہ سو رہے تھے۔ ممی کہہ رہی تھیں پہلے سے بہت بہتر ہیں لیکن پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ ممی سچ نہیں کہہ رہی ہیں۔ ان کی طبیعت ذرا سی بھی بہتر ہوتی تو وہ اسپتال میں نہ ٹکتے۔ بلا وجہ بستر پر پڑنا انہیں پسند نہیں ہے۔ فوجی آدمی ہیں، چڑ ہے انہیں بستر پر پڑنے سے۔''

''آپ ایسا کیوں نہیں کرتیں ماما۔''افنان نے چٹکی بجائی۔''پاپا کے ساتھ جا کر نانا جان سے مل آئیں۔ آپ کی تسلی ہو جائے گی۔''

''تمہارے پاپا تو صبح تمہارے جانے کے بعد لاہور چلے گئے ہیں۔''

''کیا مطلب...... وہ ابھی تو آئے تھے تین دن پہلے......؟''افنان کو حیرت ہوئی تھی۔

''ہاں...... لیکن وہ کہہ رہے تھے کہ وہ صرف آپا کی ناراضی کے خیال سے شادی میں شرکت کے لیے واپس آئے تھے ورنہ وہاں ابھی بہت کام تھا انہیں۔''

''اوہو...... تو آپ نے بھی ان کے ساتھ چلے جانا تھا ناں۔''

''کہا تھا میں نے۔''ایمل کی آواز میں افسردگی تھی۔''لیکن وہ نہیں مانے...... کہہ رہے تھے کہ تم لوگ یہاں اکیلے ہو گے۔''

''اوہو...... ماما، ہم کوئی بچے ہیں اور گھر میں اتنے ملازم ہیں۔ خیر......''وہ مسکرایا۔''ڈونٹ وری...... آپ تیاری کریں۔ کل یوں بھی ویک اینڈ ہے، سنڈے کی چھٹی ہے...... منڈے کی صبح واپسی......''

ایمل کی آنکھیں یک دم چمکی تھیں لیکن پھر بجھ سی گئیں۔

''تمہارے پاپا ناراض ہوں گے اِفی...... تمہاری اور ارفی کی پڑھائی کا حرج ہوگا۔''

''اوہ ماما، ایک دن میں قیامت نہیں آ جائے گی اور پاپا کو پہلے سے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم وہاں جا کر انہیں سرپرائز دیں گے۔''اس نے فائل اٹھائی۔''میں فریش ہو کر آتا ہوں۔ آپ کھانا لگوائیں تب تک ارفی بھی آ جائے گی۔''

''وہ تو کب کی آ چکی۔''

''کہاں ہے؟''اس نے چاروں طرف دیکھا۔

ارتفاع کی عادت تھی کہ اگر وہ یونیورسٹی سے افنان سے پہلے آ جاتی تو لاؤنج میں بیٹھ کر افنان کے آنے کا

انتظار کرتی تھی پھر اکٹھے کھانا کھایا جاتا اور کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں جاتی تھی لیکن آج کل ایسا نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اکثر دیر سے ہی آتی اور کھانا کھا کر ہی آتی تھی۔

''وہ اپنے کمرے میں ہے۔''

''یعنی محترمہ کا موڈ ابھی تک آف ہے۔''

''وہ ناراض ہے مجھ سے ارفی اتنے دن ہو گئے اس نے مجھ سے بات نہیں کی، میری بات کا جواب نہیں دیا۔ شادی کے فنکشن کے تینوں دن وہ مجھ سے الگ، الگ رہی۔ اس نے ایک بار بھی مجھ سے اپنے ڈریسز کے متعلق مشورہ نہیں کیا حالانکہ پہلے ایک، ایک بات پوچھتی تھی۔ میرے ساتھ ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا۔'' ایمل کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''کیا میں اچھی ماں نہیں ہوں افی...... ؟ کیا میں نے بچپن سے لے کر اب تک اس کا خیال نہیں رکھا۔ راتوں کو اس کے لیے نہیں جاگی۔ اس کی ذراسی تکلیف پر بے چین نہیں ہوئی۔ ہاں تمہارے پاپا کی طرح میں نے اس کی غلط ضدیں نہیں مانیں۔ میں اس کی بہترین تربیت کرنا چاہتی تھی...... میں نہیں چاہتی تھی کہ بے جا لاڈ پیار اُسے میری طرح ضدی بنا دے۔ میں نے اپنی ضد کی وجہ سے بہت نقصان اٹھائے ہیں افی۔''

''آپ بہت اچھی ماں ہیں ماما...... دنیا کی ساری ماؤں سے زیادہ اچھی ماں......'' افنان نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

''میں ابھی اس کے کان کھینچتا ہوں۔ اتنے دن سے انتظار کر رہا تھا کہ محترمہ خود ہی اپنا موڈ ٹھیک کر لیں...... ویسے ماما......'' وہ جاتے، جاتے مڑا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پاپا نے یہاں کیوں بزنس سیٹ کیا...... یہاں ہمارا کوئی بھی نہیں ہے۔ پھپھو بھی ابھی دو سال پہلے یہاں شفٹ ہوئی ہیں۔ کتنا جی چاہتا تھا میرا کہ میں یو ای ٹی سے انجینیئر نگ کرتا۔ اگر پاپا کو یوں ہی ہر مہینے لاہور کے چکر لگانے ہوتے ہیں تو ہم لاہور ہی کیوں نہیں شفٹ ہو جاتے۔ یہاں کے حالات بھی تو......'' اس نے کندھے اچکائے۔ ''پاپا آئیں تو میں ان سے بات کروں گا کہ وہ ہولے، ہولے کراچی کا بزنس سمیٹ کر لاہور شفٹ ہو جائیں۔ پھر نانو اور نانا جان بھی اکیلے نہیں رہیں گے۔'' افنان کو ان کا بہت خیال تھا اور وہ اپنے نانا کا بہت لاڈلا تھا...... لیکن ایمل جانتی تھی کہ بابر کبھی نہیں مانے گا۔ جب شادی کے چند ماہ بعد ہی بابر نے کراچی شفٹ ہونے کی بات کی تھی تو ممی، ڈیڈی نے بہت مخالفت کی تھی بلکہ ممی نے تو صاف، صاف کہا تھا کہ انہوں نے ایمل کی بابر کے ساتھ شادی کا فیصلہ ہی اس لیے کیا تھا کہ اس طرح ایمل ہمیشہ ان کے ساتھ رہے گی ورنہ بابر سے اچھے رشتے بھی تھے...... لیکن بابر نے کسی کی بات بھی نہیں مانی تھی۔ حالانکہ شادی سے پہلے وہ ممی، ڈیڈی کی ہر بات مانتا تھا۔ لیکن اب اپنی منوانے لگا تھا۔ کراچی میں نہ بابر کے والدین تھے نہ اس کے پھر بھی اس نے کراچی سیٹل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔

''میں گھر داماد نہیں بننا چاہتا اور نہ ہی میں یہ چاہتا ہوں کہ لوگ کہیں...... کہ میری نظر آپ کے بزنس پر ہے۔ میں اپنے دوست کے ساتھ پارٹنر شپ میں اپنا الگ بزنس شروع کر رہا ہوں۔'' ڈیڈی کے اعتراض پر اس نے کہا تھا اور ڈیڈی تو اس کی شادی کے بعد جیسے کمزور ہی ہو گئے تھے۔

''ٹھیک ہے جس طرح تم چاہو۔ جیسے خوشی محسوس کرو۔'' اور ڈیڈی نے ایمل کو بھی سمجھایا تھا۔

''وہ تمہارا شوہر ہے ایمل اور اب اس کی مرضی اور خواہش پر تمہیں چلنا ہے...... گھر بنانے کے لیے قربانی عورت کو ہی دینا پڑتی ہے۔'' ممی نے بھی سمجھایا تھا۔ اور ڈیڈی نے تو بابر کو سراہا بھی تھا کہ وہ اپنے بل بوتے پر

کچھ کرنا چاہتا ہے تو یہ اچھی بات ہے۔
''او کے ماما، آپ کھانا لگوائیں، میں ارفی کو لے کر آتا ہوں۔'' اس نے چونک کر افنان کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرایا اور ہاتھ ہلاتا ہوا تقریباً بھاگتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔
ارتفاع اپنے کمرے میں بیڈ پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ گود میں رکھے تکیے پر بائیں ہاتھ کی کہنی ٹکائے اور دائیں ہاتھ میں سیل فون لیے کسی سے باتیں کر رہی تھی...... لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔
''میں نے کب کہا کہ رواحہ اچھا لڑکا نہیں ہے۔''
''وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔'' دوسری طرف سے عالیہ نے بتایا۔
''اچھا'' اس کا ''اچھا'' خاصا لمبا تھا اور لبوں پر بکھری مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔ ''مجھے تو کبھی نہیں لگا کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے۔''
''پسند سے بھی کچھ آگے...... اگر جنابہ غور کرتیں تو پتا چلتا لیکن تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔'' دوسری طرف عالیہ ہنسی تھی۔ ''خیر میں نے فون اس لیے کیا تھا کہ ظفری نے آج رات ڈنر پر انوائٹ کیا ہے، تمہارا فون بند تھا۔ اس لیے اس نے مجھے کہہ دیا کہ تمہیں بتادوں۔ ہوسکتا ہے کچھ دیر تک وہ تمہیں پھر فون کرے...... احتیاطاً مجھے کہا تھا۔''
''لیکن کس خوشی میں...... اور کون، کون انوائٹڈ ہے؟'' ارتفاع نے تکیے سے کہنی ہٹا کر فون دائیں سے بائیں ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔
''کہہ رہا تھا کہ ہم دونوں اس کی برتھ ڈے پارٹی میں شرکت نہیں کر سکے تھے اس لیے اس نے صرف...... ہم دونوں کو بلایا ہے۔''
''اوہ...... یہ ظفری بھی ناں......'' اس نے ہونٹ سیکڑے۔
''تو تم چلو گی؟'' عالیہ نے پوچھا۔
''وائے ناٹ......!''
''کیا تمہاری مام اجازت دے دیں گی؟''
''مام کی اجازت کی پروا کسے ہے؟'' وہ لاابالی سے انداز میں بولی۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔
''آجاؤ......''
''تو ڈن......؟'' عالیہ پوچھ رہی تھی۔
''ہاں ڈن......''
اس نے دروازے سے اندر آتے افنان کو دیکھا۔
''میں تمہیں پک کرلوں گی لیکن جانا کہاں ہے؟''
''میں تمہیں کنفرم کر کے بتادوں گی......'' عالیہ نے کہا۔
''او کے......!'' اس نے فون بند کر کے افنان کی طرف دیکھا جو اندر آنے کے بعد شیلف کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا اور اس کی بات ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔
''کہاں جا رہی ہو؟''
''عالیہ کے ساتھ ڈنر پر جانا ہے۔''

''کس خوشی میں......؟'' افنان نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
''ایک ٹریٹ ڈیو تھی اس پر۔''
''آج تم جلدی آ گئی تھیں؟''
''ہاں، آج میم زبیری اور سر انصاری چھٹی پر تھے۔''
''ڈنر پر کب جانا ہے تمہیں آج یا کل......؟'' افنان ابھی تک شیلف سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔
''آج ہی......''
''یہ اچھا ہے...... کیونکہ کل ہم لاہور جا رہے ہیں...... اور پھر اگر کل ڈنر ہوتا تو تمہیں کینسل کرنا پڑتا۔''
''لیکن لاہور کیوں جا رہے ہو؟''
''بہت عرصہ ہو گیا ہے نانا جان اور نانو سے ملے اور پھر نانا جان بیمار ہیں کچھ تو ان کی مزاج پُرسی بھی ہو جائے گی اور سب سے مل بھی لیں گے۔ ماما، نانا جان کے لیے بہت پریشان ہیں۔''
''تو......'' اس نے بھویں اچکائیں۔ ''تمہارے نانا جان ہیں، تم جا کر مل لو، میرا بھلا کیا رشتہ ہے تمہارے نانا جان سے؟''
''کیا فضول باتیں کر رہی ہو ارفی...... تمہارا بھلا کیوں رشتہ نہیں ان سے؟'' افنان نے اسے گھورا تھا۔
''اس لیے کہ ایمل بابر تمہاری ماما ہیں میری نہیں، اس لیے ان کے ڈیڈی میرے نانا نہیں سمپل......''
''ارفی تمہارے دماغ سے یہ خناس نہیں نکلا؟'' افنان نے ناراضی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ بتاؤ کہ وہ سب مائیں جو اپنی بچیوں کو غلط باتوں سے روکتی ہیں، کیا ان کی سوتیلی ہوتی ہیں؟''
''سب کی نہیں لیکن میری مام سوتیلی ہے۔''
''اوہ گاڈ...... ارفی ایسا نہیں ہے۔''
''ایسا ہی ہے۔'' اس کا لہجہ ہٹیلا تھا۔ ''اور مجھے اس کا یقین ہے۔''
''دیکھو اس روز ماما تمہارے لیے پریشان تھیں۔ انہیں اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ تم مایوں کے فنکشن میں شرکت نہ کرو۔ وہ پھپو کی ناراضی سے بھی ڈر رہی تھیں۔ یہ میں تھا جس نے ظفری کے متعلق ماما کو بتایا تھا۔ وہاں جس قسم کی پارٹیاں ہوتی ہیں، میں سب جانتا ہوں اس لیے میں نے تمہیں فون کیا تھا... واپس آنے کے لیے۔ اب کہہ دو کہ میں بھی......''
''ہاں تم بھی تو سوتیلے ہی ہو ناں......'' ارتقاع کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ افنان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ لمحہ بھر وہ ہونٹ بھینچے اسے دیکھتا رہا۔
''ٹھیک ہے، میں تمہارا سوتیلا بھائی ہوں، ماما تمہاری سوتیلی ماں ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم ان کے ساتھ بدتمیزی کرو۔ وہ بڑی ہیں، سوتیلی ہی سہی ماں کا درجہ رکھتی ہیں ہو سکے تو اپنے رویے پر نظرِ ثانی کرنا۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ ارتقاع کی بات نے اسے ازحد رنج پہنچایا تھا۔
''سوری انی......'' وہ شرمندگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ''وہ میرے منہ سے نکل گیا تھا، تم جانتے ہو ناں کہ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں، تم میرے بھائی ہو۔ میرے پاپا کی اولاد ہو۔''
''لیکن میری ماما تمہاری ماما نہیں ہیں بقول تمہارے......'' افنان کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''اس لیے سوتیلے بھائی اور ماں سے بھلے جتنی نفرت کرنا چاہو کرو...... لیکن ہم...... ماما اور میں پھر بھی تم سے محبت کرتے

ہیں۔ کرتے رہیں گے تم جو بھی سمجھو...... لیکن جب میں دیکھوں گا کہ تم کسی غلط راستے پر چل رہی ہو تو میں ضرور روکوں گا۔ ہم کل صبح کی فلائٹ سے لاہور جارہے ہیں۔ تم نہیں جانا چاہتیں تو ٹھیک ہے۔ وہاں جا کر میں دو دن کے لیے پاپا کو بھیج دوں گا۔'' اس کے لہجے میں ہی نہیں چہرے پر بھی گہری سنجیدگی تھی۔ وہ ارتقاع کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اسے ارتقاع پر بہت غصہ تھا جس نے معمولی سی بات کا اتنا ایشو بنالیا تھا کہ سگے رشتوں کو deny کررہی تھی۔

''افی سنو...... رکو تو۔'' ارتقاع کو لگا جیسے کچھ غلط ہوگیا ہے اس سے۔ افنان صرف اس کا بھائی ہی نہیں اس کا بچپن سے ہی اچھا دوست بھی تھا۔ اس سے صرف پندرہ ماہ چھوٹا اس کا بھائی اسے اپنا محافظ لگتا تھا۔ جب وہ ایک ہی اسکول میں تھے تو اس کے ساتھ چلتے ہوئے نہ صرف یہ کہ اسے تحفظ کا احساس ہوتا تھا کہ بلکہ فخر کا احساس بھی ہوتا تھا۔ اس کا بھائی ہر لمحہ اس کے ساتھ رہتا تھا۔ بریک میں، چھٹی ٹائم وہ اسے کبھی تنہا نہیں چھوڑتا تھا جیسے وہ اس سے بڑا ہو...... اور ماما...... اسے پہلے تو کبھی ان سے شکایت نہیں ہوئی تھی۔ وہ کسی بات پر روکتی ٹوکتی تھیں تو اسے برا نہیں لگتا تھا۔ وہ اپنی بات بڑے آرام سے پاپا سے منوالیتی تھی لیکن ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ یوں ردِعمل ظاہر کرے۔ کیا ظفری کے فارم ہاؤس جانا اتنا ہی اہم تھا۔ اس نے سوچا تو اسے جواب نفی میں ملا۔ ہرگز نہیں بلکہ وہ تو جانا ہی نہیں چاہتی تھی اور اس نے ظفری کو صاف انکار کردیا تھا...... پھر پاپا نے خود ہی تو اسے اجازت دی تھی۔ پتا نہیں پاپا کو کیسے پتا چلا تھا۔ شاید اس نے خود ہی ظفری کے فارم ہاؤس کا ذکر کیا تھا اور پاپا نے خود ہی پوچھا تھا کہ وہ کیوں نہیں جارہی...... ''یہی تو دن ہوتے ہیں انجوائے کرنے کے فرینڈز کے ساتھ...... بعد میں سب دوست وغیرہ چھوٹ جاتے ہیں...... ایسے فنکشن تو بہت اٹینڈ کروگی لیکن دوستوں کا ساتھ نہیں ملے گا۔ اپنی ماما کو ہی دیکھ لو، اتنی ڈھیروں فرینڈز تھیں لیکن اب کسی سے رابطہ نہیں، اپنی فاسٹ فرینڈز سے بھی نہیں۔''

اور اسے لگا تھا پاپا صحیح کہہ رہے ہیں اور سب اس کے ساتھ جانے کا سن کر کتنا خوش ہوئے تھے۔ خاص کر ظفری اسے یوں واپس آنا برا لگا تھا۔ وقتی طور پر غصہ بھی آیا تھا لیکن اتنا شدید ردِعمل کہ اتنے دن گزر جانے کے بعد بھی وہ ان سے بات نہیں کررہی تھی۔ اگر ماما اس کی سوتیلی ماں تھیں بھی تو انہوں نے کبھی اسے احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اس کی سوتیلی ماں ہیں۔ یکے بعد دیگرے کئی مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے آئے تھے۔ اسے ذرا سا زکام بھی ہوجاتا تھا تو وہ کتنی پریشان ہوجاتی تھیں۔ اس کی چھوٹی سی کامیابی پر بھی بے حد خوش ہوتی تھیں۔ شاید اسے یہ جان کر دکھ ہوا تھا کہ ایمل اس کی سوتیلی ماں ہے اور یہ اسی دکھ کا ردِعمل تھا کہ وہ اس کی سگی ماں کیوں نہیں ہیں۔ اس نے پاپا سے پوچھا تھا کہ کیا وہ اس کی سگی ماں ہیں لیکن انہوں نے ٹال دیا تھا اور اس نے ان کی باتوں سے خود ہی اخذ کرلیا تھا کہ ایمل اس کی سگی ماں نہیں ہیں اور اسے پھر بھی اس کا یقین تھا کہ ایسا ہی ہے اور یہ دکھ اس سے برداشت نہیں ہورہا تھا۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے اپنی نم آنکھوں کو پونچھا۔

آج اس نے افنان کو بھی ناراض کردیا تھا۔ وہ یک دم اٹھی اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ سیڑھیوں سے اترتے ہوئے اس نے دیکھا۔ افنان صوفے پر سنجیدہ سا بیٹھا تھا۔ اس نے ایک نظر اسے نیچے اترتے دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں اور اسے نظرانداز کرتے ہوئے ایمل کو آواز دی۔

''ماما کھانا لگ گیا ہے؟''

''ہاں بیٹا، آجاؤ...... ارفی آگئی کیا؟'' ڈائننگ روم سے ایمل کی آواز آئی تو افنان اس کی طرف دیکھے

بغیر ڈائننگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ چند لمحے تو ارتقاع لاؤنج کے وسط میں ساکت کھڑی رہی۔تب ہی ایمل نے جھانک کر اسے دیکھا۔

''بیٹا آجاؤ، آج میں نے سب کچھ تمہاری پسند کا بنایا ہے۔'' ایمل کے لہجے میں اس کے لیے ماِمتا تھی، شفقت تھی اور وہ بہت محبت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''سوری......'' ارتقاع کا دل یک دم پگھلا اور وہ تیزی سے ایمل کی طرف بڑھی۔ایمل نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگاتے ہوئے اس کی پیشانی چوم لی۔

''کوئی بات نہیں بیٹا، تمہاری عمر میں، میں تمہاری ہی طرح تھی۔ میں بھی چھوٹی، چھوٹی باتوں پر ممی سے روٹھ جاتی تھی۔ حالانکہ وہ ہمیشہ میرے بھلے کی بات کرتی تھیں......لیکن نادان عمر سمجھتی نہیں ہے اور ڈیڈی، ممی سے ناراض ہو جاتے تھے کہ وہ ان کی بیٹی کو خفا کیوں کرتی ہیں۔ اور میں بھی تمہاری طرح اپنے ڈیڈی کی بہت لاڈلی تھی۔'' وہ اسے لیے، لیے ڈائننگ روم میں آئیں۔ افنان نے دیکھا ان کی بجھی، بجھی آنکھوں میں ایک دم چمک آئی تھی۔ اور وہ بار، بار اس کی پلیٹ میں کچھ نہ کچھ ڈال رہی تھیں۔

''احمق۔'' افنان ہولے سے بڑبڑایا اور اپنی پلیٹ میں چاول ڈالنے لگا۔

''سوری افی......'' اس نے افنان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''اٹس او کے......'' افنان بدستور سنجیدہ تھا۔

کم از کم آج کے دن وہ اپنا موڈ ایسا ہی رکھنا چاہتا تھا تا کہ ارتقاع کو بھی اپنے رویے کی بدصورتی کا احساس ہو۔ کھانا کھاتے ہوئے کئی بار ارتقاع نے افنان کی طرف دیکھا تھا لیکن وہ سر جھکائے کھانا کھاتا رہا تھا۔ کھانا کھاتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''مما میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ کچھ دیر ریسٹ کروں گا۔ پھر شام کو مجھے ایک دوست سے ملنے جانا ہے۔'' وہ بات مکمل کر کے باہر نکل گیا تھا۔ اس نے ارتقاع کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

''میں نے بہت ہرٹ کیا ہے اسے۔'' ارتقاع نے سوچا۔ ''یا اللہ اب ایسا کیا کروں کہ وہ مان جائے پہلے جیسا ہو جائے۔''

''تمہاری اپنے پاپا سے بات ہوئی ارفی؟'' ایمل نے پوچھا تو اس نے چونک کر ایمل کی طرف دیکھا۔

''ہاں لاہور پہنچنے کے بعد انہوں نے فون کیا تھا مجھے۔''

''اچھا......'' ایمل کے چہرے پر اطمینان نظر آیا۔ ''میں پریشان ہو رہی تھی کہ جب بھی فون کیا آف تھا۔''

''دراصل ان کی میٹنگز چل رہی ہیں ناں......تو وہ میٹنگ کے دوران فون آف کر دیتے ہیں۔'' اتنے دنوں بعد وہ نارمل انداز میں بات کر رہی تھی......ایمل کے دل میں دور تک خوشی پھیلتی چلی گئی۔

''یہ افی بھی پورا جادوگر ہے۔'' ایمل کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ملازمہ کو ٹیبل سمیٹنے کا کہہ کر ایمل نے ارتقاع سے پوچھا۔

''افی نے تمہیں لاہور کے پروگرام کا بتایا ہے۔ دراصل تمہارے نانا جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے......بس دو دن کے لیے جانا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ سر ہلا کر کھڑی ہو گئی۔

''کل کتنے بجے کی فلائٹ ہے؟''

''افی کہہ رہا تھا... کوشش کرے گا کہ صبح پہلی فلائٹ میں ہی سیٹ مل جائے۔''
وہ سر ہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
''سنو بیٹا افی کہہ رہا تھا تمہارے پاپا کو سرپرائز دیں گے۔ ابھی ذکر نہیں کرنا اگر ان کا فون آئے تو......''
اس نے پھر سر ہلایا تھا اور لاؤنج سے ہوتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ دل پر پتا نہیں کیوں بوجھ سا تھا۔
''پتا نہیں ماما، کیسی تھیں...... کیا ہوا تھا انہیں۔ شاید یں چند ماہ کی ہی ہوں گی۔'' پاپا نے ایمل ماما سے دوسری شادی کی ہوگی...... پاپا آئیں تو میں انہیں اپنی قسم دے کر پوچھوں گی...... پاپا ضرور بتادیں گے۔ وہ میری بات بھی نہیں ٹال سکتے۔'' وہ دل ہی دل میں سوچتی ہوئی اپنے بیڈروم میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے فون کی بیل ہو رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر بیڈ پر پڑا اپنا فون اٹھایا۔ عالیہ کا فون تھا۔
''کہاں تھیں تم......؟'' اس نے فون آن کیا تو عالیہ کی جھنجلائی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ ''نمبر ملاتے، ملاتے انگلیاں تھک گئی ہیں لیکن محترمہ فون ہی نہیں اٹھا رہیں۔''
''یار میں نیچے کھانا کھا رہی تھی۔ میرا ایسل اوپر میرے روم میں ہی پڑا تھا۔''
''وہ ظفر یہ کہہ رہا تھا کہ......''
''یار ظفری سے معذرت کرلو میں آج ڈنر پر نہیں آسکوں گی۔''
''کیوں......؟'' عالیہ زور سے چیخی تھی۔
''موڈ نہیں ہے میرا۔''
''لیکن میں اسے بتا چکی ہوں۔'' عالیہ روہانسی ہوئی۔
''تو کیا ہوا، کون سا اس نے دیگیں چڑھانی ہیں۔ پھر کبھی سہی۔''
''لیکن......''
''لیکن ویکن کچھ نہیں......بس نہیں تو......نہیں جانا۔'' اس نے فون آف کر کے بیڈ پر پھینک دیا اور ایک بار پھر بیڈروم سے باہر نکل آئی اور اب نیچے جا رہی تھی...... اسے افنان کو بھی منانا تھا...... وہ اسے ناراض نہیں دیکھ سکتی تھی۔
ایمل جو اتنے دنوں سے بہت تھکی، تھکی اور افسردہ لگ رہی تھی اس وقت بے حد مطمئن سی لاؤنج کے صوفے پر بیٹھی قہوے کے ہلکے، ہلکے گھونٹ لے رہی تھی۔ اس نے مسکرا کر سیڑھیوں سے اترتی ارتفاع کو دیکھا۔ قہوے کی پیالی ٹیبل پر رکھی۔ اور پاس پڑا فون اٹھایا جس کی بیل ہو رہی تھی۔ دوسری طرف ممی تھیں۔
''ایما......ایما......'' ممی رو رہی تھیں۔
''کیا ہوا ممی...... کیا ہوا؟'' ایمل کی بلند آواز سن کر ارتفاع تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی۔
''ممی پلیز بولیں ناں......'' ایمل کی آواز لرز رہی تھی۔
''تمہارے ڈیڈی......'' ممی بلند آواز میں رونے لگی تھیں۔
''کیا ہوا ڈیڈی کو...... بتائیں ناں......؟'' ارتفاع نے اس کے قریب آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔
''ممی......'' ایمل کے لبوں سے چیخ نکلی تھی اور فون اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ ارتفاع نے ایک نظر گرے ہوئے فون کو دیکھا اور پھر ایمل کو سنبھالنے لگی۔

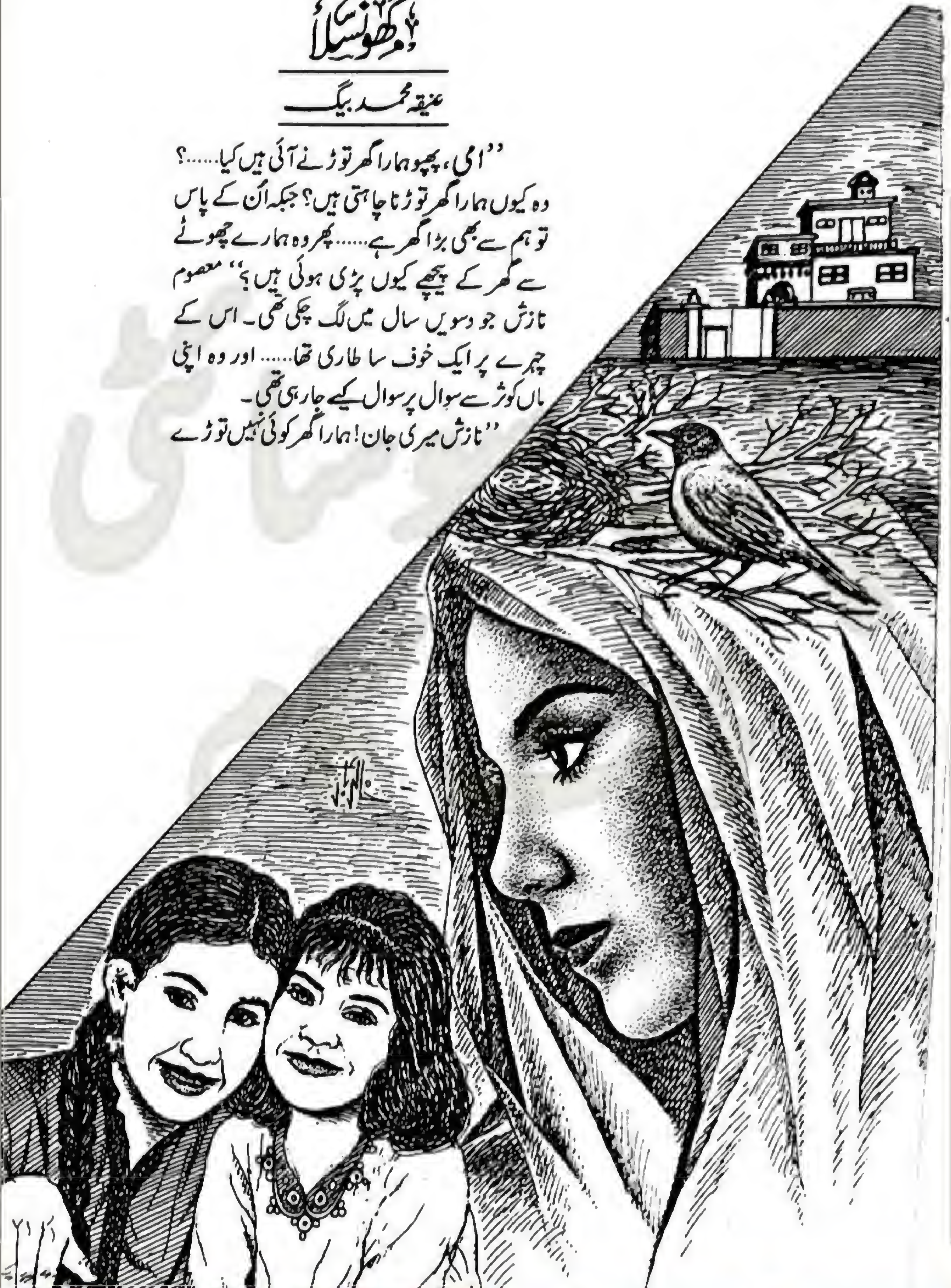
جاری ہے

گھونسلا

عنیقہ محمد بیگ

''امی، پھپھو ہمارا گھر توڑنے آئی ہیں کیا......؟ وہ کیوں ہمارا گھر توڑنا چاہتی ہیں؟ جبکہ اُن کے پاس تو ہم سے بھی بڑا گھر ہے...... پھر وہ ہمارے چھوٹے سے گھر کے پیچھے کیوں پڑی ہوئی ہیں؟'' معصوم نازش جو دسویں سال میں لگ چکی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک خوف سا طاری تھا...... اور وہ اپنی ماں کوثر سے سوال پر سوال کیے جارہی تھی۔

''نازش میری جان! ہمارا گھر کوئی نہیں توڑے



گا...... میری بچی، اللہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔'' کوثر نے اپنی معصوم بیٹی کے ماتھے پر بوسہ دیا...... اور تسلی دی...... جبکہ وہ بھی نورین کی اس حرکت پر حیران تھی۔ جس بھائی نے محنت کر کے اس کو پالا پوسا تھا...... آج وہ اسی بھائی کے برے دنوں میں اس کا گھر تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے۔

''امی...... پھپو نے اگر ہمارا گھر توڑ دیا...... تو ہم کہاں جائیں گے۔ کیا ہم نانی اماں کے گھر پر رہیں گے؟ وہاں تو بلال مجھے مارے گا...... پچھلی دفعہ بھی اس نے مجھے مارا تھا، آپ کو یاد ہے ناں......؟'' نازش نے اپنے ماموں زاد کزن بلال کی حرکت یاد دلائی۔ جس کی نازش سے بنتی نہیں تھی اور اکثر دونوں کا جھگڑا ہو جاتا تھا۔

''نہیں...... میری جان...... ہم اس گھر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔ یہ گھر ہمارا ہے، تمہارے بابا کا...... اور تمہارے بابا اس گھر کو توڑنے نہیں دیں گے۔'' کوثر نے بیٹی کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا...... جس کا وجود کانپ رہا تھا۔ وہ نورین کے جھگڑے پر بری طرح سے سہم چکی تھی...... جو اپنے میاں کے ساتھ کل گھر آ کر خوب ہنگامہ برپا کر کے گئی تھی کہ اسے اب اس گھر میں سے اپنا حصہ چاہیے تھا وہ بھی جلدی...... جس پر ہاشم اپنی چھوٹی بہن کے رویّے پر کچھ نہ بول پایا۔

کیونکہ وہ اِک اصول پسند انسان تھا اور کسی کے حق پر قبضہ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس نے صاف لفظوں میں بہن کو سمجھا دیا تھا کہ وہ اپنی کم تنخواہ کے سبب اتنی جلدی رقم کا بندوبست نہیں کر سکتا۔ وہ گھر کے حصے کے پیسے آہستہ، آہستہ کر کے دے سکتا ہے۔ جس پر نورین بھڑک اٹھی...... اور الزامات کے ڈھیر ہاشم کے حصے میں آ گئے...... کہ وہ بہن کے حصے کو ہڑپ کرنا چاہتا ہے۔ اور اگر اس نے ایک ہفتے کے اندر، اندر پیسوں کا بندوبست نہیں کیا تو وہ عدالت کا رخ کرے گی۔

''امی...... پیسے بہت برے ہوتے ہیں...... ہے ناں...... پیسوں نے میری پیاری پھپو نورین کو بھی بدل دیا ہے۔'' معصوم نازش نے باپ کی کل رات کی گفتگو کو ذہن میں رکھ لیا تھا... کہ ''پیسہ انسان کو رشتے بھلا دیتا ہے۔'' اس نے معصومیت سے پوچھا تو کوثر نے بیٹی کی بات پر سر جھکا دیا۔ مگر وہ اپنی معصوم سی بچی پر اس حادثے کے زہریلے نتائج بھی اثر انداز کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے مطمئن لہجے میں بولی۔

''پیسے برے نہیں ہوتے بیٹا...... اور نہ ہی انسان...... بس صرف وقت برا ہو جاتا ہے۔'' اتنا کہہ کر اس نے اپنی نظریں چرا لیں۔

''وقت کیوں برا ہوتا ہے امی......؟'' معصوم سی نازش نے اگلا سوال کر دیا۔ وہ اپنی پیاری پھپو کے بدلتے رویّے کے بارے میں جاننے کے لیے بے تاب سی ہو گئی۔

''وقت برا نہیں ہوتا بس لوگوں کے رویّے برے ہو جاتے ہیں۔'' کوثر نے لمبی سانس لے کر بتایا۔

''امی یہ رویّے کیوں برے ہو جاتے ہیں؟'' اس نے پیار سے ماں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کے گالوں پر بہے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ ڈر اس کے چہرے سے دور تھا۔ اور وہ اپنے معصوم سے ذہن سے پیسہ، انسان، وقت اور قسمت کا کھیل جاننا چاہتی تھی...... کہ آخر ایسا کیا ہوا...... جس نے اس کی پیار کرنے والی پھپو کو بدل دیا۔

''میری پیاری بیٹی......'' کوثر نے اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کا چہرہ صاف کیا۔ اب اس کی اپنی آنکھیں بھی پُرنم سی ہو گئیں۔ وہ کافی حد تک اپنی بیٹی نازش کا ذہن موڑ چکی تھی...... کہ اس کی بیٹی اس حادثے سے کوئی منفی سوچ اپنے ذہن میں نہ بٹھا لے۔ مگر جہاں لوگوں کے بدلنے کی بات ہوئی تو وہ خود اندر سے بکھر کر رہ گئی۔ قسمت کا شکوہ تو کئی بار

خود وہ اپنے اللہ کے سامنے کرتی ہی تھی۔

''امی بتائیں ناں...... قسمت کیا ہوتی ہے۔''
ماں کی خاموشی پر وہ ایک دم چڑ سی گئی۔ کوثر کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے...... اس کے پاس اب کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ بیٹی کے سر پر پیار دینے لگی۔

''کوثر...... نازش کو قسمت کے متعلق کیوں نہیں بتا رہی ہو...... میری بیٹی کو قسمت کے متعلق علم ہونا چاہیے۔ اسے انسانی رویوں کا پتا ہونا چاہیے۔'' ہاشم جو ماں، بیٹی کی باتیں دروازے کے پیچھے سے سن رہا تھا کوثر کے یوں بے بس ہو جانے پر کمرے میں داخل ہو کر بولا۔

''آپ آ گئے؟'' کوثر نے جلدی سے اپنے آنسوؤں پر ضبط کا پہرہ بٹھا دیا۔

''میں اپنی بیٹی کو قسمت کے متعلق بتاؤں گا۔'' ہاشم نے مسکرا کر نازش کے سر پر پیار دیا۔

''بابا...... سچ...... ؟'' اس کی آنکھوں میں چمک سی بھر آئی...... اور وہ باپ کی طرف دیکھنے لگی۔

ہاشم نے بیوی کی طرف نظر ڈالی...... اس کے چہرے پر بہت اداسی تھی۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں، وہ کل رات ہی تو ہاشم سے اپنی بری قسمت ہونے کا شکوہ کر رہی تھی۔

''بابا بتائیں ناں......'' پھر اس نے باپ کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔ جس کی نظریں کوثر پر تھیں۔

''قسمت اللہ کی رضا ہے اور اللہ کو راضی اس کی عبادت...... اور نیک اعمال کر کے کیا جا سکتا ہے۔ اور جب اللہ اپنے بندے سے راضی ہو جاتا ہے تو سب کچھ پھر بندے کے حق میں ہوتا چلا جاتا ہے۔'' ہاشم نے کوثر کو دیکھتے، دیکھتے اپنی بیٹی کو سمجھایا۔

''بابا...... اگر میں اللہ کو راضی کر لوں...... تو کیا پھر اللہ پھپھو کو ہمارا گھر توڑنے نہیں دیں گے۔''

''یقیناً...... بے شک، انسان کی زندگی میں جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے وہ اللہ کی آزمائش ہوتی ہے......

کیوں کوثر میں نے اپنی پیاری بیٹی کو ٹھیک سمجھایا ناں......؟'' ہاشم نے بجھی، بجھی کوثر کو مخاطب کیا۔

''جی بالکل ٹھیک......'' اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ بے شک وہ بھی جانتی تھی، اللہ اس کے حق میں بہتر کرے گا۔

''امی...... اب مجھے جلدی، جلدی اللہ کو راضی کرنا ہے، آپ کے ساتھ اب میں بھی نماز پڑھوں گی، اللہ سے دعا کروں گی جیسے آپ روز پڑھتی ہیں۔'' نازش نے ایک ہی سانس میں پُرجوش انداز سے کہا۔ جس پر ہاشم اور کوثر ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے...... جیسے وہ اپنی معصوم سی بیٹی کو سمجھانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

☆☆☆

''تمہارا بھائی بہت لالچی ہے نورین...... وہ تمہیں تمہارا حصہ کبھی نہیں دے گا۔'' جواد نے ٹی وی چینلز بدلتے ہوئے اس سے بات کی۔

''وہ یقیناً ایسا کچھ نہیں کریں گے...... مجھے یقین ہے کہ وہ میرے حصے کے پیسے مجھے دے دیں گے۔'' نورین جو کپڑوں کی الماری ٹھیک کر رہی تھی...... اچانک اس بات پر تڑپ سی گئی۔

''اچھا...... اگر ایسا سوچتی ہو تو...... تم بہت بڑی بے وقوف ہو۔ تمہاری بھابی نے انہیں بدل کر رکھ دیا ہے۔ انہیں تمہاری اب کوئی پروا نہیں۔'' جواد نے طنزیہ لہجے میں کہا اور میوزک چینل لگا دیا۔

''آپ زخموں پر نمک نہ چھڑکا کریں، آواز ہلکی کریں۔'' نورین گانے کی آواز پر جل سی گئی اور غصے سے شوہر کو دیکھنے لگی۔

''سچ کڑوا ہی ہوتا ہے...... اگر انہیں تمہارا خیال ہوتا تو فوراً تمہیں پیسے دینے کا انتظام کرنے پر لگ جاتے۔ مگر انہوں نے تو صاف انکار کر دیا کہ جب ان کے پاس پیسے ہوں گے تب وہ دے دیں گے۔ حق مانگ رہی ہو یا پھر وہ بھیک دیں

گے؟'' جواد نے مزید اسے بھائی کے خلاف بھڑکایا...... اصل میں وہ خود لالچی انسان تھا...... اور اس کی نظر بیوی کے میکے کے گھر پر کب سے تھی۔
بدقسمتی سے اسے اپنے چھوٹے سے بزنس میں نقصان ہوا...... تو اس نے اس نقصان کو بڑھا چڑھا کر نورین کے سامنے ظاہر کیا...... اور نورین کو اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ اپنے والدین کے گھر میں سے اپنے حصے کا تقاضا کرے اور اپنے شوہر کو ان مشکلوں سے رہائی دلائے...... نورین جو جواد کی اصلیت سے واقف نہ تھی۔ اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں پہلے بھاوج سے بات کی۔ جس پر کوثر نے صاف، صاف اسے سمجھایا کہ ہاشم کا ہاتھ پہلے ہی بہت تنگ ہے...... نورین یہ سن کر خاموش ہوگئی۔ مگر جواد نے نورین کو بھاوج کے خلاف بھڑکایا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اور وہ لوگ اس کے گھر پر قبضہ کر چکے ہیں۔ اس کے نزدیک وہ خود اس گھر کی مالکن ہے...... اور اسے اپنی خوشیوں کے سامنے کوئی نظر نہیں آرہا...... جس پر نورین نے بھی یہ بات ذہن میں بٹھالی...... اور نوبت یہاں تک پہنچی...... کہ بھابی اور نند میں جھگڑے ہونے لگے...... اور صورتِ حال یہاں تک آپہنچی...... کہ نورین نے عدالت کی دھمکی دے ڈالی۔ جبکہ وہ ایسا خود کرنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر وہ شوہر کے منہ سے خود کو بے وقوف...... اور کوثر کو سمجھ دار خاتون سننا بھی گوارا نہیں کرسکتی تھی۔ آخر کار جواد کی روز، روز کی جلی کٹی سن کر اس نے فیصلہ دے دیا۔
''جواد، آپ ہاشم بھائی پر کیس کردیں۔ اگر کوثر بھابی اپنی خوشیوں کے لیے سب کچھ کررہی ہیں...... تو مجھے بھی اپنی خوشیاں پیاری ہیں...... آپ اگلے ہفتے کسی اچھے سے وکیل سے مل کر مشورہ کرلیں، میں آپ کے ساتھ ہوں۔'' نورین نے آج حتمی فیصلہ جواد کے حق میں دے دیا۔
جس پر جواد نے اس کی سمجھداری پر چار چاند لگادیے۔ مگر وہ خود اندر سے بجھی، بجھی سی دکھائی دینے لگی۔

☆☆☆

کوثر کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے...... اور ہاشم اس کے پاس سر جھکا کر بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد آخر کار اس کے لب ہلے۔
''مجھے نورین سے یہ امید تو نہیں تھی مگر اب جو کچھ کرنا ہوگا...... جلدی کرنا ہوگا۔''
''آپ کہاں سے اتنی بڑی رقم کا انتظام کرسکیں گے؟'' کوثر نے کانپتی آواز میں پوچھا...... وہ فکر مند تھی...... اور جانتی تھی کہ شوہر نے اپنی ساری جمع پونجی اپنی ماں کی بیماری پر خرچ کردی تھی۔ جو کینسر کی مریضہ تھی اور اس بات کو نورین سے چھپالیا گیا تھا...... کہ اسے بیٹی ہونے کے ناتے شدید دکھ ہوگا۔ اور یہ بھی کہ نورین کے سسرال والے اس بات پر کوئی ایشو نہ اٹھادیں کہ کینسر چھوت کی بیماری ہے...... جواد اور اس کی فیملی کی دقیانوسی سوچ کے باعث اس نے دل پر پتھر رکھ کر اپنی ماں کی بیماری کو راز رکھا...... اور تنہا ہی لڑتا رہا۔ اور قرض میں ڈوب کر رہ گیا۔ جس کی خبر نورین کو نہیں تھی۔ اور نہ ہی وہ کبھی اپنی چھوٹی بہن کو خود بتانا چاہتا تھا۔
''کوشش کرتا ہوں کہ کسی دوست سے ادھار مانگ لوں۔'' اس نے ایک لمبی سانس لی اور فکر مندی سے بولا۔
''پہلا قرض ابھی تک نہیں اتر پایا...... اور پھر قرض پر قرض لے رہے ہیں۔ اتنا قرض اکیلے کیسے اتار سکیں گے۔'' اب کے کوثر کا چہرہ زرد سا پڑ گیا۔ پہلے بھی وہ بہت مشکل سے گھر کا خرچ پورا کررہی تھی۔
''کوثر...... اب مصیبت سے نکلنے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ تو تلاش کرنا ہوتا ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ میں بہت محنتی انسان ہوں...... اور محنت سے انسان بڑی سے بڑی مشکل کو بھی آسان بنالیتا ہے۔

تمہیں مجھ پر اور اپنے اللہ پر بھروسا ہونا چاہیے۔ اور اللہ کی رضا سے ایک دن ہمارے پاس اتنے پیسے آجائیں گے کہ قرض کے اس سیلاب سے باہر نکل آئیں گے۔ ایک نیا راستہ ہمارا منتظر ہوگا...... جہاں خوشیاں ہی خوشیاں ہماری منتظر ہوں گی۔''

''بابا...... اس راستے میں آپ کے ساتھ میں بھی ہوں گی ؟'' معصوم سی نازش جو بستر پر لیٹی سو نہیں رہی تھی بلکہ خاموشی سے اپنے والدین کی باتیں سن رہی تھی۔ ہاشم کے مسکرانے پر فوراً بول پڑی۔ جس پر کوثر اور ہاشم کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''ہاں...... میری جان...... تم ہمارے ساتھ رہو گی۔ ہمارے دل کے پاس رہو گی۔'' ہاشم نے اپنی پیاری، معصوم سی بیٹی کا ماتھا چوما۔

''امی...... آپ بھی نہیں روئیں گی۔ اللہ کی رضا ہوگی تو اللہ تعالیٰ ہمیں بہت سارے پیسے دیں گے...... اور جب اللہ ہمیں پیسے دیں گے...... تو ہم پھپھو کو وہ سارے پیسے دے دیں گے۔ پھر نورین پھپھو پہلی جیسی اچھی پھپھو بن جائیں گی۔ کیوں بابا...... سچ ہے ناں!'' معصوم نازش نے مسکرا کر پوچھا۔

''ہاں...... بالکل سچ......'' ہاشم اور نازش دونوں ایک دوسرے کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگے جبکہ کوثر دل ہی دل میں اللہ کو پکارنے لگی کہ اللہ ان سے بس راضی ہو جائے۔

☆☆☆

ایک ہفتے کے بعد جواد نے ناشتے کی ٹیبل پر وکیل کے خرچے گنوانا شروع کر دیے۔ جس پر نورین تپ سی گئی۔

''پہلے ہی آپ اس سے مکمل فیس کی بات کر لیتے۔ اب روز، روز پیسے دینے سے تو ہم رہے۔'' جواد نے جب نورین سے شادی کی انگوٹھی فروخت کرنے کی بات کی تو نورین پھٹ پڑی۔

''میں تو خود پریشان ہو گیا ہوں۔ اب دوسرا وکیل بھی نہیں کر سکتے...... یہ وکیل پیسے واپس تھوڑی کرے گا۔''

''آپ کو ہی شوق تھا...... کہ عدالت کے ذریعے معاملہ نمٹا لیتے ہیں...... میں نہیں اپنی انگوٹھی دوں گی......'' نورین نے غصے سے اپنی انگوٹھی کو دیکھتے ہوئے جواب دیا جو اس کی ماں کی آخری نشانی تھی۔ آج ایک انگوٹھی کی بات تھی کل کو باقی کا زیور بھی بیچنا پڑ جاتا۔

''اچھا...... کیس نہ کرتے تو تمہارا بھائی کون سا پیسے دے دیتا...... میرے خیال میں عدالت کا نوٹس مل جانے پر ہی وہ ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ میں نے کسی سے سنا ہے کہ ہاشم بھائی پیسوں کا بندوبست کر رہے ہیں۔''

''سچ...... ہاشم بھائی پیسوں کا بندوبست کر رہے ہیں؟ تو آپ اب اس وکیل کی چھٹی کر دیں اور اپنی فیس واپس لے لیں۔ جتنی آپ نے دی ہے۔'' نورین نے بچگانہ انداز میں پیسوں کا مطالبہ کیا۔

''او میری بے وقوف بیوی...... فیس واپس نہیں ہوگی اور نہ ہم کیس واپس لیں گے۔ کیس کے ڈر سے تو تمہارا بھائی ہاتھ میں آیا ہے۔ ورنہ تمہاری چالاک بھابی جال میں پھنسنے سے تو رہی۔''

''آپ نے پھر مجھے بے وقوف کہا۔'' نورین نے غصیلی نظروں سے اسے دیکھا...... وہ کوثر بھابی کے نام پر پھر جل بھن سی گئی...... جس کی سمجھداری کے چرچے کر کے جان بوجھ کر جواد اسے بھڑکا دیتا تھا۔

''اوہو بیگم...... مجھے معاف کر دو اور سمجھداری کا مزید ایک اور کام کر دو۔ اگر خود کو بہت سمجھدار سمجھتی ہو تو۔''

''کون سا کام......؟'' وہ شوہر کو حیرانی سے دیکھنے لگی۔

''تم کل پھر اپنے بھائی کے گھر جاؤ۔ اور وہاں کے حالات دیکھو...... کہ سچ میں تمہارا بھائی پیسوں کا بندوبست کر رہا ہے؟'' جواد نے نہ جانے کیا سوچ کر

اس سے کہا۔

''جواد...... میں اب اس گھر میں نہیں جاؤں گی...... میں کوثر بھابی کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی...... میرے برے وقت میں انہوں نے میرا کبھی ساتھ نہیں دیا اور میں وہاں پر قسم کھا کر آئی تھی کہ میں کبھی اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گی۔''

''میں تمہاری انہی باتوں پر تمہیں بے وقوف کہتا ہوں، تمہیں کتنی مرتبہ سمجھایا کہ وقت دیکھ کر اپنے قدم اٹھایا کرو۔ اور تمہاری سمجھداری یہی ہے کہ تم اس گھر میں اپنے قدم رکھو...... اور کوثر پر ظاہر کرو کہ وہ گھر اس کا نہیں بلکہ تمہارا بھی ہے...... اور تم اس گھر کے آدھے حصے کی مالکن ہو۔ تم دو ہی تو بھائی، بہن ہو۔'' جواد نے اپنے سازشی دماغ سے الفاظ سوچ، سوچ کر نکالے۔ جس پر وہ جھٹ سے راضی ہوگئی اور اگلے دن جانے کا وعدہ کرلیا۔ پھر جواد کا سازشی دماغ نئی سوچوں میں ڈوب گیا۔ جس کا مقصد صرف پیسہ حاصل کرنا تھا اور کافی حد تک وہ کامیاب ہوتا نظر بھی آرہا تھا۔

☆☆☆

''امی، پھپھو آئی ہیں۔'' کوثر باورچی خانے میں ہنڈیا بنا رہی تھی۔ جب نازش نے اسے گھبرا کر بتایا۔

''کہاں ہیں؟'' کوثر نے جلدی سے چولھے کی آنچ کم کی اور ہنڈیا پر ڈھکن رکھتے، رکھتے پوچھا۔

''وہ صحن میں کھڑی ہیں...... میں نے انہیں سلام کیا مگر پھپھو نے جواب نہیں دیا۔ اور آپ کو بلانے کے لیے مجھے بھیجا ہے۔'' نازش نے ڈرتے، ڈرتے بتایا جو نورین کے چہرے پر غصے کے آثار دیکھ چکی تھی۔

''اللہ خیر رکھنا......'' کوثر نے تیزی سے صحن کا رخ کیا...... جہاں پر نورین بے چینی سے ٹہلتی ہوئی اسے نظر آئی۔

''نورین تم آؤ...... گھر کے اندر تو آؤ...... یوں صحن میں......'' کوثر نے اپنی نند کو شائستگی سے احساس دلایا...... کہ اس کی بھابی اس سے رشتہ توڑنا ہرگز نہیں چاہتی...... مگر شوہر کی سازشی باتیں اس کے ذہن میں اس قدر حاوی تھیں کہ وہ بھابی کا پیار سمجھ نہ پائی اور الٹا اس کو تیکھا سا جواب دے مارا۔

''مجھے اس گھر کے اندر آنے سے کوئی روک بھی نہیں سکتا...... یہ گھر میرا ہے، میں ہاشم بھائی سے ملنے آئی ہوں...... جاننا چاہتی ہوں کہ انہوں نے پیسوں کا بندوبست کیا کہ نہیں......؟ اور نہیں کیا۔ تو آخر چاہتے کیا ہیں وہ؟'' نورین نے غصے سے چیختے ہوئے پوچھا۔ جس پر نازش تو سہم گئی اور کوثر کی آنکھیں پُرنم سی ہوگئیں...... ہاشم نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ اب وہ کبھی نورین سے جھگڑا نہیں کرے گی۔

کوثر کے یوں خاموش رہنے پر نورین کا پارہ مزید چڑھ گیا۔

''آپ اپنے آنسوؤں سے اس گھر کو ہڑپ نہیں کرسکتیں...... میں اس گھر میں برابر کی حصے دار ہوں۔ اماں نے مرتے وقت یہ گھر آدھا میرے نام پر اور آدھا بھائی کے نام کردیا تھا۔'' نورین نے تیکھے لہجے میں اپنی حکمرانی ظاہر کی...... مگر کوثر کے لب پھر بھی خاموش تھے جیسے اس کے پاس زبان نہ ہو...... وہ اپنے شوہر کی مصیبتوں کو بڑھانا نہیں چاہتی تھی...... اس لیے بت بنی کھڑی رہ گئی۔

''میں آپ کے جھکے سر سے سمجھ چکی ہوں...... پیسوں کا بندوبست نہیں ہوسکا اور شاید اگر ہو بھی جاتا تو آپ بھائی کو بھڑکا کر ہرگز مجھے پیسے دینے پر آمادہ نہیں ہوتیں۔'' نورین نے ہر لفظ چبا، چبا کر ادا کیا۔ جواد نے کوثر کے خلاف جو زہر اس کے ذہن میں بھر دیا تھا وہ مسلسل اگل رہی تھی۔

ماں کے چپ رہنے پر معصوم نازش آخر کار معصومیت سے بولی۔

''پھپھو، بابا آپ کو پیسے دے دیں گے۔ جب

اللہ کی رضا ہوگی......'' نازش نے یہ الفاظ ڈر کے مارے بول دیے۔ جس کی بات پر نورین دنگ رہ گئی۔

''نازش تمہیں کتنی دفعہ سمجھایا ہے کہ بڑوں کی باتوں میں نہیں بولتے۔'' کوثر بیٹی کے اچانک بول دینے پر بوکھلا سی گئی۔

''اچھا...... تو بچوں کے ذہنوں میں بھی زہر آخر کار گھول ہی دیا۔'' نورین نے معصوم نازش کی بات پر تلملا کر جواب دیا...... اور غصے سے کوثر کو گھورتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئی۔

کوثر کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے...... جبکہ معصوم نازش ڈر کے مارے کانپتی رہ گئی کہ پھپھو اب اس کا گھر توڑ دیں گی۔

☆☆☆

وہ غصے سے گھر لوٹی...... اس کا بی پی ہائی ہو چکا تھا۔ نازش کی آواز اس کے کانوں میں بار بار گونجنے لگی۔''

''اللہ کی رضا ہوگی۔ تو وہ آپ کو پیسے دے دیں گے۔'' نورین، بھتیجی کی اس بات کو کوثر کی کارستانی سمجھ بیٹھی۔ جس سے اس کا سر درد سے پھٹنے لگا۔

''کوثر تم سچ میں بہت بری ہو...... تم نے میری معصوم سی بھتیجی کو میرے خلاف لا کھڑا کیا...... جواد نے جو اندازہ لگایا تھا، وہ بالکل سچ نکلا......'' نورین، بھاوج کے خلاف ذہن میں باتیں دُہرانے لگی......

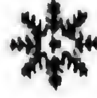
کہ اچانک صحن میں اس نے چڑیوں کا عجیب شور سنا...... یہ شور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ آج سے پہلے بھی اس نے چڑیوں کا یوں شور نہیں سنا تھا۔ وہ اپنے صحن کی جانب بڑھ گئی۔ شور نے اس کے ذہن سے تمام باتوں کو نکال دیا...... اب اس کی ساری توجہ چڑیوں پر تھی، صحن کی دیوار کے ایک کونے میں چھوٹا سا گھونسلا اس کی نظروں میں آ گیا۔ آج سے پہلے کبھی یہ گھونسلا اسے نظر نہیں آیا تھا۔ یہ گھونسلا کب، کیسے تیار ہوا۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ اس کے باہر آنے پر ایک دم چڑیوں کا شور ختم ہو گیا مگر گھونسلے کے اندر ایک سہمی ہوئی چڑیا

اور چڑا بار، بار گھونسلے سے سر باہر نکال کر عجیب طرح سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے کہ آناً فاناً ایک دوسری چڑیا...... اور دوسرا چڑا کہیں سے آ نکلے...... اور اس گھونسلے میں زبردستی گھسنے لگے اور پھر شور ہی شور ہونے لگا۔ گھونسلے کے اندر چڑیا اور چڑا اپنے گھر کی حفاظت پر لڑ پڑے...... جس پر کافی چڑیوں کے پر صحن میں آ گرے...... اس نے فوراً اپنا دوپٹا ہاتھ میں پکڑا اور دیوار پر بیٹھے چڑیا اور چڑے کو بھگایا۔ یک دم شور ختم ہو گیا۔ ڈر کے مارے گھونسلے کی چڑیا اور چڑا گھونسلے میں جا چھپے اور باقی آسمان کی جانب پرواز کرنے لگے۔ اور پھر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ایک سکون کی لہر اس کے وجود میں اتری اس کے سر کا درد غائب ہو گیا تھا۔ اس لڑائی کے شور نے اس کے ذہن کے شور کو ٹھنڈا کر دیا۔ اب اسے نازش کی آواز پھر کانوں میں سنائی دی۔

''جب اللہ کی رضا ہوگی تو وہ پیسے آپ کو دے دیں گے۔'' اس کی آنکھیں پُرنم سی ہو گئیں...... وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

''اللہ کی رضا ہو گئی ہے، جس نے مجھے آج عقل کی دولت سے نوازا ہے۔ جب ننھے سے پرندے اپنا گھونسلا بچانے کے لیے چیختے ہیں، دوسروں سے لڑتے ہیں تو کوثر بھابی اور میری معصوم سی بھتیجی چپ کیسے رہ پاتیں۔ میں ان کا گھر بھی توڑوں اور احتجاج کی آواز پر اعتراض بھی کروں...... یہ کیسے ممکن تھا۔ میں سچ میں بے وقوف تھی مگر آج اللہ کی رضا نے مجھے عقل کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ اب نہ میں اپنا اور نہ ہی اپنے بھائی کا گھر تباہ ہونے دوں گی۔ مجھے انشاء اللہ پروردگار کی رضا سے کوئی دوسرا راستہ مل جائے گا...... اور بے شک اللہ کی رضا ہو تو وہ ایک ننھے سے پرندے کے ذریعے انسان کو سبق پہنچا دیتا ہے۔''

ناولٹ



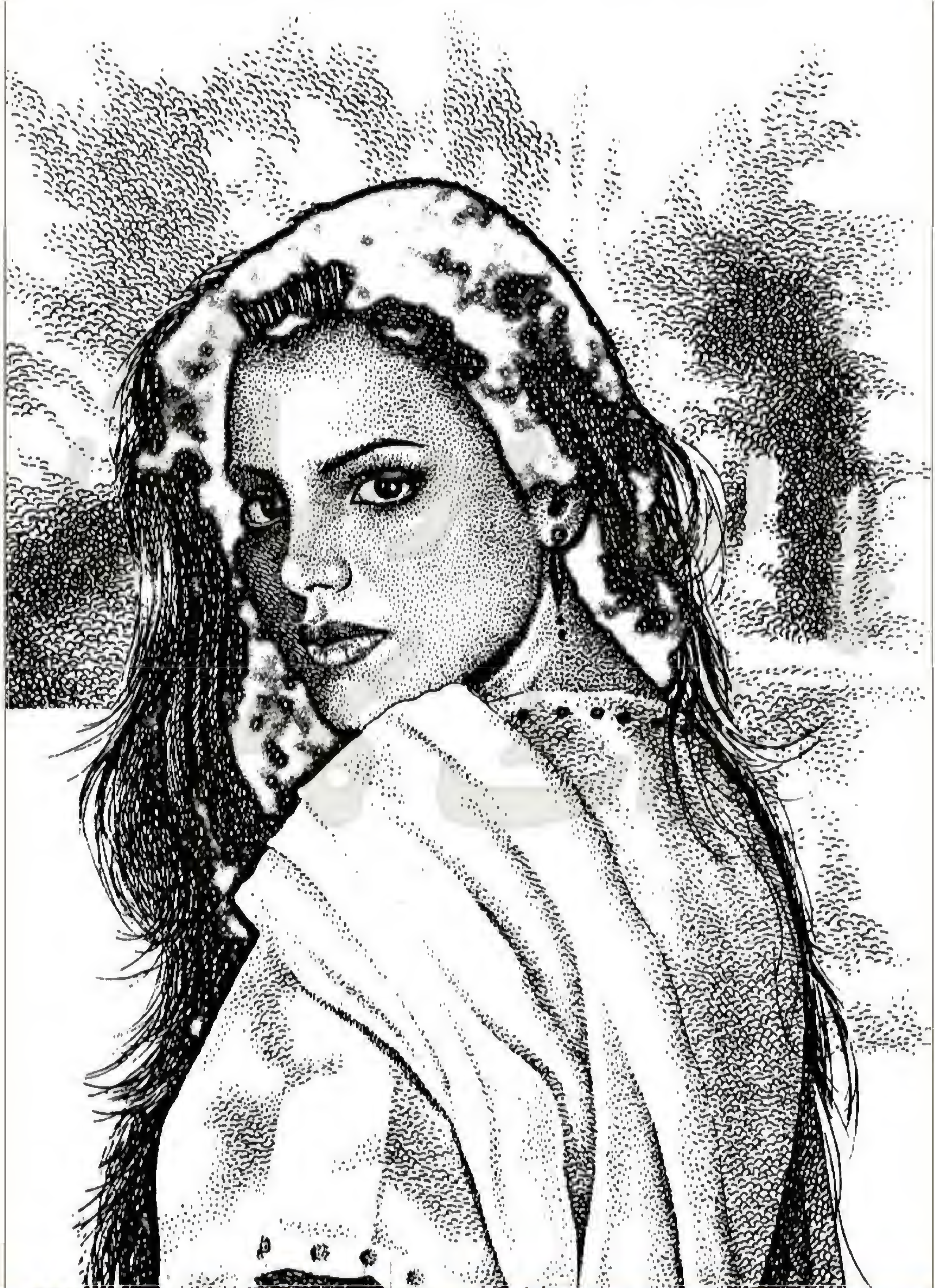
ترکِ وفا

نایاب جیلانی

بارھواں حصہ

"یہ سب کیا ہے؟" اس نے مضطرب سے لہجے میں میکس سے پوچھا تھا۔ جو بڑا ہی بے پروا نظر آرہا تھا۔

"کچھ نہیں یار...... یہاں مشق ہو رہی ہے۔" میکس کے انداز میں بے نیازی تھی جیسے یہ سب اس کے لیے چونکانے والا ہرگز نہیں تھا۔ جبکہ آفاق تو مارے خوف کے کچھ زرد ہوا جارہا تھا۔ ایک دم... پُراسرار ماحول...... ہال میں اندھیرا چھایا ہوا تھا اور اس کے مختلف کونوں میں ایک، ایک موم بتی جلائے اچھی



بھلی حسینائیں چڑیلیں لگ رہی تھیں۔ موم بتی پر نگاہ جما کر نہ جانے کون سا عمل ہو رہا تھا۔

''یہ کیا روح کو بلا رہی ہیں؟'' آفاق نے ہونق پن سے پوچھا تھا۔ اس کے وطن میں خود کالج لائف کے دوران آفاق نے کئی مرتبہ دوستوں کے ساتھ ایسے ناکام شغل کیے تھے مگر یہاں یورپ میں اس قسم کا ماحول دیکھنا اچنبھے کا باعث تھا۔

''نہیں تو......'' اس نے سوال دُہرایا تو میکس نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا تھا۔

''پھر یہ سب کیا ہے؟'' وہ جیسے دنگ ہو گیا تھا۔

''یہ لوگ ٹیلی پیتھی کی مشق کر رہے ہیں۔ ہماری اونر ہے ناں مون حسیب...... وہ ماہر انتقالِ افکار ہے۔ ایک دم جادوئی علم ہے اس کے پاس۔ کھڑے، کھڑے تمہارے دماغ میں گھس سکتی ہے۔'' میکس نے اس کے شوق، تجسس اور خوف کو کچھ اور ہوا دی تھی۔ آفاق کی آنکھیں ابل پڑیں۔

''مون حسیب، علی عیسیٰ کی بہن ناں؟'' آفاق جیسے تصدیق کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ جیسے ایک دم الجھن میں گرفتار ہو گیا تھا۔

''ہاں...... وہی، تم ملے ہو مون حسیب سے؟'' میکس نے سرسری سے انداز میں پوچھا تھا۔

''بس ایک مرتبہ...... ہاں، وہ کوئی ساحرہ لگتی ہے۔'' آفاق جیسے کھڑے، کھڑے متفق ہو گیا تھا۔

''ہمیں مون حسیب کے متعلق زیادہ گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔'' میکس نے جیسے اسے احساس دِلایا تھا۔ آفاق چپ سا کر گیا...... مگر اس کے اندر تجسس کی لہریں ابھر رہی تھیں۔ وہ مون حسیب کے متعلق صرف کچھ نہیں، بہت کچھ جاننا چاہتا تھا۔

''میں بھلا کیسے یقین کرلوں کہ وہ ذہنوں میں گھس جاتی ہے؟'' آفاق نے ہونقوں کی طرح میکس کے چہرے کو کھوجا تھا مگر میکس اسے کوئی اشارہ دے رہا تھا۔ آفاق قطعاً سمجھ نہیں پایا تھا مگر کچھ ہی دیر بعد اسے میکس کے اشارے کی وجہ سمجھ آ گئی تھی۔ بلی کی چال چلتی وہ لڑکی دبے قدموں آفاق کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھی۔ یقیناً وہ یہاں سے گزر رہی تھی اور ان کی باتیں سن کر اِدھر آ چکی تھی۔ آفاق ایک دم گھبرا گیا تھا۔

''میں تمہیں یقین دلا سکتی ہوں، شرط یہ ہے کہ تم میرے ساتھ آؤ۔'' مون کا پُراسرار و سحر زدہ لہجہ آفاق کو اور بھی گھبراہٹ میں مبتلا کر چکا تھا۔ وہ تو جیسے بات کر کے پچھتا رہا تھا۔ میکس اس کی پتلی حالت دیکھ کر بیچ میں ہی بول پڑتا مگر مون نے اسے روک دیا۔

پھر اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے کسی اور ہال میں داخل ہو گئی۔ آفاق مرے، مرے قدموں سے چلتا مون کے پیچھے آ گیا تھا۔ پھر مون اسے انتقالِ افکار کے متعلق کچھ ابتدائی چیزیں بتاتی رہی تھی پھر اس نے میکس کو بھی بلوا لیا تھا۔ اب نہ جانے وہ ان کے ساتھ کیا کرنے والی تھی۔ آفاق کچھ گھبرایا ہوا تھا مگر میکس اس ماحول کا عادی تھا، اسی لیے کچھ بے نیاز تھا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ آفاق کو متاثر کرنے کے لیے مون کیا کرنے والی ہے۔

''تم بیدی نونگ کی حدود سے نکل کر باہر چلے جاؤ۔ ایک پینسل اور کاپی ساتھ لے جانا اور اپنے ساتھ آفاق کے قابلِ اعتبار دو تین بندے بھی ساتھ رکھنا...... یہاں پر ڈیزی اور ڈیانا ہوں گی پھر آفاق دیکھ لے گا کہ ذہن میں کیسے گھسا جاتا ہے۔'' وہ معنی خیز سی پُرغرور مسکراہٹ لیے میکس سے کہہ رہی تھی۔ جیسے یہ کام اس کے لیے قطعاً مشکل یا کٹھن نہیں تھا۔ اور وہ جیسے آفاق کی حالت سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور آفاق، زرد رنگت لیے ہونق بنا بولتی ہوئی مون کو دیکھ رہا تھا۔

''میں تمہیں پیام کی ترسیل کے متعلق بتاؤں گی۔ لاکھوں میل کی دوری کے باوجود میں کیسے پیغام

کو معمول تک پہنچا سکتی ہوں۔ اگرچہ میکس زیادہ دور نہیں۔ پھر بھی تمہارے لیے اتنا ہی کافی ہوگا۔'' مون کی نخوت کا جیسے کوئی عالم ہی نہیں تھا۔ وہ کسی اونچی مسند پر خود کو محسوس کر رہی تھی اور اس کے اردگرد لوگ جیسے بونے تھے بہت ہی حقیر اور معمولی...... آفاق کو اس کا انداز بہت برا لگا تھا۔ کچھ دیر پہلے کی اس کی گھبراہٹ ختم ہو چکی تھی اب اس کے اندر ناگواری اور غصہ تھا۔ یہ اتنی سی لڑکی آخر خود کو سمجھتی کیا تھی؟ آفاق کا دل چاہ رہا تھا۔ یہ جو دعویٰ کر رہی تھی، اس کا دعویٰ کسی بھی طریقے سے غلط ثابت ہو جائے۔ اس کا غرور کسی بھی طریقے سے ٹوٹ جائے مگر بعض خواہشات کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ آفاق کی خواہش بھی پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اس مغرور لڑکی کو ناکام نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ اپنے بھائی سے کتنی مختلف تھی۔

وقتِ مقررہ پر جیسے ہی مون نے اپنا پیام لہروں کی شکل میں میکس کی طرف بھیجا تھا دوسری طرف میکس (جو کہ معمول تھا) کے دماغ نے ان لہروں کو وصول کر لیا تھا پھر پاس رکھے کاغذ پر پیغام کو لکھ لیا۔ چونکہ تجربے کے وقت دونوں مقامات پر ماہرین موجود تھے سو کسی بھی قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ بھی کامیاب تجربہ تھا مگر آفاق پھر بھی الجھ گیا اور اس کے ذہن نے اس تجربے کو تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ اس نے مون سے کہہ دیا تھا۔

''مجھے یقین نہیں آیا...... تم مجھے میکس کی جگہ بھیجو......'' آفاق کی بات سن کر کئی ماہرین چونک گئے تھے۔ جیسے ڈیزی، ڈیانا اور ابھی ابھی اندر داخل ہونے والا پروفیسر......

''تم اسے میکس کی جگہ بھیج دو مون......'' پروفیسر نے انتہائی سنجیدہ لہجے میں کہا تھا۔ ''مگر اس سے پہلے آفاق کے دماغ کی جانچ کرنا ہوگی۔ اس کا دماغ کتنا طاقتور ہے؟ قوتِ ارادی کس پوائنٹ تک ہے؟ برین گلینڈز ہیں یا نہیں...... اور اعصابِ دماغ بارہ حصوں پر مشتمل ہونے کے بعد کہیں کچھ گڑبڑ تو نہیں کر رہے؟ اور یہ احکامات کی کتنی پابندی کر سکے گا۔ اور اسے سمجھا دو کہ ہپناٹک کو اپنا 'معمول' بنانے کے لیے خصوصی تربیت دی جاتی ہے مگر اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ بنا تربیت کوئی بندہ مسخر نہیں ہو سکتا۔ ہم آج آفاق کو بنا تربیت ہی مسخر کریں گے۔'' پروفیسر جیسے چیلنج قبول کر کے اسے مون کے حوالے کرتا باہر نکل گیا تھا۔ آفاق کو پروفیسر بہت برا لگا تھا۔ اپنی تمام تر وجاہت کے باوجود آفاق کو پروفیسر کے چہرے سے شیطانیت ٹپکتی نظر آ رہی تھی۔ اسے پروفیسر کا خوب صورت چہرہ ماسک زدہ لگتا تھا۔ جانے یہ صرف آفاق کے خیالات تھے یا پھر بیدی نونگ کے باقی لوگ بھی اس کی رائے سے متفق تھے۔ مجموعی طور پر یہاں سب لوگ پروفیسر کو عقیدت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ پروفیسر نے یہاں آ کر ایک قدیم ترین علم کو متعارف کروایا تھا اور بہت سے لوگوں کو اس علم نے فائدہ پہنچایا تھا۔ اس نے بہت سارے بیمار لوگوں کو ہپناٹائز کر کے ان کی بیماریاں ختم کی تھیں۔ نشئی اور بدعادتوں میں مبتلا لوگوں کی بری عادتیں چھڑوائی تھیں۔

اس نے علاقے میں اپنا نام اور پہچان بنانے کے لیے بڑے پاپڑ بیلے تھے اور اب نتیجہ اس کے حسبِ توقع نکلا تھا۔ یقیناً وہ اچھائی کے لبادے میں برائی کی پرورش کرنے والوں میں سے تھا۔ اسی طرح مون نے پروفیسر کے شانہ بشانہ کام کیا تھا۔ بلکہ کچھ چیزوں میں پروفیسر، مون کو اپنے سے بہت آگے سمجھتا تھا۔ خصوصاً مون کا ذہن برقی لہروں جتنی طاقت سے پیغام کی ترسیل کر سکتا تھا اور اس کے علاوہ مون کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ بغیر تربیت دیے کسی بھی بندے کو ہپناٹائز بہت آسانی کے ساتھ کر لیتی تھی۔ عموماً عام بندہ جو بغیر تربیت لیے 'معمول' بنتا ہے، وہ پہلی کوشش میں ہپناٹائز نہیں ہو سکتا مگر مون نے یہ ناممکن کام بھی کر دکھایا تھا۔

اب اسے ایک عظیم چیلنج ملا تھا...... بغیر کسی خاص نفسیاتی ہوم ورک کے آفاق کو نشریاتی رابطے کے ذریعے پیغام بھیجنا تھا اور وہ یہ ناممکن کام پورا کرنے کا مکمل ارادہ رکھتی تھی مگر اس کے لیے مون کو تحت الشعور کو کھنگالنا تھا۔

دراصل تحت الشعور کا ٹیلی پیتھی کے علم سے گہرا تعلق ہے اور ہماری ذہنی کارکردگی جن عناصر کے تحت ظاہر ہوتی ہے ان میں تحت الشعور کا بڑا ہاتھ ہے۔ اگرچہ فزیکل ریسرچ سے یہ پتا چل چکا ہے کہ ہم ذہن کے کس حصے سے کون، کون سا کام لیتے ہیں، ان میں شعور، تحت الشعور اور لاشعور شامل ہیں۔

شعور کیا ہے؟ ہمارے ذہن کا پہلا حصہ، پہلی منزل، کسی بھی دفتر کا گراؤنڈ فلور...... شعور ہر وقت مصروفِ عمل رہتا ہے۔ زندگی کے ہر، ہر لمحے، واقعے، حادثے، سانحے کا احساس دلاتا ہے۔ کسی ایک نکتے پر کام نہیں کرتا بلکہ بیک وقت آگے، پیچھے، دائیں، بائیں چاروں سمت مکمل بیداری کی حالت میں توجہ رکھتا ہے۔ جیسے لکھتے ہوئے ہمارا قلم، صفحے، الفاظ، قلم کے علاوہ آس پاس کے ماحول سے بھی رابطے میں رہتا ہے۔ جہاں کہیں کھٹکا ہوا، شعور نے گھنٹی بجائی، قلم فوراً رک گیا اور آس پاس کے ماحول کی طرف دھیان چلا گیا۔ یہ شعوری کوشش ہوتی ہے۔

تحت الشعور ذہن کی عمارت کا درمیانی حصہ ہے۔ اس کی قوت کیا ہے؟ اس کا اندازہ لگانا ممکن ہی نہیں۔ تاہم اس کی قوتِ پرواز اس وقت عروج پر ہوتی ہے جب یہ لاشعور کے ساتھ مل کر کوئی کام سرانجام دیتا ہے۔ تحت الشعور، لاشعور کی طاقت کو اپنے اندر ضم کر لیتا ہے۔ وہ طاقت اپنے اندر مدغم کر لیتا ہے۔ ورنہ اس کا کام دماغی کمپیوٹر میں بس اتنا ہے کہ جو واقعات انسان کو عام شعور کی نسبت زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ یہ شعور سے انہیں حاصل کر کے اپنے اسٹور میں محفوظ کر لیتا ہے۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ فلاں، فلاں کی یادداشت بڑے غضب کی ہے، حافظہ کیا کمال کا ہے، دراصل ان لوگوں کا ڈیٹا اسٹور کرنے والا سسٹم یعنی تحت الشعور بڑا مضبوط اور طاقتور ہوتا ہے۔

عمارت کی سب سے بلند ترین جگہ، کسی بھی بلڈنگ کا ٹاپ فلور لاشعور کی طرح ہوتا ہے۔ بلند، اونچا اور عظیم ہونے کے ساتھ، ساتھ انتہائی طاقتور بھی... یہ پہلے دونوں حصوں سے بڑھ کے قوت اور طاقت رکھتا ہے۔ یہ تحت الشعور سے ایسے واقعات لے کر اسٹور کرتا ہے جن کو شعور نے بری طرح متاثر کیا ہوتا ہے۔ یہی ذہن کا عروج والا حصہ ہوتا ہے جو تحت الشعور کے ساتھ مل کر عظیم قوتِ مخفی کی بلندی، اونچائی اور اڑان کے لیے اکساتا رہتا ہے۔ جب اندر کوئی مخفی قوت انگڑائی لے کر جاگتی ہے تو یہی قوت دراصل رشک آمیز انسان، شخصیت بنانے میں اہم رول پلے کرتی ہے۔

یہ قوت انتہائی رہنما، رفیق اور دوست ہوتی ہے۔ یہ راہ کی کٹھنائیاں چن لیتی ہے۔ کسی بھی انسان کو روحانیت کے اعلیٰ مقام تک پہنچا دیتی ہے۔ دراصل دورِ قدیم میں مسلمان صوفی مراقبے کی صعوبتیں جھیل کر اعلیٰ درجے کا ہی کشف حاصل کیا کرتے تھے۔ اسی طرح ہندو یوگی جو جنگلوں، صحراؤں میں بھوکے، ننگے، پیاسے رہ کر غیر مادی قوت حاصل کرتے اور پھر ان کے سامنے کئی طرح کے اور جہان آجاتے۔

یہ قوت انسان کو عروج بھی دیتی تھی اور زوال بھی۔ اس کے دو رخ ہوتے ہیں، مثبت اور منفی...... اور پروفیسر نے مون حسیب کو منفی رخ کی طرف زیادہ گائڈ کیا تھا، جس میں اپنا مطلب، اپنا مفاد عظیم ہوتا اور باقی سب چیزیں بے معنی ہو جاتیں۔

اسے رہنما ملا بھی تو کیسا؟ جو ہیرے کو تراشنے

کے بعد اسے کیا بنا رہا تھا؟ ہیرا جسے تراشا بھی جاتا تب بھی اس کی باقیات اور کچرے کی قیمت لاکھوں میں ہوتی اور پروفیسر نے مون حسیب کو ہیرے کے سانچے سے اٹھا کر گریفائیٹ کی دلدل میں پھینک دیا تھا اور اب پروفیسر کو آفاق کی صورت میں ایک اور شکار دکھائی دے رہا تھا۔ پروفیسر کو لگ رہا تھا کہ آفاق، میکس کی طرح بیزار ہو کر بھاگنے والا نہیں بلکہ ثابت قدمی کے ساتھ میدان میں کھڑا رہے گا اور پروفیسر، آفاق کے فریش دماغ کو استعمال میں لا سکتا تھا۔

پھر جس وقت نشریاتی رابطے کا وقت مقرر ہوا تب آفاق کو کرخ (چرچ) کی طرف بھیج دیا گیا تھا۔ یعنی ایک الگ، پُرسکون اور سنسان جگہ پر...... آفاق نے اپنی مرضی سے تیس تصویریں منتخب کی تھیں۔ یہ تیس تصویریں بیدی نونگ کے طالب علموں کی تھیں۔ ان میں ایک ڈیزی اور ڈیانا کی تھی...... ایک مون کی تھی، ان میں سے ایک تصویر سوزن کی تھی۔ میکس کے علاوہ ایک تصویر کسی ایشین جوان کی تھی۔ ان بے شمار انگریز، جرمن لوگوں میں ایک ایشین خوبرو جوان کی تصویر آفاق کے لیے اچنبھے کا باعث نہیں تھی۔ شاید یہ جوان بھی بیدی نونگ کا کوئی اسٹوڈنٹ تھا۔ اب آفاق نے ایک تصویر سلیکٹ کرنا تھی۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا تھا اور تصویر کے ایک، ایک نقش کو اپنی ذہنی سطح پہ ابھارنا تھا۔ قریب، قریب پانچ سیکنڈ میں تصویر پہ آفاق کا ارتکاز قائم ہو گیا تھا۔ مکمل یکسوئی کے ساتھ یک ٹک وہ تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر ماہرین اور بیدی نونگ کے قابل ترین ماہرِ انتقالِ افکار بیٹھے تھے۔ جیسے وہ آفاق کے ذہن پر ابھرنے والی تصویر کو کھوج رہے تھے۔ آخر یہ تصویر کس کی ہوگی؟ تیس لوگوں میں آفاق نے کس تصویر کو سلیکٹ کیا ہوگا؟ یہ مون کا ہی نہیں، بیدی نونگ کی ساکھ کا بھی سوال تھا پھر آفاق کوئی تربیت یافتہ 'معمول' نہیں تھا جو عامل کی

تحیشن پہ فوراً چوکنا ہو جاتا۔ مون نے اپنے لیے ایک بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ آفاق اس کی تمام تر محنت کو مٹی میں بھی رول سکتا تھا۔ وہ اسے پورے بیدی نونگ کے سامنے شرمندہ اور ذلیل بھی کر سکتا تھا۔

دوسری طرف مون کے ماتحت، اسٹوڈنٹس اور اتالیق کی کنڈیشن نارمل نہیں لگتی تھی۔ اندر سے وہ لوگ کچھ، کچھ مضطرب تھے اگرچہ مون نے جوتوں کی دکان پر ایک کمزور قوتِ ارادی کی مالک لڑکی کو فوراً ہپناٹائز کر لیا تھا مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ ہر بندہ ایک ہی مشق میں ہپناٹائز ہو جاتا۔

مون کے کمرے میں ہلکی روشنی موجود تھی۔ روشنی کا منبع سر کی پچھلی جانب تھا اور وہ پیغام کھینچنے کی مکمل پوزیشن میں آچکی تھی۔ مون نے اپنی پوری توجہ ایک غیر مرئی عکس پر جما دی تھی۔ جیسا کہ یہی عکس کوئی جزئیات نشر کرنے والا تھا۔ پیغام نشر ہونے کے قریب تھا اور مون، آفاق (معمول) کو اپنے قریب بیٹھا محسوس کر رہی تھی۔

عام حالات میں مون کو جب کوئی پیغام یا تصویر دوسرے ذہن تک نشر کرنا ہوتی تھی تو صرف اٹھائیس سیکنڈ لگتے تھے... مگر ایک غیر تربیت یافتہ 'معمول' کے ذہن سے پیام یا تصویر کو کھینچنا خاصا وقت طلب کام تھا مگر پھر بھی چوبیسویں سیکنڈ میں مون کا آفاق کے ساتھ ذہنی رابطہ ہو گیا تھا جس کا مطلب تھا آفاق کا ذہن بہت طاقتور ہے اور وہ اگر باقاعدگی کے ساتھ ٹیلی پیتھی کی مشقیں دہراتا تو ایک بہترین 'عامل' بن سکتا تھا۔

مون چونکہ اس وقت 'معمول' کی کنڈیشن میں تھی، وہ پیام دے نہیں رہی تھی بلکہ کھینچنے والی تھی سو وہ کمرے میں ٹہلتے ہوئے ایک خاص وقت کا انتظار کرنے لگی تھی اور پھر جیسے ہی آفاق نے تصویر پہ نگاہیں فوکس کر کے ارتکاز کو آخری حد تک آزما ڈالا تھا، تب ایک دم مون کے ذہن کی اسکرین پہ

تصویر کے نقش ابھرنے لگے تھے۔ قریب بیٹھے ماہرین نے کاپی پنسل سنبھال لیے۔

''کالے بال، سرمئی آنکھیں......اونچی مغرور ناک، سفید رنگت اور ہونٹ کے پاس سیاہ تل......ایشین جوان...... جیسے یہ تصویر مکمل ہوگئی...... ذی شاہ......ہاں، یہ تصویر ذی شاہ کی ہے۔ میکس، جوزف، زئی، خسرو یا احمدین کی نہیں۔ آفاق کے ہاتھ میں ذی شاہ کی تصویر ہے۔'' مون حسیب نے پچیسویں سیکنڈ میں پیغام کھینچ لیا تھا مگر یہ کیا؟ آفاق ابھی ذہنی رابطہ توڑ نہیں رہا تھا۔ وہ خود کلامی کے سے انداز میں کچھ سوال کررہا تھا۔ اس کی نگاہیں ابھی تک تصویر پر جمی تھیں۔

مکمل منظر کشی ذہن میں بٹھانے کے لیے ارتکازِ توجہ کا ہونا ضروری ہوتا ہے جیسا کہ کبھی معمول کو پیغام میں عامل کی آواز سنائی دیتی ہے اور کبھی اس کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ آواز سنائی دینے کے بعد پھر معمول کو پیغام کا تصویری عکس نظر آتا ہے۔ اب مون نے پہلے اُپنے کانوں میں عامل (آفاق) کی آواز سنی تھی پھر جیسے تصویر کے نقش ابھر آئے تھے۔

''ذی شاہ کون ہے؟'' آفاق (عامل) کی طرف سے پیام نشر ہوا تھا۔ جیسے وہ خود کلامی کررہا تھا۔ جیسے وہ خود سے مخاطب تھا۔

''محبت......'' مون نے جواب میں ایک لفظ کہا تھا، یہ جواب آفاق تک پہنچا تھا یا نہیں؟ اسے ماہرین بتا سکتے تھے۔ نشریاتی رابطہ اب ٹوٹ چکا تھا۔ مگر عامل اور معمول دونوں دم بخود تھے۔ آفاق جیسے ابھی تک بے یقین سا تھا۔ وہ لفظ محبت پر اٹک گیا تھا اور قریب بیٹھے ماہرین اس کے بولے لفظ محبت کو کاغذ پر لکھ رہے تھے۔

قریب، قریب اٹھارہ منٹ بعد اسے ہال میں لایا گیا تھا۔ یہ وہی تجربہ گاہ تھی جس میں کچھ دیر پہلے مون نے پیام وصول کیے تھے۔ ماہرین نے متفقہ طور پر رائے دی تھی اور فیصلہ مون کے حق میں ہوا۔ وہ ٹیلی پیتھی کی ماہرین میں شمار ہونے لگی تھی۔ ایسی انتقالِ افکار کی ماہر جو غیر تربیت یافتہ معمول کے ساتھ بھی نشریاتی رابطہ قائم کرسکتی تھی۔

مون کے سر پر جیسے شہرت کا بھوت سوار ہونے لگا تھا......وہ آفاق کی سلیکٹ کی گئی تصویر کو صحیح طریقے سے ذہن کی سطح پر ابھار کے سامنے لائی تھی۔ آفاق ماہرین کے الفاظ دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔ مون نے بالکل صحیح تصویر کشی کی تھی۔ تین تصویروں میں سے ایک ایشین جوان کی تصویر کو ٹھیک اندازوں سے پہچان کر ایک، ایک نقش بتانا کوئی معمولی بات تھی؟ آفاق کا ذہن جیسے اس حقیقت کو دیکھ کر آزما کر بھی انکاری تھا۔

پروفیسر، آفاق کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ جیسے آفاق ابھی تک کسی الجھن میں گرفتار ہو۔ اس نے پروفیسر کی چبھتی نگاہوں کو محسوس کرکے نگاہوں کا رخ بدل لیا تھا۔ تب پروفیسر اس کے قریب آگیا۔

''کہو جوان! تمہیں کیسی لگی ہماری دنیا؟'' وہ بڑے فخر کے عالم میں پوچھ رہا تھا۔ جیسے جو کامیاب تجربہ مون نے کیا تھا، وہ پروفیسر کے اپنے کریڈٹ میں جاتا تھا۔ آفاق کو پروفیسر کا انداز سخت برا لگا۔

''بہت حیران کُن......؟ یہ جادو کیا بنگال کے کسی جادوگر سے سیکھ کر مون کو سکھایا ہے؟'' آفاق کا لہجہ گہرا اور کاٹ دار طنزیہ تھا۔ پروفیسر کے چہرے کی مسکراہٹ ختم ہوگئی تھی۔ اسے بھی آفاق کا انداز برا لگا تھا۔

''یہ کوئی جادو نہیں، جادوئی علم ہے۔'' پروفیسر نے نخوت سے بتایا۔

''اگر مثبت طریقے سے استعمال میں لایا جائے تو اسے علم روحیت بھی کہتے ہیں۔ سائیکا کینیز بھی کہتے ہیں۔ آسٹرل پروجیکشن بھی کہتے ہیں۔ نورانیت، روحانیت بھی کہتے ہیں۔ مگر مجھے تمہاری نظر میں بس شیطانیت نظر آتی ہے۔ مجھے نہیں لگتا، تم ٹیلی پیتھی جیسے

علم سے کوئی فائدہ مند کام کرتے ہو گے۔ حالانکہ یہ اعلیٰ ترین خداداد صلاحیت کسی کے ذہن اور دل پر اترتی ہے تو بندے کو بلندی کی انتہا پر لے جاتی ہے مگر تم تو مجھے پستی کی انتہا پر نظر آتے ہو۔ یہ مون حسیب کیسے لوگوں میں پھنس گئی ہے۔'' آفاق جیسے دکھ کے عالم میں صرف سوچ کر رہ گیا تھا جبکہ پروفیسر اپنا کوئی فون سننے میں مصروف تھا۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا جو وہ آفاق کی ذہنی الجھنیں دور کرتا۔ آفاق جو سوچتا تھا، بے شک سوچتا رہتا، پروفیسر کو اس کی سوچ، الجھن اور تفکر کی کوئی پروا نہیں تھی۔

آفاق کچھ عرصہ بیدی نونگ سے منسلک رہا تھا پھر مون کی خاص عنایت کے باعث اس کی گروسی کے گھر شفٹ ہو گیا تھا۔ یہاں آ کر اس پر مون کی شخصیت کے کچھ اور اسرار کھلے تھے۔ وہ علی عیسیٰ جیسے انسان کی بہن لگتی ہی نہیں تھی۔ وہ بہت پتھر دل لڑکی تھی۔ جذبات اور احساسات اس پر اثر نہیں کرتے تھے۔ تبھی جب آفاق کے توسط سے میکس نے مون کی کزن کے لیے اپنا پروپوزل دیا تو مون کا ردِعمل حیران کن ہی نہیں بلکہ کسی حد تک ہتک آمیز تھا۔

''وہ میکس...... غریب سا لڑکا، ہمارے انسٹی ٹیوٹ میں پڑھاتا ہے۔ وہ بھلا سوزن کے قابل ہے؟'' مون نے انتہائی نخوت بھرے لہجے میں آفاق کو جھڑک دیا تھا۔ وہ بیچارہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

''اس میں کمی تو کوئی نہیں......؟'' آفاق نے بجھے لہجے میں کہا تھا۔ آج میکس کے بہت دفعہ مجبور کرنے پر آفاق نے مون سے بات کی تھی۔ میکس کی پہلی ملاقات سوزن سے چرچ میں ہوئی تھی۔ وہ بھی وہاں عبادت کرنے گیا تھا۔ وہیں پہ روتی ہوئی سوزن کو دیکھ کر اپنی سدھ بدھ بھلا بیٹھا تھا۔ جانے سوزن کس لیے اتنا رو، رو کر دعا کر رہی تھی؟ شاید آخرت کے خوف سے یا پھر......؟ میکس کو وہ اس لیے بہت اچھی لگی تھی۔ اس کے ابھرے، ابھرے انتہائی پھولے سرخ چکنے سے گالوں پر پھسلتے آنسو میکس کا دل لوٹ کر لے گئے تھے۔ وہ سوزن کا جیسے دیوانہ ہو گیا تھا۔ پھر بہت بچار کے بعد اس نے آفاق سے رازِ دل شیئر کیا۔ اور آفاق نے اس کی مدد کرنے کی حامی بھر لی تھی مگر مون کے اتنے بے رحمانہ انکار نے اسے دھچکا پہنچایا تھا۔ وہ مون کی نخوت، غرور اور تکبر کو ملاحظہ کر کے شاکڈ ہو چکا تھا۔ اسے ایسی رکھائی کی امید نہیں تھی۔

''وہ اتنا بھی غریب نہیں، کم از کم سوزن کو خوش رکھ سکتا ہے۔'' آفاق نے جرح کرنے والے انداز میں کہا۔ اس سے ایک غلطی ہو چکی تھی، اسے مون سے بات ہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ تا نتے یا گروسی سے براہِ راست بات کر لیتا۔ چونکہ غلطی اب ہو چکی تھی سو اس کا کفارہ ادا نہیں ہو سکتا تھا۔ مون کا انکار پہلے کی طرح قائم و دائم تھا۔ اور وہ ایک بات کر کے پھرتی نہیں تھی۔ آفاق کو یہ انکار اٹھا کر میکس کے پاس لے کر جانا بہت مشکل لگ رہا تھا۔ وہ ایک آخری کوشش ضرور کرنا چاہتا تھا۔

''میکس، سوزن سے محبت کرتا ہے مون! محبت اہم ہوتی ہے، دولت نہیں۔'' آفاق نے لجاجت سے کہا تھا۔ وہ مون کو غصہ بھی نہیں دلانا چاہتا تھا۔ وہ بہت نرمی سے میکس کے جذبات کی وضاحت دے رہا تھا۔

''یہاں کوئی کسی سے محبت نہیں کرتا۔'' مون نخوت سے بولی تھی۔ آفاق کا منہ اتر گیا تھا۔ دل کو عجیب سی ٹھیس لگی تھی۔

''یہ بات تو سراسر غلط ہے...... کیا حسیب انکل اور میری آنٹی نے محبت نہیں کی؟'' وہ بڑی نرمی سے بولا مگر مون کو پھر بھی بہت برا لگا۔ وہ ان کی فیملی میں گھسا تھا تو بہت سی باتیں جان گیا تھا۔ اصولاً مون کو غصہ نہیں آنا چاہیے تھا مگر......

''ان کا یہاں کیا ذکر......؟'' مون کے تیور بگڑ

کیسے جاتی ؟ اس نے پروفیسر کی گدی پر آخر بیٹھنا تھا۔ بہرحال جو بھی تھا، آفاق کے لیے مون کی زندگی کا یہ تاریک پہلو بڑا افسوس ناک تھا۔ یعنی وہ کسی بھی وقت کسی بھی شخص کو بدگمان کر سکتی تھی۔ وہ کسی بھی وقت کسی بھی شخص سے اپنا من پسند کام نکلوا سکتی تھی۔

وہ گروسی کے گھر میں نہ رہ رہا ہوتا تو اسے ہرگز بھی مون کی ان کارروائیوں کا پتا نہیں چلتا۔ وہ ایک بامقصد علم کو کیسے، کیسے کاموں میں استعمال کر رہی تھی۔ بہرحال ٹیلی پیتھی ایک بامقصد علم ہے اگر اسے کوئی اپنے ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے تو یہ اس کا اپنا عمل ہے۔

یہ صبح نوخیز کا وقت تھا، بواریا یہ صبح بھی بڑی نمناک سی اُتری تھی۔ ہلکی، ہلکی بارش کی پھوار آلپس کے پہاڑوں پہ موتیوں کی طرح گر رہی تھی۔ سبزے کو نکھار بخشا جا رہا تھا۔ پھولوں کی بھینی مہک بیلے کی طرف سے آ رہی تھی۔ آفاق دم بخود سا اللہ کے پھیلائے حسن کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے جنت کی کوئی حسین ترین وادی ہو۔

بواریا گیلا ہو جاتا تو مون کمرے میں گھس جاتی۔ باہر کے کام روک دیتی۔ گھر کے اندر تک محدود ہو جاتی۔ اسے گیلے شہر اور دیہات بھی بے حد ناپسند تھے۔ اسے گیلے چہرے، گیلی آنکھوں سے بھی نفرت تھی۔ یہ بارش رکنے سے کچھ پہلے کی بات ہے۔ آفاق کچن میں کھڑا اپنے لیے کافی بنا رہا تھا۔ کافی بن چکی تو وہ مون کی تلاش میں سٹنگ روم سے ہوتا ہوا اوپر آ گیا تھا۔ مون کے بیڈروم کے ساتھ ہی یہ چھوٹا سا تکون کمرا تھا۔ جس کا دروازہ بند تھا۔ اندر سے آواز نہیں آ رہی تھی مگر آفاق کو لگ رہا تھا کہ مون یہیں ہوگی۔ اس نے کچھ سوچ کر دروازے کو ہلکا سا دبایا تھا جیسے دروازہ ہاتھ کا دباؤ نہ جھیل سکا اور کھلتا چلا گیا۔ اندر کا منظر اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ بس ہلکی سی روشنی تھی جو مون کی پشت کے اوپر سے اٹھ رہی تھی۔ ماحول انتہائی پُرسکون تھا، سوئی بھی گرتی تو آواز آ جاتی پھر دروازہ کھلنے کی آواز بھی ضرور آئی ہوگی۔ مگر مون اپنا عمل روک نہیں سکتی تھی۔ اس نے سوزن کو ہپنا ٹائز کر رکھا تھا۔ یہ پوسٹ ہپنا ٹک سجیشن کے ذریعے عمل ہو رہا تھا۔ سوزن کے کان سے موبائل لگا تھا اور وہ وہی بات کر رہی تھی جو مون اس سے کہلوا رہی تھی۔ اور مون اسے کون سی سجیشن دے رہی تھی؟ آفاق کے سر پر جیسے آسمان گر پڑا تھا۔

”میں عیسیٰ تم سے محبت کرتی ہوں، تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تم میری خاطر اپنی شرط کو ختم کر دو۔“

سوزن نے یہ بات کئی مرتبہ دُہرائی تھی۔ پھر جیسے دوسری طرف سے انتہائی غصے کے عالم میں رابطہ منقطع کر دیا گیا تھا۔ اِدھر کچھ ہی دیر میں مون نے سوزن کو ہپنا ٹزم کی نیند سے ہلکے اشارے کے ساتھ جگا دیا تھا۔ سوزن جو ایک پل صراط عبور کر کے آئی تھی۔ پھر بھی ذرا سی تھکاوٹ اور تکلیف محسوس نہیں کر رہی تھی۔ ہپنا ٹزم کی نیند نے اس کے اعصاب پُرسکون کر دیے تھے اور اب وہ اپنے سامنے رکھے پرچے کو دیکھ رہی تھی۔ یہ وہ الفاظ تھے جو اس نے نیند کی حالت میں لکھے تھے۔ یعنی جاگتی آنکھوں والی نیند...... دوسری طرف مون کسی فاتح شہزادی کی طرح بیٹھی تھی۔ گردن اکڑائے، انتہائی مغرور تاثرات کے ساتھ...... جیسے کہہ رہی ہو۔ ”دیکھا میرا کمال...... یہ بات تم حالاتِ عام میں کبھی بھی عیسیٰ سے نہیں کہہ سکتی تھیں۔ اب جیسے ہی تم نے اظہارِ محبت میں پہل کر دی۔ دوسری طرف عیسیٰ کا دل ضرور پگھل جائے گا۔ وہ تمہاری طرف پلٹ آئے گا۔“

جبکہ سامنے بیٹھی سوزن کچھ گھبرا رہی تھی۔ جیسے آئندہ آنے والے حالات اسے بہتر نہیں لگ رہے تھے۔ باہر کھڑے آفاق کا دل بوجھل ہو گیا تھا۔ وہ جیسے ہی پلٹنے لگا، مون کی سرکش سی آواز آئی تھی۔

”اس دو ٹکے کے میکس کو بتا دینا۔ سوزن، عیسیٰ

سے محبت کرتی ہے اور اس اظہارِ محبت کے بعد عیسیٰ بھی اس کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔'' مون کے لہجے میں کھنکھناہٹ تھی۔ آفاق ایک دم ٹھٹک گیا۔ اسے مون کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ کیا واقعی سوزن، عیسیٰ سے محبت کرتی ہے؟ اور علی عیسیٰ بھلا کسے چاہتا تھا؟ آفاق کو اس سوال کا جواب کچھ گھنٹوں تک مل گیا تھا مگر اس سے بھی پہلے اس نے مون کو باور کروادیا تھا۔ بلکہ ایک طرح سے تو لفظوں کا طمانچہ اس نے رسید کیا تھا۔

''عورت کی طرف سے پہل مرد کو کبھی اٹریکٹ نہیں کرتی، عورت چاہے مشرق کی ہو یا مغرب کی......'' آفاق کے الفاظ سوزن کا سر جھکا گئے تھے جبکہ مون ایک دم بھڑک اٹھی تھی۔

''تم اپنی حد میں رہو۔'' مون کا انداز انتہائی توہین آمیز سا تھا۔ آفاق کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''مجھے اپنی حدود کا اچھی طرح پتا ہے۔'' آفاق مدھم آواز میں کہتا باہر نکل گیا تھا۔ وہ مزید مون کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا اسی لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ شام تک قریب کے کسی مکان میں کمرا کرائے پر لے کر اُدھر شفٹ ہو جائے گا مگر اس سے پہلے ایک انوکھا واقعہ ہو گیا۔ مِن ہائیم سے اچانک علی عیسیٰ چلا آیا تھا۔ غیظ و غضب سے بھرا ہوا۔ اس نے سوزن کو خوب کھری، کھری سنائی تھیں۔ یقیناً سوزن کی فون کال نے عیسیٰ کو بھڑکا دیا تھا۔ عیسیٰ کو یہ تو خبر نہیں تھی کہ مون نے کس طرح سوزن کو اپنے اسلوب سے مسمرائز کر کے اتنی بڑی بات فون پر کہلوائی تھی جسے وہ عام حالات میں کبھی عیسیٰ سے کہنے کا حوصلہ نہیں رکھ سکتی تھی۔ وہ تو سوزن پہ ہی بھڑک رہا تھا جبکہ آفاق تو اس ساری کارروائی کا چشم دید گواہ تھا۔ مگر وہ قطعاً مناسب نہیں سمجھ رہا تھا کہ عیسیٰ اور مون کے گھریلو معاملات میں دخل اندازی کرے...... مون کو تو پہلے سے ہی آفاق پہ بہت غصہ تھا اور اگر آفاق اب بھی بیچ میں بول پڑتا

تو پھر مون کے غضب سے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ پھر آفاق یہاں لڑائیاں مول لینے تو نہیں آیا تھا۔ اس پر بے شمار ذمے داریاں تھیں...... اور وہ یہاں سیٹ ہو کر اپنے پچھلوں کے فیوچر بھی بہترین کرنا چاہتا تھا۔ بس کچھ مجبوریوں کی آڑ میں وہ خاموش رہا۔ ورنہ اس کا دل اور ضمیر تو کہہ رہے تھے کہ وہ فوراً سوزن کی حمایت میں بول پڑے مگر مون کے خوف کا ہوّا بہت بھاری تھا۔ سوزن کو آخر مون کی باتوں میں آ کر اپنا آپ ہلکا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اگر وہ عیسیٰ کو پسند کرتی تھی تو ضروری نہیں تھا کہ اس پسندیدگی کی تشہیر کر کے اپنا آپ ہلکا کرتی۔ وہ بھی اس صورت میں جبکہ عیسیٰ کا رشتہ طے ہو چکا تھا۔ آفاق کو آج ہی عیسیٰ کی زبانی پتا چلا تھا کہ انکل پاکستان گئے ہوئے تھے۔ شاید وہ عیسیٰ کی منگیتر کو لینے گئے ہوئے تھے۔ اس صورت میں تو بالکل غیر مناسب تھا۔ سوزن کا اظہارِ محبت اسے عیسیٰ کی نگاہ میں ہلکا کر چکا تھا۔ اور یہیں سے عیسیٰ کی سوزن کے ساتھ ناراضی کی ابتدا ہوئی تھی جو بعد میں ختم بھی ہو گئی۔ شاید کچھ دنوں تک عیسیٰ کی شادی متوقع تھی کیونکہ سوزن پہ اپنی بھڑاس نکال کر وہ آفاق کو کارڈ چھپوانے کے متعلق بتا رہا تھا۔ پھر اچانک وہ جس طرح آیا تھا واپس چلا گیا مگر سوزن بیچاری بہت شرمسار ہو چکی تھی۔ اس دفعہ غصے میں عیسیٰ نے مون کو ساتھ چلنے کے لیے بھی نہیں کہا۔ آفاق کے دل میں بہت دفعہ خیال آیا کہ وہ عیسیٰ کو مون کے بارے میں بتائے پھر اس نے سوچ لیا کیا خبر عیسیٰ کو پہلے سے پتا ہو یا پھر آفاق کا بتانا اسے ناگوار گزرے۔ بہت ساری باتیں سوچ کر آفاق چپ سا کر گیا مگر وہ گروسی کے اصرار کرنے، روکنے اور ضد کرنے کے باوجود بھی ان کا گھر چھوڑ کر رینٹ پر چلا گیا حالانکہ سوزن نے اسے بہت دفعہ روکا مگر آفاق کو اپنی عزتِ نفس بہت عزیز تھی اور وہ مون کے ہاتھوں مزید

ذلیل نہیں ہوسکتا تھا۔ ویسے بھی مون کا جب بھی دل کرتا سو، سو باتیں سنا ڈالتی۔

پھر کچھ دن مزید کھسک گئے۔ اس کا کورس کامیابی کے تیسرے حصے میں پہنچ گیا تھا۔ ڈچ سیکھنے کے بعد اسے بہ آسانی کہیں بھی جاب مل سکتی تھی اگرچہ وہ پُریقین تھا کہ علی عیسیٰ اسے جوتیاں چٹخانے نہیں دے گا۔ اس کے پاس اعلیٰ تعلیمی ڈگری بھی موجود تھی...... اور عیسیٰ کا خلوص اور محبت بھی ہمراہ تھے۔ اسے یقین تھا، عیسیٰ کے دفتر میں ہی پہلے کی طرح جاب مل جاتی۔

پھر ایک دن اچانک مون، آفاق کے مکان تک آگئی۔ اس نے یہ مکان مون کے گھر سے کچھ فاصلے پر ہی دریافت کرلیا تھا، اوپری منزل میں اسے ایک کمرا بہ آسانی مل گیا تھا۔ مون اس کے پاس قریب، قریب تیس منٹ تک رکی رہی اور آفاق بہت حیران تھا۔ جانے ملکۂ عالیہ کس مقصد کے تحت آئی تھیں......؟ کیونکہ عام حالات میں مون صاحبہ کبھی کسی کو گھاس نہیں ڈالتی تھیں۔ پھر آفاق کی بھلا مون کی نگاہ میں اوقات ہی کیا تھی؟ مون کچھ وقت اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اٹھ گئی پھر اس نے جاتے، جاتے آفاق سے کہا تھا جیسے اسے اچانک یاد آیا ہو۔

''میں تم سے نشریاتی رابطہ کروں گی......'' اس نے ٹائمنگ کا حساب بتا دیا تھا۔ آفاق کچھ پل کے لیے چپ سا کر گیا۔ آخر مون کی اس مہربانی کا مقصد کیا ہے؟ وہ بذاتِ خود اس سے ملنے کے لیے آئی تھی۔ بِنا مفاد کے تو وہ کوئی قدم اٹھانے والی نہیں...... پھر اس نے آفاق کی یہ بے چینی بھی دور کردی۔ آخر بغیر مقصد کے یہ لوگ کہاں کسی کو گھاس ڈالتے تھے۔ آفاق چوکنا ہوگیا۔

''اگر تم اس مشق میں کامیاب ہوگئے تو پھر پروفیسر تمہیں، باقاعدہ تربیت دے گا۔ تم بہت جلد لوگوں کے ذہن تسخیر کرنا سیکھ جاؤ گے اور سوسائٹی میں اعلیٰ مقام پالو گے۔ اس کے ساتھ دولت بھی بہت ملے گی، تمہیں اڑتالیس گھنٹے کام کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔'' مون جیسے اسے خواب دکھا رہی تھی۔ نیلے، پیلے، ہرے، سنہرے خواب...... خواب جو دیکھنے میں بھلے لگتے ہیں مگر اُن کی حقیقت بہت بھیانک ہوتی ہے۔

''مجھے اعلیٰ مقام نہیں پانا مون......! میں جیسا ہوں، جس طرح سے ہوں بالکل ایسا ہی رہنا چاہتا ہوں۔'' آفاق نے مدھم آواز میں کہا۔ پھر مون جیسے مسکراتے ہوئے پلٹ گئی۔ گویا وہ اس کے دعوے پر مسکرا رہی تھی۔ آفاق بہت دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ وہ یہ ہرگز نہیں جانتا تھا کہ مون اور پروفیسر اس کا پہلا ٹیسٹ لینے والے تھے اور کامیابی کے بعد وہ اسے مزید اپنے لیے کام کرنے کا کہتے یا مجبور کرتے۔ وہ پُراسراریت کے دلدل میں آفاق کو ڈبو دینا چاہتے تھے۔ ٹائمنگ کے حساب سے آفاق کو پہلا سگنل ملا تھا۔

وہ آرام دہ، پُرسکون حالت میں رہ کر پانچ سیکنڈ کے لیے عامل (مون) سے ذہنی رابطہ قائم کرنے والا تھا۔ اسے عامل کا پیغام وصول کر کے اپنے پاس رکھی ڈائری میں لکھنا تھا۔

انتہائی سکون اور مطمئن انداز میں بیٹھ کر وہ اپنے ذہن میں ابھرنے والے تاثرات کا انتظار کر رہا تھا۔ قدرے مناسب وقت سے ہی لاشعور میں تاثر ابھرتا ہے اور اس کو شعور میں منتقل ہونے کے لیے بھی قدرے عرصہ درکار ہوتا ہے، اس لیے معمول کو بھی وقت درکار ہوتا ہے۔ پروفیسر کے بھیجے گئے مشاہدین پہنچ چکے تھے۔

چونکہ ٹیلی پیتھی ایک ادراک ہے جس کا تعلق انسان کی چھٹی حس سے ہوتا ہے۔ جب کسی معمول کو یہ احساس ہوتا ہے کہ انسان نے کوئی پیغام یا عکس اپنے ذہن میں وصول کیا ہے تو شروع میں اظہار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ جیسے آفاق کو مشکل لگا تھا۔ معمول

بننے کی صلاحیت ہر بندے میں پائی جاتی ہے لیکن مزاج، ذہنی ساخت اور اندازِ طبیعت کے لحاظ سے ہر بندے کی حساسیت کا پیمانہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ چونکہ بلغمی مزاج والے لوگ معمول بننے کی صلاحیت کم رکھتے ہیں۔ سوداوی مزاج والے جلد ترقی کرتے ہیں۔ آفاق سوداوی مزاج رکھتا تھا اور اپنے پہلے تجربے کی کامیابی سے ہی پروفیسر کی نگاہ کا تارہ بن چکا تھا۔ اب پروفیسر اسے اپنے وسیع نیٹ ورک کا حصہ بنانے کے لیے پورا لائحہ عمل تیار کر رہا تھا۔ اس نے مون سے کہا تھا کہ وہ آفاق کو تجربے کے لیے لائے۔ وہ آفاق جو ڈچ سیکھ کر من ہائیم کی طرف جانے والا تھا چونکہ ابتدا میں معمول کو تجربے کے دوران غنودگی کا احساس اکثر ہو جاتا ہے مگر آفاق کو ایسا نہیں ہوا تھا۔ مشاہدین اور معاون اس کے ساتھ تھے اور آفاق کی ایک، ایک حرکت کا بغور مطالعہ کر کے پروفیسر کو بتا دیتے تھے۔ آفاق ٹیلی پیتھک علم سے واقف تھا۔ یہ ایک بامقصد سائنسی علم تھا۔ اور اس علم کی بدولت یورپ میں بے شمار لوگ اپنے ملک اور قوم کی ترقی میں شانہ بشانہ کام کر رہے تھے۔ یہ بیماروں کو تندرست کرنے، بد عادتیں چھڑوانے، آنے والے خطرات سے آگاہ کرنے اور دشمنوں کی چالیں سمجھنے میں بہت معاون رہا ہے۔

مشہور و معروف ٹیلی پیتھسٹ دوناولگاس اپنی کتاب ٹیلی پیتھی کے تجربات میں اس کے فوائد اور کامیابی کے اعلیٰ ترین راز لکھتے ہیں۔

''چھٹی حس کا ادراک بہت بچپن میں ہو جاتا ہے۔ یعنی بچوں میں یہ صلاحیت زیادہ ہوتی ہے اور بچوں میں نفسی صلاحیت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔''

اس بات سے پتا چل سکتا تھا کہ مون حسیب بچپن سے ہی غیر معمولی ساخت کا دماغ رکھتی تھی۔

آفاق کو کچھ دن بعد پروفیسر کی طرف سے کچھ کتابچے ملے تھے...... یہ پروفیسر کی طرف سے دانستہ پھینکا گیا تھا جسے چگتا ہوا وہ جال میں آپھنستا۔ بہر حال اس نے کتابچوں کا مطالعہ ضرور کر لیا تھا۔ دوناولگاس نے سویڈن کے پیرا سائیکالوجی انسٹی ٹیوٹ میں بچوں پر ایک کامیاب تجربے کے بعد اس بات کا اظہار کیا تھا۔ انہوں نے چار تا پانچ سال کے بچوں کو بلا کر ان کے درمیان ٹیلی پیتھی کارڈز استعمال کیے اور ان بچوں کو ڈاکٹر کی معاون مس کیتھرا مائیکی کے ذہن کو پڑھ کر کارڈز پر بنی ہوئی شکل شناخت کرنا ہوتی تھی۔ انہوں نے پانچ کارڈز کے متعلق بتانا ہوتا تھا۔ بچوں کے جوابات کا تناسب بڑوں کی نسبت زیادہ تھا۔

انتقالِ افکار کی مشقیں جادو ٹونے کے زمرے میں شامل نہیں ہوتیں۔ ان کا ادراک البتہ ملتا جلتا ضرور ہے۔ ٹیلی پیتھی ایک ٹھوس حقیقت پر مبنی سائنسی علم ہے۔ انسان خیالات کی قوت سے انکار کر ہی نہیں سکتا۔ کئی یورپین ممالک میں مایہ ناز ٹیلی پیتھسٹ اپنے ملک و قوم کی خدمت میں اعلیٰ ترین کارنامے سر انجام دے رہے ہیں۔ وہ اس علم سے مثبت فائدے حاصل کرتے ہیں۔ یہ بات تو مستند کتابوں سے ثابت تھی مگر ضروری نہیں تھا کہ پروفیسر بھی اس انمول خزانے کا درست استعمال کرتا۔ جانے کیوں آفاق کی چھٹی حس اسے کچھ غلط اشارے دے رہی تھی۔ جیسے اسے یقین تھا۔ پروفیسر، دوناولگاس جیسا علم رکھنے کے باوجود بھی مثبت کام نہیں کرتا۔ پروفیسر کی سوچ منفی تھی اور یہی منفی سوچ وہ مون کے ذہن میں بھی قطرہ، قطرہ زہر کی طرح اتار رہا تھا۔

انہی دنوں بیدی نونگ میں اس کے کورس کا چوتھا حصہ شروع ہو چکا تھا۔ جب پروفیسر نے ایک فنکشن کے دوران ٹیلی کارڈ استعمال کر کے کئی ڈچ سیکھنے اور زبان پر عبور حاصل کرنے والے طالب علموں کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کر دیا۔ پروفیسر مجمع میں اپنے علم کی تشہیر ضرور کرتا تھا تاکہ پبلسٹی زیادہ سے زیادہ ہو اور لوگ

متاثر ہو کر اس کی طرف دوڑے چلے آئیں۔ بہرحال پروفیسر کی یہ محنتیں رائگاں نہیں جارہی تھیں۔ اسی لیے آفاق میں کچھ غیرمعمولی چیزیں محسوس کرکے پروفیسر چوکنا ہوگیا تھا۔ مستقبل قریب میں آفاق، پروفیسر کے لیے فائدہ مند ہوسکتا تھا۔ وہ آفاق کو اپنے بکھیرے جال میں مقید کرنے کی پلاننگ میں ان دنوں مصروف تھا۔ مون، ڈیزی اور ڈیانا کی طرح آفاق کو بھی اپنے بس میں کرلینا چاہتا تھا۔

ٹائمنگ کے خاص اوقات میں آفاق نے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔ اس کے لاشعور میں ایک تاثر ابھرا تھا۔ پھر یہ تاثر شعور میں منتقل ہوگیا تھا، آفاق نے آنکھ کھول کر لمحے کے آخری حصے میں ڈائری کے صفحے پر لکھ دیا۔

"میں ذی شاہ سے محبت کرتی ہوں۔ محبت اور جنگ میں سب جائز سمجھتی ہوں۔" لاشعور میں ابھرے تاثر نے شعور میں پہنچ کر تہلکہ مچادیا تھا۔ آفاق جیسے بھونچکا رہ گیا۔ یہ مون نے کیسا پیغام ترسیل کیا تھا؟ وہ جیسے ششدر رہ گیا۔ مگر زیادہ بچار اس لیے نہیں کرسکا تھا کہ وہ اپنے تئیں سمجھ رہا تھا کہ مون اس کا مشکل پیغام بھیج کر امتحان لے رہی ہے۔ تاہم اس کے ذہن میں ذی شاہ کا نام کھب کر رہ گیا تھا۔ آخر یہ ذی شاہ تھا کون؟ اور مون نے ایسا پیغام کیوں بھیجا؟ کیا واقعی اس کا امتحان لینے کے لیے۔

پھر دو چار دن آفاق کی مون سے ملاقات نہیں ہوسکی تھی۔ البتہ علی عیسیٰ اس دوران ضرور آیا تھا۔ وہ مون کو لینے آیا تھا مگر مون نے ہمیشہ کی طرح ساتھ جانے سے صاف انکار کردیا تھا۔ آفاق سمجھ سکتا تھا، مون جس رستے کی طرف نکل گئی تھی وہاں سے واپسی کے امکان کم ہی تھے۔ وہ پلٹ نہیں سکتی تھی۔ وہ مڑ نہیں سکتی تھی۔ تاہم آگے ضرور جاسکتی تھی۔

کبھی، کبھی آفاق کو بہت حیرت ہوتی تھی کہ "انکل یا عیسیٰ کو مون کی اتنی اعلیٰ پائے کی صلاحیتوں کا

پتا ہی نہیں۔ اور کیا خبر، پتا ہو مگر مون ان کی مانتی ہی نہ ہو۔ یہاں کے بچے اٹھارہ سال کی عمر کے بعد آزادانہ لائف اسٹائل گزارنا پسند کرتے ہیں اور مون تو کب کا گھر چھوڑ آئی تھی۔'' کبھی، کبھی آفاق کی اپنی ہر سوچ بلاک ہو جاتی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ظاہری حواس کے علاوہ کچھ ایسی طاقتیں انسان کو ودیعت کر رکھی ہیں جن کو ماہرینِ نفسیات مافوق الفطرت طاقتیں کہتے ہیں۔ اور یہ بہت ہی حیرت انگیز صلاحیتیں ہوتی ہیں جو مون پر کسی بڑی نعمت کی طرح سایہ فگن تھیں۔ وہ مون جو دیکھنے میں ہی کوئی ساحرہ لگتی، حسن و جمال اور ذہانت میں بے مثال...... ماہرین نے ادراکِ ماورائے حواس کو کئی طرح کی شاخوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور یہ سب کسی نہ کسی طریقے مون کے اندر پیدائشی طور پر پنپتی رہی تھیں۔ صدائے غیبی، روشن ضمیری، اشراق یا منتقلیٔ خیالات، غیب بینی یا مستقبل بینی، پس بینی و پیش بینی اس کے علاوہ نفس پیمائی۔ آفاق کو لگتا روشن ضمیری اور نفس پیمائی کو چھوڑ کر مون ہر فن میں ماہر تھی۔ دراصل وہ پُراسراریت کی ایک کتاب تھی اور آفاق نے تو اس کی ذات کا ابھی پہلا صفحہ بھی ٹھیک سے نہیں پڑھا تھا۔

انسانی جبلت کو فطرت کی بدتہذیبی سے منسوب کرتے ہیں۔ انسانی جبلت کی شوریدہ سری اُسے آدمیت کے مقام سے گرا کر کیچڑ کی پستی نما دلدل میں لا پھینکتی ہے۔ جہاں غلاظت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ سب لاشعور کی کارستانیاں ہیں جو شعور کو اپنے اختیار میں کر لیتا ہے۔ پروفیسر بشر نے سب سے پہلے کیلی فورنیا یونیورسٹی کے شعبۂ نفسیات کے پروفیسر اور مشہور ٹیلی پیتھسٹ گارڈ مرفی کے مقولے پڑھے تھے اور انہوں نے جو ٹیلی پیتھی کے تجربات کے لیے ٹیلی کارڈ کا طریقہ ایجاد کیا تھا اس کی پروفیسر نے وضاحت کی تھی۔ پھر اس نے پینتالیس کارڈ اٹھائے ان پر علیحدہ، علیحدہ علامتی تصویر یا نشان لگائے تھے۔ تاش کے پتوں کی طرح انہیں پھینٹ کر اس نے مون اور ڈیزی کو بلا لیا تھا۔ ان میں مون عامل تھی اور ڈیزی معمول۔

عامل یعنی مون ہر کارڈ اٹھا کر اس پر بنا نشان دیکھ رہی تھی جبکہ ڈیزی (معمول) اپنی ٹیلی پیتھی قوت کے ذریعے یہ اندازہ کر رہی تھی کہ کون سا کارڈ مون نے اٹھایا ہے۔

ہر کارڈ کا اندازہ ایک کاغذ پر لکھا جا رہا تھا۔ اور بعد میں پھر اس کا موازنہ کیا گیا۔ ڈیزی نے قریب، قریب تمام اندازے درست لگائے تھے۔ تالیوں کی گونج نے ڈیزی کو آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ ہزاروں لوگوں کے مجمع میں یہ ایک کامیاب تجربہ تھا۔ کئی لوگ متاثر ہو کر فوری طور پر پروفیسر کے زیرِ تربیت آ چکے تھے۔ یعنی پروفیسر کا اصل مقصد تو حل ہو ہی چکا تھا۔ آفاق کا دل جیسے بوجھل سا ہو گیا۔

پروفیسر اب مسمیریزم کے بانی ڈاکٹر فرائز کی شان میں قصیدہ پڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے علوم مخفیہ کے عظیم ماہر کیگلسٹرو کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالنی شروع کر دی تھی۔ بعد میں وہ وکٹوریہ عہد کے ایک سائنسدان کا نقطۂ نظر واضح کر رہا تھا۔

''فطرت کے سامنے عاجزی سے بیٹھنا، قانع ہونا...... جس طرف وہ لے جائے، اس کی پیروی پر قانع ہونا۔'' وہ لوگوں پر اپنے لفظوں کا سحر پھونک رہا تھا۔ پھر اس نے پروفیسر مادام کیوری کی شان میں نغمے پڑھے تھے جس نے پچ بیڈ دھات کو جسے ٹنوں کے حساب سے بیکار سمجھ کر سمندر میں پھینک دیا گیا تھا کہ اس میں خاص قسم کا مادہ نہیں تھا جس کی سائنسدانوں کو تلاش تھی۔ مادام کیوری نے اسی پر تجربہ کیا اور دنیا کی نایاب اور اہم ترین دھات ریڈیم دریافت کر لی۔ پروفیسر انسان کی چھپی قوتوں اور طاقت پر روشنی ڈال کر حاضرین کو مسحور کر رہا تھا۔ وہ انہیں بتا رہا تھا کہ ہر بندے کے اندر مخفی قوتیں پائی

جاتی ہیں۔ بس ان کی تلاش کا مرحلہ کٹھن ہوتا ہے اور وہ ان خفیہ قوتوں کی جانچ کرنے کا علم رکھتا ہے۔

پروفیسر گفتگو کے اختتام پر مشہور ہپناٹسٹ بریڈ کوخراجِ تحسین پیش کر رہا تھا۔ اور ڈاکٹر ہائیڈن ہین کے الفاظ میں ہپناٹزم کی تعریف بیان کر رہا تھا۔

''یہ یکساں نوعیت کی ایک ایسی حالت ہے جس میں خوابیدہ انسان ایک دم نارمل رہتا ہے۔ یعنی خوابیدہ حالت ہونے کے باوجود اس کے حواس قائم رہتے ہیں۔ اور اپنے عامل کی ہر تحکیشن کو سنتا ہے۔ اس حالت کو نیند بھی نہیں کہا جاتا اور بیداری بھی نہیں کہا جاتا۔ یہ ایک ایسی حالت ہے جو نیند اور بیداری کے ملاپ سے وجود میں آتی ہے۔'' پروفیسر حاضرین کو سانس روکے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس کا کلام جادو اثر تھا۔ آفاق تک جیسے ٹرانس میں چلا گیا۔ البتہ مون، ڈیزی اور ڈیانا کی کیفیات مختلف تھیں اور وہ اپنے اتالیق کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھ رہی تھیں۔ پروفیسر اب 1877ء کے ماہرین میں سے لی ابیو کے تجربات بیان کر رہا تھا۔

عہدِ قدیم میں ہندوستان، یونان، ایران اور روم کے مذہبی پیشواؤں کا طریقہ علاج بتا رہا تھا کہ وہ مریضوں کو عبادت کدوں میں سلا کر ان کا علاج کرتے تھے جس کی بدولت جب مریض نیند سے اٹھتے تو صحت یاب ہو چکے ہوتے۔ پروفیسر کی تقریر کے اختتام سے پہلے ہی آفاق اٹھ کر آ گیا۔ اس کا دل بوجھل اور طبیعت بیزار ہو چکی تھی۔ پھر کچھ دن مزید آرام سے گزر گئے۔ جب مون کی ایک اور خفیہ صلاحیت کا آفاق پر انکشاف ہوا تھا۔

وہ مون سے اس آخری تجربے کے بعد ذی شاہ کے متعلق بہت سا تجسس لے کر کچھ پوچھنے آ رہا تھا کہ جو بطخوں کے پاس حوض کے کنارے پر بیٹھی مون کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ بطخوں کے ساتھ بطخوں کی آواز نکال رہی تھی۔ آفاق جیسے دم بخود رہ گیا تھا۔

پھر آفاق کو دیکھ کر مون مسکرا دی تھی۔ وہی خوب صورت سی پُرمغرور مسکراہٹ۔

آفاق کی حیرانی کو دیکھ کر مون خوب لطف اندوز ہو رہی تھی۔ پھر اس نے آفاق کو اور بھی ششدر کرنے کے لیے مختلف جانوروں کی آوازیں نکالی تھیں حتیٰ کہ اس نے پروفیسر، میکس اور خود اپنی آواز کو کئی طریقوں سے مختلف انداز میں آفاق کی سماعتوں میں اتارا تھا۔ وہ بہترین نقال تھی اور ڈیزی، ڈیانا اور سوزن تک کی آواز کو بہت مشاقی کے ساتھ حلق سے نکال لیتی تھی۔ آفاق جیسے دم بخود رہ گیا۔ آخر یہ مون حسیب تھی کیا؟ وہ آفاق کی آواز کو بھی مردانہ پن کے ساتھ اپنے حلق سے اس خوبی سے نکالتی کہ سامنے بیٹھا اور راہ چلتا بندہ بھی ٹھٹک سکتا تھا۔

آج آفاق کو یقین آ گیا تھا...... مون حسیب کمال کی لڑکی تھی...... اور بیک وقت بے شمار ہنر اور فن میں مہارت رکھتی تھی۔ بلیوں، کتوں اور مختلف جانوروں کی آواز کے علاوہ انسانوں کی آوازوں کو مکس اپ کر دیتی۔ آفاق کو اس ساحرہ کے سامنے اپنا آپ حقیر لگ رہا تھا۔ وہ جیسے تعظیماً اور بھی نیچے ہو رہا تھا۔ مگر لمحے بھر کے لیے ٹھٹک گیا۔ ایک انسان سے متاثر ہونا تو ٹھیک تھا مگر اس کے سامنے تعظیماً جھکنا قطعاً مناسب نہیں۔ اس نے پہلی مرتبہ مون کے جادوئی علم کی تعریف کی۔

''تم بہت باکمال لڑکی ہو مون! میری تمنا اور دعا ہے کہ تم اپنے علم سے لوگوں کے لیے روشنی کی طرح کا وسیلہ بنو۔ میں ٹیلی پیتھی کو کچھ خاص نہیں سمجھتا تھا، میرے نزدیک یہ وقت کو ضائع کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میری نظروں میں اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ میں سفلی علم اور روحانیت کے متعلق صرف اتنا جانتا ہوں کہ روحیت زندگی ہے اور سفلی علم موت اور تباہی...... تم یقیناً ان دونوں سے اگرچہ کسی اور سمت نکل چکی ہو، میری دعا ہے، اللہ تمہیں کامیاب

کرے۔'' آفاق نے صدقِ دل سے کہا۔ مون بے نیازی سے مسکراتی رہی۔ جیسے آفاق کی دعا اسے چاہیے ہی نہیں۔ وہ اسے دعا دے کر وقت ضائع کر رہا ہے۔ اسے دعاؤں کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ آفاق کچھ دیر مزید بیٹھ کر اور ذی شاہ کے متعلق کچھ بھی پوچھے بغیر اٹھ کر چلا گیا تھا۔

پھر اسے عیسیٰ کی شادی کا کارڈ ملا...... تب گروسی کے گھر میں ایک ہنگامہ مچ گیا تھا۔ مون نے یقینی طور پر طوفان اٹھا رکھا تھا۔ شاید وہ سوزن کے ساتھ بہت مخلص تھی اور اس کے حق اور محبت کی خاطر لڑنا چاہتی تھی۔

مگر یہ طوفان بڑی جلدی خاموش ہو گیا۔ پھر آفاق نے یہ بھی دیکھا تھا کہ مون، عیسیٰ کے بلاوے پر اس کا ولیمہ اٹینڈ کرنے چلی گئی تھی۔ پھر سب کی فرمائش پر اس نے ویوالدی کی دھنیں بھی سنائی تھیں۔ آخر مون کے اندر یہ تبدیلی کیسے آ گئی تھی؟ ایک طرف وہ عیسیٰ کے ساتھ سوزن کی شادی کے لیے قیامت اٹھائے ہوئے تھی اور دوسری طرف ایک دم پُراسراری یہ خاموشی کوئی بھید تو لازمی اپنے اندر چھپائے ہوئے تھی جسے کم از کم آفاق نہیں جان سکتا تھا بلکہ وہ تو کچھ بھی نہیں جان پایا تھا اور عیسیٰ کو بتانے اور نہ بتانے کی کشمکش کے دوران اتنا کچھ ہو گیا جس کا عقل گمان بھی نہیں کر سکتی تھی۔

☆☆☆

مون کے لیے اپنے باپ کا یہ عمل کسی بھاری کیچڑ سے لت پت طمانچے سے کم نہیں تھا۔ پاپا نے جیسے اپنی بھتیجی کو بیاہ کر اسے اپنے بیٹے سے منسوب کر کے مون کی توہین کی تھی۔ وہ مالا کو جرمنی لے آئے تھے۔ وہ مالا جس کے باپ نے مون کو ریجیکٹ کر دیا تھا۔ یہ ذلت، یہ تضحیک اس کے لیے کم نہیں تھی۔ وہ سوچتی تو اس کے دماغ کی شریانیں پھٹنے لگتیں۔ اپنا ٹھکرایا جانا اسے کسی عذاب سے کم نہیں لگتا۔ اسے تایا کے وجود سے نفرت ہونے لگتی۔

اگر پروفیسر اسے منع نہ کرتا تو مون قیامت تک مالا کی عیسیٰ کے ساتھ شادی نہ ہونے دیتی۔ یہ تو پروفیسر کی جامع پلاننگ تھی جس کی بدولت مون اپنی توہین کا بڑی آسانی کے ساتھ بدلہ لے سکتی تھی۔ پروفیسر کے سمجھانے کا اثر تھا جو وہ کچھ عرصے کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔ وہ مالا کے ذریعے تایا کے دل کو بڑی سخت قسم کی ٹھیس پہنچانا چاہتی تھی۔ جس طرح وہ اسے ٹھکرا کر دھتکار کر گئے تھے اسی طرح وہ ان کی بیٹی کو ذلیل کر کے دھتکار دینا چاہتی تھی۔ اس کے اندر پنپنے والے منفی جذبات کو پروفیسر نے مزید ہوا دی۔ مون کے اندر پنپتی نفرت کو وہ کسی بھی طور ختم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ گویا مون کی نفرت کے پیچھے پروفیسر کے کچھ اپنے بھی مفاد تھے۔ وہ جب تک مالا سے نفرت میں مبتلا رہتی اسے پروفیسر کے سہارے کی ضرورت رہتی اور پروفیسر اس کی مدد کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا۔ تاکہ مون کو اس کا سہارا ہمیشہ کے لیے درکار رہے۔

عیسیٰ اور مالا اپنی شادی کے ایک ہفتے بعد بواریا آئے تھے۔ مون کو یقین تھا عیسیٰ اسے ضرور بواریا لے کر آئے گا۔ تب مون نے پروفیسر سے پورے تین گھنٹے میٹنگ کی۔ ان تین گھنٹوں کے درمیان مالا کی زندگی کا فیصلہ جیسے ہو گیا تھا۔ مالا کو عیسیٰ کے ساتھ نہیں رہنا تھا۔ مالا کو عیسیٰ کی زندگی سے نکال دینا تھا۔ مالا کو ذلت و رسوائیاں دے کر پاکستان بھجوانا تھا۔ مون کے لیے اپنی توہین اہم تھی، ذلت اہم تھی، ٹھکرایا جانا اہم تھا۔ بھائی کے چہرے پر پھیلی چمک، تابنا کی اور مالا کے لیے محبت بالکل غیر اہم...... عیسیٰ کو مالا کی زندگی سے اور مالا کو عیسیٰ کی زندگی سے کس طرح الگ کرنا تھا...... بیدی نونگ کی ''تجربہ گاہ'' میں جیسے فیصلہ ہو چکا تھا۔ اب عمل کرنا باقی تھا۔ پروفیسر نے مون کو صرف ایک نکتہ سمجھایا

تھا۔ اگر وہ اس نکتے کو سمجھ کے عمل کرتی تو کبھی ناکام نہیں ہوسکتی تھی۔

پروفیسر نے اسے کہا تھا کہ وہ مالا کو خوف کی چبھن دے کر چونکا دے۔ وہ اس کے اردگرد خوف کا حصار قائم کردے۔ وہ ایک ایسا جال تیار کرے جس کے ہر سوراخ پر خوف کا پہرا ہو۔ وہ مالا کو خوف کے ہتھیار سے زیر کرے۔ اس میں ناکامی ہرگز نہیں ہوگی۔ مون کے لیے پروفیسر کی ہر بات حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ اس کا اتالیق تھا اور کبھی غلط گائڈ نہیں کرسکتا تھا۔ یہ مون حسیب کا پروفیسر کی ذات پر یقین تھا اور انسان پر یقین کرنے کی وہ اپنی زندگی میں بڑی بھیانک غلطی کررہی تھی۔

اس نے پروفیسر کے ذہن کو آگے رکھ کر اپنی زندگی کے باقی معاملات طے کیے تھے۔ وہ اتنے باکمال ذہن کی مالک ہوکر غلطی پہ غلطیاں کرتی رہی تھی۔ اسے رہنما ملا تو ضرور تھا مگر اس کی رہنمائی وہ ٹھیک سے نہ کرسکا۔ پروفیسر ایک شاطر انسان تھا اور ہر چال بڑی عیاری کے ساتھ چلتا۔

فی الحال وہ مون کا ہمدرد تھا۔ اس دنیا میں مون کا سب سے بڑا ہمدرد...... جو مون کے باپ اور بھائی سے بڑھ کر ہمدردی کرسکتا تھا۔ کم از کم مون کے ذہن میں یہ سوچ پختہ ہوچکی تھی۔ وہ جو دوسروں کے ذہنوں میں ان کی مرضی کے خلاف گھس جاتی تھی۔ جو لاکھوں میل کی دوری کے باوجود اپنا پیغام کسی بھی بندے کو ارسال کردیتی تھی۔ وہ جو بنا نیند کے بندے کو ہپناٹائز کرسکتی تھی۔ پروفیسر کی عیاری، مکاری اور چالاکی کو سمجھ نہ سکی۔ کیونکہ پروفیسر اس سے بڑھ کر، اس سے زیادہ چالاک اور شاطر تھا۔ وہ مون کی ذہانت کو کیش کررہا تھا۔ وہ حسن کا نہیں بلکہ اعلیٰ ذہنوں کا سوداگر تھا۔ وہ عمدہ ترین سوچ رکھنے والے، منفرد ساخت کے دماغوں کی سوداگری کرتا تھا۔ اس نے مون حسیب کے دماغ سے بڑے فائدے حاصل کیے تھے اور اب اگر مون اس سے کچھ مدد مانگ رہی تھی تو پھر وہ بھلا کیسے انکار کرتا۔

اس کام کے لیے تو اتنی سوچ بچار کی ضرورت تھی اور نہ ہی کسی اعلیٰ ترین منصوبے کی۔ وہ چاہتے تو مالا کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک سکتے تھے۔ چاہتے تو عیسٰی کو مالا سے اس حد تک بدگمان کرتے کہ وہ مالا کا نام بھی بھول جاتا۔ وہ لوگ چاہتے تو مالا کو چھ مہینے کے بجائے شادی کے دوسرے ہفتے ہی طلاق کے پروانے کے ساتھ جہاز پر چڑھا دیتے۔ مگر مون اسے ذہنی طور پر شکستہ کرنا چاہتی تھی۔ یہ بھی پروفیسر کا ہی مشورہ تھا۔ وہ مالا کو تڑپا، تڑپا کر اور سزائیں دے، دے کر، ستانے کلسانے اور جلانے کے بعد پاکستان بھجوانا چاہتی تھی۔

اور مون حسیب اپنے شیطانی منصوبے میں بالآخر کامیاب ہوہی گئی تھی کہ ناکامی کا منہ اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے اللہ کی طرف سے عطا کردہ بہترین، اعلیٰ ترین اور خاص الخاص صلاحیتوں کا بڑا غلط قسم اور منفی اسلوب کے ساتھ استعمال شروع کردیا تھا۔ اور اللہ جب کسی کو اعلیٰ ترین، منفرد اور الگ قسم کی صلاحیت سے نوازتا ہے تو بلاشبہ اس بندے کو امتحان میں ڈالتا ہے پھر اس بندے پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ اپنی خوبی کا استعمال مثبت کرتا ہے یا منفی......؟

اور جب وہ اپنے رستے سے ہٹ کر مخلوقِ خدا کے آزار کا باعث بنتا ہے تب اللہ اس بندے سے اس کا فہم اور اس کا عروج تک چھین لیتا ہے۔ مون حسیب کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اللہ نے مون حسیب سے اس کا عروج چھین لیا اور اسے زوال کے پاتال میں گرادیا۔ وہ عمر بھر کے لیے ایک گڑھے میں گرگئی تھی۔ وہ برائی کے رستے پر چلی تو اسے کوئی اچھائی نظر نہیں آئی۔

☆☆☆

وہ ایک بھیگی سی حسین خوشگوار رات تھی۔ سفید

اور سرخ گلابوں کی مہک سے مہکیلی، البیلی، فضا میں خوشبوؤں کا میٹھا پن رچا ہوا تھا۔ گروسی کے گھر سے لے کر آبشار کے کنارے تک پھولوں سے لدے کھیت تھے۔

اس رات سے پہلے بڑا حسین دن طلوع ہوا تھا اور بڑی سُبک خرامی سے گزرا تھا۔ آج وہ سوزن کے ساتھ چرچ گئی تھی۔ وہ پادری کا وعظ سننے کے بجائے دیوار پر عیسائی ولیوں کی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ سینٹ بینے ڈکٹس کے ساتھ، سینک سکولاسٹک تھے۔ ایک دیوار پر سفید کتبوں کا کوئی شمار نہیں تھا۔ عقب میں کنواری مریم اور یسوع مسیح کی شبیہیں تھیں۔

ہزاروں سال پرانا یہ گرجا سیاحوں کی من پسند جگہ تھی۔ اس گرجے کے مینار کا نوکدار کلس جیسے سونے کی ندی میں نہلا کر لگایا گیا تھا۔

آلٹر پر ایک کیتھولک پادری مقدس عبا اور جوگوشیہ ٹوپی پہنے ڈچ زبان میں کتابِ مقدس سے کچھ پڑھ کر سنا رہے تھے۔ وہ جو کچھ پڑھ رہے تھے، مون کو سمجھ آرہا تھا مگر اسے پادری کے وعظ میں کوئی دلچسپی، کشش یا لذت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس کے جذبات سے قطع نظر سوزن بہتی آنکھوں کے ساتھ وعظ سن رہی تھی۔ وہ ایک مذہبی لڑکی تھی اور اسی مذہب کی خاطر اس نے اپنی محبت کو ٹھوکر ماردی تھی۔ مون کو کبھی، کبھی وہ بہت عجیب لگتی تھی۔ اس دنیا میں کیا سوزن جیسے لوگ بھی موجود ہیں جو مذہب کی خاطر محبت کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ مون کو سوزن کے صبر اور استقامت پر بڑی حیرت ہوتی۔ اور ایک وہ خود تھی، من میں محبت کی آگ کیا لگی اس نے زمانے کو اس آگ سے بھسم کر دینے کا عزم کر لیا۔ تو پھر کیا وہ سوزن جیسا صبر نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بے صبری تھی، جلد باز تھی اور اپنے دل کی ٹھیس پر تحمل کا مظاہرہ نہیں کر سکی تھی۔ سوزن کو روتا دیکھنا مون کے لیے کم از کم آسان نہیں تھا۔ اگرچہ بوارین لوگ بہت مذہبی تھے مگر سوزن بہت کٹر قسم کی مذہبی لڑکی تھی۔ اور اس وقت نہ جانے آخرت کے خوف سے رو رہی تھی یا پھر علی عیسٰی کو ہمیشہ کے لیے کھودینے کے غم میں آنسو بہارہی تھی۔ مون کا دل چاہا تھا کہ وہ اٹھ کر سوزن کے پاس جائے اور اسے تسلی دے تاکہ سوزن کے آنسو رک جائیں اور وہ سوزن کے ساتھ اس چرچ میں بیٹھ کر عہد کرے...... ایسا عہد جو سوزن کو علی عیسٰی سے ملادے۔ علی عیسٰی، مالا کو چھوڑ دے اور سوزن، عیسٰی کی زندگی میں شامل ہو جائے۔

وہ ابھی انہی سوچوں میں گم تھی جب اس کی نگاہ علی عیسٰی پر پڑی۔ اس کے ساتھ ایک عام سی لڑکی تھی۔ شرمائی، لجائی سی۔ مون کی مقناطیسی آنکھوں کی برقی لپک نے پہلی نگاہ میں ہی مالا کا جائزہ لے لیا تھا۔ مون کے اندر باہر آگ سی بھڑک اٹھی تھی۔ دل چاہ رہا تھا۔ سامنے بیٹھی لڑکی کو پٹرول چھڑک کر جلادے یا خود کو دریائے نیکر کے حوالے کر دے۔

کچھ ایسی نفرت اس کے اندر ٹھاٹھیں مار رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ مالا کا ہنستا مسکراتا چہرہ نوچ دے یا اسے منظر سے غائب کر دے۔ مالا، عیسٰی کے ساتھ اسے بہت بری لگ رہی تھی۔ مالا کے چہرے میں اسے ذی شاہ نظر آرہا تھا۔ ذی شاہ جو اس سے بہت دور تھا، اتنے فاصلوں پر تھا کہ مون چاہتی تو ذی شاہ کے ذہن پر تسلط جما کر اسے اپنی طرف مائل کر سکتی تھی مگر ایسی زبردستی کی محبت اسے نہیں چاہیے تھی۔

محبت کا جیسے حساب کوئی نہیں تھا اور نفرت کا بھی کوئی شمار نہیں تھا۔ نہ ذی شاہ سے محبت ختم ہو سکتی تھی نہ تایا اور مالا سے نفرت ختم ہو سکتی تھی۔ وہ جیسے بے بسی کی انتہا پر تھی۔ اسے مالا کو دیکھ کر حسد محسوس ہوتا۔ وہ اس کے بھائی کے ساتھ کیوں تھی؟ جب مون کو ذی شاہ نہیں مل سکا تھا تو پھر مالا کو علی عیسٰی کیوں مل گیا؟

ہوہن موس کے جنگلاتی میلے کو دیکھنے وہ سوزن کے اصرار پر چلی آئی تھی۔ اس نے نیلی روک پر ولیس

نلر کی موتیوں سے بھری شرٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر یاقوت اور ہیرے سے سجا کراؤن پہن کر وہ خود کو کسی ریاست کی شہزادی سمجھتی تھی۔ مون کو یقین تھا عیسیٰ بھی ضرور میلا دیکھنے آئے گا۔ وہ ہر سال یہاں آیا کرتا تھا مگر پہلے تنہا آتا تھا اور اب مالا کو ساتھ لے آیا تھا اور ایک بات تو جیسے طے تھی، وہ مالا کو علی عیسیٰ کے ساتھ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس نے جس طرح شادی والے روز مالا کو نظر انداز کر کے جتا دیا تھا کہ اس کی نگاہ میں مالا کی کوئی حیثیت نہیں۔ اسی طرح ہوہن موس کے جنگلاتی میلے کو دیکھنے آئے لوگوں کے درمیان بیٹھی مالا کو نظر انداز کر کے وہ اسے جتا چکی تھی کہ مون کے نزدیک اس کی ٹکے برابر بھی اہمیت نہیں۔ مالا کے چہرے پر بڑے رنجیدہ اور خفت آمیز تاثرات ابھرتے تھے اور دوسری طرف مون کے اندر ٹھنڈک اتر آئی تھی۔ وہ مالا کو جوتی کی نوک پر سمجھتی تھی۔

وہ اور سوزن میلا دیکھے بغیر واپس آ گئی تھیں۔ مالا کو مستقل دیکھنا کم از کم مون کے لیے محال تھا۔ رات تک وہ اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا پروگرام طے کر چکی تھی۔ اسے مالا کو کس طرح خوفزدہ کر کے چونکانا تھا؟ اور کس طرح اسے ایک خوف کے حصار میں کھینچ کر ذہنی طور پر شکستہ کرنا تھا؟

مون رات ہونے تک کا انتظار کرتی رہی تھی۔

وہ گھر کے بجائے بیدی نونگ کے ہاسٹل میں آ گئی۔ دراصل وہ سوزن کے علاوہ باقی گھر والوں کو بھی باور کروانا چاہتی تھی کہ وہ رات کو ہاسٹل میں ہی رہی ہے گھر نہیں آئی۔ جوں ہی آسمان سے اوس گر، گر کر پھولوں کی نم پتیوں کو اور بھی نمناک کرنے لگی تب مون اپنے اندازے کے تحت گروسی کے گھر چلی آئی۔ اس کے پاس گھر کی چابیاں موجود تھیں مگر وہ کبھی رات کو اتنی دیر تک گھر نہیں آتی تھی یا تو سرِ شام آجاتی اور یا پھر اگلی صبح تک آتی۔ اسی لیے گھر والے مون کی روٹین کے عادی تھے۔

جب اسے پورا یقین ہو چکا کہ گھر والے گروسی سمیت سو چکے ہوں گے تب وہ گھر کی طرف آ گئی۔ پھولوں کی البیلی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے تین میل کے فاصلے تک سے بھی مون کی برقی لہروں جیسی آنکھوں نے بالکونی میں کھڑی مالا کو دیکھ لیا تھا۔ دراصل مون نے کچھ دیر پہلے مالا کا چہرہ تصور میں رکھ کر ایک نشریاتی ہلکا سا آدھے سیکنڈ کا رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے مالا کے لاشعور تک پیغام پہنچایا تھا کہ مالا کسی طریقے سے اٹھ کر باہر آ جائے، اگرچہ ارتکاز کے اعلیٰ مقام پر پہنچنے کے باوجود بھی مون پُر یقین نہیں تھی کہ مالا باہر آ جائے گی یا اس کا لاشعور پیغام کو شعور تک پہنچا دے گا۔ اس کے باجود مالا بالکونی میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ کیا خبر اس کے لاشعور میں ہلکی سی ہلچل مچی ہو اور لاشعور نے شعور تک پیغام منتقل کر دیا ہو۔ اور کیا پتا، وہ تنہائی کے خیال سے گھبرا کر بالکونی کی طرف آ گئی ہو؟ کچھ بھی تو متوقع تھا تاہم مون کا کام تو ہو چکا تھا۔ اسی لیے وہ زیادہ بچار میں پڑنا نہیں چاہتی تھی۔

گھر کے اندر داخل ہو کر اس نے گلیارے میں موجود الماری سے گھر کے اندرونی لاکڈ دروازوں کی چابیاں نکال لی تھیں۔ بھلا عیسیٰ کے کمرے کا دروازہ کھولنا اس کے لیے کیا مشکل تھا؟ اگرچہ وہ ایک غیر اخلاقی حرکت کر رہی تھی مگر اسے ذرا بھی اس حرکت پر شرمساری یا شرمندگی نہیں تھی۔

عیسیٰ دن بھر کا تھکا یقیناً سو چکا تھا۔ مالا بالکونی میں تھی اور یہ بڑا ہی سنہری موقع تھا مالا کو چونکانے اور ڈرانے کا۔ اس نے بڑی مہارت کے ساتھ لاک کھول لیا تھا۔ اب وہ دبیز قالین پر بلی جیسی چال کے ساتھ چلتی بالکونی تک پہنچ گئی تھی۔ پھر اس نے پروفیسر کی ہدایت کے عین مطابق مالا کے دماغ پر اچانک غیر متوقع حملہ کیا تھا۔ مالا اس وقت نارمل کیفیت میں اپنی سوچوں میں گم تھی۔ اس کیفیت میں بندے کو جلد خوفزدہ کر لیا جاتا ہے۔ پروفیسر کا ہدایت

نامہ اس کے ساتھ تھا اور وہ لمحے کے آخری حصے میں مالا کو اچانک خوفزدہ کرچکی تھی۔ مالا کو خوفزدہ ہی ہونا تھا۔ وہ اس وقت تنہا تھی اور کسی بھی انسان کی توقع نہیں کررہی تھی پھر دروازہ بھی لاکڈ تھا۔ اب مالا کا دماغ بھلا اتنی سی مدت میں کیا، کیا سوچتا؟ مون کہاں سے آئی؟ مون گھر میں نہیں تھی۔ مون نے دروازہ کیسے کھولا؟ مون اس کے پیچھے کیسے آ گئی؟ نفسیاتی دباؤ میں آکر وہ ایک دم رو نکھی ہوچکی تھی۔ حیران، ششدر اور خوفزدہ...... پھر اسی ذہنی خلجان، خوف، گھٹن اور اچانک لگنے والے ہتھوڑے کے دوران ہی مون نے اس پر ایک اور حملہ کردیا تھا۔

''تم بہت جلد علی عیسیٰ کی زندگی سے جانے والی ہو اور میرا بھائی عنقریب تمہیں طلاق دے دے گا۔ یہ مت بھولنا، مون کے کہے الفاظ کبھی غلط نہیں ہوتے۔'' یہ اچانک لگنے والا الیکٹرک شاک تابوت میں لگی آخری کیل جتنا کام کرچکا تھا۔ وہ سامنے کھڑی لڑکی کے حواس معطل کرکے اسے دم بخود کرچکی تھی۔ اس کی قوتِ ذہنی بہت مضبوط نہیں تھی اور یقینی طور پر اس کے دماغ اندر دوران خون اعتدال قائم نہیں کرسکا تھا۔ جس کی وجہ سے مالا کے قوائے ذہنی بھی درست نہیں رہے تھے۔ دورانِ خون کی کمی یا زیادتی کی وجہ سے حواس معطل ہوجاتے ہیں۔ اور مون کو یقین تھا اس کا دورانِ خون کم ہوگیا ہے۔ وہ چکرا کر گرا سکتی ہے، بے ہوش ہوسکتی ہے یا پھر ہذیان بک سکتی ہے؟ تینوں کیفیات میں مون کے لیے رسک تھا۔ اور وہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی۔

پھر اس نے لمحے کے آخری حصے میں جانچ لیا تھا۔ مالا ایک کمزور اعصاب کی لڑکی ہے۔ وہ اسے ہپنا ٹائز کرتی تو یقیناً مالا پہلی مشق میں ہی ہپنا ٹائز ہوجاتی...... مگر مون نے اس معاملے پر ابھی غور کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ ابھی بہت سے دوسرے کام باقی تھے جو زیادہ توجہ کے قابل تھے۔

مالا کو پہلی مرتبہ تو اس نے چونکا کر خوفزدہ کردیا تھا۔ اب اسے تھوڑا خدشہ لاحق تھا کہ مالا، عیسیٰ سے ذکر نہ کردے...... اگرچہ یہ خیال باطل تھا۔ وہ مالا کو پہلی نظر میں پرکھ چکی تھی کہ وہ ایک کمزور، دبو اور سیدھی سادی لڑکی ہے۔ وہ علی عیسیٰ کو ورغلا نہیں سکتی پھر مون نے اس پر اپنی ہیبت طاری کردی۔ وہ جان چکی تھی کہ مالا اب اس ہیبت کے اثر سے کبھی نہیں نکل سکتی۔ وہ مالا کی طرف دیکھتی نہیں تھی، عموماً وہ کسی کی طرف دیکھ کر بات نہیں کرتی تھی۔ یہ اس کی فطری عادت تھی اور مالا شاید سمجھتی تھی کہ مون اسے جان بوجھ کر اگنور کرتی ہے۔ یہ بات کسی حد تک ٹھیک بھی تھی۔ وہ مالا کو احساسِ کمتری کا شکار کرنا چاہتی تھی۔ اور مون حسیب نے حقیقتاً مالا کو احساسِ کمتری میں مبتلا کردیا تھا۔ وہ جس کام کی طرف توجہ کرلیتی تھی۔ اسے کبھی ادھورا نہیں چھوڑتی تھی۔

پھر مون نے کچھ گھنٹوں بعد مالا پہ دوسرا وار کیا تھا۔ مالا کو خوفزدہ کرنا جیسے اس کا دلچسپ مشغلہ بن رہا تھا۔ وہ اسے خوفزدہ کرکے لطف حاصل کرتی تھی۔ اسے اندازہ ہوا کہ مالا اب اپنے کمرے میں اکیلی ہے۔ سوزن کے سرسری سے بتانے پر کہ ''مالا سو رہی ہے اور عیسیٰ گروسی کے پاس گیا ہے۔'' مون جیسے الرٹ ہوگئی تھی۔ مالا اکیلی تھی تو پھر یہ دوسرا سنہری موقع میسر آگیا تھا۔ اس نے شمع بینی کی مشق کے ساتھ حصار کھینچنے کے لیے اپنے سارے وجود کے گرد شہادت کی انگلی سے گول دائرہ بنایا تھا اور پھر اپنے چاروں طرف کنکریاں رکھ لی تھیں۔ اب دماغی قوت کا حصار کھنچ چکا تھا۔ اب مون کی اجازت کے بغیر کوئی شے اس دائرے میں نہیں داخل ہوسکتی تھی۔ دراصل یہ مشق، القا اور کشف و الہام کے لیے ہوتی ہے۔ ٹیلی پیتھی میں الہامی کیفیت کی خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔ الہام یعنی inspiration فوق البشر قوتوں کی تسخیر کے لیے بھی یہی وہ طریقہ ہے

جس میں صبر و استقامت کے ساتھ تمام حالات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اس نے سب سے پہلے مالا کی تصویر کو اپنے سامنے رکھا تھا پھر اس نے اپنی پوری قوت مالا کی تصویر میں بھر دی تھی یعنی پورے ارتکاز کے ساتھ تصویر کو دیکھ رہی تھی۔

پھر ایک دم مون کو محسوس ہونے لگا تھا کہ مالا کی تصویر اس کے پورے ذہن پہ چھا چکی ہے۔ اور تصویر اس کے اندر سرائیت کر گئی تھی۔ تصویر کا ایک، ایک نقش مون کے ذہن میں پھیل گیا تھا پھر مون کو محسوس ہوا تھا کہ اس تصویر میں وہ پوری طرح محو ہو چکی ہے اگر دوسری طرف کوئی معمول بیٹھا ہو تو مون اس تصویر کو پردۂ ذہن پر منعکس کر دیتی اور معمول کے ذہن پر اس تصویر کی چھاپ پڑ جاتی جیسے سینما میں پروجیکٹر تصویر کو اسکرین پر منعکس کر دیتا ہے مگر دوسری طرف کوئی معمول نہیں بیٹھا تھا۔ وہ صرف مالا کو گھبراہٹ میں مبتلا کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسے تنہا کمرے میں خوفزدہ کرنا چاہتی تھی۔ اور مالا یقیناً دوسری طرف خوفزدہ ہو رہی تھی۔ اس کے لاشعور سے مون کا لاشعور ٹکرا گیا تھا۔

مالا نے پہلے اپنے دماغ پر بوجھ محسوس کیا تھا، جیسے چکی کے پاٹ یا کوئی بھاری وزن...... پھر اس کی آنکھوں میں چبھن ہونے لگی تھی۔ یہ چبھن جنگلی پھولوں کے کانٹوں سے مشابہ تھی۔ اسے بے انتہا تکلیف ہوئی تھی۔ مالا کو لگ رہا تھا، اس کے دماغ یعنی اوپر والے حصے میں کوئی چپکے سے گھس آیا ہے۔ اسے لگ رہا تھا کہ دو عجیب ترین آنکھیں اس کے دماغ میں گھس گئی ہیں۔ وہ ان آنکھوں کو اپنے دماغ سے نکالنا چاہتی تھی مگر مالا کی یہ کوشش بیکار تھی۔ اس پر نیند طاری ہو رہی تھی۔ اگرچہ وہ کمرے میں سونے کے لیے آئی تھی۔ اسے نیند نہ بھی آتی تب بھی وہ علی عیسیٰ کا حکم کیسے ٹال سکتی تھی۔ پھر مالا کو جیسے کوئی سجیشن ملی تھی وہ اٹھ کر سلیپر پہننے لگی تھی پھر دروازے تک

حالتِ نیند میں اٹھ کر چلی آئی۔ شاید اس کا دوپٹا پیروں میں الجھا تھا۔ وہ لہرا کر زمین پر گر پڑی تھی اور جیسے نیند ٹوٹ سی گئی۔ اس کے ذہن کو بڑے زور کا جھٹکا لگا تھا۔ اور جیسے دو عجیب ترین آنکھیں اس کے دماغ سے ایک دم نکل گئیں۔ وہ کارپٹ پر گری تھی اور عجیب حیرت کے عالم میں سوچ رہی تھی۔

''میں تو بیڈ پر سوئی تھی۔ پھر نیچے کیسے گری؟''

اسے اپنے اس سوال کا جواب کبھی نہیں مل سکا تھا۔ کیونکہ جواب تو مون حسیب کے پاس تھا۔ وہ ہر دفعہ بڑا کامیاب عمل کرتی اور ہر دفعہ مالا کو پہلے سے بڑھ کر خوفزدہ کر دیتی۔ پھر اپنے تئیں مالا نیند پوری کر کے جب نیچے آئی تو علی عیسیٰ نے اسے بہت ڈانٹا تھا۔ ظاہر ہے، وہ دو تین گھنٹے کے بجائے دو تین منٹ نیند لے کر جو آ گئی تھی۔ مالا اگلے کئی دنوں تک اسی عجیب و غریب نیند کے حصار میں رہی۔

مون کے لیے یہ عمل بہت کامیاب رہا تھا کیونکہ وہ مالا کو پھر سے خوفزدہ کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور نہ صرف خوفزدہ کیا تھا بلکہ عیسیٰ کو غصہ بھی دلا دیا جو مالا اس کی بات مانے بغیر یعنی سوئے بغیر نیچے آ گئی تھی۔ یعنی ایک ہی تیر سے کئی شکار ہو چکے تھے۔ ان دنوں عیسیٰ چونکہ سوزن کے ساتھ خفا، خفا تھا اسی لیے مون کو عیسیٰ پر کچھ اور غصہ آ گیا تھا۔ عیسیٰ کے غصے کی وجہ وہی سوزن کا ہپناٹزم کی نیند میں اظہارِ محبت کرنا تھا۔ یعنی اسے سوزن جیسی لڑکی سے اس قسم کی بے باکی اور بے شرمی کی امید نہیں تھی۔ اب وہ یہ تو جانتا نہیں تھا کہ اس سب کارروائی کے پیچھے آخر ہاتھ کس کا ہے؟

پھر مون کو آج کل سوزن پہ بھی بہت غصہ تھا جو وہ سوزن کے لیے اتنی کوششیں کر رہی تھی ان کوششوں کی جیسے سوزن کی نظر میں کوئی وقعت ہی نہیں تھی بلکہ وہ عیسیٰ کی بیوی کے قصیدے پڑھتی تھی۔ اس کے لیے این فاخ یو پے جیسے الفاظ بولتی اسے

معصوم، سادہ گڑیا نما لڑکی لگتی تھی جو سادگی اور معصومیت کا مرقع تھی۔

مون کو سمجھ نہیں آتا تھا کہ سوزن کو کیسے مالا سے بدظن کرے اور مالا، سوزن کے درمیان بدگمانی کی دیوار بنا دے۔ ان دونوں کے بڑھتے التفات مون کو ذہنی خلجان میں مبتلا کر رہے تھے اور وہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے دور رکھنے کی خواہش رکھتی تھی اور اب مسلسل کوشاں تھی۔

مالا اور عیسیٰ بواریا سے واپس جانے والے تھے اور مون چاہتی تھی کسی نہ کسی طریقے سے مالا رک جائے۔ وہ ابھی اس پر اپنا مزید تسلط جمانا چاہتی تھی۔ اس کے لیے قدرت نے اسے ایک اور موقع فراہم کر دیا تھا۔ عیسیٰ کی فرم کے ورکرز کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ وہ اچانک من ہائیم جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ مالا کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر بھلا ہو طوفانی بارش کا موسم اتنا بگڑا کہ گروبی اور سوزن نے مالا کو روک لیا تھا البتہ علی عیسیٰ رک نہیں سکتا تھا۔ وہ واپس جا رہا تھا جبکہ مالا اس کے ساتھ ہی جانا چاہتی تھی۔ مون اس وقت گھر میں اچانک داخل ہو کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔ پھر اُدھر سے اٹھ کر سٹنگ روم میں چھپ کر بیٹھ گئی۔ وہ مالا کا ردِعمل دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی گھبراہٹ مون کو لطف اندوز کر رہی تھی۔ مالا کو پریشان حال دیکھنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

مالا جو عجلت میں واپس جاتے ہوئے عیسیٰ کے ساتھ جانا چاہتی تھی مگر اپنی زبان سے کچھ کہہ ہی نہیں پائی۔ وہ کہہ ہی نہیں سکتی تھی۔ مون کی عجیب تر آنکھیں اس کے لاشعور میں اچانک گھس گئی تھیں۔ وہ مالا کے لاشعور میں پیغام رسانی کے ذریعے اسے رک جانے کا سگنل دے رہی تھی اور عیسیٰ کو روکنے کی طرف اس کی توجہ تو تھی ہی مگر جرأت سلب ہو چکی تھی۔ یعنی مالا چاہ کر بھی عیسیٰ کو روک نہیں پائی تھی کیونکہ مون ایسا نہیں چاہتی تھی۔ دھیرے، دھیرے ہی سہی مون اپنا تسلط مالا کے ذہن پر قائم کر ہی چکی تھی۔ مالا جیسے بے بس ہو گئی تھی جیسے اسے اپنی مرضی کے ساتھ کسی نے روک لیا تھا یہ کوئی آخر تھا کون؟ اس طرف کسی کا دھیان نہیں گیا کیونکہ مالا اپنے ساتھ ہونے والے ان انہونے واقعات کا ذکر علی عیسیٰ سے بھی نہیں کرتی تھی۔ صرف اس خوف کی وجہ سے کہ عیسیٰ کہیں اس سے بدگمان نہ ہو جائے۔

حالانکہ مالا کو لگا تھا جیسے پھر سے کوئی دو آنکھیں اس کے دماغ میں گھس گئی تھیں مگر وہ یہ بات کسی سے شیئر نہیں کر سکتی تھی۔ قوی گمان تھا کہ کوئی بھی اس کی بات پر یقین نہیں کرے گا۔ اور اکثریت اسے نفسیاتی مریض سمجھ کر جھٹک دیں گے پھر مالا کو سب کی نگاہ میں گرنے کی آخر کیا ضرورت تھی؟ یہ لوگ اسے ذہنی بیمار سمجھتے تو وہ کبھی برداشت نہیں کر پاتی۔ اس کے ساتھ یہ انہونے واقعات بواریا میں قیام کے دنوں میں پیش آئے تھے۔ یعنی شروعات بواریا سے ہوئی تھی۔ مالا بہت خوفزدہ ہو چکی تھی اور اپنے خوف کو سب سے چھپا بھی رہی تھی۔ یہ مون کی کامیابی کا دوسرا زینہ تھا۔ وہ مالا کو ذہنی طور پر شکستہ کر دینا چاہتی تھی یوں کہ علی عیسیٰ خود بخود اسے چھوڑ دیتا۔ اور یقیناً وہ خوشگوار وقت دور نہیں تھا۔

پروفیسر کی ساری ہمدردیاں مون کے ساتھ تھیں۔ وہ اسے نت نئے مشورے دیتا۔ اس کی حوصلہ افزائی کرتا اور اس کی ہمت کو مسلسل سراہتا۔ جیسا کہ مون اپنا انتقام یا بدلہ لے کر بڑا عظیم، نیکی کا کارنامہ سرانجام دینے والی تھی۔ وہ اسے سوئفٹ کے مقولے پڑھ کر سناتا تھا۔

''وہ آدمی عظیم ہے جو اپنا کام چلانے کے لیے دوسروں کے دماغوں سے استفادہ حاصل کرتا ہے۔''
یقیناً سوئفٹ نے یہ بات کسی اور ضمن میں کہی تھی مگر پروفیسر اس مقولے کے معنی اپنے لفظوں میں لے لیتا

تھا۔ وہ مون کے انتقام کو اور بھی ہوا دیتا۔ کہتے ہیں ناں کہ انتقام کے طریقوں پر غور کرنے والے کے زخم کبھی نہیں بھرتے۔ ہمیشہ ہرے رہتے ہیں۔ سو مون کے ساتھ بھی یہی معاملہ چل رہا تھا۔ وہ ہر وقت انتقامی کارروائیوں کے متعلق سوچتی رہتی۔ سو اس کے زخم عموماً کھلے رہتے تھے پھر پروفیسر اسے کچھ بھی بھولنے نہیں دیتا۔ وہ اسے اکثر بڑی ہمدردی کے ساتھ جتاتا تھا۔

''تمہارا تایا بہت خبیث آدمی ہے۔ اپنی پینڈو بیٹی کو راج کرنے کے لیے اِدھر چھوڑ گیا اور تمہیں اپنے بیٹے کے لیے دھتکار گیا۔ بہت عیار اور چالاک شخص جس نے اپنا مفاد سامنے رکھا۔ بیٹی کا فیوچر سنوار گیا۔ بیٹے کے لیے کوئی مشرقی دبوسی ان پڑھ لڑکی لائے گا۔ تم جیسی قابل اور حسین لڑکی کو ٹھکرا کر ہمیشہ پچھتائے گا۔'' پروفیسر کی ہمدردی اسے لہو، لہو کردیتی۔ وہ بے انتہا اذیت سے تڑپتی رہتی۔ جی چاہتا ہر چیز کو آگ لگادے۔ نفرت کا زہر ابل پڑتا تھا، غیظ اس کے دماغ کو چڑھنے لگتا۔ مون کا دل چاہتا تھا کہ وہ ہر چیز کو تہس نہس کردے۔ اگر اس کا دل ویران تھا تو لوگ کیوں خوش ہیں اگر اس کی آنکھ میں خوشی نہیں تو لوگ خواب کیوں دیکھتے ہیں۔ اس کا دل اجڑا تھا تو دوسروں کے دل آباد کیوں تھے؟

پروفیسر چاہتا تھا کہ بہت سلیقے کے ساتھ علی عیسیٰ کو مالا سے بدظن کردیا جائے۔ اور اس کے لیے وہی گھٹیا اور ٹیپیکل طریقے کا استعمال کرنا ضروری تھا۔ مون اس حد تک دل فگار اور زخم خوردہ تھی کہ عیسیٰ کو مالا سے دور کرنے کے لیے کچھ بھی کرسکتی تھی۔ اور مالا کے دل میں کانٹے چبھو کر اپنے من کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کچھ بھی کرسکتی تھی۔ پھر کچھ ہی دن بعد اسے دوبارہ مالا کے روبرو ہونے کا موقع مل گیا تھا۔ اس نے مژدۂ جاں فزا پروفیسر کو بھی سنا دیا تھا۔ ویسے بھی پروفیسر کو ہر بات بتانا وہ اپنا فرضِ اولین سمجھتی تھی۔ اور پروفیسر کا میلان بھی مون کی طرف زیادہ تھا۔ حالانکہ ڈیزی اس پر جان دیتی تھی مگر پروفیسر کے دل میں اس کے لیے اصل میں کیا تھا؟ یہ کوئی بھی نہیں جان سکا۔

ایک دن پاپا کی اچانک کال آئی تھی۔ وہ اپنے لہجے کی کھنک سے بہت خوش لگ رہے تھے۔ گویا من پسند بہو پا کر بہت خوش تھے۔ مون کے اندر باہر جھکڑ چلنے لگے۔ نفرت کا ایک طوفان اسے اڑانے کے لیے آرہا تھا۔ وہ غیظ کے عالم میں بہ مشکل خود پر قابو پاسکی تھی کہ اسے موقع کی مناسبت سے سنبھلنا آتا تھا۔ پاپا کی کھنکتی آواز اسے اپنے نقصان یاد دلارہی تھی۔ کیا تھا جو اگر تایا اسے دھتکار کر نہ جاتے۔ آخر اس میں برائی ہی کیا تھی؟ مون شاید اس ہتک آمیز حصار سے نکل ہی آتی مگر پروفیسر بھی اسے ذہنی طور پر پُرسکون ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

فی الوقت مون پاپا کی کال سن رہی تھی۔ وہ اسے بتارہے تھے کہ آج عیسیٰ کی سالگرہ ہے۔ اور ان کی لاڈلی مالا، علی عیسیٰ کو سرپرائز دینا چاہتی ہے۔ انہوں نے چپکے، چپکے تیاری بھی کررکھی ہے اور یہ کہ مون بھی ان کی خوشی میں شریک ہوجائے۔ مون تو قیامت تک ان کی خوشی میں شریک نہیں ہوتی مگر پروفیسر کے مجبور کرنے پر اسے جانا ہی پڑا مگر اس سے پہلے مون نے اپنی فطری صلاحیتوں کا ناجائز استعمال کرکے سب سے پہلے مالا کا سرپرائز تباہ کرنا چاہا تھا۔ اس نے نشریاتی رابطہ قائم کرکے تین سیکنڈ کے دوران علی عیسیٰ کے لاشعور میں ایک خیال دھکیلا تھا جو اس کے لاشعور سے کھسک کر شعور میں آگیا۔

''آج تو میری سالگرہ ہے۔'' معاً عیسیٰ کو جیسے خیال سا آیا تھا۔ یہ خیال تو آنا ہی تھا۔ وہ دنیا کی سب سے غیر معمولی حد تک ٹیلی پیتھسٹ مون کے اثر میں آیا تھا۔ وہ لڑکی جو بغیر تربیت یافتہ (معمول) کے پھر بھی اپنا پیغام تین سیکنڈ کے اندر، اندر مقابل

تک یا اپنے سے بہت دور بندے تک پہنچا دیتی تھی۔

یہ کائنات جب سے وجود میں آئی ہے اور انسان نے شعور کی آنکھ سے اسے دیکھا ہے تب سے ہی انسانی آنکھ کے سامنے دو تصور ہیں۔ ایک نیکی کا اور دوسرا بدی کا...... اور انسان کو ان دو رستوں میں صرف ایک کو منتخب کرنا ہوتا ہے۔ انسان ہونے کے ناتے ہر فرد کی تمنا ہوتی ہے کہ وہ نیکی کے رستے سے اپنی منزل کا سفر طے کرے لیکن اس کے ہمراہ خیر اور شر کی صلاحیت بھی ہوتی ہے۔ یہ انسان کی اپنی طاقت پہ منحصر ہے کہ وہ کس منزل کا تعین کرتا ہے۔ وہ خیر کی طرف آتا ہے یا شر کی طرف جاتا ہے۔ گر نیکی کی راہ پہ چلے گا تو فرشتے اس کے رستوں پر ستاروں کے پھول بکھیر دیں گے اگر برائی کی طرف جائے گا تو شیطان اس پر مسلط کر دیا جائے گا۔ جس کی بدولت ذلت، رسوائیاں اور تنہائیاں ملتی ہیں۔ اس میں زیادہ دخل کسی رہنما یا ارد گرد کے لوگ، ماحول اور صحبت کا بھی ہوسکتا ہے۔ مون حسیب دو رستوں کے درمیان کھڑی تھی۔ نیکی اسے اپنی طرف بلاتی تھی اور برائی دامن نہیں چھوڑتی تھی۔ انتقام، غصہ، ضد اور اپنی برتری کا احساس اسے منزل سے دور لے جا رہا تھا مگر وہ اتنی ناسمجھ تھی کہ نادانیوں پر نادانیاں کرتی رہی مگر پھر بھی سمجھ نہ پائی۔ یہاں تک کہ اسے عظیم ٹھوکر نے ایک اندھی کھائی میں جا گرایا۔

برائی کرتے ہوئے انسان کو کچھ سمجھ نہیں آتی۔ مون کو بھی نہیں آئی تھی۔ اپنے تئیں وہ عیسیٰ کو نشریاتی رابطے کے ذریعے سالگرہ کا بتا کر مالا کے سرپرائز کو چوپٹ کرنا چاہتی تھی۔ یعنی مالا کو یہ معمولی سی خوشی بھی نہ ملتی پھر اس نے بڑے اطمینان سے ایک نقلی نگینوں کا بریسلیٹ خریدا تھا۔ ایک سلپ پہ چھوٹی سی تحریر لکھی۔

''پیاری میڈیشن مالا! تمہارے لیے حقیر گفٹ، تم بوار یا آئی اور چلی گئیں مگر تمہاری یادیں مٹ نہ پائیں گی۔'' سلپ کے نیچے اس نے کسی کا بھی نام نہیں لکھا تھا۔ وہ بس عیسیٰ کو اب چونکانا چاہتی تھی کہ اس کی بیوی کو جرمنی آنے کے فوراً بعد ہی اجنبی لوگوں سے گفٹ موصول ہوتے ہیں۔ اس کا مقصد... فی الحال عیسیٰ کو چونکانا تھا۔ وہ آگے بھی اسے چونکا کر ڈبل مائنڈڈ کرنا چاہتی تھی۔ اتنا تو مون کو پتا تھا کہ وہ جلد بدگمان ہونے والا نہیں ہے۔ پتھر پہ قطرہ، قطرہ پانی گرے گا تبھی سوراخ ہونے کے امکان تھے اور وہ ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھی۔ ایک مرتبہ عیسیٰ، مالا کو غلط سمجھ کر اس سے بدظن ہو جاتا تو آگے کے معاملات سے نمٹنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ اسے تو بس مالا کو رسوا کر کے پاکستان بھجوانے کی جلدی تھی تاکہ تایا اپنی عزت مآب، حیادار بیٹی کے کرتوت دیکھ کر شرم سے مٹ جاتا۔ کتنا عجیب سا انتقام تھا اس لڑکی کا۔ اتنی معمولی سی بات پر اس نے کئی لوگوں کی زندگیوں میں آگ لگا دی تھی۔ حالانکہ آگ تو اس کے اندر محبت کی لگی تھی جس نے دل کو گلزار بنانے کے بجائے آتش کدہ اور نار، نار بنا دیا تھا۔ ایسی محبت کا کیا فائدہ......؟ وہ مالا کی خوشی تو تباہ کر چکی تھی۔ آج سے پہلے عیسیٰ کو کب اپنی سالگرہ یاد رہی تھی مگر مون کی بدولت یہ کام بہ آسانی ہو گیا تھا۔ اگرچہ مون نے دیکھا تھا کہ مالا کا سرپرائز خراب ہوتا دیکھ کر پاپا رنجیدہ ہو گئے تھے اور یقینی طور پر اس کی کارستانی کو سمجھ گئے تھے۔ وہ بیدی نونگ سے منسلک تھی۔ یہ بات پاپا جانتے تھے مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ مون اعلیٰ پائے کی ٹیلی پیتھسٹ بھی بن چکی ہے۔ اگرچہ انہوں نے مون کی ان خفیہ تخریب کاریوں کے متعلق سن رکھا تھا مگر عیسیٰ اور وہ خود بھی ہرگز اس بات پر یقین نہیں کرتے تھے اور ان کے یقین نہ کرنے کی وجہ سے اتنا بڑا نقصان ہوا کہ پھر اس کی تلافی ممکن ہی نہیں ہوسکی۔

یقیناً پاپا یہی سمجھتے رہے تھے کہ مون نے عیسیٰ کو فون کر کے اطلاع دی ہے مگر عیسیٰ نے ان کی غلط فہمی

دور کردی تھی۔ اس کے ذہن میں تو بس خیال سا آیا تھا۔ مون نے کوئی کال نہیں کی تھی مگر اس کا ذہن اتنا طاقت ور تھا کہ وہ بِنا کال کیے بھی کچھ کام بڑے طریقے سے سرانجام دے لیتی تھی۔ اگرچہ سارا زمانہ ہی مون کی اس قسم سے متعلق صلاحیتوں کا معترف تھا۔ بس عیسیٰ اور پاپا ہی نہیں مانتے تھے۔ وہ مانتے بھی کیسے؟ انہیں تو سرے سے یقین ہی نہیں آتا تھا۔ یہ ممکن ہی کیسے تھا؟ مون اتنی کم تعلیم یافتہ ہو کر کیسے؟ بھلا اس کا ذہن اتنا غیر معمولی کیسے تھا؟

وقتی طور پر عیسیٰ کو بہت غصہ آیا تھا۔ جیسے مون کا تجربہ اسے غیظ و غضب میں مبتلا کر گیا تھا۔ جیسے وہ مون کے تجربے پر کچھ شاکڈ اور کچھ حیران ہو گیا تھا پھر جیسے اسے خیال آیا۔ ضروری تو نہیں تھا، یہ مون کی کوئی کارستانی ہو؟ یہ بھلا ممکن ہی کہاں ہے؟ ایک بندہ کسی کے ذہن میں کیسے گھس سکتا ہے؟ سننے والے اور کہنے والے غلط کہتے ہیں۔ مون میں ایسی اعلیٰ پائے کی صلاحیت ہے ہی نہیں۔ ایک ٹیلی پیتھسٹ ہونا کوئی عام بات تو نہیں ہے۔ مون نے محض اپنی شہرت کے لیے یہ شوشا چھوڑ رکھا ہوگا۔ ایسی ہی دلیلوں سے عیسیٰ نے خود کو مطمئن کر رکھا تھا۔ وہ تو آخری سانس تک بھی مون کو ادراکِ ماورائے حواس کی اقسام میں ماہر نہیں مان سکتا تھا۔ اس کے نزدیک مون نے انفرادیت حاصل کرنے کے لیے بکواس کر رکھی تھی۔ اس کے اندر کوئی بھی موج برقناطیسی electromagnetic wave جیسی کوئی قوت نہیں تھی۔ آسٹرل پروجیکشن اور عکسی رابطہ، انتقالِ افکار، ماہئیت افکار یہ سب مون کے اندر کیسے آسکتا تھا؟ عیسیٰ کی سوچ یہاں آکر بلاک ہو جاتی تھی۔

دوسری طرف مون مزید تخریب کاریوں کے متعلق سوچ رہی تھی۔ وہ بے نام تحفہ عیسیٰ اور مالا کی آنکھوں کے سامنے سوالیہ نشان تو چھوڑ چکا تھا۔ اب آگے کیا کرنا تھا؟ مون اگلا لائحہ عمل تیار کر رہی تھی۔

مگر اس کے ساتھ مون کو خدشہ لاحق تھا کہ مالا، سوزن یا آفاق میں سے کسی کو فون کر کے پوچھ نہ لے۔ کیونکہ آج تک اس کی سوزن سے خوب بنتی تھی اور آفاق بھی عیسیٰ کے بہت قریب تھا۔ وہ عیسیٰ کو مالا سے بدظن کرنے کے لیے آفاق کو بیچ میں لانا چاہتی تھی۔ اب کہانی کو کچھ اس سلیقے سے ترتیب دینا تھا کہ مالا اور آفاق کی قربت بہت حد تک اجاگر ہو۔ کوئی ایسا سیٹ ترتیب دیا جائے جس میں آفاق اور مالا ہی ہر سین میں نظر آئیں۔ کہانی میں رنگ تو مون نے ہی بھرنے تھے مگر اس کے لیے بہت ذہانت سے کام لینا تھا۔

سوئے اتفاق جس روز وہ سوزن کو گفٹ کے متعلق ماہرانہ انداز میں بریفنگ دینے آرہی تھی۔ اسی روز کی یہ بات ہے۔ وہ اپنے مخصوص بوئے گل والے لبادے میں لپٹی شانِ بے نیازی کے ساتھ گروسی کے گھر کا داخلی دروازہ پار کر رہی تھی۔ جب اندر سے آتی آواز سن کر لمحے بھر میں ٹھٹک گئی تھی۔ اس کی چھٹی حس نے مخصوص الارم بجایا تھا۔ جیسے کچھ ہونے والا تھا؟ کیا ہونے والا تھا؟ وہ لمحے کے آخری حصے میں سمجھ گئی تھی۔ سوزن نے ریسیور کان سے لگا رکھا تھا۔ وہ کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ بھلا کس سے بات کر رہی تھی...؟ مون کو سمجھنے میں لمحہ بھی نہیں لگا تھا۔

''کون سا گفٹ......؟'' سوزن کے ہونٹوں پر ابھی یہی الفاظ اترنے والے تھے۔ یعنی دوسری طرف کال مالا کی تھی۔ وہ سوزن سے گفٹ کے متعلق تصدیق کر رہی تھی یا پھر شکریہ ادا کر رہی تھی؟ مون کو ذرا بھی سمجھنے میں دشواری نہیں ہوئی تھی۔ اس کا دماغ جیسے جھنجنا اٹھا تھا۔ مون کو لگا، ساری پلاننگ تار، تار ہو جائے گی۔ ابھی سوزن نے مالا کو سچ بتا دینا تھا۔ ظاہر ہے، سوزن نے بھیجا ہی نہیں تھا پھر وہ جھوٹ کیوں بولتی......؟ سوزن تو ویسے بھی آج کل مالا پر فدا تھی۔ اب جو کچھ کرنا تھا، مون کو ہی کرنا تھا۔ اور

محض لمحے کے آخری حصے میں کرنا تھا۔ ورنہ بازی اس کے ہاتھ سے پھسل جاتی۔ مون کو پورا یقین تھا سوزن ابھی سچ کھول دے گی۔ مالا کو مون کی اصلیت کا پتا چل جائے گا اور پھر عیسیٰ اور پاپا بھی موت کی شیطانیت اور حسد کو جان جائیں گے۔

مون نے برقی لہروں جیسی آنکھوں کی تیز لپک کو سوزن کی آنکھوں میں بھر دیا تھا۔ اس کی توجہ کا ارتکاز سوزن کی آنکھیں تھیں۔ وہ پلک جھپکے بغیر سوزن کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی جیسے لمحے بھر کی مدت کے لیے اس نے سوزن کو ہپناٹائز کر دیا تھا۔ وہ تو مجموعی ہپناٹزم میں بھی بہت مہارت رکھتی تھی۔ پھر اس کے سامنے تو سوزن کھڑی تھی جسے ہپناٹائز کرنا مون کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔

مون نے اسے شدید قسم کا ہپناٹائز نہیں کیا تھا۔ سوزن پہ اونگھ برابر نیند آئی تھی۔ یعنی اونگھ برابر نیند طاری ہوئی تھی اور اسی دوران مون نے اپنے خیال کو سوزن کی لاشعور کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ وہ خیال آخر کیا تھا؟ ''ہاں...... گفٹ میں نے بھیجا تھا مگر شکریے کی ضرورت نہیں۔'' سوزن کے ہونٹ اپنے لاشعور سے آئے خیال کو شعور میں منتقل کرنے کے بعد اب زبان سے ادا کر رہے تھے۔ یعنی ہونٹ دھیرے، دھیرے ہل رہے تھے۔

پھر یوں ہوا کہ عیسیٰ کو مالا نے مطمئن کر دیا تھا وہ گفٹ چونکہ سوزن نے بھیجا تھا سو عیسیٰ کے ذہن کی گرد خود بخود ہٹ گئی تھی۔ مالا، سوزن کو کال کر کے پُرسکون ہو چکی تھی مگر جس جذباتی اور خوف کی کیفیت میں اس نے بریسلیٹ کورپ میں پھینک دیا تھا اور پھر سوزن کو کال کرنے کے بعد جب اسے پتا چل گیا کہ پارسل آفاق یا کسی تیسرے بندے نے نہیں بھیجا تب اس کے ذہن سے بریسلیٹ کو کورپ میں سے نکالنا یاد نہیں رہا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر اپنی نادانی کے باعث عیسیٰ کی نگاہ میں چور بن گئی تھی جب عیسیٰ نے غیر ضروری کاغذات والی کورپ کو کھنگالا تو نقلی نگینوں والا بریسلیٹ اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔ یہ وہی بریسلیٹ تھا جسے مالا نے تب بہت غصے اور خوف کے عالم میں ڈسٹ بن کے اندر پھینک دیا تھا۔ پھر سوزن کی فون کال کے بعد اسے کورپ کو کھنگالنا یاد نہیں رہا تھا اور اب عیسیٰ کا طنز سن کر جیسے شرمندہ، شرمندہ ہو رہی تھی۔

''تحفے کی ایسی ناقدری پہلے کبھی نہ دیکھی نہ سنی...... اگرچہ بریسلیٹ اتنا مہنگا نہیں تھا مگر اتنا حقیر بھی نہیں جو اس کی جگہ یہ کورپ ہوتی۔'' عیسیٰ جس انداز میں بول رہا تھا، مالا شرمندگی کے گڑھے میں گر رہی تھی۔ پھر جانے وہ مالا کے لیے کیا، کیا سوچتا ہوگا؟ یہ کہ اس نے سوزن کے دیے تحفے کی اتنی ناقدری کی تھی۔ اسے اٹھا کر ڈسٹ بن میں پھینک دیا تھا۔ چاہے عیسیٰ نے بہت دفعہ جتایا نہیں تھا مگر اس کے ذہن میں گرہ تو ضرور پڑ گئی تھی۔ آخر کوئی تو وجہ تھی جو اس نے سوزن کے گفٹ کو کورپ میں پھینک دیا تھا۔

پھر انہی دھوپ چھاؤں جیسے لمحوں میں کچھ وقت آگے کھسک گیا تھا۔ مون اب کچھ اور چونکا دینے والا کام کرنا چاہتی تھی۔ وہ مالا کو ذہنی طور پر آخری حد تک شکستہ کرنا چاہتی تھی اور پروفیسر کے ساتھ میٹنگ کے بعد اس نے کچھ اگلے اسٹیپس پر غور کیا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا مالا کا تنہا ہونا...... عیسیٰ ان دنوں شہر سے باہر گیا تھا۔ اور مون کے لیے یہ موقع بڑا انوکھا تھا۔ اب وہ مالا کو کسی اور طریقے سے ڈسٹرب کرنا چاہتی تھی۔ عیسیٰ کے گھر کی تمام باتیں اسے نینی بڑی آسانی کے ساتھ بتا دیتی تھی۔ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی ہر بات نینی کے توسط سے مون تک پہنچتی تھی۔ اس معمولی کام کے بدلے مون نے نینی کو ذاتی فلیٹ لے دیا تھا اور کام مکمل ہونے کے بعد ذاتی کنوینس کے ساتھ سپر اسٹور بھی لے کر دینا تھا۔ نینی کے لیے مون ایک بڑی

لکشمی تھی۔ اس کی غربت جیسے دنوں میں ختم ہوگئی تھی۔ قرضے اتر گئے تھے۔ اس کے بہن بھائی کام کرنے کے بجائے اب اسکول جاتے تھے۔ نینی کی زندگی جیسے مون کے توسط سے سنور گئی تھی۔ اس کا بیروزگار باپ بڑا خوش تھا اور نینی کو مارنے کے بجائے اب بہت محبت کرتا تھا۔

پہلی مرتبہ عیسیٰ کی غیر موجودگی میں وہ مالا کو ڈرانے آئی تھی۔ وہ اسے انتہائی حد تک خوفزدہ کر کے لاچار کرنا چاہتی تھی۔ اتنی بے بس کے وہ اپنی کیفیات کسی سے شیئر بھی نہیں کرسکتی تھی۔

مون جب گھر میں داخل ہوئی تب اس نے سب سے پہلے تمام لائٹس آن کرلی تھیں۔ اس کے پاس ڈپلی کیٹ چابی بھی تھی۔ جس کا فی الحال کسی کو پتا نہیں تھا۔ وہ جب گھر کے بیرونی طرف تھی تب عیسیٰ کے کمرے سے مالا کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ مالا جاگ رہی تھی اور یقیناً عیسیٰ سے فون پر بات کررہی تھی۔ پھر جب وہ فون سن کر باہر نکلی تب مون سٹنگ روم کے دروازے میں کھڑی تھی۔ اندھیرے میں گم...... وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک ٹہل کر مالا کو ہراساں کررہی تھی۔ رات کے انتہائی پہر گھر کے اندر کوئی سایہ چلتا ہوا نظر آئے تو بندے کی حالت کیا ہوتی ہے؟ شاید مالا کی طرح ہی...... وہ خوف سے تھر، تھر کانپ رہی تھی۔ پھر جب وہ تھوڑی ہمت کر کے آگے بڑھنے لگی تو مون کی بدلی ہوئی کرخت آواز میں ''ریخت (خبردار)'' سن کر ٹھٹک گئی تھی۔ پھر دوسرے ہی لمحے وہ نینی کے کمرے کی طرف بھاگی۔ اب یقیناً وہ گھر والوں کو جگانا چاہتی تھی۔ مون سارے گھر کی لائٹس آف کرتی فاتحانہ تاثرات لیے باہر نکل کر اندھیرے میں گم ہوگئی تھی۔ پھر باقی کی تفصیلات نینی نے مون کو فراہم کردیں۔

''وہ بہت خوفزدہ ہے، جیسا تم چاہتی تھیں بالکل اسی طرح...... وہ سمجھ رہی ہے گھر میں آسیب ہے، چلتا اور بولتا ہوا۔'' نینی تالاب کے کنگرے پہ بیٹھی گھٹنوں میں منہ چھپا کر مون کو مزید تفصیلات فراہم کررہی تھی۔ جب پیچھے سے آتی مالا کی چاپ کو سن کر ٹھٹک گئی۔ پھر نینی نے مہارت کے ساتھ فون بند کردیا تھا۔ تاہم مون کو کامیابی کی خبر تو مل ہی چکی تھی۔ مون نے نینی کو سمجھا رکھا تھا کہ مالا کو کس، کس طرح خوفزدہ کرنا ہے۔ یہ کہ مما کی زندگی میں بھی اس گھر پر آسیب کا سایہ تھا۔ وہ آسیب مما کے کپڑے جلادیتا۔ برتن توڑتا اور مما ہر وقت بیمار رہتیں۔ اس قسم کی باتوں نے مالا کو بہت حد تک حواس باختہ کردیا تھا۔ وہ نادیدہ سے آسیب سے ڈرنے لگی تھی جس کی آواز صرف مالا کو سنائی دیتی تھی اور کسی کو ہرگز نہیں۔

مالا مزید بھی نینی سے کرید، کرید کر باتیں پوچھتی رہی اور نینی رٹے رٹائے اسکرپٹ کو پڑھتی رہی جو مالا کو خوف کی انتہا تک پہنچا رہا تھا۔ مون کی توقع کے عین مطابق مالا ذہنی طور پر شکستہ ہورہی تھی۔ یعنی منزل قریب تھی۔ پھر پروفیسر نے اسکرپٹ میں کچھ اور تبدیلیاں کی تھیں...... وہ مون کی ایک تیسری صلاحیت سے کام لینا چاہتا تھا۔ اب کرنا یہ تھا کہ مون نے سوزن اور آفاق کو نشانہ بنانا تھا۔ یعنی مالا کو ان دونوں سے بدگمان کرنا تھا کیونکہ سوزن اور آفاق کی ہمدردیاں، مالا کی طرف جھکاؤ اور بڑھتا جارہا تھا۔

اس کے لیے ایک مرتبہ پھر علی عیسیٰ کی غیر موجودگی درکار تھی اور یہ موقع جلد انہیں میسر آگیا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ مون نے پچھلی دفعہ کی طرح داخلی دروازے میں سے گزر کر اندر جانے کے بجائے عیسیٰ کے کمرے کی کھڑکی کو ٹارگٹ بنایا تھا۔ کھڑکی کے باہر کھڑے ہو کر اس نے اندازہ لگالیا تھا کہ مالا جاگ رہی ہے۔ تب اس نے سوزن کی آواز حلق میں سے نکال کر مالا کی سماعتوں کو بلاک کردیا تھا۔

''ٹارگٹ مشکل ضرور ہے، پر ناممکن نہیں...... میں چاہتی تو لمحوں میں کھیل کو ایک ہی چال کے ساتھ ختم

کرسکتی تھی مگر ایسی گیم کا مزہ ہی کیا...... جس میں مقابل کو بے خبری میں مار ڈالا جائے۔'' وہ سوزن کی آواز میں بول رہی تھی۔ یوں کہ اندر کھڑی مالا کے قدموں تلے سے زمین کھسکتی چلی گئی تھی۔ مالا بیچاری کو خبر ہی کیا تھی؟ مون حسیب کو مردوں، عورتوں کے علاوہ جانوروں کی آوازیں نکالنے میں بھی بلا کی مہارت حاصل تھی۔ پھر اس نے آفاق کی مردانہ آواز میں ''ٹارگٹ تو اچیو کرنا ہی ہے۔'' بول کر مالا کو اور بھی خوفزدہ کردیا تھا۔ وہ مالا کی نفسیات بخوبی سمجھ رہی تھی۔ وہ اس کی کیفیات بھی سمجھ رہی تھی۔ دو مخلص لوگوں کی اتنی بڑی غداری کو سہنا آسان نہیں تھا مگر مالا بیچاری سہنے پر مجبور تھی۔ اور اس بات کا ذکر بھی کسی سے نہیں کرسکتی تھی۔ بالآخر مون حسیب، مالا علی عیسیٰ کو ایک دوراہے پر لے آئی تھی۔

نیکسٹ اسٹیپ کم از کم مالا کے لیے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوسکتا تھا۔ کیونکہ پروفیسر اب بہت احتیاط کے ساتھ مُہرے چل رہا تھا۔ اس دفعہ نینی کو سخت قسم کی ٹریننگ دی گئی تھی۔ کیونکہ نینی پہ منحصر تھا کہ وہ مالا کو کس حد تک خوف کی انتہا پہ لے جاسکتی تھی۔

اس دفعہ پروفیسر نے مون کے بجائے عیسیٰ کے گھر ڈیزی کو بھیجا تھا۔ ڈیزی کے لیے پُراسرار سا ڈریس بنوایا گیا تھا پھر اس کا بڑا خوفناک سا میک اپ کروایا گیا یعنی اس کا چہرہ میک اپ کی سفید تہوں میں چھپا دیا گیا تھا۔ نینی کو فل بریفنگ دی گئی تھی...... اب نینی کی ایکٹنگ پر منحصر تھا کہ وہ حقیقت کے رنگ کیسے بھرتی ہے؟ ٹائمنگ کا نینی نے فون پر بتا دیا تھا۔ سو جب ڈیزی، مالا کو ڈرانے اس کے کمرے میں داخل ہوئی تب مالا نماز ادا کررہی تھی۔ اس نے سلام پھیرا تو ایک اجنبی صورت کو دیکھ کر چیخ پڑی۔ اس دوران نینی کی کامیاب ایکٹنگ نے مالا کو خوف و ہراس کی آخری سطح پر پہنچا دیا تھا۔ یعنی مالا کو یقین آچکا تھا کہ اس گھر مین واقعی کوئی آسیب موجود ہے۔ تب

پاپا اور عیسیٰ بھی بے انتہا پریشان تھے اور مون کو کسی کی پریشانی کا قطعاً کوئی احساس نہیں تھا۔ وہ اپنی نفرت، ضد اور انتقام میں ان دنوں اندھی ہوچکی تھی۔ اسے نہ باپ کی صورت نظر آتی تھی اور نہ بھائی کی محبت نظر آتی تھی۔ مالا کے ان دنوں کچھ اور لوگوں کے ساتھ اچھے تعلقات بن گئے تھے جن میں ایک میکس وان بھی شامل تھا، میکس فطرتاً اچھا لڑکا تھا اور سوزن کے لیے دل میں نرم جذبات رکھتا تھا۔ چونکہ میکس نے پروفیسر کے لیے مزید کام کرنے سے انکار کردیا تھا۔ سو وہ بیدی نونگ سے نکالا گیا۔ اب کسی مقامی اسکول میں ڈچ کے علاوہ ایک دو اور سبجیکٹ پڑھا رہا تھا۔ اسی اسکول میں میکس کی مالا کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی۔ ان دنوں مون کو میکس پر بڑا غصہ تھا۔ وہ اس کے دشمنوں سے دوستانے جو جوڑ رہا تھا۔

پروفیسر کو بھی اطلاع مل چکی تھی۔ اور وہ مون کو کول ڈاؤن رہنے کی تلقین کرتا تھا۔ اب وہ ایک مرتبہ پھر میکس کو مُہرہ بنا رہے تھے۔ میکس کی برتھ ڈے پارٹی نے جیسے راہیں مزید آسان کردی تھیں۔ مون کو لگتا تھا کہ قدرت اس پر مہربان ہے۔ حالانکہ مون کا اصل امتحان تو اب شروع ہورہا تھا۔ دوسروں کے لیے گڑھا کھودتے ہوئے وہ بڑی مسرور اور شاد تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ اس گڑھے میں اندھا دھند چلتے ہوئے اگر وہ خود بھی گر پڑتی تب......؟ میکس کی برتھ ڈے پارٹی نے جیسے مون کے لیے کچھ اور آسانیاں کردی تھیں۔ اسے میکس نے انوائٹ کیا تھا اور یقیناً آفاق، مالا اور کچھ مزید لوگوں کو بھی بلایا تھا۔ اب مون صرف یہ چاہتی تھی کہ مہمانوں کے جمع ہونے سے پہلے وہ اپنا کام تمام کرلے۔ اس کے لیے زیادہ کوشش بھی نہیں کرنی پڑی تھی۔ وہ سب سے پہلے میکس کے فلیٹ پر پہنچ گئی تھی۔ اور اسے قوی امید تھی کہ مالا دوسرے نمبر پر آنے والی مہمان ہوگی۔ اس کا یہ یقین قائم رہا تھا۔

مالا اس کے اندازوں سے بھی پہلے پہنچ چکی تھی اب مون کا کام شروع ہونے والا تھا۔ وہ مالا کے ڈرائنگ روم تک آنے سے پہلے اپنی تیسری بڑی صلاحیت کا بڑا ہی بھرپور استعمال کر رہی تھی۔ اس نے آوازوں کے بدلنے، بولنے، ہنسنے اور نقل اتارنے پر بڑی ریسرچ کی تھی۔ اس کی یہ صلاحیت بقول پروفیسر کے پورے جرمنی میں کسی اور کے پاس نہیں تھی۔ پہلے آوازوں کی بھنبھناہٹ شروع کی گئی تھی۔ پھر مون نے وقفے، وقفے سے سوزن اور آفاق کی آوازیں حلق میں سے نکالی تھیں۔

''ٹارگٹ کامیابی کے آخری مراحل میں ہے......بس ایک جھٹکے میں کہانی کا اینڈ ہو جائے گا۔ اس فلم کی پروڈیوسر مون حسیب ہے۔'' مون نے سب سے پہلے اپنے مخصوص لہجے میں بات کا آغاز کر کے باہر کھڑی مالا کے چھکے چھڑا دیے تھے پھر کچھ توقف کے بعد آفاق کی آواز نکالنے لگی تھی۔

''اس فلم کا ڈائریکٹر آفاق یعنی ایفق یعنی کہ میں ہوں......علی عیسیٰ کی آستین میں آرام فرمانے والا ڈلیش، ڈلیش اور ڈلیش......'' وہ آفاق کی طرح قہقہہ نہیں لگا سکتی تھی مگر اس نے ایسی کوشش ضرور کی تھی......لمحے بھر کی مدت گزرنے کے بعد سوزن بول رہی تھی۔ مون کے لیے سوزن کی آواز اور لہجے کی نقل اتارنا ذرا بھی مشکل نہیں تھا۔ وہ مالا کو لمحہ بہ لمحہ الیکٹرک شاکس لگا رہی تھی۔

''اور میں فلم کی کاسٹ کا اہم حصہ ہوں...... اس فلم کا نام ترکِ وفا ہے۔ یہ فلم علی عیسیٰ اور مالا کی کہانی پر مبنی ہے۔ اس کا اسکرپٹ مون حسیب نے لکھا ہے اور اسے پروڈیوس بھی مون حسیب نے کیا ہے جبکہ ہم کہانی کے اہم ترین کیریکٹرز ہیں......اور ایکٹنگ میں کمال کا فن رکھتے ہیں۔'' سوزن نے اپنی بات مکمل کر دی تھی، یعنی مون اب مزید کچھ بولنا نہیں چاہتی تھی۔ اگرچہ وہ ایک کامیاب نقال تھی مگر

پھولوں جیسے لفظ

☆ رات کی تنہائی میں انسان کی آنکھ سے ٹپکنے والے آنسو زمانے بدلتے ہیں اور طوفان کا رخ موڑ دیتے ہیں۔

☆ اگر انسان کا دل غلاظت سے بھرا ہوا ہو تو بے شک وہ دنیا کی بہترین خوشبو کیوں نہ استعمال کر لے مگر اس کی گندگی کی بدبو نہیں جاتی۔

☆ پاؤں کبھی غلط راہ پر نہیں چلتے جب تک آپ خود نہ چاہیں۔

☆ خواب اور تعبیر علیحدہ چیزیں ہیں جنہیں ایک کرنا آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔

☆ لوگ اتنے بے اعتبار نہیں ہوتے جتنا ہم ان پر اپنی توقع کا بوجھ لاد دیتے ہیں۔

☆ سچی محبت یہ بھی ہے کہ بچھڑ جانے کے بعد بھی اس کی کسک محسوس کرو۔

مرسلہ: نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدر مرجان

پھر بھی دل میں ذرا سے خدشے ضرور لہرا رہے تھے۔ حالانکہ اسے تو اب بہت خوش ہونا چاہیے تھا کیونکہ مالا علی عیسیٰ، سوزن اور آفاق سے عمر بھر کے لیے بدگمان ہو چکی تھی۔ وہ ان دو لوگوں کی کبھی زندگی بھر صورت نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ مون حسیب کو تو خوش ہونا چاہیے تھا۔ وہ ان دو لوگوں سے مالا کو عمر بھر کے لیے بدظن کر چکی تھی۔

☆☆☆

سوزن کو علی عیسیٰ نے گھر سے نکال دیا تھا......

حالانکہ سوزن نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اسے مون نے اپنا معمول بنا کر ہپنا ٹائز کیا تھا اور معمول کے پاس اگر کاپی پینسل ہو تو وہ فوری طور پر ملنے والے پیغام کو لکھ لیتا ہے۔ ورنہ بعد میں اسے بھول جاتا

ہے۔ اب سوزن بیچاری تو سچی تھی، وہ اپنی صفائی پیش کر رہی تھی کہ وہ گفٹ اس نے مالا کو نہیں بھیجا۔ مگر مالا اس کے جھوٹ کو سن کر نیم پاگل ہوگئی تھی۔ علی عیسیٰ، مالا کی بگڑتی طبیعت دیکھ کر سوزن پہ چڑھ دوڑا تھا۔ اس نے سوزن کو گھر سے نکال دیا تھا۔ حالانکہ بعد میں اسے بہت افسوس ہوا تھا۔ خصوصی طور پر سوزن کے وہ آخری الفاظ اسے کبھی نہیں بھولے تھے۔

''مقدس انجیل کی قسم......! یہ لڑکی خسارہ اٹھانے والی ہے۔ اسے انسانوں کی پہچان ہی نہیں۔'' سوزن کے یہ الفاظ مالا کو بھی کبھی نہیں بھولے تھے۔

آخر سوزن نے ایسے الفاظ کیوں بولے تھے؟ وہ اتنی جھوٹی، مکار اور عیار ہونے کے باوجود بھی اتنی سچی کیوں نظر آتی تھی؟ مالا کی آنکھوں کے سامنے سے اس کا چہرہ ہٹتا ہی نہیں تھا۔ رویا رویا چہرہ، پھولے گالوں پر پھسلتے آنسو اور توہین کی شدت سے سرخ پڑتی آنکھیں...... اسے عیسیٰ کے گھر سے نکالنے پر بہت دکھ اور غصہ تھا۔ عیسیٰ نے تب سوچ لیا تھا کہ وہ سوزن سے جلد معذرت کرلے گا مگر پھر اپنی پریشانیوں میں الجھ کر رہ گیا۔

پھر ایک روز عیسیٰ کے گھر بڑی خوشگوار تقریب میں مون کو اپنی چھپی ہوئی تمام صلاحیتوں کو ظاہر کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ یہ لوگ یہاں برج کھیل رہے تھے اور برج کھیلنے سے پہلے عیسیٰ نے جو مون کی شان میں قصیدہ پڑھا تھا، اس قصیدے کو سن کر مون کی گردن میں سریا فٹ ہوگیا تھا۔ وہ جیسے لمحے بھر میں ان سب بیٹھے لوگوں میں بہت اونچی بہت بلند ہوگئی تھی۔ باقی سب اس کے نزدیک بہت بونے اور چھوٹے تھے۔

پھر اسے اپنے جوہر دکھانے کا بھی موقع مل گیا تھا۔ یہ لوگ برج کھیلنا چاہ رہے تھے۔ کھیل برج کا ہو یا کارڈز کا...... مون کو کوئی ہرا نہیں سکتا تھا۔ اگرچہ مقابل ڈاکٹر ابوبکر ہی کیوں نہ ہو۔

ٹیلی پیتھی کا علم سیکھنے کے دوران اس نے کارڈز کے استعمال کا طریقہ بخوبی سیکھ لیا تھا۔ کیلی فورنیا یونیورسٹی کے شعبۂ نفسیات کی پروفیسر اور مشہور ٹیلی پیتھسٹ گارڈ مرفی نے ٹیلی پیتھی کے تجربات کے لیے ٹیلی کارڈ کے استعمال کا طریقہ ایجاد کیا تھا۔ اور مون جیسے کئی لوگوں نے ان تجربات سے فائدہ حاصل کیا تھا...... اب ٹیلی کارڈ ہوتے یا تاش کے پتے...... مون کے سامنے کسی کو ٹھہرا نہیں سکتے تھے۔ وہ مات پر مات دے سکتی تھی جس طرح اس نے ابوبکر کو مات دی تھی پھر جب کوئز مقابلہ شروع ہوا تب مون کے لیے اصل پریشانی کا آغاز ہوا تھا۔ وہ اتنے لوگوں میں اکیلی ہیرا کو کیسے ہپناٹائز کرتی؟ بس لمحے بھر کی دیر میں اس کا ذہن مختلف راہیں خود بخود ڈھونڈتا گیا تھا۔ اس نے مقابلے کے آغاز سے لے کر مقابلے کے اختتام تک دس سوالوں کو ٹیلی کارڈ سمجھ کر ہیرا کے شعور، لاشعور سے کھوج نکالا تھا۔ اگرچہ ان دس سوالوں میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا اور نہ ہی کوئی اور ان کی طرف متوجہ ہوا تھا تاہم ڈاکٹر ابوبکر کو مون پر شک ضرور ہوگیا تھا۔ وہ ایک ماہر نفسیات تھا اور وہ جان گیا تھا کہ مون نے اس کی بیوی کو کچھ لمحوں کے لیے ہپناٹائز کردیا تھا...... تاہم ابوبکر کے لیے مقامِ حیرت یہ تھا کہ کوئی بھی ٹیلی پیتھسٹ اتنی آسانی اور کم مدت میں کسی کو مسمرائز نہیں کرسکتا تھا۔ اگر مون کے پاس یہ صلاحیت تھی تو وہ واقعی ایک باکمال لڑکی تھی مگر اس نے اپنی اتنی اعلیٰ صلاحیت کو دھوکے اور منافقت میں استعمال کرلیا تھا۔ گیم جیتنے کے لیے اس نے رُولز کے خلاف دھوکے سے کام لیا تھا۔ اسی طرح کی دھوکا دہی سے تو وہ کچھ بھی کرسکتی تھی؟ پھر کیا یہ درست عمل تھا؟ کسی کو دھوکا دے کر فاتح بننا...... منافقت، فریب اور مکاری کے ساتھ جیتنا...... ڈاکٹر ابوبکر جیسے لمحے بھر کے لیے دنگ رہ گیا تھا۔ مالا نے ہیرا پہ مصنوعی نیند چند سیکنڈ کے لیے طاری کی تھی پھر اسے ہلکے سے اشارے کے ساتھ جگا بھی دیا تھا مگر ڈاکٹر ابوبکر

جیسے سن ہوگیا تھا۔ مون حسیب یقیناً ایک باکمال لڑکی تھی مگر اس دھوکے کے بعد ابوبکر کے لیے یہ جاننا مشکل نہیں تھا کہ مون حسیب اپنے علم سے بامقصد کام لے رہی ہے یا؟ ایسا ہوتا ہرگز نہیں نظر آرہا تھا۔ وہ اگر چھوٹی سی گیم کے دوران دھوکا دے کر جیت سکتی تھی تو پھر زندگی کی بڑی بازی میں بھی دھوکے، فریب اور بے ایمانی کے ساتھ فاتح عالم بن سکتی تھی۔ یعنی وہ اپنے علم کا غلط استعمال کررہی تھی۔ اور اس بات سے مکمل بے خبر تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ کوئی چیز دے کر اتنے لوگوں کے بیچ میں کسی بندے کو منفرد بناتا ہے تو اس کی سرکشی کو دیکھ کر اپنی عطا کی صلاحیت کو واپس بھی چھین لیتا ہے۔

وہ ایک ماہرِ نفسیات تھا اور مون کے اندر تک جیسے اتر گیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ مون حسیب اپنی فطرت پہ پیدا ہونے والا ایک نایاب قسم کا ہیرا ہے جو اپنی ہی نادانی اور کم فہمی کے باعث گریفائیٹ (گریس) میں بدل گئی تھی۔ اس کی سرکشی، خود پسندی، غرور اور تکبر نے اسے گریفائیٹ بنادیا تھا مگر مون حسیب خود یہ حقیقت سمجھ نہیں پارہی تھی اور اسی ناسمجھی کے عالم میں وہ مالا کی زندگی میں بے ترتیبی بھر رہی تھی۔ کبھی نینی سے کہہ کر عیسیٰ کے کپڑے جلادیتی، کبھی سیکسی ٹائپ رسالے منگوا کر مالا کے گھر میں جگہ، جگہ رکھوادیتی۔ مون کا مقصد صرف اتنا تھا کہ عیسیٰ کے دل میں مالا کے خلاف پکی گرہ پڑجائے۔ یہ کہ اس کی حیادار، معصوم بیوی بھی یہاں کے رنگ میں رنگتی جارہی تھی۔ اس کے تمام مقاصد آہستہ آہستہ پورے ہورہے تھے۔ مالا، آفاق اور سوزن سے تو بدگمان ہوچکی تھی اب ان سے کوئی بات شیئر نہیں کرسکتی تھی اور مون چاہتی بھی یہی تھی۔

پھر آخری مرتبہ جب اس نے ڈیزی کو مالا کی طرف بھیجا تب ڈیزی کے ایک ہلکے سے احمقانہ عمل کی بدولت مالا کا یقین آسیب وغیرہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ ایک ہلکی سی کلی سے گھبرا کر ڈیزی الٹے قدموں بھاگ گئی تھی۔ شاید اسے وہم ہوا تھا کہ مالا اس کے نزدیک نہ آجائے۔ ڈیزی کا گریبان نہ پکڑ لے حالانکہ مون کو مالا سے اتنی جرأت کی امید ہرگز نہیں تھی مگر اس دنیا میں بھلا کیا کچھ نہیں ہوجاتا۔

مون کے مشن کو نینی کے تعاون نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا تھا۔ آخری واردات سے پہلے جب نینی نے مون کو گھر میں کیمرے نصب ہوجانے اور مالا کے ٹیپ ریکارڈ کی اطلاع دے کر ان دونوں چیزوں کو ناکام بنادیا تھا تو اس کے بدلے مون نے نینی کو چھوٹی سی کار اور چھوٹا سا ذاتی اسٹور خرید دیا تھا۔ اب بس تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے تک کا انتظار تھا۔ اس کے بعد نینی روپوش ہوجاتی۔ علی عیسیٰ کا گھر چھوڑ دیتی۔ پلاننگ مکمل تھی، کہیں بھی جھول نہیں تھا۔ وہ جلد کامیابی کا آخری زینہ طے کرنے والی تھی۔

علی عیسیٰ اور مالا دونوں آفاق اور سوزن سے بدگمان ہوچکے تھے اور مالا کسی بھی وقت آفاق کو گھر سے نکال دینے والے فیصلے کی منتظر تھی۔

اس دن مارکیٹ سے آنے کے بعد مالا نے پھولوں کے جھنڈ کے پاس آفاق کو بیٹھے دیکھا تھا۔ ہلکی سی سرسراہٹ کے بعد کسی نے ''او میرے مالک!'' کہا تھا پھر جیسے آفاق گھاس میں سے کوئی نوکیلی چیز دریافت کرتا شاکڈ تھا۔ مالا نے گردن کا رخ بدل کر دیکھا۔ اسے آفاق کی جیکٹ نظر آگئی تھی۔ اب آفاق عجلت میں ''او میرے مالک!'' بولتا کوئی نوکیلی چیز اٹھا کر بیگ میں رکھتا اٹھ گیا تھا۔ پھر اس نے جاتے، جاتے مالا کو جتادیا تھا۔

''عیسیٰ کو مجھے گھر سے نکالنے کی ضرورت نہیں...... میں خود تم لوگوں کا گھر چھوڑ دوں گا مگر اس سے پہلے تمام سچائی علی عیسیٰ کو کھول، کھول کر بتا کر جاؤں گا۔'' آفاق کے یہ الفاظ بھی مالا کے دل پر لگا زنگ نہیں اتار سکے تھے۔ وہ علی عیسیٰ کو آفاق کے کرتوت بتاچکی تھی۔ اب عیسیٰ، آفاق کے نکاح تک کا انتظار کررہا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ نکاح کی شام بھی

آ گئی اور اس کے بعد وہ سب ہو گیا جس کا تصور اب بھی روح تک کو کانپنے پر مجبور کر دیتا۔

علی عیسیٰ اور آفاق کے درمیان ڈرائنگ روم میں کیا بات ہوئی تھی؟ آفاق نے عیسیٰ کو کیا دکھایا تھا؟ پھولوں کے جھنڈ میں گھاس کے اندر سے اسے کون سی ایسی چیز ملی تھی؟ جسے آفاق نے اپنے لیدر بیگ میں محفوظ کر لیا تھا۔

جیسے ساری حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی تھی۔ آفاق دہاڑ، دہاڑ کر بول رہا تھا۔ جیسے اس کی آنکھیں ابل رہی تھیں اور غصے کی زیادتی سے اس کی شریان پھٹنے کے قریب تھی۔ عیسیٰ کی حالت بھی آفاق سے کچھ مختلف نہیں تھی۔

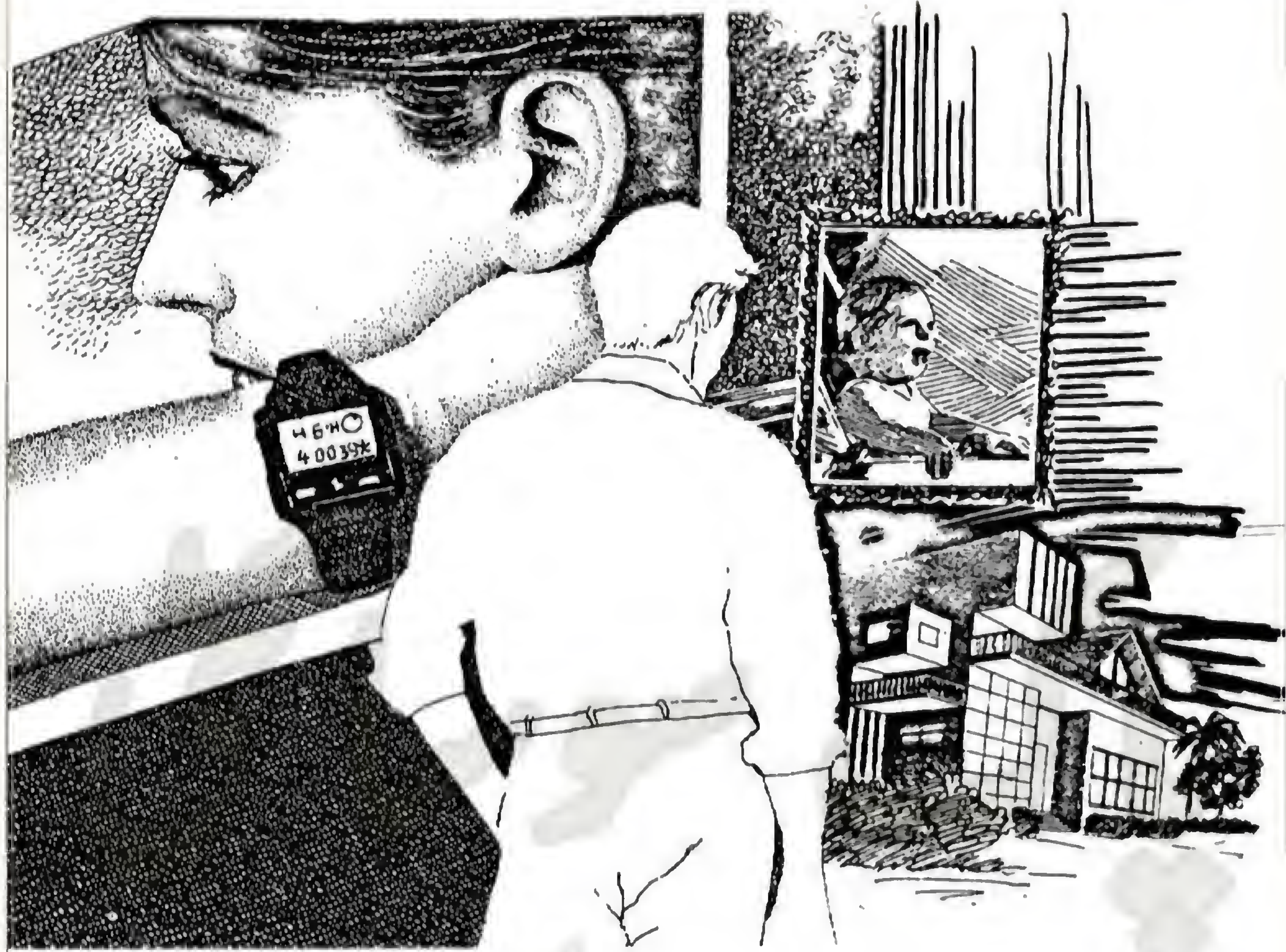
اس رات بڑے زوروں کا طوفان آیا تھا۔ آندھی کے تیز جھکڑ جیسے سب کچھ اڑائے جا رہے تھے۔ آج کی رات علی عیسیٰ پہ بہت بھاری تھی۔ آج کی رات آفاق پر بھی بہت بھاری تھی۔ جانے لمحوں کے کھیل میں کیا ہونے والا تھا؟ مالا کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپتا رہا۔ خوف اسے تھر تھراتا رہا اور رشتوں کے بندھن ٹوٹتے رہے۔ آفاق کو لہولہان کرتا عیسیٰ اپنے حواسوں میں نہیں تھا اور آفاق جیسے چیخ، چیخ کر اسے بتا رہا تھا۔

''تو اُس جادوگرنی کی گردن دبوچ...... وہی تو ہے تیری آستین کی سنپولن...... اپنی بہن سے پوچھ......'' آفاق جانے کیسی، کیسی سچائیوں کو بے نقاب کرنا چاہ رہا تھا مگر علی عیسیٰ وہ اپنی بہن کے خلاف .... ایک لفظ نہیں سننا چاہتا تھا۔ وہ آفاق کا منہ توڑ رہا تھا۔ اسے گھونسے، مکے، لاتیں مار رہا تھا۔ آفاق وہ پہلا دولھا تھا جو اپنی شادی کی رات انتہائی زخمی حالت کے ساتھ بھنبھوڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ شاید وہ مرنے کے قریب پہنچ چکا تھا اور علی عیسیٰ اسے مار دینا چاہتا تھا۔

''پھر لیا تو نے اپنی گندی زبان سے اس کا نام...... اب تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' عیسیٰ کے سر پر خون سوار ہو چکا تھا۔ یہ اس کا دوست آفاق تھا۔ جس پر اس نے ترس کھایا، اسے اجنبی ملک میں سہارا دیا۔ مدد کی، گھر میں جگہ دی اور وہی اس کا گھر تباہ کرنا چاہ رہا تھا۔ عیسیٰ کے گھر میں فحش رسائل منگواتا، مالا کو خوفزدہ کرتا اور مون سے اسے بدظن کرنے کی کوشش کرتا...... وہ اس غدار، لالچی اور بدفطرت انسان کو قتل کر دینا چاہتا تھا جو اپنے لیدر بیگ میں سے مون کا کراؤن نکال کر اس کے منہ پر مار رہا تھا۔

''تمہاری بہن ایک بہت بڑی ٹیلی پیتھسٹ ہے، وہ غلط اور ناجائز کام کرتی ہے۔ بدی کی راہ میں بھٹک رہی ہے پروفیسر بشر کی انگلیوں پر ناچتی ہے۔ اسی پروفیسر کی خاطر غیر ملکی ایجنسیوں کے لیے کام کر کے کروڑوں ڈالر پروفیسر کو کما کر دے رہی ہے۔ وہ لوگوں پہ اجارہ داری قائم کرنا چاہتی ہے۔ انسانوں کے ذہنوں پر حکومت کرنا چاہتی ہے۔ جائز ناجائز کام کرنے سے ڈرتی نہیں......اور کسی ذی شاہ سے محبت بھی کرتی ہے اور اس کے علاوہ تمہاری بیوی مالا سے شدید نفرت کرتی ہے۔ وہ تمہارا گھر برباد کر دینا چاہتی ہے۔ تمہاری غیر موجودگی میں اسے خوف زدہ کرنے آتی ہے، یہ اس رات مون کے سر سے کراؤن پھولوں کے جھنڈ کے پاس گرا تھا۔ جسے میں نے بڑی تحقیق، کوشش اور کھوج کے بعد اٹھا لیا ہے۔ میرے پاس اس سے بڑا ثبوت بھی ہے...... یہ تمہاری ملازمہ نینی، مون کے اشاروں پر ناچتی ہے......اور مون تم دونوں کے بیچ......'' آفاق کی ہر بات ادھوری رہ گئی تھی۔ عیسیٰ نے ٹریگر دبا دیا تھا اور چاچو کی بھیانک چیخ سنائی دی تھی۔

کیا مون حسیب نے اسی ٹیلی پیتھی کے ذریعے عیسیٰ اور مالا کی زندگی میں دراڑ ڈالی مگر اس کا اپنا انجام کیا ہوا یہ اب پڑھیے گا آخری قسط انشاء اللہ ماہِ فروری میں



طرفِ دارِ دل

شمیم فضل خالق

کچن میں حمیرا کی بڑ بڑاہٹ اور برتنوں کی اٹھا پٹخ جاری تھی۔ عابد لاؤنج میں اپنا سر پکڑے بیٹھا تھا...... ایک گھنٹے سے وہ ناشتے کے انتظار میں بیٹھا تھا، اسے آفس سے دیر ہو رہی تھی۔ آج کام والی ماسی چھٹی پر تھی اس لیے حمیرا کا غصہ عروج پر تھا...... اسے ناشتا ماسی ہی دیا کرتی تھی...... ایک ٹھنڈی سانس لے کر اس نے اپنے سامنے لگی دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی...... اب مزید اس کے پاس ٹائم نہیں تھا، وہ اٹھ

کھڑا ہوا...... اور بغیر ناشتا کیے آفس کے لیے نکل گیا۔ اپنی آلٹو میں بیٹھا وہ مسلسل اپنی ناکام اور ناشاد زندگی کے بارے میں سوچتا رہا۔

یونیورسٹی میں اس کا اور حمیرا کا زوردار قسم کا عشق چلا تھا۔ ایسا دھواں دھار قسم کا عشق تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے جان تک فدا کرنے کو تیار تھے۔ عابد اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا...... اس کا باپ چند سال پہلے ایک ایکسیڈنٹ میں وفات پا چکا تھا۔ اس نے ورثے میں عابد کے لیے دو عدد کوٹھیاں اور مین بازار میں چند دکانیں چھوڑی تھیں۔ دونوں کوٹھیاں پوش علاقے میں تھیں۔ ایک کوٹھی میں وہ دونوں ماں، بیٹا رہتے تھے اور دوسری کوٹھی کو کرایے پر دے رکھا تھا۔ دکانوں سے بھی اچھا خاصا کرایہ وصول ہو جاتا تھا۔ ایم ایس سی کے بعد اسے ایک پرائیویٹ ادارے میں جاب مل گئی تھی۔ اس کی سیلری اگرچہ زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن کوٹھی اور دکانوں کے کرایے کی رقم سے بہت اچھے سے گزارہ ہو رہا تھا جبکہ عابد کے برعکس حمیرا کافی اونچے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے والد کا قالینوں کا بزنس تھا۔ دو بھائی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اب آسٹریلیا میں مشترکہ کاروبار کر رہے تھے۔ حمیرا کی ایک بہن کی شادی خاصے بڑے گھرانے میں ہوئی تھی، اس لیے حمیرا کے لیے عابد کا رشتہ اس کے والدین کے لیے بالکل بھی قابلِ قبول نہیں تھا لیکن حمیرا، عابد کے عشق میں پاگل ہو رہی تھی سو وہ عابد سے شادی پر اَڑ گئی۔ جب اس کے والدین کا ہر سمجھانا بیکار گیا تو انہوں نے شرط رکھ دی کہ عابد اپنی دونوں کوٹھیاں اور دکانیں حمیرا کے نام کرے گا تبھی وہ اس شادی کے لیے راضی ہوں گے۔ عابد تو حمیرا کے عشق میں گوڈے گوڈے دھنس گیا تھا سو وہ مان گیا جبکہ اس کی ماں نے اسے بہت سمجھایا کہ اس کی تو کل پونجی... یہی کچھ ہے اور اگر وہ یہ سب حمیرا کے نام کرتا ہے تو وہ تہی داماں رہ جائے گا۔

''اماں...... حمیرا میرے گھر آ رہی ہے اور یہ سب کچھ پہلے کی طرح میرے ہاتھ میں ہوگا۔ وہ یہ سب لے کر تو نہیں جائے گی ناں۔'' تبھی اس نے ہنس کر ماں سے کہا تھا۔

''بیٹا وقت بدلتے دیر نہیں لگتی...... آج کل کی شادیاں اتنی دیرپا نہیں ہوتیں...... اگر کل کو اس نے تم سے علیحدگی اختیار کر لی تو تمہارے پاس کچھ بھی نہیں رہے گا، عابد کو ماں کی یہ بات بالکل اچھی نہیں لگی۔ عشق جو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

''مائیں تو بیٹوں کا گھر بسا رکھنے کی دعائیں مانگتی ہیں اور آپ ابھی سے علیحدگی کی باتیں کر رہی ہیں۔'' وہ منہ بنا کر خفگی سے بولا۔

اماں بیچاری چپ رہ گئیں۔ ظاہر ہے بیٹا کچھ سوچنے سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا اور اس طرح سب کچھ حمیرا کے نام ہو گیا اور وہ دلہن بن کر عابد کے آنگن میں آ گئی۔ اماں تو عابد کی شادی کے دو سال بعد ہی وفات پا گئیں۔ عابد کے بچے کھلانے کا ارمان ان کے دل میں ہی رہ گیا۔ حمیرا نے ہر طرح کا علاج کیا لیکن شادی کو آٹھ سال کا طویل عرصہ ہو گیا تھا لیکن ان کا آنگن بچوں کی چہکار سے خالی تھا۔ عشق کا خمار تو حمیرا اور عابد دونوں کے ہی سروں سے اتر گیا تھا۔ گزرتے وقت نے حمیرا کو حد درجہ چڑچڑا اور زود رنج بنا دیا تھا۔ ایک تو اولاد نہ ہونے کا غم، دوسرا اب اسے افسوس ہو رہا تھا کہ آخر عابد میں ایسا کیا تھا جو اس نے اس کے لیے اتنا بڑا اسٹینڈ لیا اور اچھے، اچھے رشتے ٹھکرا دیے۔ وہ اکثر یہ بات عابد کے منہ پر کہہ دیتی تھی...... اب عابد کو بھی اپنی اماں کی باتیں یاد آ رہی تھیں انہوں نے کتنا روکا تھا کہ وہ اپنی ساری جائداد حمیرا کے نام نہ کرے لیکن تب اس نے اماں کی ایک نہیں مانی تھی۔ اب تو یہ رشتہ جیسے تیسے نبھانا ہی تھا کیونکہ سب کچھ تو حمیرا کے نام تھا اور حمیرا کو طلاق دیتا تو وہ سڑک پر آ جاتا۔ اب وہ اپنی بے وقوفی پر رات، رات بھر جاگ کر ماتم کرتا رہتا۔ لیکن اب پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ حمیرا

نے اس کی زندگی اجیرن بنادی تھی۔ وہ جتنی دیر گھر میں رہتا۔ حمیرا اور وہ مسلسل لڑتے رہتے، اس لیے وہ گھر سے باہر ہی خوش رہتا۔

اس دن وہ گھر آیا تو ماسی آچکی تھی...... ماسی نے اسے کھانا نکال کر دیا، آج گھر میں کچھ سکون لگ رہا تھا۔ عابد نے ماسی سے حمیرا کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ اپنے میکے گئی ہے۔ عابد نے سکون کی سانس لی۔ وہی اس کے لیے اب سکون کے لمحات ہوتے جب حمیرا گھر سے باہر ہوتی۔ اس نے بڑی رغبت سے کھانا کھایا اور ٹی وی کھول کر اطمینان سے ٹی وی دیکھنے لگا۔ گزرتے وقت نے اس کے دل میں بچوں کی خواہش بڑھادی تھی۔ اسکرین پر ہنستے کھیلتے بچوں کو اس نے انہماک سے دیکھنا شروع کیا۔ بچوں کی معصوم حرکتوں سے وہ محظوظ ہورہا تھا، بار بار اس کے چہرے پر مسکراہٹ آجاتی۔ شروع شروع میں وہ حمیرا کو خود علاج کے لیے لے جاتا رہا لیکن جب سے ایک مشہور گائنی کالوجسٹ نے عابد کو صحت مند قرار دیتے ہوئے سارا نقص حمیرا میں قرار دیا تھا تو وہ اور زیادہ چڑچڑی ہوگئی تھی... اب وہ اکیلی ہی مختلف ڈاکٹروں کے پاس جایا کرتی...... عابد نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ کاش وہ اس کے ساتھ تعاون کرتی تو وہ اسے ایک سے ایک اچھی ڈاکٹر کے پاس لے جاتا۔

کبھی کبھار اس کا ذہن دوسری شادی کے لیے آمادہ ہوتا۔ ''لیکن کیا حمیرا ایسا کرسکے گی؟ نہیں......'' وہ خود اپنے سوال کی نفی کرتا...... ''وہ میرا گلا دبا کر مجھے ماردے گی لیکن......'' اچانک اس کے دل میں سرسراتا ہوا خیال آگیا...... ''اگر وہ مرگئی تو...... تو یہ سب بہت آسان ہوجائے گا'' وہ دوسری شادی بھی کرسکے گا اور اس کے بچے بھی پیدا ہوجائیں گے۔ بچوں کی خواہش اتنی شدید تھی کہ اس نے اپنے دھڑ دھڑ کرتے دل کو سنبھال لیا۔

''لیکن...... وہ مرے گی کیوں...... وہ تو ہٹی کٹی ہے۔ صحت مند ہے، وہ تو مجھے مار کر ہی مرے گی...... میں بچوں کی خواہش دل میں لیے اس دنیا سے چلا جاؤں گا۔'' وہ خود ترسی کے حصار میں گھرا سوچ رہا تھا۔ ''لیکن اگر وہ خود نہیں مرتی تو اسے مارا تو جاسکتا ہے۔'' دل نے اسے ایک نئی راہ بتائی۔ وہ تھرتھر کانپنے لگا۔ ریموٹ سے ٹی وی بند کردیا۔ اس کا دل لرز رہا تھا اتنی خوفناک سوچ...... ایسی سوچیں تو دماغ میں پہلے کبھی نہیں آئی تھیں۔ اس نے ریموٹ ایک طرف پھینکا اور خود بیڈروم میں جاکر اپنے بستر پر گر گیا۔ اس کا دل بے ترتیب انداز میں دھڑک رہا تھا۔ جسم کے سارے مساموں سے پسینہ بہنے لگا تھا۔ وہ اس خیال کو جتنا اپنے دل سے دور کرتا وہ اتنا ہی اس کی سوچ پر حاوی ہورہا تھا۔ وہ کبھی اٹھتا کبھی بیٹھتا کبھی ٹہلنے لگتا لیکن یہ خیال ہٹ کر نہیں دے رہا تھا۔ یہ تو جیسے دل کی دیواروں سے چپک کر رہ گیا تھا۔

اگلے چند دن اس پر خاصے کٹھن گزرے...... نہ کھانے کا خیال رہا تھا نہ پینے کا...... نہ آرام کرنے کا...... بس سوچتا جاتا...... اور ہر بار اس کا طرف دار دل کہتا تمہیں بھی جینے کا حق ہے...... اتنی زندگی اس تنک چڑھی چڑیل کے ساتھ اذیت میں گزر گئی۔ اب باقی زندگی اس طرح نہیں گزر سکتی۔'' اسے ایک بچے کی گدگداہٹ اپنے بہت قریب محسوس ہوتی جبکہ اس کا آدھا دل جو اس کا طرف دار نہیں تھا وہ اسے ڈراتا...... ''اچھی زندگی کی خواہش میں قتل جیسا گناہ کروگے...... ہوسکتا ہے آئندہ زندگی جیل میں بسر ہو۔'' وہ کانپ اٹھتا تب طرف دار دل کہتا۔

''ارے جاجا...... آج کل ایسے طریقے آئے ہیں کہ کسی کو شبہ تک نہیں ہوسکتا۔'' آخر کار اس کا طرف دار دل غالب آگیا۔ اب وہ ایسے قتل کے طریقے سوچنے لگا جس پر چل کر حمیرا کا قتل قدرتی موت ظاہر ہو۔ لیکن ہر طریقہ سوچتا اور پھر اسے رد کردیتا ''نہیں اس میں پکڑے جانے کا خطرہ موجود

ہے۔'' خیر...... اسے کوئی جلدی نہیں تھی اب جب وہ حمیرا کو قتل کرنے کا حتمی ارادہ کر چکا تھا تو بڑے اطمینان سے اور باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت سارا کام کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ان دنوں حمیرا کی چیخ پکار بھی جانے کیوں کم ہوگئی تھی۔ گھر پر ایک پُراسراری خاموشی چھائی رہتی۔ آخر کار اسے ایک ایسا طریقہ سوجھ ہی گیا جسے اختیار کر کے کوئی اس پر شبہ تک نہیں کر سکتا تھا وہ بڑی آسانی سے اپنی منزل پا سکتا تھا۔ اسے رونے دھونے اور ماتم کرنے کی تھوڑی سی اداکاری کرنی ہوگی۔ ویسے بھی اس کے دونوں سالے آسٹریلیا میں تھے، سالی اور بوڑھے ساس، سسر کو... اپنی بیٹی کے ساتھ کی محبت پر فخر تھا۔ شادی کے بعد اس نے حمیرا کو کبھی کوئی تکلیف نہیں دی تھی چھوٹے، چھوٹے جھگڑے تو ہر میاں بیوی میں ہوتے ہیں بلکہ جب بھی ان دونوں کے درمیان کوئی جھگڑا ہوتا تو اس کے ساس، سسر حمیرا کو ہی ڈانٹتے ڈپٹتے۔ یہ ساری باتیں سوچ کر ہی اس نے یہ منصوبہ بنایا تھا اور اس میں اس کے طرف دار دل نے اسے اور اس کے منصوبے کو بہت سراہا تھا۔

ماسی ہفتے میں ایک دن کی چھٹی کرتی تھی اور اس دن حمیرا کے ذمے ہی سارا کچن کا کام ہوتا تھا حالانکہ وہ ذرا بھی خوشی سے یہ کام نہیں کرتی بلکہ بول، بول کر ماسی کو کوس کوس کر عابد کا ناطقہ بند کر دیتی...... عابد نے بھی طریقۂ واردات سوچ لیا تھا۔

یوں تو اس کا .... منصوبہ بہت بے داغ تھا اور اس پر ایک پرسنٹ بھی شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب وہ ماسی کے چھٹی پر جانے کا انتظار کر رہا تھا...... اس دوران وہ جب بھی آئندہ زندگی کے بارے میں سوچتا اس کے خیالوں میں ایک ہمکتا ہوا بچہ آجاتا...... گدرائے جسم کا ایک گول مٹول سا بچہ جسے اپنے خیالوں میں وہ سینے سے چمٹا کر سکون حاصل کرتا...... جانے کیا بات تھی لیکن اس کے تصور میں بھی

کوئی خوب صورت لڑکی نہیں آتی تھی جسے اس کی بیوی بنتا تھا...... شاید حمیرا اسے کیا گیا عشق اتنا شدید تھا کہ اب کسی اور عشق کی گنجائش ہی نہیں تھی لیکن بچہ پانے کے لیے شادی تو لازمی تھی لیکن پہلے حمیرا سے تو جان چھوٹے پھر چند ماہ اس کے سوگ میں گزارنے ہوں گے۔ سوچوں نے اسے نڈھال کر کے رکھ دیا تھا۔

اس دن ماسی کے چھٹی پر جانے کا دن تھا، جانے سے پیشتر وہ کچن کے کئی کام نمٹا کے جایا کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ کچن میں لگی تھی۔ آج اسے اپنی طبیعت کی خرابی کا اور آفس نہ جانے کا بہانہ کرنا تھا...... عابد کسلمندی سے لاؤنج میں صوفے پر بیٹھا ماسی کا انتظار کر رہا تھا جو اس کے لیے ناشتا لانے والی تھی۔ لیکن وہ چونک کر رہ گیا۔ جب ماسی کی جگہ حمیرا ناشتے کی ٹرے لیے آگئی۔ حمیرا کو دیکھ کر عابد کا دل تیز رفتاری سے دھڑکنے لگا وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ حمیرا آج ایک مدت بعد پرانی جون میں نظر آرہی تھی۔ اس کے چہرے پر نرم سا تاثر پھیلا ہوا تھا اس نے پنک کلر کا لباس زیب تن کیا ہوا تھا، یہ کلر عابد کا پسندیدہ کلر تھا اور شادی کے اولین دنوں میں جب وہ اس کلر کا لباس پہنتی تو عابد اس پر دیوانہ وار نثار ہونے لگتا۔ آج اس نے اپنے گھنے بالوں کو کھلا چھوڑ رکھا تھا اور وہ بہت پیاری اور بے حد مختلف نظر آرہی تھی۔ عابد نے حیرت سے اس کا یہ بدلا روپ دیکھا وہ ناشتے کی ٹرے چھوٹی ٹیبل پر اس کے سامنے رکھتے ہوئے خود بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

''عابد......'' اس نے نرمی سے محبت سے اس کا نام پکارا تو عابد اس کے انداز سے مارے حیرت کے بھونچکا رہ گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ، پھاڑ کر اسے ایسے دیکھنے لگا جیسے اسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ ایک عرصہ ہوا، حمیرا نے اسے اتنے پیار سے نہیں پکارا تھا۔ حمیرا نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑا ''کیا وہ خواب دیکھ رہا ہے؟'' وہ جیسے خود سے کہنے لگا۔

''میں بہت شرمندہ ہوں عابد...... مجھے معاف کردو...... میں نے تم سے کوئی اچھا...... سلوک روا نہیں رکھا......'' عابد کے منہ سے بات نہیں نکل پارہی تھی۔ حمیرا اور معافی...... ناقابلِ یقین بات تھی ''کہیں اسے میرے منصوبے کا تو علم نہیں ہوگیا۔'' عابد کا دل نا معلوم خدشات سے لرزنے لگا...... ''اور وہ اس خوف سے سنبھل گئی کہ کہیں میں اسے ختم نہ کرادوں...... لیکن نہیں......'' اس نے خود ہی اپنی سوچ کی نفی کردی...... ''میرے دل کی بات وہ کیسے جان سکتی ہے جبکہ یہ راز تو میں خود سے بھی شیئر کرتے ہوئے احتیاط کرتا ہوں......'' اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو حمیرا بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ یونیورسٹی کے دنوں سے لے کر اب تک اس نے اپنا وزن نہیں بڑھایا تھا۔ عابد کا دل پہلو میں بڑے زور سے دھڑکا...... ''نہیں......'' اس نے اپنے دل کو سرزنش کی...... ''بس اب سب کچھ ختم ہوگیا ہے۔ اب معافی تلافی کا وقت گزر چکا ہے۔ اب میں وہی کروں گا جو میں نے سوچ رکھا ہے۔''

''عابد......'' اس نے اسی سُریلی آواز سے عابد کو اپنے خیالات سے چونکا دیا۔

''میں تمہیں ایک خوش خبری سنانے والی ہوں۔''

''خوش خبری......؟'' وہ حیرت کی انتہا پر تھا۔

''ہاں...... تین دن بعد ہماری شادی کی سالگرہ ہے، پہلے تو میں نے سوچا تھا کہ میں تم کو اپنی شادی کی سالگرہ پر ہی یہ خوش خبری گفٹ کے طور پر دوں گی...... لیکن مجھ سے مزید انتظار نہیں ہوسکتا تھا اس لیے......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ عابد منہ پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ کہنے سننے کی اس میں طاقت نہ تھی۔ حمیرا اس کے قریب ہوکر...... اس کے کندھے پر سر رکھ کر بولی۔ ''عابد...... مبارک ہو۔ تم باپ بننے والے ہو۔''

''کک...... کیا......؟'' عابد کو لگا اس کے کانوں نے غلط سنا ہے، وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں سے بے یقینی مترشح تھی جبکہ حمیرا قریب کی دراز سے کاغذات نکالتے ہوئے بولی۔

''یہ چیک کرلو...... اس میں الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ بھی ہے اور باقی رپورٹس بھی ہیں۔ دراصل جب مجھ میں نقص...... کا پتا چلا تو میں بڑی اپ سیٹ ہوئی۔ میں نے کوئی لیڈی ڈاکٹر...... کوئی حکیم نہیں چھوڑا۔ میری ممی کی ایک خالہ ڈاکٹر ہیں انہوں نے لگ کر میرا علاج کیا...... میں اگرچہ علاج کروا رہی تھی لیکن مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ میں کبھی ماں بھی بن سکوں گی لیکن...... خدا نے مجھ پر بہت بڑا فضل کیا ہے۔'' شدتِ جذبات سے اس کی آواز رُندھ گئی اور دوسرے لمحے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''عابد پلیز...... مجھے معاف کردو...... اب ہم دونوں مل کر اپنے ہونے والے بچے کا استقبال کریں گے...... ہم اسے ایک اچھا ماحول دیں گے۔ اتنی مدت بعد خدا نے ہمیں نوازا ہے عابد۔''

عابد کسی سنگی مجسمے کے مانند یوں بیٹھا تھا جیسے وہ بالکل بے جان ہو۔ اس میں ہلنے کی بھی طاقت نہیں رہی تھی۔ اس سے جانے اس کا وہ طرفدار کہاں غائب ہوگیا تھا۔ ہاں البتہ...... آدھا مخالف دل طنزیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''عابد...... شکر ادا کرو اپنے رب کا...... جس نے تمہیں بہت بڑے گناہ سے بچالیا...... ورنہ آج تم ایک نہیں دو خون کردیتے، ایک اپنی بیوی کا اور دوسرا اپنے بچے کا۔''

اچانک عابد میں حرکت پیدا ہوئی اس نے حمیرا کو اپنے ساتھ چمٹالیا اور بلند آواز سے روتے ہوئے کہنے لگا۔ ''مجھے معاف کردے میرے رب...... اپنے اس گناہ گار بندے کو معاف کردے۔ تو رحیم ہے، تو کریم ہے مجھے معاف کردے۔''



منی ناول



جنگل کا پھول

زاہدہ پروین

پانچواں حصہ

سنسان راہ گزاروں پر چلتے ہوئے خرم کے قدم خود بخود مسجد کی طرف اٹھتے گئے۔ اس کے چاروں طرف جنگل کی ٹھنڈی ٹھار ہواؤں کے جھونکے تھے...... ویرانی تھی اور خاموشی...... دل میں ایک پکا عزم خود بخود سر اٹھا رہا تھا۔ وہ جس بے نیاز لڑکی کے عشق میں دیوانہ ہوئے جا رہا تھا، وہ اب بھی بلاشبہ اس سے کوسوں دور تھی مگر اب خود خرم میں تابِ انتظار ختم ہو چکی تھی۔



وقت کے ان حساس لمحات میں، اس اندھیری رات میں گھنے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے وہ ہیں، کھڑے اور سائیں، سائیں کرتے سناٹوں کے بیچ اس نے جو فیصلہ کرڈالا تھا اب اس سے منحرف ہونا نہیں چاہ رہا تھا۔ اب اس فیصلے سے ایک انچ ہلنا بھی اسے اپنی مردانگی کے خلاف لگا۔

جب وہ بستی سے ایک طرف کو ہٹ کر بنی ہوئی مسجد کے قریب پہنچا تو عشا کی نماز ختم ہوچکی تھی اور نمازی اپنے، اپنے جھونپڑوں کی طرف جارہے تھے۔ وہ اندھیرے میں ایک طرف کھڑے ہوکر مسجد خالی ہوجانے کا انتظار کرنے لگا۔ ساتھ ہی اپنی سوچوں کو یکجا کرنے میں مصروف تھا۔ جب اس کے اندازے کے مطابق مسجد سے آخری نمازی بھی جاچکا تو وہ تاریکی سے نکل کر مولوی صاحب کے حجرے کی طرف آگیا۔

مولوی جی دن بھر کی مصروفیات کے بعد اب سونے کی تیاری کررہے تھے۔ ابھی انہوں نے چراغ بجھایا نہیں تھا کہ کسی نے ہلکے سے دروازے پر دستک دی۔ ایسا اکثر ہوتا تھا۔ ان اطراف میں رہنے بسنے والے لوگوں کی دوا دارو بھی مولوی جی کے سینے میں محفوظ کلام الٰہی تھا۔ رات برات کسی کی طبیعت بگڑتی، کوئی بچہ روتا...... ضد کرتا...... سب انہی کی طرف دوڑتے تھے اور وہ قرآنی آیات پڑھ، پڑھ کر دم کرتے ...... پڑھا ہوا پانی دیتے...... خدا کے حکم سے دکھ درد دور ہوجاتا اور آنے والے انہیں سیکڑوں دعاؤں سے نوازتے ہوئے رخصت ہوجاتے۔ اس وقت بھی وہ یہی سمجھے کوئی حاجت مند آیا ہے۔

''آیا...... بھائی آیا......'' انہوں نے اپنا بستر بچھاتے ہوئے جواب دیا۔ پھر چند قدم بڑھ کر دروازے کی زنجیر گرادی۔

دروازے میں کھڑے ہوئے شہری وضع قطع لیے خرم کو تھوڑی دیر تو وہ شناخت نہ کرسکے۔ وہ خود سے سر جھکا کر اندر آیا اور اپنی پہچان کرائی۔

''مولوی صاحب! میں ہوں آپ کا خرم...... فاریسٹ آفیسر۔''

''اوہو......تم کیسے آئے؟ خیریت سے تو ہو۔'' انہوں نے شفقت سے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اپنے قریب بستر پر بٹھالیا۔

خرم یہاں تک آیا تو بڑے جوش وخروش کے ساتھ تھا مگر اب مولوی صاحب کو روبرو پاکر جھجک آڑے آنے لگی۔ بہت دیر تک حجرے میں سکوت طاری رہا۔ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ مولوی صاحب اسے منتظر نظروں سے تک رہے تھے......سمجھدار تھے۔ ان کی تجربہ کار نگاہیں سمجھ چکی تھیں کہ خرم ضرور کسی اہم معاملے کے سلسلے میں آیا ہے۔ لیکن وہ معاملہ کیا ہے؟ یہ سمجھنے سے قاصر تھے۔

حالانکہ گزرتے وقت اور آگے کو بھاگتی رات کے پیشِ نظر خرم بھی ان بزرگ ہستی کو بے آرام کرنا نہیں چاہ رہا تھا مگر زبان تھی کہ ہل ہی نہیں رہی تھی۔ لب تھے کہ جامد ہوگئے تھے۔ کافی وقت اسی کشمکش کی نذر ہوگیا۔ پھر مولوی صاحب نے ہی اس سکوت کو توڑا۔ اس کے شانے تھپتھپائے اور بڑی محبت و شفقت سے بے حد پیار سے، اپنے فطری میٹھے اور نرم لہجے میں کہنے لگے۔

''بولو...... بولو بیٹے...... اتنا تو مجھے اندازہ ہے کہ تم اتنی سردی پالے میں رات گئے ضرور کسی خاص وجہ سے ہی نکلے ہوگے۔ اگر میں کسی مسئلے کو حل کرنے کے سلسلے میں تمہارے کام آسکوں......تو میرے لیے بہت خوشی کی بات ہوگی۔ میری پوری دیانت دارانہ کوشش شامل ہوگی۔'' مگر خرم تب بھی خاموش رہا۔ دراصل...... ایک لحاظ تھا......اِک حیا تھی...... جو بار، بار آڑے آجاتی اور چپ رہنے پر مجبور کردیتی۔

بالآخر مولوی صاحب سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں گویا ہوئے۔

''ایسی کون سی بات ہوسکتی ہے جو تم جیسا پڑھا

لکھا اور با اختیار شخص بھی کہتے ہوئے جھجک رہا ہے؟ میں بہت غور کررہا ہوں مگر یہ سوال میری محدود عقل سے بالاتر ہے۔ بیٹا میں ایک بار پھر یقین دلاتا ہوں کہ تم بغیر کسی خوف وخطر کے اپنا راز مجھ سے کہہ سکتے ہو۔ بالکل یہی سمجھنا گویا کسی سے کچھ کہا ہی نہیں...... تمہارا راز، میرا راز رہے گا بیٹا۔ مجھے ہمراز بنا کر تم کسی خسارے اور پشیمانی میں نہ رہو گے۔ یہ میرا وعدہ ہے... جیسے بھی بن پڑا میں تمہارے کام آنے کی کوشش کروں گا...... اور اگر تمہارے کسی کام نہ آسکا تو خیال رکھنا کہ میں اگر کسی کا کچھ بنا نہ سکوں تو بگاڑتا بھی نہیں ہوں...... بس اس سے آگے میں تمہیں کچھ یقین دہانی نہیں کرواسکتا۔ آگے تم اپنی مرضی کے مالک ومختار ہو بیٹا۔'' اتنا کچھ کہہ کر وہ خاموش ہوگئے۔ اور منتظر نگاہوں سے اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھنے لگے۔

خرم جو اتنی دیر سے ضبط کیے ہوئے تھا اور صبرو تحمل کا دامن تھامے بیٹھا تھا یکلخت بکھر گیا۔

اچانک وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مولوی صاحب کا دامن پکڑ کر پھوٹ بہا۔ بس پھر ضبط نہ ہوا تو اپنی تمام تر بے چینیوں اور بے قرار رتجگوں کی داستانیں مولوی صاحب کو سناڈالیں۔ اپنی بے تابیاں، اپنی سوچیں اور فکریں ان کے سپرد کردیں۔ اس رات بہت ساری اَن سوئی راتوں کے بعد ایک پُرسکون نیند اس کے نصیبوں میں آئی تھی۔

رات گئے مسجد کے حجرے سے لوٹا اور دن چڑھے تک لمبی تان کر سویا۔ مولوی صاحب بیچارے ایک سیدھے سادے شریف النفس انسان، اس کے دل کا حال سن کر گہری سوچ میں پڑگئے تھے۔ اک عجیب کیفیت کا شکار تھے۔

خرم تو ایک وزنی ذمّے داری ان کے بوڑھے کاندھوں پر ڈال آیا تھا۔ بعد میں جو ہوتا سو ہوتا... فی الحال تو وہ اپنا بوجھ اتار بھی آیا تھا اور انہیں اپنا ہمراز بنا کر دل کی ساری بات کہہ سنائی تھی۔

بالآخر مولوی صاحب نے اس سے وعدہ کرلیا تھا کہ اگلے چند دنوں میں موقع دیکھ کر وہ اس کے سوال کا جواب معلوم کرکے آگاہ کریں گے۔ انہوں نے خرم کو اپنے پورے، پورے تعاون کا یقین دلایا تھا اور تب اس نے بچوں کی طرح ضد کرکے کہا تھا۔

''مولوی صاحب! مجھے جواب ''ہاں'' میں چاہیے۔ ''نہ'' میرے لیے ہونے مت دیجیے گا۔ میری آئندہ کی تمام زندگی اس ایک ہاں میں بند ہے۔ آپ خود دیکھیے! میں کوئی غلط راستہ تو اختیار نہیں کررہا ہوں...... نکاح تو خدا اور رسولؐ دونوں کے نزدیک محبوب ومسنون ہے۔ میں شرع، قانون اور مذہب سے کچھ حقوق حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ان کی ہر شرط منظور ہوگی۔ وہ کچھ مثبت انداز اختیار کریں گے تو میں آگے قدم بڑھاؤں گا۔ بس آپ ہر صورت جواب ''ہاں'' میں لیجیے۔ آخر مجھ میں کیا کمی ہے؟ کیا خامی ہے؟ کیا میں مسلمان نہیں؟''

''لاحول ولاقوۃ!'' مولوی صاحب نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے قرأت سے کہا تھا۔ ''بیٹا! تم تو خود ہی سوال کررہے ہو، خود ہی جواب دے رہے ہو۔ ارے تمہارے مسلمان ہونے سے کہیں کوئی انکار کرسکتا ہے۔ سوچ تو اصل میں، میں یہ رہا ہوں کہ تم نے میرے علاوہ رحمت کو بھی ایک بڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے...... یہ تمہارا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے۔''

مگر وہ مولوی صاحب سے اصرار پر اصرار کرکے ہی واپس لوٹا تھا۔ آخر اس نے بھی تو ذاتی طور سے کچھ کم رسک نہیں لیا تھا۔

جانے کس ہمت اور جرأت کو بروئے کار لاکر اس نے اتنا بڑا فیصلہ کرڈالا تھا۔ نہ اپنے گھر والوں کا خیال آیا نہ سخت گیر اور روایت پسند اماں سے ڈرا۔ یہ اس کی حد سے بڑھی ہوئی، جانے والی دیوانگی ہی تھی کہ اس نے اپنے اس فیصلے کے جواب میں پیدا ہوجانے

والے مسائل کی بھی پروا نہیں کی تھی۔
وہ رات یادگار رات گزری تھی۔ وہ بے حد امن وچین سے سویا۔ صبح بیدار ہو کر نہا کر یوں معلوم ہوا جیسے روح وجسم کی تمام تھکن اتر گئی ہو اور وہ تازہ دم ہو کر ہلکا پھلکا ہو گیا۔
کئی دنوں کے بعد آج اس نے ناشتا بھی اچھے موڈ میں کیا۔ ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ مزدوروں کی، کاریگروں کی ٹولی آج دن بھر کے کام کی ہدایات لینے آ موجود ہوئی۔
وہ اٹھ کر باہر آیا اور کافی دیر تک نہایت خوشگوار ماحول میں خوش دلی کے ساتھ ان لوگوں سے باتیں کرتا رہا۔ ان کو ضروری باتیں سمجھائیں، ہدایات دیں۔ وہ لوگ چلے گئے تو خرم دوبارہ اندر آیا اور برآمدے میں پڑی آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر ایک دن پرانا اخبار پڑھنے لگا۔
آج آسمان بالکل صاف وشفاف تھا۔ بادل کا ایک ٹکڑا بھی کسی گوشے میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ چاروں اطراف پھیلتی، بکھرتی سنہری دھوپ کی چمکیلی، چمکیلی کرنیں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ ٹھٹھرے، ٹھٹھرے جسم وجاں کو اِک توانائی سی اور اِک راحت سی محسوس ہو رہی تھی۔ کل کی اندھیری رات تک جو ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے تھے، ان میں کمی آ گئی تھی۔
کافی دیر کے بعد خرم اخبار ایک طرف رکھ کر کھڑا ہو گیا اور ایک طویل انگڑائی لے کر باہر آ گیا۔ جیکٹ لینی غیر ضروری تھی۔ فکر لگی تھی کہ مزدور کام درست طریقے سے کر بھی رہے ہیں یا نہیں؟ وہ ٹہلنے کے انداز میں اُدھر ہی جا نکلا۔
کام صحیح طریقے سے ہو رہا تھا۔ وہ لوگ اپنے، اپنے کام میں مصروف تھے۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر وہ جنگل میں اندر ہی اندر گھومنے لگا۔ آج اسے سوکھے، خشک اور سرسبز درختوں کو علیحدہ علیحدہ شمار کرنا تھا۔ چنانچہ اس نے جنگل کا ایک گوشہ منتخب کیا۔ چل پھر کر سب طرف کا جائزہ لیا پھر جیب سے نوٹ بک نکال کر ضروری اندراجات کرنے لگا۔
اسی مصروفیت میں ٹھیک دوپہر کا وقت ہو گیا۔ اس وقت سردی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ جیسے ماگھ، پھاگن کے بجائے جیٹھ یا ہاڑ کے مہینے ہوں۔ تقریباً دو تین گھنٹے وہ مسلسل اسی کام میں لگا رہا۔ لیکن اسے کچھ خاص تھکاوٹ کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ یوں بھی وہ ایسی دردِسری کا عادی تھا۔ فطری طور پر انتہائی محنتی، چاق وچوبند اور حافظے کا تیز انسان تھا۔ نڈر اور... جفاکش...... دلیر اور خوش اخلاق۔ یہ محنتیں، یہ ریاضتیں اس کے لیے کچھ اہمیت نہ رکھتی تھیں۔ وہ اس جنگل میں اگے ہوئے ہر، ہر پیڑ، پودے اور درخت کی نگہداشت از خود رکھنے کا عادی تھا۔ ہر ریکارڈ بحفاظت کلیئر رکھتا۔ اس کے دیگر آفیسرز بھی اس کی دیانت دارانہ روش اور احساسِ ذمے داری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور تعریف کرتے تھے۔
اِدھر گزشتہ بہت دنوں سے اس کے حوصلے جیسے پست ہو کر رہ گئے تھے۔ ریشم کی طرف سے کوئی مثبت پیش رفت نہ ہونے کی وجہ سے وہ اندر ہی اندر بجھ کر رہ گیا تھا۔ حالانکہ اس امر سے بھی بخوبی واقف تھا کہ وہ حد سے زیادہ معصوم اور ناواقفِ حال ہے، اس کے اندر فریب اور چالاکی نام کو نہ تھی، اس نے کبھی خرم کا حالِ دل سمجھنے سمجھانے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اپنے حال میں مست رہنے والی لڑکی تھی......
لیکن اس کی یہی بے توجہی اور لاعلمی خرم کے جی کا روگ بنی جا رہی تھی۔ اس کے دل ودماغ کو جیسے ایک ضدی لاحق ہو گئی تھی۔ جتنا، جتنا وہ اس کا بے نیاز اور لاتعلق رویہ محسوس کرتا اتنا اس کے لیے اس کی طلب اور تڑپ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔
چنانچہ اب تو اس کی فطری جفاکشی اور تیزی طراری پر سستی اور غفلت کی گرد جمی رہنے لگی تھی۔ اِک بے نام سی پژمردگی اور مایوسی تھی، جس نے اس

کی ہمہ صفت ذات کو اپنے احاطے میں لے لیا تھا۔ لیکن...... کل رات بالآخر اس نے ایک فیصلہ کن قدم اٹھا ہی لیا تھا...... حوصلے اور غیر معمولی ہمت سے کام لے کر اپنی تمام سستی اور غفلت اتار پھینکی تھی اور تمام تر مایوسیوں کی گرد جھاڑ کر از سرِ نو تازہ دم ہوا تھا۔ اپنے گھر والوں سے ڈر رہا تھا نہ اماں کا خیال آیا تھا۔ اس نے خود پر بوجھل اور افسردہ خیالات و محسوسات کو بڑے حوصلے سے پچھاڑ ڈالا تھا اور آج ایک بار پھر چاق و چوبند خرم بن گیا تھا۔

جنگل کے بیچوں بیچ ایک کم چوڑے پاٹ کی تیز رفتار ندی بہتی تھی۔ جس کے رواں دواں پانی پر ہر وقت سوکھے پتے اور جنگلی پھل پھول تیرتے رہتے تھے۔

چلتے، چلتے خرم اسی ندی پر جا پہنچا۔ نزدیکی جھاڑیوں سے ایک موروں کا جوڑا اس کے قدموں کی آہٹ پا کر دوسری سمت کو نکل بھاگا۔ خرم خود بخود مسکرانے لگا۔ پھر طمانیت کی ایک گہری سانس کھینچ کر نوٹ بک جیب میں ڈال لی۔ خیال تھا کہ بہتے پانی سے منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہو جائے یہی سوچ کر ندی کے کنارے کی طرف چل دیا۔

آگے بڑھتے، بڑھتے وہ اچانک ٹھٹک کر رک گیا۔ نگاہیں سیدھی، کپڑے دھوتی ہوئی ریشم بی بی پر جا ٹکیں۔ دفعتاً یوں محسوس ہوا جیسے پورے چاند کی ٹھنڈک آنکھوں میں اترتی چلی گئی ہو۔ اس نے ہمت کی اور چند قدم بڑھا کر ریشم کے قریب جا کھڑا ہوا۔ لیکن ریشم بدستور اپنے کام میں اس قدر مگن اور مصروف تھی کہ کافی دیر تک اسے خبر نہیں ہو سکی۔ اس کا ایک ہاتھ چھپا چھپ پانی میں چل رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں ڈنڈا تھامے دھپا دھپ کپڑے پیٹ رہی تھی۔ اس عالم میں اوڑھنی سر سے ڈھلک گئی تھی۔ گہرے رنگ کی قمیص میں اجلی، اجلی گردن شفاف آئینے کی طرح چمک رہی تھی۔ بالوں کی ایک گستاخ سی لٹ بار، بار صبیح رخساروں کے بوسے لے رہی تھی

وہ دل ہی دل میں سوچنے لگے۔

''اگر جو اس جنگل میں رہتے ہوئے بھی میں اس حسنِ بے مثال سے محروم رہوں تو کیا یہ میرے ساتھ زیادتی نہ ہوگی؟ مگر یہ ریشم بی بی اس قدر سادہ لوح ہے کہ دل لگی اور مکر و فریب سے کوسوں دور...... میرا بھی اپنے آپ سے یہ عہد ہے کہ میرے سوا اس بند کلی کی مسحور کن خوشبو سے کوئی دوسرا ہرگز فیضیاب نہ ہو سکے گا۔ اس جدوجہد میں میرا خواہ کیسا ہی نقصان ہو جائے، اماں جان مجھ سے خفا ہو جائیں مگر میں اپنی ہر چیز داؤ پر لگا ڈالوں گا۔'' اس کی تشنہ نگاہیں بے خبر ریشم پر جمی تھیں اور وہ خیالوں کی نقرئی پگڈنڈی پر قدم، قدم چلتے کہیں سے کہیں گھوم آیا۔ وہ آپ ہی آپ مسکرا دیا۔

☆☆☆

اتوار کا دن تھا۔ اس لیے شرمین گھر پر ہی تھی۔ بارش ہو جانے کی وجہ سے سردی معمول سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ آسمان پر سیاہ بادلوں کے دل کے دل چلے آ رہے تھے۔ ہوا سرد اور چبھنے والی تھی کہ گھر سے باہر قدم نکالنا دشوار تھا۔

دادی اماں کی کمر کا درد تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ ظاہر تو کرنا نہیں چاہتی تھیں مگر چہرے سے تکلیف کے آثار صاف ظاہر ہو رہے تھے اور شرمین انہیں تکلیف میں دیکھ کر ہولے جا رہی تھی۔ ابتدائی چند دنوں تک تو انہوں نے اپنی تکلیف کا احساس ہی نہیں ہونے دیا اور بس گھریلو علاج پر اکتفا کیے رہیں۔ ٹوٹکے چٹکلے کہاں تک چلتے۔ پیاری بوا سے جو کہا انہوں نے حسب ہدایت ابال، ابال کر دے دیا یا جس تیل کے متعلق بتایا۔ اس کی مالش کر دی مگر......

مگر آخر کہاں تک...... جب تکلیف حد سے سوا ہوئی تو شرمین کو پوری طرح احساس ہوا۔ وہ بھی کبھی آیوڈیکس ملتی تو گرم پانی کی بوتل سے سکائی کرتی۔ دادی اماں نے اس کے ہاتھوں سے ارنڈ کے پتے بھی بندھوائے مگر درد کسی طور ختم نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ وہ

خود بھی پریشان ہوا ٹھیں۔

اس روز تھوڑی دیر کو ان کی آنکھ لگی تو پیاری بوا کے بلانے پر شرمین باہر صحن میں چلی آئی۔

''بیٹا! اپنی دادی کے لیے کچھ کرو...... وہ تو سردی کا درد، سردی کا درد کہے جا رہی ہیں مگر میرا دل کچھ اور ہی کہہ رہا ہے۔'' وہ فکرمندی سے کہنے لگیں۔

''آپ کیا کہہ رہی ہیں پیاری دادی، میری سمجھ میں نہیں آیا۔'' شرمین ڈر گئی۔ سہم کر بولی۔

''بیٹا! سردی میں ہو جانے والا کمر کا درد معمولی سا ہوتا ہے جو گھریلو دوائیوں سے جاتا رہتا ہے...... مگر میں دیکھتی ہوں کہ بیگم کا درد ایک جگہ پر جم کر رہ گیا ہے۔ ورنہ اتنے دنوں میں جو، جو کچھ جتن ہم نے کیے ہیں۔ ان سے تو درد ہٹ جانا چاہیے تھا۔ میرا خیال ہے یہ کمر کا درد نہیں ہے بلکہ......کوئی دوسری ہی بیماری ہے۔'' انہوں نے سمجھا کر کہا۔

''پیاری دادی اس طرح مت کہیے۔ میرا دل گھبراتا ہے۔'' شرمین نے گھبرا کر کہا۔ انہوں نے سمجھایا۔

''ناں بھنو......! دل گھبرانے کی کون سی بات ہے؟'' بوا نے جھٹ اسے گلے سے لگا کر تسلی دی۔

''میں تو اس لیے کہہ رہی ہوں کہ کہیں اندر ہی اندر مرض نہ بڑھ جائے تو اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ کسی ڈاکٹر، حکیم کو دکھالو۔''

''اچھا...... یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' شرمین نے چونک کر کہا۔ ''اگر ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تو وہ تو سمجھ سکیں گے ناں!''

''اللہ تمہارا بھلا کرے......خوش رہو بیٹا...... میرے کہنے کا یہی مطلب تھا۔ اب یوں کرو کہ میرے ساتھ چلی چلو۔ دو گلیاں چھوڑ کر تیسری گلی کے نکڑ پر حکیم بندے علی کا مطب ہے۔ بڑے سمجھدار اور اچھے حکیم دِکھتے ہیں۔ ان سے حال کہہ کر دوا لے آتے ہیں۔'' بوا نے خوش ہو کر کہا۔

''ہاں دادی، یہ ٹھیک ہے۔ اسی طرح کر لیتے ہیں۔'' شرمین نے خوش کر ہاں میں ہاں ملائی۔ ابھی ان لوگوں کی گفتگو آخری مرحلے میں تھی کہ دفعتاً دادی اماں نے شرمین کو پکار لیا اور وہ جلدی سے ان کے پاس چلی آئی۔

انہوں نے دوبارہ آنکھیں بند کر لی تھیں۔ شرمین پلنگ پر بیٹھ کر ان کی کمر دبانے لگی۔ اس کے نرم، نرم ہاتھوں کے لمس سے وہ بہت سکون اور آرام محسوس کر رہی تھیں۔ کچھ وقت اسی طور کٹ گیا۔

''دادی اماں......! آپ کے لیے یخنی لے آؤں؟ دیر سے تیار رکھی ہے۔'' شرمین نے محبت سے گندھی آواز میں دریافت کیا۔

''ہاں ٹھیک تو ہے بیگم صاحب، تھوڑی سی یخنی ضرور پی لیں ورنہ کمزوری بہت بڑھ جائے گی۔ بھوک تو آپ کی رک کر رہ گئی ہے۔'' پیاری بوا نے بھی آگے بڑھ کر ٹکڑا لگایا۔

''اچھا لے آؤ۔'' انہوں نے آہستہ سے کہا۔

بوا یخنی گرم کر کے لے آئیں، شرمین نے دھیرے دھیرے چمچ سے انہیں پلائی۔ دادی اماں نے منع نہیں کیا۔ خاموشی سے پی لی۔ انہیں دوبارہ لٹانے کے بعد شرمین ان کے قریب ہی بیٹھ گئی......اور سمجھا کر کہنے لگی۔

''دادی اماں......! یہیں گلی کے نکڑ پر حکیم صاحب کا مطب ہے۔ میں پیاری دادی کے ساتھ جا کر آپ کا حال کہہ دوں۔ وہ دوا دے دیں گے؟''

''ہاں بیگم صاحب! منع نہ کریں۔ جب گھر کی دوا نہ لگے تو باہر کی لگا...کرتی ہے۔'' پیاری بوا بھی اس کی بات پر خوشامد سے بولیں۔ خلافِ توقع انہوں نے منع نہیں کیا۔ بلکہ خاموش لیٹی کسی نکتے پر غور کرتی رہیں۔

''بیٹی! پچھلے کئی برسوں سے تم ایک ڈاکٹرنی صاحبہ کے بچوں کو پڑھایا کرتی تھیں، اب ان سے رابطے میں ہو یا نہیں......؟'' اندر ہی اندر کسی نتیجے پر

پہنچ کر شرمین سے پوچھا۔

''کون ! ڈاکٹر شاکرہ صاحبہ، ہاں، ان کے بچے اب کالج اسٹوڈنٹ ہیں۔'' شرمین نے فوراً جواب دیا۔

''ہاں، انہی کے متعلق پوچھ رہی ہوں میں۔۔ وہ تمہیں مل سکتی ہیں کہیں؟''

''کیوں نہیں۔'' شرمین نے جوش وخروش سے جواب دیا۔ ''ظاہر ہے وہ اپنے گھر میں ہوں گی اور گھر ان کا اسپتال میں ہی تھا۔''

''بس پھر تم ایک کام کرو، انہی ڈاکٹرنی صاحبہ کے پاس چلی جاؤ، کچھ تفصیل میں تمہیں بتاؤں گی۔ تم سارا حال ان سے جا کہو۔'' دادی اماں نے مطمئن ہو کر کہا۔

''بہت اچھا دادی اماں.....'' شرمین نے مستعدی سے جواب دیا۔

''زیادہ بہتر یہ ہے کہ عبداللہ کو لے کر ابھی چلی جاتی ہوں۔ تاکہ پھر جلدی واپس بھی آؤں...... ولی اللہ اور پیاری دادی آپ کے پاس ہیں۔'' اتنا کہہ کر اس نے پھر وقت ضائع نہیں کیا۔ جلدی، جلدی تیاری کی۔ دادی اماں سے ضروری معلومات لیں اور عبداللہ کو ساتھ لے کر گھر سے باہر آ گئی۔

باہر کی فضا دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گئی۔ بادل خوب گھر، گھر آ رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا فراٹے سے چل رہی تھی اور سردی میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ سڑکوں، گلیوں میں لوگوں کا رش بھی کم تھا۔ شرمین نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اندر کمرے میں ہونے کی وجہ سے دادی کو موسم کی شدت کا احساس نہیں ہو سکا تھا ورنہ وہ کبھی اسے گھر سے ایسے وقت نکلنے نہ دیتیں۔ یہی سب سوچتے، سوچتے وہ بھائی کا ہاتھ پکڑے تیز، تیز قدموں سے اس اسپتال کی طرف چلی جا رہی تھی، جس کے احاطے میں ڈاکٹر شاکرہ کا بنگلا تھا۔ شکر یہ ہوا تھا کہ وہ بنگلے کے اندر جا پہنچی مگر بارش نہ برسی تھی۔

''ارے...... شرمین ۔۔ تم......!'' ڈاکٹر شاکرہ اسے لان میں ہی مل گئیں۔ دور سے ہی حیرت آمیز خوشی سے چلائیں۔ قریب آ کر زوردار انداز میں گلے لگایا پیار کیا پھر بڑی محبت سے عبداللہ کے گال تھپتھپاتے ہوئے دریافت کیا۔ ''یہ چھوٹا بھائی ہے۔ کیا نام ہے؟''

''جی ہاں......'' شرمین نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''اس کا نام عبداللہ ہے۔''

''ویری گڈ......'' وہ اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے اندر آئیں اور ڈرائنگ روم میں بٹھا کر خیر خیریت دریافت کرنے لگیں۔ شرمین نے ان کو اپنے آنے کا سبب بتاتے ہوئے مفصل کیفیت دادی اماں کے بیمار ہو جانے کی سنائی اور آبدیدہ ہو کر کہنے لگی۔

''ڈاکٹر صاحبہ! میری دادی اماں بہت زیادہ تکلیف میں ہیں ورنہ وہ مجھے کبھی اس موسم میں آنے نہ دیتیں۔ حیرت کی بات تو میرے لیے یہ ہے کہ انہوں نے ازخود آپ کا نام لیا اور اصرار کر کے آپ سے ہی اپنا حال کہنے کی اجازت دی ہے۔'' اس کی بات پر ڈاکٹر شاکرہ نے محبت سے اس کے ایک چپت رسید کرتے ہوئے کہا۔

''بھئی وہ ایک جہاندیدہ اور سمجھدار خاتون ہیں۔ اپنی حالت اور طبیعت کا بہتر ادراک ہے ان کو......اور یہ بہت اچھا ہوا کہ تم نے فوراً ان کے کہنے پر عمل کیا ہے۔ اب میں تمہاری خاطر داری کیے بغیر تمہارے ساتھ تمہارے گھر چل رہی ہوں۔''

''آپ! ہمارے گھر......؟''

شرمین نے حیرت سے اچھل کر ان کی طرف دیکھا۔ ''آپ...بذات خود ہمارے گھر چلیں گی؟ شاید مذاق کر رہی ہیں؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' ڈاکٹر شاکرہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''میرا تمہارا...... مذاق کا

رشتہ ہے بھی نہیں۔'' انہوں نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔
شرمین شرمندہ سی ہو کر خاموش ہوگئی۔
ڈاکٹر شاکرہ نے اس سے باتیں کرتے، کرتے اپنے دوائیوں کے باکس میں ضروری دوائیاں اور انجیکشن وغیرہ رکھے۔ عبد اللہ کے ہاتھ میں ٹافیوں کا پیکٹ زبردستی تھمایا۔ دراز سے گاڑی کی چابی نکالی لیکن پھر باہر نکلتے، نکلتے رک گئیں اور غور سے شرمین کی طرف دیکھنے لگیں۔
شرمین کچھ بھی نہ سمجھ سکی وہ عجلت میں ڈرائنگ روم سے باہر گئیں۔ فوراً ہی ان کی واپسی ہوگئی۔ ہاتھوں میں ایک نیلے رنگ کا گرم کوٹ تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے شرمین کو پہنایا اور کہنے لگیں۔
''اتنی شدید سردی میں فقط ایک شال اوڑھے چلی آئیں...... آئندہ اس کوٹ کو خود سے جدا مت کرنا، سمجھیں۔'' ان کے رعب اور محبت کے سامنے وہ کچھ بھی نہیں بول سکی۔ باہر نکل کر انہوں نے دونوں بہن، بھائی کو اپنے برابر فرنٹ سیٹ پر بٹھایا اور پل بھر میں گاڑی اسٹارٹ کردی۔ انہیں گاڑی چلاتے دیکھ کر یہ دونوں بہت مرعوب تھے۔ شرمین سے پوچھ، پوچھ کر وہ گاڑی گلیوں سے نکالتے ہوئے بالآخر ان کے گھر تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئیں۔
جس وقت وہ انجن بند کررہی تھیں۔ عین اس وقت بادل زور دار انداز میں گرجے۔ بجلی کالے بادلوں پر یکبارگی یہاں سے وہاں تک دو دھاری تلوار کی طرح کوندتی چلی گئی۔ عبداللہ نے ڈر کر بہن کا ہاتھ زور سے پکڑلیا۔
تبھی بارش دھا دھم برس پڑی۔ یہ تینوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر تقریباً بھاگتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوئے۔ شرمین ڈاکٹر صاحبہ کو لے کر دادی اماں کے کمرے میں آئی۔
انہوں نے ان کا مکمل تفصیلی معائنہ کیا۔ ان سے سوالات بھی کرتی جارہی تھیں۔ اچھی طرح چیک اپ کرنے کے بعد ان سے پوچھا۔
''اس وقت کچھ کھایا ہے آپ نے یا خالی پیٹ ہیں؟''
''بیٹی یخنی پی تھی۔ شرمین پلا کر تو آپ کے پاس گئی تھی۔'' دادی اماں نے جواب دیا۔
''یہ ٹھیک کیا اس نے۔'' انہوں نے مطمئن ہو کر کہا۔ پھر ایک انجیکشن تیار کر کے دادی اماں کو لگایا۔ بیگ میں سے مختلف دوائیں نکال کر تین خوراکیں بنائیں، ان میں سے ایک خوراک اسی وقت پانی منگوا کر اپنے ہاتھ سے کھلا دی اور شرمین کو بلا کر ہدایت دی۔
''یہ دو خوراک دوا ہے۔ اس میں سے ایک خوراک رات کھانے کے بعد کھلا دینا۔ دوسری خوراک کل صبح ناشتے کے بعد دینی ہے، یاد رکھنا۔''
شرمین نے ان کی ہدایات توجہ سے سنیں اور ''جی بہت اچھا۔'' کہہ کر تیزی سے باہر چلی گئی۔
تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک ٹرے اٹھائے ہوئے آئی اور چھوٹی میز پر رکھ دی۔ دادی اماں سے باتیں کرتے، کرتے ڈاکٹر شاکرہ چونک کر بولیں۔
''یہ تم...... اتنی جلدی کیا بنا لائیں؟''
''کچھ بھی نہیں...... بس یہ ہیں۔'' شرمین نے پلیٹ میں گرم، گرم پکوڑے ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔
''ارے پکوڑے! اور وہ بھی اتنی جلدی۔''
''اتفاق سے بیسن بھگا رکھا تھا اور بس چائے دم کی ہے۔'' شرمین نے شرمندہ ہو کر وضاحت کی۔
ڈاکٹر شاکرہ نے اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے تعریف کر کر کے پکوڑے کھانے شروع کردیے۔
مجموعی طور سے وہ ایک خوش اور کھلے ذہن کی باغ و بہار طبیعت والی خاتون تھیں۔ شرمین سے تو انہیں خاص طور سے بہت انسیت تھی۔ مثل اپنے بچوں کے چاہتی تھیں اور بہت خیال رکھتی تھیں۔ اس

کی بہت بڑی مثال آج ان کا دادی اماں کو دیکھنے خود یہاں تک چلے آنا تھا۔

دادی اماں کو تو وہ بہت ہی اچھی لگی تھیں۔ ان کا اپنائیت اور سچائی سے گندھا پُرخلوص لہجہ ان کے دل میں گھر کر گیا تھا۔

باہر بارش بہت زوروں میں ہو رہی تھی۔ سیاہ بادل چڑھے چلے آرہے تھے مگر وہ بے فکری سے بیٹھی دادی اماں سے باتیں کر رہی تھیں۔

جب چائے اور پکوڑوں سے انصاف کر چکیں اور پیاری بوا برتن اٹھا کر لے گئیں تو انہوں نے شرمین کو بلا کر اپنے قریب بٹھایا خود بھی سنجیدہ ہو گئیں پھر اسے دادی کو مخاطب کر کے کہنے لگیں۔

''بیماری چھوٹی ہو یا بڑی...... بہر حال بیماری ہی ہوا کرتی ہے مگر بیمار کو اور نہ تیمار دار کو بدحواس نہیں ہونا چاہیے۔ دنیا میں ہر بیماری کا علاج موجود ہے۔ پریشانی انسان لاعلمی سے اٹھاتا ہے۔ شرمین! تمہاری دادی کی بیماری بھی کوئی پریشان کن بیماری نہیں بلکہ ایک عام سی قابلِ علاج بیماری ہے۔ اس لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' پھر وہ دادی اماں کی طرف دیکھ کر بولیں۔

''آج اتوار ہے، اس لیے اسپتال بند ہے۔ کل پیر کے دن آپ کو خود تکلیف کرنی پڑے گی اور کسی بھی صورت اسپتال ضرور آنا ہوگا۔ دراصل وہاں ہمیں ایکسرے مشین کی سہولت حاصل ہے۔ اول تو یہ کہ دوسرے اسپیشلسٹ ڈاکٹر سے آپ کا تسلی بخش چیک اپ بھی ہو جائے گا اور ضروری ہوا تو اسی وقت کمر کا ایکسرے بھی ہو جائے گا پھر آپ کو یہ معلوم ہی ہے کہ تشخیص اگر درست ہو جائے تو علاج خود بخود درست ہوتا چلا جاتا ہے۔''

دادی اماں نے ان کی باتیں بغور سنیں۔ کچھ تفصیل پوچھنی چاہی مگر پھر شرمین کی صورت دیکھ کر خاموش رہیں۔ شرمین کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سپید پڑ گیا تھا۔

''کوئی ......خطرے والی بات تو نہیں ؟'' شرمین نے بے چینی سے پوچھا۔

''خطرے والی بات کیا ہوتی ہے؟'' ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے اسی سے پوچھ لیا۔

''مم...... میرا مطلب ہے کہ آپ ایکسرے کا کہہ رہی ہیں۔'' انہوں نے زور سے ہنس کر اسے ایک چپت رسید کی۔

''بڑی بی معلوم بھی ہے ایکسرے کیا ہوتا ہے؟'' پھر مزید وضاحت کیے بغیر انہوں نے دادی اماں سے رخصت چاہی اور باہر نکلنے سے پہلے ان پر جھکتے ہوئے بہت نرمی سے بولیں۔ ''آپ تیار رہیے گا، کل دس اور گیارہ کے درمیان میں خود آپ کو لینے کے لیے آجاؤں گی۔ ٹھیک ہے، اللہ حافظ......''

شرمین اور عبد اللہ انہیں گاڑی میں بٹھانے گئے۔ بارش کا زور اب ٹوٹ چکا تھا۔ تاہم بوندوں کا جلترنگ اب بھی بج رہا تھا۔ ہلکی، ہلکی بارش کے ساتھ ہواؤں کے جھکڑ سردی میں اضافہ کر رہے تھے۔ شرمین اندر آکر دادی اماں کے پاس بیٹھ کر ان کا سر دبانے لگی۔ عبداللہ اور ولی اللہ پڑھنے بیٹھ گئے۔ پیاری بوا باورچی خانے میں تھیں۔ شرمین بہت اداس اور متفکر سی تھی۔ دادی اس کی خاموشی کو پوری طرح محسوس کر رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے اس مخاطب کر کے کہا۔

''بیٹی! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کام درست کرے گا۔ اپنی حالت کو میں بھی اچھی طرح محسوس کر رہی ہوں مجھے خود سے زیادہ تم تینوں بہن، بھائیوں کی تنہائی کا خوب خیال ہے۔ یہی سب سوچ کر اور جلد صحتمند ہونے کی خواہش کے ساتھ میں نے تمہیں ڈاکٹرنی صاحبہ کے پاس بھیجا تھا کیونکہ ممکن ہے کہ ڈاکٹری علاج سے ہڈی کا یہ درد جلدی جاتا رہے۔ بس اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو۔''

''نہ خدا کے سوا ہم لوگوں کا ہے کون، دل ہر صبح اور ہر گھڑی اسی سے تو دعا گو رہتا ہے۔'' اس نے آبدیدہ ہو کر آہستہ سے کہا۔

''بس تو پھر ہنسی خوشی رہو۔ اللہ پر توکل رکھو، وہی بہتر کرے گا۔ نماز پڑھو اور عاجزی سے کام لو۔ تم منہ لٹکائے رکھو گی تو دونوں بچے اور پیاری بوا بھی سہمے رہیں گے اور ہمارا دل بھی پریشان رہے گا۔''

اتنے میں باورچی خانے سے فرصت پا کر پیاری بوا بھی تسبیح پڑھتی ہوئی آپہنچیں۔ شرمین بچوں کی پڑھائی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ بیچ، بیچ میں دادی اماں ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں پھر ان کی آنکھ لگ گئی تو یہ لوگ برآمدے میں آ گئے اور آہستہ، آہستہ باتیں کرنے لگے۔ کمرے کی نسبت یہاں ٹھنڈ زیادہ تھی مگر دادی اماں کے اچانک پڑ رہنے سے گھر میں اِک اداسی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

ڈاکٹر شاکرہ کی تسلی تشفی کے باوجود اس کا دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا تھا۔ اس نے عصر کے لیے وضو کیا اور نماز ادا کر کے نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ رب سے اپنی دادی اماں کی شفایابی کے لیے دعائیں مانگتی رہی۔ جب وہ جائے نماز تہ کر رہی تھی تو بہت سکون محسوس ہوا۔

آج اپنی الجھن کی وجہ سے اسے سردی کا احساس بھی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ باورچی خانے میں آ کر رات کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔

مغرب کے وقت دادی اماں اٹھ بیٹھیں۔ ماشاء اللہ پہلے سے بہتر نظر آئیں۔ ڈاکٹر شاکرہ کی دوا نے اثر دکھایا تھا۔ جبھی انہوں نے یہ کہا۔

''کمر کا درد تو دوا نے چن لیا جیسے۔''

شرمین اور پیاری بوا خوش ہو اٹھیں۔

اگلے دن ٹھیک دس بجے ڈاکٹر شاکرہ حسبِ وعدہ آ گئیں۔ شرمین اور دادی اماں تیار تھیں۔ ان کے ہمراہ اسپتال آ گئیں۔ مختلف مراحل سے گزار کر ڈاکٹر شاکرہ انہیں ایکسرے روم میں لے گئیں اور وہاں بیٹھے ڈاکٹر خاور کی آنکھیں جھپکنا بھول گئیں۔ اچانک شرمین کو اپنے سامنے پا کر وہ ساکت رہ گئے۔ حیرت تو شرمین کو بھی ہوئی تھی مگر دادی کی فکر نے اسے زیادہ حیران بھی نہ ہونے دیا۔

تھوڑی دیر میں ڈاکٹر خاور پر تمام صورتِ حال منکشف ہوئی تو وہ جو ایکسرے روم میں کسی کام سے گئے تھے پھر وہیں رک گئے۔

ایکسرے روم سے نکل کر وہ خود ان لوگوں کے ساتھ آرتھوپیڈک شعبے میں گئے۔ ڈاکٹر کو دکھانے سے دوائیں تجویز کرنے تک انہوں نے ایک لمحے کے لیے انہیں آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ حتیٰ کہ جب اسپتال سے باہر آئے تو ڈاکٹر شاکرہ سے مخاطب ہوئے۔

''ڈاکٹر! کل سے اب تک آپ دادی اماں کی خدمت کر رہی ہیں..... مگر اب مجھے بھی موقع دیجیے۔ اگر اجازت ہو تو گھر پر میں ڈراپ کر دوں انہیں؟''

''بسر و چشم..... آپ ضرور یہ خدمت انجام دیجیے۔ اس وقت میں آن ڈیوٹی ہوں اور آپ آف ڈیوٹی..... ہاں پوچھ لیجیے ان سے ... کیوں شرمین؟'' انہوں نے بات کرتے، کرتے شرمین کو مخاطب کیا۔ وہ خاموش رہی تو انہوں نے سنجیدہ ہو کر وضاحت کی۔

''شکر ہے خدا کا رپورٹیں ساری درست ہیں۔ فقط کمر کے ایک مہرے کا ذرا سا مسئلہ ہے جو دواؤں اور آرام سے سیٹ ہو جائے گا۔ دس انجیکشنوں کا ایک کورس بھی مکمل کروانا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر خاور بذاتِ خود تعاون کرنے کو کہہ رہے ہیں۔ خود گھر پر آ کر لگا دیا کریں گے۔''

شرمین نے بڑی ممنونیت سے ڈاکٹر خاور کی طرف دیکھا اور پھر ہاتھ پکڑ کر جلدی سے دادی اماں کو لیے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

ڈاکٹر خاور نے انجن اسٹارٹ کیا اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر گاڑی ڈال دی۔ آج ان کا دماغ مسرت کے ساتویں آسمان پر تھا۔

☆☆☆

''اچھا تو بھائی رستم علی خان کا کاروں کا شوروم ہے؟'' معصومہ نے بڑے اشتیاق سے دریافت کیا۔

''کوئی ایک شوروم تھوڑی ہے ان کا۔'' خاور نے دہی پھلکی کھاتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔

''ان کے تو کئی چھوٹے بڑے شہروں میں کاروں کے شوروم ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی طرح کے کاروبار ہیں، شہری جائداد ہے۔ شہر بھر کے چوٹی کے امیر لوگوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔''

''بھائی! آپ نے ان کی لڑکیوں کو دیکھ رکھا ہے، کیسی ہیں؟'' معصومہ نے دوبارہ بصد شوق پوچھا۔

''اللہ توبہ، میں کہاں سے دیکھ لوں گا ان کی لڑکیاں...... اماں نے دیکھ رکھی ہیں، ان سے پوچھ جا کر۔'' خاور نے کان کی لو چھو کر کہا۔

''نہ بابا...... اماں سے کون پوچھے...... اپنی شامت بلوانی ہے کیا؟'' معصومہ نے جلدی سے کہا۔ خاور ہنسنے لگے۔ روبی بہت دیر سے خاموش بیٹھی بہن، بھائی کی باتیں سن رہی تھی۔

''کیوں بی......! آپ بہت چپ بیٹھی ہیں۔ آپ کے الائچی کے جہاز تو نہیں ڈوب گئے؟'' خاور نے اسے چھیڑ کر پوچھا۔ روبی نے کسی سوچ سے چونک کر اُن کی طرف دیکھا اور بولی۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ تمہی لوگوں کی باتیں سن رہی تھی۔''

''آپ بھی اپنی ہونے والی دیورانی کے لیے کچھ پوچھیے۔ کوئی چھان بین کیجیے، یہ کیا کہ چپ چاپ بیٹھی سب کچھ سن رہی ہیں۔'' خاور نے شوخی سے کہا۔

''میری دیورانی تو بعد میں پہلے تو تمہاری بھاوج ہوگی، تم کرو سب کچھ۔'' روبی نے آہستہ سے کہا۔

''جل گئیں، جل گئیں۔'' خاور نے قہقہہ لگایا۔

''میں کیوں جلوں......؟ جلے میری جوتی۔'' روبی نے تیوری چڑھا کر کہا۔ پھر اچانک ہی اس کا موڈ بدل گیا اور اس نے مسکرا کر کہا۔

''ایک تو نہیں، سنا ہے دو لڑکیاں ہیں ان کی۔ ہو سکتا ہے ممانی جان کو ایک کے بعد دوسری بھی پسند آجائے۔''

''ہاں بھئی یہ تو ہے...... ممکن ہے دونوں پسند آجائیں۔'' خاور نے اس کی بات سمجھے بغیر ہاں میں ہاں ملائی۔ اب ہنسنے کی باری روبی کی تھی۔

''کیوں بھئی...... اس میں کیا ہنسنے کی بات ہے۔ لطیفہ تو ہوا نہیں۔'' انہوں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

''اگر دوسری بھی پسند آگئی تو آپ جناب کا کیا بنے گا؟'' روبی بدستور ہنستے ہوئے بولی۔

''میرا یا میرے بھائی کا......؟'' خاور کہاں چُوکنے والے تھے۔ اس کی چوٹ سمجھ کر برجستہ بولے۔ وہ یکلخت چپ ہوگئی۔ تبھی معصومہ روہانسی ہو کر چلائی۔

''نہ بابا نہ ہمیں نہیں چاہیے، نہ بابر بھائی کے لیے نہ خاور بھائی کے لیے...... خدا کے واسطے ایسی بے سُری باتیں مت کیجیے۔''

''چلو بابر بھائی کے لیے تو آپ کی چیخ سمجھ میں آگئی مگر یہ خاور بھائی کا کیا قصہ ہے؟ کیا انہیں کنوارا رکھنے کا ارادہ ہے؟'' خاور نے اسے ایک چپت رسید کر کے کہا۔

''اپنے خاور بھائی کے لیے ہم پہلے ہی ایک چاند سی دلہن ڈھونڈ چکے ہیں۔ سمجھے آپ یا مزید سمجھاؤں؟'' معصومہ نے لاڈ سے ان کے بال سنوارتے ہوئے جواب دیا۔

''اماں کو بھول گئیں؟ ایک بال بھی نہ چھوڑیں گی سر پر......''

''اللہ نہ کرے!'' معصومہ نے گھبرا کر بے اختیار ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''سچ کہہ رہا ہوں میں سو فیصد......''

''اس گھر میں کسی کی پسند و ناپسند نہیں چلتی۔ سوائے ہماری اماں جان کے...... اس لیے خوش فہمی میں مت رہنا۔''

''اللہ ڈرائیں تو نہیں خاور بھائی...... منہ سے اچھی فال نکالیں۔'' معصومہ نے خائف ہو کہا۔

''چلو فرض کرلیا کہ اماں کی طرف سے کوئی مخالفت کا اندیشہ نہیں ہے۔ مگر...... کیا معلوم تمہاری پسند کو بھی تم پسند ہو یا نہیں؟'' خاور نے اب دوسرا پینترا بدلا اور متفکر سے بن کر کہنے لگے۔

''اللہ خاور بھائی آپ تو بہت ہی خوفناک باتیں کررہے ہیں۔ یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ ہم سب کو اچھا نہ سمجھتی ہو۔ اگر ہمیں اچھا نہ سمجھتی ہوتی تو...... ہر روز ہمارے گھر آنا بھی پسند نہ کرتی۔'' معصومہ پھر چیخ پڑی۔

''لاحول ولا قوۃ ......'' خاور نے زور سے لاحول پڑھی۔ ''اسی لیے کہتے ہیں۔ عورت ناقص العقل ہوتی ہے۔ ارے میری پیاری بہنا، اچھا سمجھنے اور پسند ہونے میں بہت فرق ہے۔ تم تو اس طرح سے حمایت لے رہی ہو جیسے اس نے تم کو اپنی پسند بتادی ہے۔''

''روبی آپا......!'' اب معصومہ نے اس سے فریاد کی۔ ''آپ سن رہی ہیں خاور بھائی کی باتیں...... ہم دن رات ان کی بھلائی کا سوچتے رہتے ہیں۔ یہ ہیں کہ کس طرح مذاق اڑا رہے ہیں۔'' روبی بغور اُن کی طرف دیکھتی رہی۔ اظہارِ خیال نہیں کیا۔

خاور آج کل ہر شام شرمین کی دادی اماں کو انجکشن لگانے جارہے تھے مگر دانستہ سوچ سمجھ کر انہوں نے لڑکیوں سے یہ حقیقت پوشیدہ رکھی تھی۔ سوچتے تھے معلوم نہیں یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے۔ بلاوجہ میں ایک شریف لڑکی کو آزمائش میں ڈالا جائے۔ ویسے بذاتِ خود اندر ہی اندر بہت متفکر اور الجھن میں گرفتار رہتے۔

''اچھا یہ تو بتاؤ تم بات کس ذاتِ شریف کی کررہی ہو؟'' خاور نے بہن کو آزمانے کے لیے بن کر پوچھا۔

''شرمین کی...... اور کس کی۔ آپ اب تک سمجھے ہی نہیں کیا!'' معصومہ نے برجستہ جواب دیا۔

''اوہ...... اچھا، اچھا......'' انہوں نے بظاہر بے پروائی سے کہا۔ ''میں سمجھا سیٹھ رستم علی خان کی صاحبزادی کے متعلق کہہ رہی ہو۔ بھئی اماں تو ان کے حسن کے بہت قصیدے پڑھ رہی تھیں۔''

''ہماری شرمین کون سا کسی حسین و جمیل سے کم ہے۔'' معصومہ نے جل کر جواب دیا۔

''اب ایسے سوال جواب تو روبی آپا کو زیادہ جچتے ہیں۔ ہم کس قطار شمار میں ہیں۔'' خاور نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔

''نہیں...... اگر تمہاری مرضی سیٹھ رستم علی خان کی صاحبزادی سے ہی ہے تو کیا مضائقہ ہے۔ ان کی تو دو صاحبزادیوں کا سنا ہے کہ ممانی جان سے کہا جائے تو وہ دوسری کو بھی پسند کرلیں گی۔'' روبی نے غور سے خاور کی صورت دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''لیکن...... کس کے لیے؟'' خاور نے سنجیدہ صورت بنا کر کہا۔

''تمہارے لیے اور کس کے لیے؟''

''مگر...... جناب ہمارا ''دو عدد'' کرنے کا تو ہرگز ارادہ نہیں ہے، ہماری بہن تو ہمارے لیے کسی کو پسند کرچکی ہیں، کیوں معصومہ؟'' انہوں نے معصومہ کو اکسایا۔

''ہاں...... یہ تو سچ ہے۔'' معصومہ نے فوراً گردن ہلادی۔

یہ لوگ شمسہ پھپو کے لان میں بیٹھے باتیں

کررہے تھے۔ ساتھ، ساتھ گھر میں جاری کام اور رنگ روغن کے کام پر بھی بات ہورہی تھی۔

☆☆☆

''آپ کی ساری باتیں اپنی جگہ ٹھیک ہیں مولوی جی......'' بابا رحمت جو دیر سے سر جھکائے مولوی صاحب کی بتائی ہوئی تفصیل سن رہے تھے۔ دفعتاً کسی خیال میں ڈوب گئے۔ بالآخر کچھ دیر بعد بولے۔

''میں خود بھی جنگل بابو کی دل سے عزت کرتا ہوں۔ بہت پیار ہے مجھے اس محنتی اور خوش اخلاق اور سمجھدار لڑکے سے۔ اس کی شرافت میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں۔ جس دن سے وہ جنگل کے ریسٹ ہاؤس میں آکر رہا ہے، اس نے کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا ہے۔ اب آپ سے ایک مشورہ کیا بھی ہے تو اس میں کوئی برائی والی بات نہیں ہے۔ جہاں بیری ہوتی ہے وہاں چھوٹے بڑے پتھر آیا ہی کرتے ہیں مگر آپ یقین کریں کہ میں بہت مجبور ہوں...... میں اپنے لوگوں سے بندھا ہوا ہوں مولوی جی۔''

''یہ کیا جواب ہوا بھلا؟ کھل کر بات کرو رحمت......''

مولوی صاحب نے ان کا جواب بغور سنا پھر حیرت سے کہا۔

''دراصل مولوی جی بات اس کے اور ہمارے درمیان پھیلے ہوئے فرق پر آکر رک جاتی ہے۔ ہم اور وہ ایک سے ہرگز نہیں ہیں۔'' رحمت بابا نے تحمل سے جواب دیا۔

''یہ فرق بھی کوئی فرق ہے۔ کیا وہ کلمہ گو مسلمان نہیں ہے؟'' مولوی صاحب نے حوصلہ نہیں ہارا۔ بحث کرکے بولے۔

''میں...... یہ کب کہہ رہا ہوں؟'' رحمت بابا نے جلدی سے کہا۔ ''آپ اس کی حمایت کرتے ہوئے شاید بھول گئے ہیں کہ...... کتنا ہی اسے اچھا سمجھ لیں...... بالآخر وہ ہم میں سے نہیں ہے۔''

''لاحول ولا قوۃ!'' مولوی صاحب نے بڑی قرأت سے لاحول پڑھی۔ ''تم سمجھ دار ہوکر بڑی ہلکی بات کررہے ہو...... کتنے برسوں سے وہ ہمارے درمیان رہ رہا ہے، اس کی شرافت اور نیک نامی کا ہر کوئی گواہ ہے۔''

''میں مانتا ہوں، بالکل اس سچائی کو مانتا ہوں۔'' رحمت بابا نے بڑی سچائی سے تسلیم کیا۔ ''بے شک اس نے کبھی ہمارے اعتبار کو دھوکا دینے کی کوشش نہیں کی۔ اِدھر اُدھر کی ہر بستی کے لوگ اس کی خوبیوں کی تعریف کرتے ہیں اور رہا میں...... میں تو اس حد تک اسے پسند کرتا ہوں کہ...... کبھی اسے اپنے گھر کے اندر آنے جانے پر روک ٹوک نہیں کی کیونکہ میں نے بھی یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں۔ انسان، انسان کی پہچان ہے مجھے...... پھر میں کیوں گھبراتا اس سے۔ وہ ہماری بستی میں ایک پردیسی کی حیثیت سے آیا تھا۔ اس کی خبر گیری رکھنا ہم سب کا دینی فرض تھا مگر...... اس سے اپنی بیٹی کے ناتے کوئی رشتے داری قائم کرلوں، یہ تو میں نے کبھی...... خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔''

''مگر رحمت......! اس میں برائی بھی کیا ہے؟'' مولوی صاحب نے زور دے کر کہا۔ ''سچ پوچھو تو یہ لڑکا مجھے اس لحاظ سے بہت اچھا لگا ہے۔ اس کے کہنے کے بعد میں نے اس انداز سے سوچا تو مجھے تمہاری خوش بختی نظر آئی۔ غیر ہے تو کیا ہوا...... مسلمان تو ہے......! ہمارے دین اور مذہب کا ہے، اسلام روپے پیسے کی اونچ نیچ کو نہیں دیکھتا...... اس کی نظر میں چھوٹا ہو یا بڑا ہو، سب برابر ہیں۔''

''آپ کا کہنا سر آنکھوں پر مولوی جی۔'' رحمت بابا نے بڑے ادب سے جواب دیا۔ ''برا وہ مجھے بھی نہیں لگا...... لیکن...... ہر اچھی لگنے والی چیز اپنی ہو جائے یہ ضروری تو نہیں۔ ذرا اس طرح سوچیں۔''

''کیوں...... کیوں ضروری نہیں ہے؟'' مولوی

صاحب نے سادگی سے پوچھ ڈالا۔

''اسلام تو کہتا ہے ہر اچھی چیز کو اپنانا نیکی ہے، ثواب ہے۔''

''ہاں...... ہر بات کو جو اچھی ہو اپنانا ثواب ہے، ہے ناں......'' رحمت بابا سمجھانے والے انداز میں بولے۔ ''مگر ہر اچھے انسان کو اپنا لینا کبھی کبھی پوری برادری کو ناراض کر دیتا ہے، یہ شادی بیاہ کا معاملہ ہے، گڈے گڑیا کا کھیل تماشا نہیں۔ ہم مدت سے ایک دوسرے کے دکھ درد کے ساجھی، ساتھی ہیں، وہ سب لوگ کیا کہیں گے؟''

''وہ کیا کہیں گے؟ بیٹی تو تمہاری اپنی ہے ناں......'' مولوی صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔

''اس میں کیا شک ہے؟'' رحمت بابا نے فوراً ہاں میں ہاں ملا کر جواب دیا۔ ''مگر شادی بیاہ کا فیصلہ میں اپنے لوگوں سے صلاح کیے بغیر نہیں کر سکتا۔ ان سب سے رائے لیے بغیر میں اپنی بیٹی کا ہاتھ ایک پردیسی کے ہاتھ میں تھما دوں؟ کل کو سب لوگ مجھے یہی طعنہ دیں گے کہ روپیہ، پیسہ اور مالی خوشحالی دیکھ کر...... ایک پردیسی پر تو ریجھ گیا اور اپنوں کی کوئی حیثیت نہ جانی۔''

''ہاں...... یہ بات تو ہے۔'' اس دفعہ مولوی صاحب نے قائل ہو کر سر ہلایا۔ ''تمہارا یہ نکتہ میرے دل کو لگا۔ ویسے یہ بات میں نے جنگل بابو کو سمجھانی چاہی تھی...... مگر تم جانو یہ منچلی عمر کب بوڑھوں کے مسئلے مسائل کو سمجھنا چاہتی ہے۔ بہر حال...... تم ایسا کرو کہ کسی دن سب اپنوں کو اکٹھا کر ڈالو۔ میں بھی موجود رہوں گا۔ تم سب کے بیچ اس سوال کو رکھ دو۔ ایک کی نسبت بہت سوں کی رائے بہتر ہوتی ہے۔''

رحمت بابا نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ منہ سے کچھ نہیں بولے۔ اپنا صافا کندھے پر ڈالا اور لاٹھی ٹیکتے ہوئے اپنے جھونپڑے کی طرف چل دیے۔ چہرے پر گہرے تفکرات کی چھاپ تھی۔

آج مولوی صاحب سے حقیقتِ حال معلوم ہونے کے بعد رحمت بابا کو حیرت اور مسرت کا زور دار جھٹکا لگا تھا۔

اگر جو بستی کے لوگوں کی پسند و ناپسند کا خیال نہ ہوتا تو وہ ذاتی طور پر اس سنجوگ کو اپنی خوش نصیبی سمجھتے۔ حقیقت یہی تھی کہ خرم انہیں دل و جان سے پسند تھا۔ وہ کئی برسوں سے سب کے درمیان گھل مل جانے کے بعد اجنبی نہ رہا تھا۔ اپنی بیٹی کا خوشگوار اور خوش آئند مستقبل کس کو عزیز نہیں ہوتا۔

جبکہ یہاں اس جنگل میں خرم کی حیثیت تو اچھی خاصی شہزادوں کی سی تھی۔ کچھ خدا نے اسے بنایا بھی فرصت سے تھا۔ سونے پر سہاگا دل موہ لینے والے طور اطوار، اخلاق، ملنساری، خوش خلقی اور خوش گفتاری...... اچھی جدید تراش خراش کے لباس میں وہ بستی والوں سے علیحدہ نظر آتا تھا۔ سب اس سے حد درجہ مرعوب رہتے تھے۔

بھلا رحمت بابا اسے کیوں نہ بطور داماد پسند کرتے۔ مگر اپنے، اپنے علاقوں کا رہن سہن، رسم و رواج اور طور طریقے بھی تو ہوتے ہیں آخر......! ہر قومیت اپنے کسی نہ کسی اصولوں کے تحت زندگی گزارتی ہے۔ لہٰذا رحمت بابا کا جواب اور خیال دونوں درست تھے۔ وہ اپنوں سے کٹ کر جی سکتے تھے اور نہ اکیلے لڑکی کی زندگی کا فیصلہ کر سکتے تھے۔

ان کی تمام رات پریشانی اور فکرمندی سے کروٹیں بدلتے گزری۔ رات بھر انہیں عجیب و غریب خیالات خوفزدہ کرتے رہے، ستاتے رہے۔ زندگی کی اگلی پچھلی کہانیاں یاد آتی رہیں۔

ریشم بی بی کو انہوں نے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھ کر پرورش کیا تھا۔ وہ اکثر اس کے مستقبل کے لیے مضطرب رہا کرتے تھے۔ مگر لاکھ چاہتے ہوئے بھی وہ ابھی تک اس کے لیے کوئی فیصلہ نہ کر پائے تھے۔

اب...... اچانک ہی خرم درمیان میں آ گیا تھا۔ مولوی جی نے اس کی بھرپور نمائندگی کی تھی مگر ان کی شدید حمایت کے باوجود وہ اتنی آسانی سے اپنی رضامندی دینے سے قاصر تھے۔ مجبور تھے، بے بس تھے...... انہیں اپنی لاچاری کا پورا احساس تھا۔ سوچنے، سمجھنے اور فیصلہ لینے کے لیے انہیں مہلت درکار تھی۔

رات بھر مولوی صاحب کی باتیں ان کی سماعت سے ٹکراتی رہیں۔ وہ ان کے کہے ہوئے ایک، ایک جملے کے معنوں پر غور کرتے رہے۔ جھونپڑے کے دوسرے گوشے میں ریشم بی بی ہر فکر اور خیال سے بے نیاز رضائی میں لپٹی گہری نیند سو رہی تھی۔ دنیا اور دنیا میں رونما ہونے والے واقعات و انقلاب سے بے خبر اور بے فکر تھی۔

''لڑکی کا باپ ہونا بھی کتنا بڑا ستم ہوتا ہے۔'' بابا کے دل پر چوٹ سی پڑی۔ وہ اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ بوڑھی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ دماغ کی اسکرین پر بے شمار گزرے برسوں مہ و سال کے لمحات جگنوؤں کی طرح جلنے بجھنے لگے۔ یادوں کی بارات دل کے آنگن میں چھما چھم اترنے لگی۔

باہر سے پاگل ہواؤں کے جھکڑ جھونپڑے کے در و دیوار کو ہلائے دے رہے تھے۔ سردی کی شدت نے جانوروں کو بھی سہما ڈالا تھا اور وہ اپنے اپنے ٹھکانوں میں دبکے ہوئے تھے۔

کبھی کبھی دور کہیں کسی بھٹ میں چھپے، سردی کھائے ہوئے گیدڑ کے رونے کی آواز ابھرتی...... اور جنگل کی سائیں، سائیں میں گونجتی ہوئی معدوم ہو جاتی۔ لمحات گزرتے رہے، رات آگے ہی آگے بڑھتی گئی اور رحمت بابا حالات اور واقعات کی لہروں میں دم بدم ڈوبتے ابھرتے رہے۔ ان کا بوڑھا اور دلفگار سینہ کبھی، کبھی زور سے سانسیں بھرتا کبھی کھانسنے لگتا، سوچوں کی پگڈنڈیاں ان کے سہج سہج قدموں کی آہٹوں سے آباد رہیں۔

رات پوری سوتی جاگتی کیفیت میں گزارنے کے بعد رحمت بابا کو اگلی صبح بخار آ گیا۔ شام تک گھٹنوں کا پرانا درد بھی اس قدر بڑھا کہ وہ اگلے چند دنوں تک اپنے جھونپڑے ہی میں محدود ہو کر رہ گئے۔ نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد تک نہ جا سکے۔ کھانسی بھی زور پکڑ گئی۔

اس اثنا میں خرم نے مولوی صاحب کے پاس دو چکر لگا ڈالے۔ انہوں نے اسے دونوں مرتبہ صبر سے انتظار کرنے کی بھرپور تلقین کی۔

ہزار چاہنے کے باوجود وہ بابا کے بیمار ہو جانے کی خبر سن کر ان کے پاس نہ آ سکا۔ کیونکہ مولوی صاحب کی معرفت اپنا مدعا بیان کر دینے کے بعد ان کے سامنے آنے سے جھجک محسوس کر رہا تھا، وہ دل پر جبر کر کے رہ گیا۔

سردی کے چھوٹے، چھوٹے دن اور ٹھٹھری کالی راتیں کچھ آگے کو سرک گئیں۔ کچھ وقت مزید گزر گیا۔ بالآخر بابا کا بخار ٹوٹ گیا۔ ریشم کی خدمت اور دیکھ بھال رنگ لائی، بابا اٹھنے بیٹھنے کے قابل ہو گئے اور پھر جھونپڑے کی محدود دنیا سے باہر بھی نکل آئے مگر خرم کے لیے کوئی جواب نہ بن پڑا ان سے۔

کئی شب و روز بیت گئے۔ ریشم بی بی ہر بات، ہر تغیر سے بے خبر، بے نیاز اپنے روزمرہ کے معمولات میں مصروف رہی...... اسے یہ بات بتاتا بھی کون بھلا؟

خرم پر ایک دفعہ پھر بے چینیوں اور بے قراریوں کی یلغار ہو گئی۔ رحمت بابا کی مستقل خاموشی اور عدم دلچسپی اسے نئے، نئے وہموں اور گمان میں مبتلا کرنے لگی۔

اس کے دل و دماغ پر وہی وحشت دستک دینے لگی۔ ''کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ویسا نہ ہو جائے......'' کے چکر میں اس نے ایک بار پھر مولوی صاحب کے حجرے کی زنجیر جا ہلائی۔ اپنی کیفیتِ انتظار سنائی۔ اب تو مولوی صاحب بھی سوچ میں پڑ گئے۔

''آخر رحمت ''ہاں'' یا ''نہ'' میں جواب دے

کر معاملے کی طوالت مختصر کیوں نہیں کرتا۔ حسنِ اتفاق سے اگلے ہی دن مولوی صاحب کو موقع مل گیا۔

وہ قصبے سے کھانے پینے کا سامان خرید کر چلے آرہے تھے کہ بستی سے باہر جنگل کے کنارے، کنارے رحمت بابا اپنی بکریاں چراتے نظر آگئے۔ اس وقت ظہر کی اذان میں بہت دیر باقی تھی۔ مولوی صاحب نے انہیں جا پکڑا اور آج دو ٹوک بات کرنے کی نیت سے انہیں اس راہ گزر سے ایک طرف برگد کے پیڑ تلے لا بٹھایا۔ چاروں طرف خوب تیز پیلی، پیلی دھوپ بکھری ہوئی تھی اور سردی بے نام سی محسوس ہو رہی تھی۔ دونوں کے درمیان ایک بار پھر وہی موضوع چھڑ گیا۔ یہاں سنسان جگہ پر ان دونوں کے سوا کوئی کہنے، سننے والا تھا نہیں۔ دیر تک یہی مسئلہ زیرِ بحث رہا۔

بالآخر دونوں کے درمیان یہ طے پا گیا کہ آنے والی کل نمازِ جمعہ کے بعد رحمت بابا اپنے رشتے دار افراد کے درمیان یہ مسئلہ رکھ کر ان کی رائے معلوم کریں گے ..مولوی صاحب کی موجودگی میں۔ جب مولوی صاحب کو قدرے چین نصیب ہوا تو انہوں نے اپنا سودا سلف دوبارہ اٹھایا اور بستی جانے کا قصد کیا۔ جاتے، جاتے بابا کے شانے پر محبت سے ہاتھ رکھا اور سچائی سے کہنے۔

''رحمت! میں اور تم اسی بستی میں پل بڑھ کر جوان ہوئے اور اب بڑھاپا دیکھتے سالوں گزر گئے ہیں۔ مگر ایک دوسرے سے ہم نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، میں جو اس لڑکے جنگل بابو کے لیے تمہیں بار، بار قائل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تو خدا کے لیے تم کہیں مجھ سے بدگمان نہ ہو جانا...... ریشم بیٹی تمہاری طرح مجھے بھی کم عزیز نہیں ہے...... ظاہر ہے جنگل بابو سے میرا کوئی رشتہ ناتا تو ہے نہیں۔ وہ تو اس نے خود ہی مجھ سے اس بارے میں اصرار کر کے رشتہ دلوانے کا ذکر کیا تو پھر مجھے بھی خیال آ گیا۔ بلکہ اس موضوع پر میں نے جوں، جوں غور کیا، توں، توں مجھے ذاتی طور سے یہ رشتہ اچھا لگتا چلا گیا۔ مجھے اس رشتے میں کوئی عیب دکھائی نہیں دیا۔ اچھا رشتہ دستیاب ہو جائے تو کتاب و سنت کی روشنی میں مناسب چھان بین کرنے کے بعد غیر ضروری مخالفت کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ سیانی ہو جائیں بیٹیاں تو اپنے گھروں میں ہی سجتی ہیں۔ اگر ریشم بیٹی کے نصیب سنور جائیں تو اس سے بڑھ کر خوش نصیبی اور کیا ہوگی۔'' مولوی صاحب اپنے تئیں بہت سہولت سے سمجھا رہے تھے۔

''دیکھو رحمت! میری نیت پر کسی طرح کا شک و شبہ مت رکھنا...... اگر میری کوئی بات بری لگی ہو تو...... میں دونوں ہاتھ باندھ کر معافی چاہوں گا...... تمہاری بیٹی، میری بیٹی ہے...... آگے تم اپنی مرضی کے مالک و مختار ہو۔''

رحمت بابا کی آنکھوں میں پہلے ہی ساون بھادوں اتر آیا تھا۔ ان کا بدن ہلکا، ہلکا کپکپانے لگا...... جو کچھ مولوی صاحب نے کہا وہ اس سے زیادہ نہ سن سکے، یہ سب کچھ ان کے اعصاب کے لیے کافی تھا یکلخت ان کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا۔ وہ بے اختیار ایک لفظ بھی زبان سے نکالے بغیر ان سے لپٹ گئے اور پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگے کسی چھوٹے سے معصوم بچے کی طرح۔ مولوی صاحب کا دل بھی بھر آیا۔ وہ اپنا سامان زمین پر رکھ کر ان کو تسلی و تشفی دینے لگے۔

☆☆☆

دس انجیکشنوں کا کورس مکمل ہوتے، ہوتے دادی اماں ماشاء اللہ اٹھنے بیٹھنے کے لائق ہو گئیں۔ شرمین نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس دوران بحالتِ مجبوری ٹیوشن جو ڈاکٹر خاور کے ہاں پڑھائی تھی، وہاں سے دو چھٹیاں بھی کرنی پڑیں مگر حیرت انگیز طور پر نائمہ بیگم نے اس کی غیر حاضری کا نوٹس نہیں لیا اور اپنی ہی کسی طرح کی ادھیڑ بن میں لگی رہیں۔

ڈاکٹر خاور برابر ہر شام دادی اماں کو انجیکشن

لگانے آتے رہے۔ شرمین ان کی بہت احسان مند تھی کیونکہ خود اسے بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ اس سلسلے میں کس سے مدد لے مگر اس کے پریشان ہونے سے پہلے ہی کچھ کہے سنے بغیر ڈاکٹر خاور نے اس کی مشکل حل کر دی تھی اور نیکی کے فرشتے کی طرح ظاہر ہو کر اس بے یارو مددگار کنبے کا سہارا بن گئے تھے۔

دادی اماں یہی سمجھتی رہیں کہ ڈاکٹر شاکرہ نے انجیکشن لگانے کے لیے کسی کو مقرر کیا ہے۔ شرمین نے بھی مصلحتاً انہیں نہیں بتایا تھا کہ وہ ان کے بہن بھائیوں کی ٹیوٹر ہے۔ ان دنوں دادی بھی ڈاکٹر خاور سے بے حد مانوس ہو گئی تھیں اور ان سے بے حد پیار سے پیش آتی تھیں۔ لیکن اس دوران ڈاکٹر خاور خود بڑے سنجیدہ رہے اور انہوں نے شرمین سے تو اتنی لاتعلقی اختیار کیے رکھی گویا اس کا اس گھر سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ حقیقت تو یہ تھی کہ ان کے اسی سرد سے لاتعلقی والے رویے کی بنا پر شرمین نے بھی ان کا تعارف اپنی دادی سے نہیں کروایا تھا اور خود بھی دور، دور رہی تھی۔

انجیکشنوں کا کورس پورا ہونے کے بعد ڈاکٹر شاکرہ نے اسپتال لے جا کر ان کا ایک دفعہ پھر سے ایکسرے کرایا تھا اور مستقل کھانے والی دوائیں بھی اسپیشلسٹ سے لکھوا دی تھیں۔ دواؤں کا وہ نسخہ وہیں پر ڈاکٹر خاور نے شرمین سے لے لیا تھا اور جب شام کو وہ آئے تو بہت ساری دواؤں کے ساتھ آئے تھے۔ اس دن انہوں نے پہلی بار شرمین کو بٹھا کر تمام دوائیوں کی تفصیل اور کھلانے کے اوقات اور طریقے از بر کرائے اور کئی ہدایات کے ساتھ دادی کو سلام کر کے چلے گئے تھے۔ بعد میں دادی اماں انہیں کئی دن تک یاد کرتی رہیں۔ پیاری بوا کو بھی وہ بہت بھائے تھے مگر انہیں شکوہ تھا کہ..... ”ڈاکٹر صاحب نے میرے ہاتھ کی دم دی ہوئی چائے ایک دن بھی نہیں پی۔“

گھر کے معمولات دوبارہ اپنی پرانی ڈگر پر



سالِ نو پر

اس نے مجھے پھولوں کا گلدستہ بھیجا ہے
میں نے عقیدت سے بے ساختہ
پھولوں کو چوم لیا
پھولوں کے پیچھے چھپا ہوا کانٹا
میرے نرم ہونٹوں پر چبھ سا گیا ہے
پھول میرے ہاتھوں میں مہک رہے ہیں
زخم بھی ابھی تازہ ہے
کیا اس نے سالِ نو پر
نئے مفہوم نئے معنی دے کر
کوئی پوشیدہ پیغام بھیجا ہے

شاعرہ: سیما سراج، کراچی

آ گئے تھے۔
ایک اتوار کو شرمین گھر پر تھی۔ دن گزر چکا تھا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ چکی تھی۔ اسے چمکتی ہوئی دھوپ کی اجلی، اجلی کرنیں خوشگوار محسوس ہوئیں۔ اس نے پیاری بوا سے کہہ کر صحن میں پلنگ بچھوایا اور بستر لگوا کر دادی اماں کو وہیں لے آئی۔
ہر طرف پھیلی ہوئی نرم گرم دھوپ انہیں بھی بہت بھائی...... جسم کے اندر ایک چستی اور حرارت سی گھوم گئی۔ جاڑے کی چمکیلی اور شفاف دھوپ میں خوشگوار تمازت تھی۔ شرمین اندر سے کنگھا اور تیل کی شیشی اٹھا لائی۔ تیل ہلکا نیم گرم کر کے ان کے ۔ میں مالش کرنے لگی۔ اس کے نرم، نرم ہاتھوں کا لمس انہیں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اور وہ بہت دیر تک اس سے مالش کرواتی رہیں۔ بے حد سکون کا احساس ہو رہا تھا انہیں۔
''لاؤ بٹیا...... میں مالش کروں اپنی بیگم صاحب کے۔'' پیاری بوا بھی ایک اسٹول پر آ بیٹھیں اور محبت سے بولیں۔
''نہیں بوا...... آج تو آپ مجھے ہی کرنے دیجیے......'' شرمین نے نرمی سے جواب دیا۔
دادی اماں نے بھی آنکھ کے اشارے سے منع کیا۔ وہ چپ ہو بیٹھیں۔ کافی دیر کے بعد شرمین نے کنگھا اٹھا کر بال سلجھانے شروع کر دیے۔ اچھی طرح آہستہ، آہستہ سلجھانے کے بعد اس نے چٹیا گوندھ کر انہیں لٹا دیا اور خود ہاتھ دھونے کے لیے چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئی تو ہاتھ میں حریرے کا پیالہ تھا۔ دادی اماں کو پلا کر ہلکے ہاتھوں سے ان کی کمر دبانے لگی۔ پیاری بوا خالی پیالہ لے کر باورچی خانے میں چلی گئیں۔
سورج اب کچھ اور اوپر ہو چکا تھا۔ دھوپ کی ترمی گرمی میں اضافہ ہو گیا تھا۔
اتنے میں دروازے پر کھٹکا ہوا۔ پیاری بوا نے جا کر کھولا تو باہر سے پڑوس کی خالہ ذکیہ اندر داخل ہوئیں اور ان لوگوں کو دھوپ میں بیٹھے دیکھ کر سیدھی اسی طرف آئیں۔
''ارے ذکیہ......! آج کدھر بھول پڑیں۔ آؤ، آؤ...... بیٹھو یہاں میرے پاس......'' دادی نے انہیں اپنے پاس بٹھا لیا۔
''آپ کے سوال کا جواب تو بعد میں دوں گی پہلے اپنی مقدر والی بٹی کی تو بلائیں لے لوں۔ اللہ نے خوب سنی غریبوں کی، اللہ تیرا شکر ہے۔'' ذکیہ خالہ نے قریب کھڑی شرمین کے سلام کا جواب دیتے ہوئے جھٹ سے اسے گلے لگا لیا اور پیار کرتے ہوئے کہا۔
''کیا کہہ رہی ہو ذکیہ......! کچھ کھل کر بتاؤ؟'' دادی اماں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔
''پہلے مٹھائی کھلائیں تو...... خوش خبری سناؤں۔'' وہ ان کے قریب بیٹھ کر چادر اتارتے ہوئے بولیں۔ شرمین غور سے ان کی صورت دیکھنے لگی۔ پیاری بوا بھی جاتے جاتے رک گئیں۔
''ارے مٹھائی بہت...... پہلے خبر تو سناؤ۔''
''کم سے کم منہ تو میٹھا کروا دیجیے۔ مٹھائی ادھار رہی۔'' شرمین کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا مگر پیاری بوا لپک کر گئیں اور باورچی خانے سے شکر دان اٹھا لائیں۔ ذکیہ خالہ نے ہنستے، ہنستے ایک چمچ چینی پھانکی اور بوا کو شکر دان واپس کرتے ہوئے کہنے لگیں۔
''سنیے، سنیے...... سب لوگ سنیے۔ کانوں کو کھول کر سنیے اور جگر کو تھام کر سنیے کہ ہماری بٹیا شرمین اب سے چند دنوں کے اندر گورنمنٹ ٹیچر ہو جائے گی۔ اس کا آرڈر نکلنے والا ہے۔''
''بارِ الہا! شکر ہے تیرا لاکھوں بار......'' دادی اماں کی زبان سے بے اختیار نکلا۔
خبر اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ شرمین کو یقین ہی نہیں آیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ، پھاڑ کر خالہ ذکیہ کو دیکھنے لگی۔ اپنے تمام ڈاکومنٹس انہیں دے کر وہ تو

کب کی بھول بھی چکی تھی۔

''لیکن...... ذکیہ یہ تو بتاؤ کہ تمہیں کس طرح معلوم ہوا؟'' دادی اماں نے انہیں مخاطب کر کے پوچھا۔

''اے باجی...... ! ہمارے خان صاحب بھلا کسی سے کم ہیں کیا؟''

''اچھا، اچھا خان صاحب نے تو شرمین کے کاغذات منگوائے تھے تم سے۔ اچھا تو انہی نے کوشش کی ہوگی اس سلسلے میں۔'' دادی اماں خوش ہو کر بولیں۔

''تو اور بھلا کون کرے گا۔

بھئی خان صاحب نے تو جب سے سنا تھا کہ شرمین بٹیا اتنا بہت سا ماشاء اللہ پڑھی ہوئی ہیں' انہیں تو اس کی نوکری کی فکر لگ گئی تھی۔''

''اللہ ان کا بھلا کرے...... ورنہ یہاں کون بیٹھا ہے ایسا درد مند۔'' دادی اماں نے دعا دے کر کہا۔

''نہیں باجی...... انسان کو کبھی خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ وہ رب مسب الاسباب ہے اور انسان ہی انسان کی دوا ہوا کرتا ہے۔ خان صاحب نے ایسا سوچا تو کوئی انوکھا نہیں کیا۔ وہ اکثر شرمین کو ٹیوشن پڑھانے کے لیے جاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ کہتے ہیں بہت لائق فائق اور سمجھدار بچی ہے۔ اللہ نصیبوں والی کرے۔'' خالہ ذکیہ نے مسکرا کر کہا۔

اپنی تعریف سن کر شرمین کانوں تک سرخ ہوگئی۔ دل میں کھد بد مچی ہوئی تھی کہ جلد از جلد اپنی ملازمت کی تفصیل سنوں۔ مگر ذکیہ خالہ کی تو باتیں ہی طویل ہوتی جارہی تھیں۔ مجبوراً وہ اٹھ کر ان کے لیے چائے بنانے چلی گئی۔ واپس آئی تو وہ کہہ رہی تھیں۔

''بس بھئی خدا کا کرنا کیا ہوا کہ آسامیاں تو آئی ہوئی تھیں۔ کچھ پہلے کسی نے ان سے ذکر کیا تھا۔ خان صاحب کو شرمین تو یاد ہی تھی چنانچہ انہوں نے فوراً اس کے کاغذات دفتر میں جمع کروا دیے اور اب تو ماشاء اللہ وہاں سے سمجھو ہاں ہو چکی ہے۔''

''خالہ جان تقرری کس اسکول میں ہوگی؟'' شرمین نے چائے کی پیالی ان کو دیتے ہوئے بصد اشتیاق پوچھا۔

''بیٹی! تمہارے خالو کہہ رہے تھے کہ اگلے چند دنوں میں انشاء اللہ آرڈر پاس ہو جائے گا، جس اسکول کا بھی ہو، فکر مندی کی کوئی بات نہیں۔ فقط جوائن کرلو پھر سہولت سے نزدیکی اسکول دلانا میرا کام ہے۔'' انہوں نے پیالی تھام کر جواب دیا۔

شرمین کے سینے میں خوشگوار سی دھڑکنیں... سرسرانے لگیں۔

''الٰہی تیرا لاکھوں بار شکر ہے۔ ذکیہ! تم خان صاحب کا ہماری طرف سے بہت' بہت شکریہ ادا کر دینا۔ ان کا احسان ہم مرتے دم تک نہ اتار سکتے ہیں نہ بھول سکتے ہیں۔'' انہوں نے پیالی تھام کر جواب دیا۔

''باجی...... آپ نے پھر وہی غیریت والی باتیں کرنی شروع کر دیں۔ شکریہ ادا کرنے کی کیا بات ہے...... شرمین ہماری بھی تو بیٹی ہے۔'' ذکیہ خالہ نے چائے کی چسکی لے کر کہا۔

''اچھے کام کا اجر اللہ دیتا ہے اس کے پاس بھی محفوظ ہوتا ہے۔ ہم تو فقط دعائیں دے رہے ہیں۔ اللہ تم دونوں کو سکھی رکھے۔'' انہوں نے اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں دعاؤں کی تو بہت ضرورت ہے، وہ دیے جائیں۔'' ذکیہ خالہ نے ہنس کر کہا۔

''خالہ جان! آرڈر میں ابھی چند دن لگ جائیں گے، ہے ناں......؟'' شرمین نے کچھ سوچتے ہوئے ان سے دریافت کیا۔

''ہاں ایسا تو ہے خان صاحب نے مجھے اسی طرح بتایا ہے۔ کہتے تھے ویسے کام تو پورا پکا ہو چکا ہے۔'' شرمین گردن ہلا کر رہ گئی۔ زبان سے کچھ بولی نہیں۔ ذکیہ خالہ اس کی صورت بغور دیکھتے ہوئے مزید بولیں۔

''کہیں تم اپنی ٹیوشنوں کے متعلق تو کچھ نہیں سوچنے لگیں؟ لیکن بیٹی......! میرا تو یہ خیال ہے کہ ابھی تم کسی کو بھی جواب مت دے بیٹھنا۔ حالانکہ تمہارے خالو نے پوری تسلی اور ذمے داری سے نوکری کا بتایا ہے مگر میں سمجھتی ہوں کہ احتیاطاً تم ٹیوشن پر برابر جاتی رہو تو بہتر ہے۔''

''میں بھی ایسا ہی سوچ رہی ہوں خالہ جان! جو کچھ کروں گی، سوچ سمجھ کر کروں گی۔ آپ بے فکر رہیے۔'' شرمین نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''جیتی رہو بیٹی......'' انہوں نے اسے پیالی واپس دیتے ہوئے کہا۔

''ویسے خدا کا شکر ہے کہ اب بہت جلد تمہیں گھر، گھر جا کر ٹیوشن پڑھانے سے نجات مل جائے گی۔ انشاء اللہ ایک ہی تنخواہ میں برکت ہو جائے گی۔'' دادی اماں بولیں۔

''آمین ثم آمین۔'' پیاری بوا جو دیر سے چپ بیٹھی سب دیکھ اور سن رہی تھیں۔ نہایت عاقلانہ انداز میں گویا ہوئیں۔

''بیگم صاحبہ! سرکاری ملازمت کی تو بات ہی دوسری ہوتی ہے۔ آندھی آئے یا طوفان، وقت پر تنخواہ تو پوری ملتی ہے ناں...... اور پھر سو باتوں کی ایک بات......سرکاری ٹیچر......''

☆☆☆

بالآخر مہینے کی چھبیس تاریخ آگئی کہ اصغری کے لائے گئے پیغام کے مطابق نائمہ بیگم کو سیٹھ رستم علی کے ہاں بغرضِ رشتہ جانا تھا سو نائمہ بیگم اور شمسہ بیگم دونوں اپنی نئی گاڑی میں بیٹھ کر سیٹھ رستم علی خان کے درِ دولت کی طرف چل دیں۔

نائمہ بیگم نے نند کو بطورِ خاص تیار ہونے پر اصرار کیا تھا حالانکہ یہ دونوں خواتین گھر میں بھی ہر وقت چار، چار چوڑیاں، بُندے اور گلے میں کچھ نہ کچھ ضرور پہنے رہتی تھیں مگر آج تو نائمہ بیگم نے حد کر ڈالی تھی۔ خود تو سونے میں لدپھند کر گئی ہی تھیں لیکن اصرار کر کر کے نند کو بھی اضافی زیور پہنوایا۔ اور خود بھی بھاری بھرکم ساری اور اپنی بھاری بھرکم شخصیت کے ساتھ خوب بارعب اور دبدبے والی خاتون نظر آرہی تھیں۔

یہ دونوں رستم ہاؤس میں پہنچیں تو ان کا خیر مقدم دو باوردی ملازموں نے کیا۔ ان میں سے ایک انہیں اپنے پیچھے آنے کا کہہ کر رستم ہاؤس میں داخل ہوا اور کاریڈور سے گزرتا ہوا ایک کشادہ اور مرصع ہال میں پہنچ گیا۔ یہاں سے ایک حسین و جمیل زینہ لہراتا ہوا اوپر کی طرف جا رہا تھا۔ ملازم سیدھا اوپر چڑھتا چلا گیا۔ یہ لوگ بھی سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔

بالائی منزل پر ایک طویل راہداری تھی جس کے ایک طرف کمرے ہی کمرے بنے ہوئے تھے۔ کمروں کے دروازے ایک سلسلے میں دور تک چلے گئے تھے۔ رستم ہاؤس اپنی طرزِ تعمیر میں حیرت انگیز طور پر مغربیت کے بجائے مشرقیت کی جھلک لیے ہوئے تھا کیونکہ راہداری کی آرائش اور تزئین میں... بھرپور مغلیہ طرز کو ترجیح دی گئی تھی۔

جگہ، جگہ محرابیں تھیں۔ ان میں پیتل کی خوب صورت نقش و نگار والی نازک، نازک قندیلیں آویزاں تھیں۔ کہیں، کہیں چھت سے نہایت نفیس اور قیمتی فانوس لٹک رہے تھے لیکن روشنیاں مدھم، مدھم تھیں۔ اتنی مدھم اور خوابناک کہ راہ داری میں چلنے والے سائے کی طرح چلتے لگ رہے تھے۔

راہ داری میں گہرے رنگ کے دبیز قالین کا فرش تھا۔ محرابوں کے نیچے ذرا ذرا سی اونچائی پر ہر گوشے میں لکڑی کے دیدہ زیب اور خوش نما تختے ہی تختے لگے ہوئے تھے۔ انہی تختوں پر چھوٹے، چھوٹے گملوں میں نہایت خوب صورت و خوش رنگ پھولوں والے پودے لگے تھے۔ ان کے قریب جگہ، جگہ انسانی قد و قامت کے برابر سیاہ و سفید پتھر کے مجسمے نصب تھے۔

دیواریں دلفریب اور قیمتی تصاویر سے سجی سنوری تھیں۔ یہ تمام مناظر دل و دماغ پر ایک انمٹ اور گہرا تاثر ثبت کر رہے تھے۔ یہ دونوں ہی بہت مرعوب اور متاثر ہوئے جا رہی تھیں۔

راہ داری میں کم از کم ایک درجن کمرے تھے۔ جبکہ ان تمام کمروں کے بیچ میں خاصا فاصلہ تھا۔ جس سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ ہر کمرا خوب کشادہ ہے۔

ان کی کھڑکیاں سب باہر کی طرف کھلتی تھیں۔

ہر کمرے کے مقابل قدرے ہٹ کر راہ داری میں جگہ، جگہ آرام دہ اور قیمتی صوفے رکھے ہوئے تھے۔

یہاں تک پہنچ کر ملازم نے دور تک ہر صوفے کا جائزہ لیا۔ مگر کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا۔ تب اس نے آگے بڑھ کر ایک ایسے کمرے پر جس کے دروازے پر جلی حروف میں ایک نمبر اور بٹن چسپاں تھا۔ بٹن کو دبایا، اندر سے کہیں برقی گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے مسلسل گردن ہلانے سے محسوس ہوا کہ اسے ہدایات مل رہی ہیں۔ لہٰذا وہ ایک دفعہ پھر ان دونوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے ان کے آگے آگے چل دیا۔ ایک دفعہ پھر وہی سفر کیا گیا۔

اس دفعہ سیڑھیاں اترتے ہوئے دونوں کا دم پھول گیا۔ زینے سے اتر کر ان لوگوں نے خود کو ایک خاصے طویل لاؤنج میں پایا، جگہ، جگہ پام اور کیکٹس کے پودے گملوں میں لگے تھے۔

لاؤنج سے گزر کر وکٹورین طرز کے ایک کشادہ ہال میں وہ داخل ہوئیں۔ ہال کی چھت لاؤنج سے کافی اونچی تھی۔

چھت کے بالکل درمیان میں ایک عظیم الشان بلوریں جھاڑ لٹک رہا تھا۔ دیواروں پر بڑی، بڑی روغنی تصویریں آویزاں تھیں۔

اس ہال میں زربفت اور مخمل کے شاندار صوفے اور دیوان بڑے قرینے اور سلیقے سے رکھے تھے۔ دروازوں اور دریچوں پر خوش رنگ، دیدہ زیب اور باریک ریشم کے پردے لہرا رہے تھے۔

دو خادمائیں تصویروں اور دریچوں کے شیشوں کو بڑی محنت اور نفاست کے ساتھ چمکانے میں مصروف تھیں۔

ان دونوں خواتین کو ملازم نے اشارے سے صوفے پر بیٹھنے کو کہا اور خود ہال عبور کر کے ایک غلام گردش میں داخل ہوا۔ غلام گردش میں بھی سرخ قالین کا فرش تھا۔ دیواروں پر خوب صورت اور حسین منظر کشی کی تصاویر آویزاں تھیں۔

دیوار گیریوں سے پھوٹتی ہوئی ہلکی، ہلکی نیلگوں روشنی میں ہر چیز خواب و خیال میں ڈھلی ہوئی اور تیرتی ہوئی لگ رہی تھی۔

غلام گردش میں کئی دروازے کھلتے تھے۔ ان پر ریشمی، ریشمی پردے سرسرا رہے تھے۔

ملازم ایک بند دروازے پر جا کر تھم گیا۔ اس نے ہلکے سے تھپتھپا کر دروازہ کھولا۔ کمرے میں مدھم سی روشنی تھی۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر دبیز پردے پڑے تھے۔ کمرا پھولوں کی مدھم بھینی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

ملازم نے کسی کو بے حد مؤدب آواز میں آگاہ کیا۔

''مہمانوں کو آرام سے بٹھا دیا گیا ہے بی بی جی۔ وہ دو ہیں اور آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔''

''ٹھیک ہے...... اب تم جا سکتے ہو۔'' اندر سے ایک بارعب نسوانی آواز نے جواب دیا۔

ملازم نے دروازہ دوبارہ بند کیا اور ادب سے دبے، دبے پاؤں رکھتا ہوا جدھر سے آیا تھا، اُدھر ہی مڑ گیا۔

جلد ہی دروازہ دوبارہ کھلا۔ اس دفعہ چھینٹ کے گھاگرے اور چولی والی خادمہ نے آ کر کھولا تھا جو اچانک ہی کسی طرف سے نمودار ہوئی تھی اور سیدھی کمرے کے اندر چلی گئی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہی خادمہ ایک ادھیڑ عمر عورت کے ساتھ اسی سامنے والے کمرے سے برآمد ہوئی۔ وہ گداز بدن کی ایک گوری چٹی عورت تھی۔ جتنی لمبی اتنی ہی زیادہ تندرست بھی۔ ناک نقشہ مُسک تھا مگر آنکھیں ذرا چھوٹی تھیں۔ آنکھوں کے نیچے ہلکی، ہلکی جھریاں تھیں۔ جنہیں چھپانے کے لیے اچھا خاصا میک اپ کیا گیا تھا۔ وہ ہاتھوں اور کانوں میں قیمتی جڑاؤ زیور پہنے ہوئے تھی۔ وہ خاصی طرح دار عورت تھی۔

خادمہ اس سے دو قدم پیچھے اور وہ آگے، آگے کاریڈور میں چل دی۔ انداز میں تمکنت اور دبدبہ تھا۔ ان دونوں کا رخ اسی طرف تھا، جہاں نائمہ بیگم اور شمسہ بیگم بیٹھی ہوئی تھیں۔ نائمہ بیگم تو اس قدر گم صم تھیں جیسے پورے بنگلے کی طلسمی فضا میں تحلیل ہو گئی ہوں۔

قریب پہنچ کر عورت نے نہایت پُرتپاک انداز میں ان دونوں سے ہاتھ ملایا اور اپنا تعارف کرایا۔

''میں ہوں جی بیگم رستم علی خان...... ویسے مجھے فوزی کہتے ہیں۔'' ان دونوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کریں۔ تاہم بڑھا ہوا ہاتھ دیکھ کر پہل نائمہ بیگم نے کی اور جلدی سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ گویا فوزی کے سلام کا جواب دیا تھا۔

بعد ازاں شمسہ بیگم نے بھی اس سے ہاتھ ملالیا۔

وہ اطمینان سے دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ملازمہ اس کے بیٹھنے کے بعد وہاں سے چلی گئی۔

''غالباً...... آپ لوگ اختر علی مرحوم کے ہاں سے آئی ہیں؟'' وہ مسکرا کر دوبارہ گویا ہوئی۔

''جی ہاں......'' اس بار شمسہ بیگم نے جواب دیا۔

''یہ...... ان کی بیوی ہیں نائمہ بیگم اور میں شمسہ بیگم۔''

''آپ ان کی ہمشیرہ ہیں یا...... باقر علی صاحب کی؟'' اس نے کچھ سوچ کر دریافت کیا۔

''میں ان کی سگی نند ہوں اور خالہ زاد بہن بھی۔'' شمسہ بیگم نے مسکرا کر جواب دیا۔

''اوہ...... اچھا پھر تو ڈبل، ڈبل رشتے داری ہے۔'' اس نے سر ہلا کر کہا پھر نائمہ بیگم سے پوچھا۔

''آپ کے کتنے بچے ہیں؟''

''پانچ بیٹے ماشاء اللہ...... اور ایک بیٹی ہے۔'' انہوں نے فی الفور جواب دیا۔

''بہت خوب......'' وہ مزید کچھ کہتے، کہتے تھم گئی کیونکہ اسی وقت ملازمہ چاندی کی ٹرے میں بلوریں گلاس لیے آ پہنچی۔ دونوں کو یخ منرل واٹر پیش کیا اور برتن لے کر واپس چلی گئی۔

فوزی نے سلسلۂ کلام دوبارہ جوڑا۔ اب بھی اس نے نائمہ بیگم کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

''آپ کے بیٹے کیا کرتے ہیں؟ کیا مشغلے ہیں ان کے؟'' جواب دینے سے پہلے انہوں نے شمسہ بیگم کی طرف دیکھا مگر وہ مطلق خاموش رہیں۔ لہٰذا وہ خود ہی بولیں۔

''ایک بیٹے کالج میں پڑھاتے ہیں، دوسرے ڈاکٹر ہیں، تیسرے بیٹے فاریسٹ آفیسر ہیں۔''

''اور...... باقی دو......؟''

''وہ ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ پڑھ رہے ہیں۔''

''ڈاکٹر بیٹے کی اپنی کلینک ہے یا ملازمت کرتے ہیں؟'' فوزی نے بلاتکلف ڈاکٹر کو پسندیدگی کی سند دیتے ہوئے پوچھا۔

''ایک سرکاری اسپتال کے ڈاکٹر ہیں۔'' نائمہ بیگم نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے جواب دیا۔

''ملازمت...... کو کتنے سال ہو گئے؟'' فوراً اگلا سوال آیا۔

''کئی سال ہو چکے ہیں...... ہے ناں آپا؟'' انہوں نے مدد کے طور پر نند سے پوچھا۔ نائمہ بیگم نے یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... خاصے تین، چار سال ہو گئے ہوں

گے۔'' شمسہ بیگم نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' فوزی نے مطمئن ہو کر جواب دیا۔ ''ہم آپ کے گھر آئیں گے۔ لڑکے سے بھی ملاقات کریں گے۔ پتا کر لیں وہ کس اسپتال میں ڈاکٹر ہے پھر آپ کو اپنا ارادہ بتا دیں گے۔''

اب نائمہ بیگم کے ہاتھوں کے طوطے اڑے۔ اس کا تو مطلب یہ تھا کہ فوزی نے ڈاکٹر کو پسند کر لیا تھا۔ انہوں نے امداد طلب نظروں سے شمسہ بیگم کی طرف دیکھا۔ فوزی کے سوالات سن، سن کر وہ پہلے ہی یہ نتیجہ اخذ کر چکی تھیں۔ مزید چپ رہنا مناسب نہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے حد درجہ متانت سے کہا۔

''بات یہ ہے کہ ہم آپ کے ہاں اپنے ڈاکٹر بیٹے کے لیے نہیں بلکہ فاریسٹ آفیسر بیٹے کے لیے آئے ہیں۔''

''جی......؟'' فوزی کی تیوری پر بل پڑے مگر پلک جھپکتے میں اس نے اپنا موڈ درست کر لیا اور بظاہر مسکرا کر پوچھا۔ ''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔ کیا آپ کے ڈاکٹر بیٹے کی شادی ہو چکی ہے؟''

''نہیں...... ایسی بات نہیں ہے۔'' شمسہ بیگم نے انکار میں گردن ہلا کر کہا۔ دراصل ہمارا ابھی فی الحال ان کی شادی کرنے کا ارادہ بھی نہیں ہے۔''

''اوہ...... آئی سی......'' اس نے ہونٹ سکوڑے پھر جلدی سے اگلا سوال جڑ دیا۔ ''فاریسٹ آفیسر سب سے بڑے والے ہیں؟''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔'' اس دفعہ نائمہ بیگم بولیں۔ ''سب سے بڑے جو بیٹے ہیں، ان کے لیے ہم نے بچپن سے اپنی انہی نند کی بیٹی مانگ رکھی ہے۔ یہاں دراصل ہم جن...... کے لیے آئے ہیں، وہ فاریسٹ آفیسر ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' فوزی نے سنجیدگی سے جواب دیا اور ساتھ ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔

''آئیں تھوڑی دیر دوسرے کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔'' اس کے پیچھے چلتے ہوئے نائمہ بیگم نے آہستہ سے سرگوشی کی۔

''آپا! لڑکی تو دیکھی نہیں......'' شمسہ بیگم گردن ہلا کر رہ گئیں۔

ذرا سی دیر میں انہوں نے خود کو ایک عالی شان ڈائننگ ہال میں پایا۔ یہاں کی سجاوٹ اور ٹھاٹ باٹ دیکھ کر نائمہ بیگم پر خاص اثر ہوا اور آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ پردوں سے لے کر ڈائننگ ٹیبل پر سلیقے سے سجے نیپکن تک سنہرے تھے۔ ہر چیز سونے کی طرح چمک رہی تھی، دمک رہی تھی۔ حتیٰ کہ تازہ، تازہ پھولوں کے گلدستوں تک میں سنہرے پھولوں کی جھلک زیادہ نمایاں نظر آ رہی تھی۔

میز انواع و اقسام کے کھانوں اور مشروبات سے لبریز تھی۔ شمسہ بیگم سے رہا نہ گیا بالآخر انہوں نے کہہ بھی دیا۔

''آپ نے بیٹی سے نہیں ملوایا؟'' ابھی ان کے منہ کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ فوزی نے وہیں رکھا ریموٹ ہلایا اور سامنے کی دیوار میں نصب ایل سی ڈی جاگ پڑی۔

پل بھر میں بڑی اسکرین پر ایک ہرے بھرے لان کا منظر اجاگر ہو گیا۔ جس کے ٹینس کورٹ میں ٹینس کھیلا جا رہا تھا۔

اس وقت ٹینس کورٹ میں تین افراد تھے۔ دو لڑکیاں اور ایک مرد...... تینوں نے سفید نیکریں اور آدھی آستینوں کی اسپورٹ شرٹس پہن رکھی تھیں۔

وہ لڑکی جو مرد کے ساتھ اس وقت ٹینس کھیلنے میں مصروف تھی بے حد خوب صورت اور دلکش چہرے کی مالک تھی۔ آنکھیں بڑی، بڑی اور روشن تھیں۔ بدن سڈول اور کسا ہوا...... وہ بے حد پھرتی کے ساتھ بھاگ، بھاگ کر اور اچھل، اچھل کر ریکٹ سے گیند اچھال رہی تھی۔ اس کی چستی قابلِ دید تھی۔

دوسری لڑکی خالی کھڑی بے حد دلچسپی کے ساتھ کھیل دیکھ رہی تھی۔ صورتیں دونوں کی ایک دوسرے سے بہت مشابہ تھیں۔ فوزی نے نہایت مختصر الفاظ میں انہیں آگاہ کیا۔

''یہ جو لڑکی کھیل رہی ہے، میری چھوٹی بیٹی نرخندہ ہے۔ جو سامنے کھڑی ہے یہ بڑی بیٹی یُسریٰ ہے۔ کھیلنے والا لڑکا میرا داماد ہے، یعنی یسریٰ کا شوہر......'' وہ دونوں آنکھیں پھاڑے ان کے لچکتے تھرکتے بدن کو دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

اگلے دن جمعتہ المبارک تھا۔ مسجد میں معمول سے زیادہ لوگ تھے۔ نمازِ جمعہ ادا کر کے نمازی واپس جانے لگے تو مولوی صاحب نے رحمت بابا کے چند خاص، خاص قریبی رشتے داروں کو روک لیا۔ دیگر افراد یکے بعد دیگرے رخصت ہو چکے تو مولوی صاحب نے باقی رہ جانے والوں سے نہایت مؤثر پیرائے میں بات چیت کا آغاز کیا۔ رحمت بابا بھی وہیں بیٹھے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ پہلے پہل تو کسی کی سمجھ میں ان کی بات نہ آسکی مگر پھر جلد ہی سب نے سمجھ لیا کہ جنگل بابو کا رشتہ رحمت بابا کی بیٹی ریشم بی بی کے لیے آیا ہے۔ جنگل بابو نے خود مولوی صاحب سے درخواست کی ہے۔

پھر مولوی صاحب نے سادہ الفاظ میں سب کو بتایا کہ اسے کوئی جواب دینے سے پہلے رحمت بابا اپنے رشتے داروں سے رائے مشورہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ کیا کہتے ہیں اس معاملے کے بیچ......

اس موقع پر مولوی صاحب نے رحمت بابا کی ہچکچاہٹ اور کشمکش کا حال ذرا کھل کھلا کر بیان کیا۔

رحمت بابا سر جھکائے بیٹھے تھے۔ سینے میں دل زور، زور سے دھڑک رہا تھا کہ دیکھیں ان کے اپنے کیا فیصلہ سناتے ہیں؟ کیونکہ اس بستی میں بہر حال یہ اپنی نوعیت کا پہلا واحد واقعہ تھا کہ کسی غیر شخص نے گاؤں کی بیٹی کے لیے دستِ سوال دراز کیا تھا۔

لوگ آپس میں اظہارِ خیال کرنے لگے۔ زور شور سے چہ مگوئیاں اور بحث شروع ہو گئی۔ جنگل بابو کا کردار اور شخصیت زیرِ بحث تھی۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا کوئی کچھ......مگر ایک بات پر سب مجموعی طور پر متفق تھے یعنی خرم کی غیر معمولی شرافت اور نیک طور اطوار کے سب قائل تھے۔ سب کھلم کھلا باتیں کر رہے تھے۔

ان سے ساری بات کہہ دینے کے بعد مولوی صاحب اب خاموش بیٹھے یہ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ دیکھیے اب کیا ہو؟ تھوڑی دیر میں انہوں نے محسوس کیا کہ وہ لوگ کسی ایک فیصلے پر متفق ہوتے جا رہے ہیں۔ سب کے چہروں سے دبی، دبی خوشی اور اطمینان کا اظہار ہونے لگا تھا۔

ان سب کو دلی مسرت تھی کہ رحمت بابا نے اپنے خاص الخاص معاملے کو ان لوگوں کے بیچ رکھ کر ان کے مشورے کو اولیت دی تھی۔ یہ بات ان کے لیے باعثِ طمانیت اور قابلِ فخر تھی۔ رحمت بابا کی بے انتہا انکساری، عاجزی اور اپنا پن ان کا دل موہ لے گیا تھا۔

دوسری طرف خرم سے بھی مطمئن تھے وہ سب کے سب، کوئی بھی اسے ناپسند کرنے والا نہیں تھا۔ اتنے برسوں میں خرم نے کبھی یہاں کے کسی بچے تک کو شکایت کا موقع نہ دیا تھا۔ سب کے ساتھ مناسب رویہ روا رکھتا تھا۔

بالآخر سب نے یک زبان ہو کر ان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ یہاں کے من پسند اور سادہ لوح لوگوں کی وسیع القلبی کی یہ بہت بڑی مثال تھی کہ انہوں نے بلا تفریق و تمیز ایک پردیسی شہری بابو سے رشتہ استوار کرنے کے لیے کھل کر اس کی حمایت کی تھی۔

رحمت بابا کی گردن احساسِ تشکر سے جھکی جا رہی تھی۔ ان کے اپنوں نے ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کی تھی۔ ان کا دل نہیں توڑا تھا۔ ایک گہرا اطمینان اور سکون اتر آیا دل میں۔

بہت دنوں کے بوجھ اور احساسِ ذمے داری

میں ایک قابلِ اطمینان کی واقع ہوتی جارہی تھی وہ خود کو چاق و چوبند محسوس کرنے لگے۔ سب کھلے دل سے انہیں مبارک باد دے رہے تھے۔ نکاح سے دو دن بیشتر رحمت بابا نے خرم کو اپنے پاس بلوایا۔ ریشم بی بی کو انہوں نے بطورِ خاص شام تک کے لیے اس کی خالہ کے جھونپڑے میں بھجوادیا تھا تاکہ خرم سے تنہائی میں چند باتیں کرسکیں۔

گیارہ بجے تک خرم خوب بن ٹھن کر خوشبوؤں میں بسا ہوا آپہنچا۔ مولوی صاحب سے مثبت جواب سن کر آج کل وہ دن رات خوشیوں کے ہنڈولے میں جھول رہا تھا۔ بابا کے بلاوے پر دل و جان سے بھاگا چلا آیا مگر جھونپڑے میں جنگل کے سدا بہار پھول کو نہ پاکر ارمانوں پر اوس پڑگئی۔ بابا نے اسے شفقت سے اپنے پاس بٹھایا اور دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

مولوی صاحب نے خرم سے مکمل معلومات کر کے رحمت بابا کو آگاہ کردیا تھا کہ دنیا میں چند دور کے رشتے داروں کے سوا اس کا کوئی نہیں ہے۔ اپنی آرزو پوری کرنے کے لیے اس نے زبردست جھوٹ کا سہارا لیا تھا۔ گو کہ ایسا کرتے ہوئے اندر سے اس کا دل بری طرح دھڑکا تھا، لرزا تھا مگر ظاہر ہے کہ وہ مجبور تھا خود سے۔

بستی میں کوئی ایسا نہیں تھا کہ جسے ان کی کہانی پر یقین نہ آیا ہو۔ بابا سمیت کسی نے بھی مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

بابا نے آج اس کے منع کرنے کے باوجود اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے چائے تیار کی تھی جو دونوں نے بہت خوشگوار ماحول میں پی۔ پیالی ایک طرف رکھ کر بابا نے حقہ بھی سرکا دیا۔ ان کے ہنستے ہوئے ہونٹوں سے مسکراہٹ کا پنچھی اڑ گیا اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے، ڈوبے بہت سنجیدہ ہوگئے۔ خرم نے ان کی کیفیت کو پوری طرح محسوس

کیا..... اور جیسے دم سادھ کر بیٹھ گیا۔ اب وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ دراصل بابا نے کس لیے بلوایا ہے؟ شاید کچھ کہنا چاہ رہے ہیں..... مگر بابا جب بولے تو ان کا افسردہ لہجہ کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔

''بیٹا..... اب جبکہ دو دن کے بعد ہم..... آپس میں رشتے داری قائم کرنے جا رہے ہیں..... اور میں اپنی عمر بھر کی کمائی تمہارے حوالے کردینے کو ہوں تو بہتر سمجھتا ہوں کہ..... تم سے چند بہت ضروری باتیں کرلوں..... لیکن امید ہے کہ تم ان باتوں کو فقط اپنے تک ہی محدود رکھو گے۔ بیٹا..... بے شک ریشم بی بی خالص میری اپنی بیٹی نہیں بلکہ میرے مرحوم بھائی کی بیٹی ہے..... مگر خدا گواہ ہے کہ..... اگر میں نے شادی کی ہوتی تو شاید میں اس اولاد کو بھی اتنا ہی چاہتا..... اس قدر ہی محبت دیتا۔''

خرم نے بُری طرح چونک کر ان کی بات کاٹ دی۔

''یہ بات..... میرے علم میں تو نہیں تھی۔ پھر بھلا آپ نے..... اب تک شادی کیوں نہیں کی؟'' ان کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

بابا اس کے اچانک سوال پر مسکرا دیے۔

''آج..... دراصل میں اسی راز پر سے پردہ اٹھانے والا ہوں۔'' بابا نے ایک دبی دبی سانس لی اور دھیرے سے بولے۔''مگر..... صرف تمہارے سامنے۔ اگر میں تم سے اپنی بچی کی شادی کا فیصلہ نہ کرتا تو یقیناً یہ پردہ..... آج بھی پردہ ہی رہتا۔ اس راز کو میرے اور میرے خدا کے سوا اس دنیا میں جاننے والے صرف تم ہوگے۔''

خرم سانس روکے ان کی بات سن رہا تھا۔ ہمہ تن گوش اور مکمل خاموش..... آج بابا اسے بہت.. پُراسرار اور گہرے نظر آرہے تھے۔

''دنیا کیسے، کیسے لوگوں اور واقعات سے بھری پڑی ہے۔'' اس نے جی ہی جی میں سوچا۔

بابا اس کی سوچوں سے بے خبر اپنی دُھن میں کہہ رہے تھے۔

''ریشم کی ماں، یعنی میری بھاوج، ہم دونوں بھائیوں کی سگی تایا زاد بہن تھی۔ بچپن ہمارا اسی بستی اور انہی پیڑوں اور جنگل میں کھیلتے، کودتے گزرا۔ ہمارے ماحول کو آج بھی شہر کی ہوا نہیں لگی ہے تو اس زمانے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ نہ کوئی جنگل بابو ہوتا تھا نہ آفیسر..... کبھی کبھار کوئی شکار پارٹی آجایا کرتی تھی شکار کھیلنے۔ وہ بھی گورے لوگوں کی! اس زمانے میں اس چھوٹی سی بستی میں رہنے والے اسی طرح مل جل کر اور پیار محبت سے رہتے تھے یعنی چھوٹے بڑے سب کے سب..... میرا بھائی مجھ سے چند سال بڑا تھا جبکہ..... ریشم کی ماں میری ہم عمر تھی۔ بجائے بھائی کے وہ مجھ سے زیادہ قریب تھی، بے تکلف تھی، سارا سارا دن میرے پیچھے پیچھے گھوما کرتی..... میرے گھر سے باہر لگا املی کا درخت آج بھی اس بات کا گواہ ہے کہ جانے کتنے کٹارے میں نے اسے اتار کردیے ہوں گے۔ وہ اپنی چھوٹی سی چنری پھیلائے نیچے کھڑی رہتی۔

بچپن کا زمانہ گزار کر ہم نے عہدِ جوانی میں قدم رکھا تو جلد ہی دونوں نے محسوس کرلیا کہ ہماری یہ بے تکلف دوستی، گہرے پسندیدہ جذبات اور معصوم سچے احساسات میں تبدیل ہوچکی ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کے بغیر ایک لمحہ قرار نہ آتا۔ اس جنگل کا پتا پتا اور بوٹا، بوٹا ہماری چاہتوں کا گواہ تھا۔ ہم ایک دوسرے کے راز دار تھے، تیسرا کوئی ہمارا راز دار نہ تھا پھر ہمارے ساتھ وہی سب کچھ ہوگیا جو ہم جیسی خاموش محبت رکھنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ وقت ہمارے ساتھ چال چل گیا۔ اور ہم چپ چاپ لُٹ گئے۔ نہ میں چلّا سکا، نہ اس نے آہ تک لبوں سے نکلنے دی۔ ہر سچائی سے ناواقف ہمارے والدین نے فیصلہ کرلیا۔ اس وقت میں اس قدر سیدھا سادہ اور شرمیلا ہوا کرتا تھا کہ باوجود ہزار چاہنے کے ہم دونوں ہی اپنا راز اپنے، اپنے سینوں میں دبائے رہے۔ وقت اپنی

اندھی چال چلتا گیا۔ حتیٰ کہ...... بزرگوں کے مشترکہ فیصلے نے اسے میری بھاوج بننے پر مجبور کردیا اور وہ میرے بھائی سے بیاہ دی گئی۔ زندگی کا یہ سب سے عظیم المیہ ہماری روحوں کو رُلاتا ہوا رونما ہوگیا، اتنا کہہ کر رحمت بابا چپ ہوگئے۔

خرم جو ہکا بکا سا ہوکر بابا کی کہانی خود انہی کی زبانی سن رہا تھا۔ ایک جھرجھری سی لے کر جنگل کے غمزدہ بوڑھے کو دیکھنے لگا جو اِن لمحات میں پہلے سے زیادہ بوڑھے دکھائی دینے لگے تھے۔

''اندر سے ایک ٹوٹے ہوئے دل کے مالک کیا اوپر سے ایسے ہی نظر آتے ہیں؟ اندر سے زخم زخم...... اوپر سے چپ چپ......'' پل بھر کے لیے خرم نے سوچا۔

خرم کو حیرت بھی تھی...... افسوس بھی ہورہا تھا۔ کتنے ہارے ہوئے اور کتنے شکستہ دل تھے رحمت بابا...... اس ایک جذبۂ محبت نے کتنوں کو برباد کیا اور کتنوں کو آباد کیا...... شہر ہو یا جنگل...... کون اس کے اثر اور شدت سے محفوظ رہا۔ کچھ دیر کے بعد ان کے احساسات قدرے پُرسکون ہوئے تو انہوں نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

''میں تو...... مرد تھا، باہر کی سو مصروفیات تھیں میری، میں نے اپنے آپ کو بھیڑ بکریوں، جنگل کی فضاؤں اور بیرونی دیگر مصروفیات میں ڈوب جانے پر مجبور کردیا۔ میری باری آئی تو والدین نے بہت اصرار کیا کہ میں بھی شادی کرلوں مگر اب یہ راہ اختیار کرنا میرے بس سے باہر تھا۔ میں ایک دفعہ لٹ چکا تھا۔ تہی دامن رہ گیا تھا۔ بس یہی کافی تھا۔ اب اس بارے میں سوچنے تک کا حوصلہ ہار چکا تھا۔ چنانچہ سب اصرار کرکر کے تھک گئے مگر سب کی کوشش بیکار گئی اور میں کنوارا رہا۔ میں دُہری زندگی گزارنے کو تیار نہیں تھا۔ اُدھر ریشم کی ماں اندر ہی اندر گھلتی رہی، کڑھتی رہی، اس کی گھائل روح سلگتی رہی مگر اتنی ظرف والی تھی کہ کبھی اپنے دکھ کا احساس ہونے دیا کسی کو اور نہ

نظم

ہمیشہ کی طرح آج بھی
اسے یاد کرتے ہوئے سوچا
میں بھی اسے یاد آتی ہوں گی
مگر پھر خود ہی لب مسکرا دیے
کہ
کتنی اچھی ہوتی ہیں یہ
خوش فہمیاں

شاعرہ: فرحین اشفاق، گگو منڈی

ہم

رزق کا دروازہ ہو یا خوشیوں کا اگر وہ بند ہوجائے تو اللہ ایک اور کھول دیتا ہے مگر ہم کھلا در دیکھ نہیں پاتے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم بند دروازے کے سامنے بیٹھے رو رہے ہوتے ہیں۔

مرسلہ: صبا نور، لیہ

منہ سے اظہار کیا۔ ریشم کی پیدائش کے بعد تو اور بھی سوکھ کر کانٹا ہوگئی تھی۔ میں نے اسے بھاوج کے روپ میں ہمیشہ نڈھال اور غمزدہ ہی دیکھا۔ بدنصیبی دیکھو اسی برس ایک وبائی بیماری پھوٹ پڑی جس نے کنبے کے کنبے ہڑپ کرلیے۔ ہر طرف رونا پیٹنا مچ گیا۔ انہی لقمۂ اجل بننے والوں میں میرا بھائی اس کی بیوی بھی تھی۔ وہ دونوں ننھی ریشم کو چھوڑ کر اگلے جہان جا بسے۔ اور یوں ریشم، ان کی پہلی اور آخری نشانی میرے ٹوٹے دل کا سہارا بن گئی۔''

بابا نے اپنی کہانی کا آخری حصہ نہایت مختصر الفاظ میں بیان کرڈالا اور اچانک خاموش ہوگئے۔ یوں جیسے بھولی بسری تکلیف دہ یادوں کا تذکرہ ان کے پرانے زخموں پر نمک پاشی کا باعث بن رہا ہو۔

خرم نے دیکھا وہ دھیرے، دھیرے ہانپ

رہے تھے۔ جیسے کہیں سے بڑی لمبی مسافت طے کر کے آئے ہوں۔ گئے دنوں کے اذیت کوش لمحوں کا افسردہ سا رنج و الم اور اپنی روح سے جدائی کا کربناک سایہ آج بھی ان کے چہرے کی ایک، ایک جھری سے جھانک رہا تھا۔

بچھڑ جانے کا زہر ان کی پور، پور، نس، نس میں لہو بن کر دوڑ رہا تھا۔ بوڑھی آنکھوں میں جم جانے والے آنسوؤں کے شفاف قطرے ساکت پتھروں کی طرح منجمد ہو چکے تھے۔

شاید یہی خون کے آنسو تھے جو ایک طویل زمانے سے بوند، بوند بن کر ان کے جگر سے ٹپکے ضرور تھے مگر بہہ نہ سکے تھے۔

ان کی حالت اور دلی کیفیت کا احساس کر کے ایک لمحے کے لیے خرم کا دل اس کے سینے میں بری طرح کپکپا کر رہ گیا۔ باوجود لاکھ کوشش کے وہ بابا سے ایک حرف بھی تسلی تشفی کا نہ کہہ سکا۔

بلاشبہ ریشم کو انہوں نے دل و جان کا خون دے، دے کر پالا اور پرورش کیا۔ خرم کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہے ہوں۔

اے داغ! دیکھ ہم بھی ہیں کس دل کے آدمی
مہمان رکھ کے غم کو کلیجا کھلا دیا

☆☆☆

اس کی قسمت بھی عجیب تھی۔ باپ کی شہادت کی خبر پاتے ہی ماں بھی ساتھ چھوڑ گئیں۔ خدانخواستہ اگر جو دادی غریب کا دم بھی نہ ہوتا تو شاید یہ تینوں بہن بھائی بھی نہ ہوتے، پروردگار کی مدد اور انہی کی ہمت اور حوصلے سے وہ کڑا وقت گزر رہا تھا۔

ایک مشقت کی چکی تھی جس میں وہ مسلسل پستی رہی تھی۔ گھر، گھر جا کر دوسروں کے بچوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا آسان نہ تھا۔ جس کا بیڑا اس نے اپنی ننھی سی جان پر اٹھا رکھا تھا اور نہ صرف یہ بلکہ اپنی اور اپنے چھوٹے، چھوٹے جڑواں بھائیوں کی تعلیم کا سلسلہ بھی منقطع ہونے نہ دیا تھا۔

اللہ کا لاکھوں بار احسان تھا کہ جس گھر میں بھی اس نے ٹیوشن پڑھائی، وہاں اپنی عزت و حرمت کا پورا، پورا پاس رکھا اور ہر گھرانے نے بھی اسے پورا احترام دیا تھا۔ مگر......سیدھے سبھاؤ چلتے، چلتے یہ کیا ہوگیا تھا اس کے ساتھ...... یہ کس آگ میں اس کا رُواں رُواں جل اٹھا تھا وہ اچانک ذلت کی کس کھائی میں جا گری تھی ایسی جہنم رسیدہ کھائی جس میں سے ہاتھ پکڑ کر نکالنے والا کوئی نہیں تھا۔

افسوس......اپنی کیفیت اپنا حال ذرا کسی کو کہنے کے قابل بھی نہیں تھی۔ وہ تو کھل کر چار آنسو بہا ڈالنے تک سے مجبور تھی۔ کوئی کیا کہتا......؟ بوڑھی دادی کیا سوچتیں۔ وہ رونے کا سبب پوچھتیں تو کیا جواب دیتی۔ اپنی مظلومیت کی داستان کسے سناتی......؟ کیوں کر سناتی۔ اندر ہی اندر گھٹ، گھٹ کر اس کا سینہ شق ہونے کو تھا۔

رات کے اندھیرے میں جب سب سو جاتے تو بے آواز ہچکیوں سے اس کا وجود آندھیوں کی زد میں آئے ہوئے خزاں رسیدہ پتے کی طرح ڈولنا شروع ہو جاتا اور پھر صبح تک اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگا رہتا۔ زخموں سے چور، چور روح گھائل پنچھی کی طرح نوحہ کناں رہتی مگر ہونٹ اوپر سے سربہ مہر رہتے۔ کیونکہ ایسا کرنے پر وہ مجبور تھی، بے بس تھی۔ اس کے اندرونی ملال سے بے خبر دادی اماں اس کی اتری ہوئی صورت کو دیکھ کر نزلے، زکام اور بخار کا علاج کرتی رہیں۔

سوئی ہوئی تقدیر نے اچانک کروٹ بدلی۔ کاتبِ تقدیر تو دلوں کے حال جانتا ہے۔ رحمتِ خداوندی ......اچانک جوش میں آئی اور اس واقعے کے تیسرے دن ذکیہ خالہ ڈھیروں مبارک بادوں کے ساتھ اس کا تقرر نامہ لے کر آ پہنچیں۔

(باقی آئندہ)



وہ میرے گماں میں رہا

نزہت جبیں ضیا

''اماں! آج کل عصام آیا ہوا ہے۔ اس کی سب سے چھوٹی بہن کی شادی ہے ناں۔'' رافع نے چائے کا سِپ لے کر اماں کو مخاطب کر کے کہا...... بظاہر عام سا جملہ تھا مگر...... استری کرتے، کرتے میں بری طرح چونکی تھی۔ ساتھ ہی بدحواسی میں گرم استری میرے اُلٹے ہاتھ کے انگوٹھے کو جلا گئی۔

''سی......'' بے ساختہ میرے لبوں سے نکلا۔

''ارے کیا ہوا؟'' چائے کا مگ ٹرے میں رکھ

کر رافع بھاگ کر مجھ تک پہنچے تھے۔

''کچھ نہیں۔'' جلن اور تکلیف کے احساس سے میری آنکھیں نم ہو گئی تھیں...... جلن کی تکلیف سے زیادہ دکھی تو دل ہوا تھا...... عصام کا نام سن کر۔

''ارے دیکھو تو...... چھالا بن گیا ہے۔'' رافع نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''کتنی بار کہا ہے خیال رکھا کرو اپنا۔'' ہمیشہ کی طرح رافع میری معمولی تکلیف پر تڑپ اٹھے تھے۔

''ارے ہلکا سا جلا ہے، ٹھیک ہو جائے گا۔'' اماں کے سامنے رافع کی وارفتگی سے میں شرمندہ ہو رہی تھی...... اس سے گہرا چھالا تو میری روح پر پڑا ہوا تھا جسے میں گزشتہ دس سال سے بہت سنبھال کر رکھے ہوئے تھی کہ مبادا کہیں پھوٹ جائے اور...... اور...... میری زندگی میں کوئی طوفان کھڑا کر دے۔

''چپ کرو۔'' رافع نے محبت سے مجھے گھرکا۔

''گڑیا ٹوتھ پیسٹ لاؤ۔'' فوراً گڑیا کو آواز دی اُپنے ہاتھوں سے جلے پر ٹوتھ پیسٹ لگایا۔ ''اب بیٹھی رہو خاموشی سے۔'' مجھے صوفے پر بٹھا دیا۔

''ارے رافع! ایسا بھی نہیں ہوا کچھ...... میں آپ کے کپڑے پریس کر دیتی ہوں۔''

''اٹس او کے! کرلوں گا میں......'' انہوں نے محبت سے میرا شانہ تھپتھپایا اور میں اُن کی محبتوں کے سامنے شرمندہ ہونے لگی۔ میں نے گزشتہ دس سالوں سے رافع کی بے پناہ محبتوں کا جواب شاید اس طرح دل سے نہ دیا تھا جیسے کہ مجھے دینا چاہیے تھا...... شاید...... دل سے نہ کر پائی تھی۔ دیگر گھریلو کام میں پہلے ہی نمٹا چکی تھی۔ تھوڑی دیر میں گڑیا اور شانی بھی سو گئے۔ اماں بھی سو گئیں۔ رافع اور میں بھی لیٹ گئے۔ رافع جلد ہی سو گئے مگر...... میں دیر تلک جاگتی رہی...... آج نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی...... میرے دل و دماغ پر، سوچوں پر اعصام کا قبضہ تھا اور میں ماضی کے دھندلکوں میں کھوتی چلی گئی۔

☆☆☆

میں اور سونی بھیا ہم دو ہی بہن بھائی تھے۔ میں چھوٹی تھی اس لیے سب کی لاڈلی تھی۔ بہت ذہین اور حاضر جواب بھی۔ شوخی اور چنچل پن میری فطرت کا حصہ تھا یعنی ''سامعہ وقار'' گھر، اسکول، کالج ہر جگہ مشہور تھی۔ پڑھنے میں بھی اچھی تھی۔ اس لیے ہر کوئی مجھے پسند کرتا تھا۔

جب میں نے کالج میں ایڈمشن لیا تو انجینئرنگ مضامین پڑھنا تھوڑا مشکل لگا تب بھیا نے کہا کہ میں تمہیں گھر پر ٹیوٹر لگوا دیتا ہوں ویسے میں خود بھی ٹیوشن لینا چاہتی تھی۔ بھیا کی بات پر خوش ہو گئی۔ بھیا نے بتایا تھا کہ ان کا ایک دوست ہے اس کے والد کی ڈیتھ ہو چکی ہے وہ سب سے بڑا ہے اور چار بہنیں ہیں وہ ہوم ٹیوشنز دیتا ہے تو میں اسی سے بات کرلوں گا۔ تمہارا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور اس کا بھی اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس روز موسم بہت حسین ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ ایسے میں نہا دھو کر تیار ہو کر صحن میں آگئی۔ اماں اور بابا کہیں گئے ہوئے تھے اور بھیا ابھی آئے نہیں تھے۔ میں صحن میں کیاری میں لگے پودوں کے پاس بیٹھ گئی۔ بہت بھلا لگ رہا تھا۔ تب ہی ڈور بیل بجی ''شاید بھیا ہوں......'' یہ سوچ کر میں نے گیٹ کھولا تو سامنے ایک ہینڈسم اور خاصے گڈ لکنگ بندے کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ بلو جینز اور بلیک ٹی شرٹ میں سنہری رنگت اور دراز قد سمیت وہ خاصا پُرکشش لگ رہا تھا۔

''رافع ہیں گھر میں؟'' اس نے ایک نظر مجھ پر ڈال کر عام سے لہجے میں سوال کیا۔

''نہیں جناب، بھیا تو نہیں ہیں۔'' میں نے قدرے شوخی سے کہا۔

''او کے، آجائے تو کہہ دیجیے گا کہ عصام آیا

تھا۔'' وہ میری شوخی پر تھوڑا سا گڑبڑا گیا تھا۔
''عصام۔'' میں زیرِلب بڑبڑائی ارے یہ نام تو ٹیوٹر کا بتایا تھا بھیا نے مجھے یک دم یاد آیا...... تب ہی بھیا بھی آ گئے۔
''ارے یار...... آؤ...... آؤ۔'' انہوں نے عصام سے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور اس کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھے، میں نے راستہ دیا۔
بھیا عصام کو لے کر ڈرائنگ روم میں چلے گئے اور میں جلدی سے چائے بنا کر لے آئی۔
''ہاں تو عصام! یہ میری شریر اور پیاری سی بہن ہے اسمارا اور اسمارا یہ میرا دوست عصام ہے، کل سے یہی تمہیں ٹیوشن دینے آئے گا اور ہاں......'' بھیا ایک لمحے کے لیے رکے اور مجھے تنبیہی نظروں سے دیکھا۔ ''اس کے ساتھ کوئی شرارت نہیں چلے گی۔''
''او کے بھیا۔'' میں نے نہایت شرافت کا مظاہرہ کیا اور وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔
اُف! اس کی مسکراہٹ بھی اس کی پرسنالٹی کی طرح جاذبِ نظر اور خوب صورت تھی۔ یہ تھی میری عصام حسن سے پہلی ملاقات جو میرے لیے خاصی متاثر کن تھی۔ اب میرا کیا امپریشن پڑا تھا یہ تو مجھے معلوم نہ تھا۔
عصام جتنے ہینڈسم اور ڈیشنگ تھے اتنے ہی اچھے اوصاف کے مالک تھے۔ وہ پڑھائی کے دوران سیریس ہو کر صرف پڑھائی کی باتیں ہی کرتے اور میں اپنی فطری چلبلی طبیعت کی وجہ سے ہی ان سے اِدھر اُدھر کی ایک آدھ بات کر لیتی۔ ان کی بہنوں کے بارے میں پوچھتی کہ کتنی ہیں؟ کیا کرتی ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ اور مجھے ان کی زبانی ہی پتا چلا کہ عصام کی چار بہنیں ہیں اور سب ان سے چھوٹی ہیں۔ سب سے بڑی کلاس VIII میں پڑھتی تھی۔ ابا کی ڈیتھ ہو چکی تھی۔ عصام ٹیوشنز کے علاوہ ایک فرم میں جاب بھی کرتے تھے۔ گھر کی کفالت کی ذمے داری اکیلے ان کے کاندھوں پر ہی تھی۔ وہ اماں کا بھی بہت احترام کرتے تھے بہت عزت اور احترام سے اماں کو جھک کر سلام کیا کرتے۔ ابا اور اماں بھی عصام کو پسند کرتے تھے اور ان کے حالات سن کر افسردہ ہوتے تھے۔
ہمارے حالات قدرے بہتر تھے۔ ابا جی کسٹم میں ملازم تھے اور بھیا بھی وہیں جاب کرتے تھے، مجھے عصام سے دلی ہمدردی ہوتی جا رہی تھی۔ ان کے حالات اور ذمے داریاں سوچ کر میں دل سے ان کے لیے دعائیں مانگا کرتی۔ رفتہ رفتہ جانے کیسے میری یہ ہمدردیاں محبت میں تبدیل ہونے لگیں اور مجھے اس بات کا احساس اس وقت ہوا جب ابا جی کے ایک دوست اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر ہمارے گھر آ گئے۔ اچھے بھلے کھاتے پیتے اور شریف لوگ تھے تب مجھے لگا جیسے انکار کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں رہے گی۔ نہ جانے کیوں میں بے پناہ اداس ہوتی چلی گئی...... تب مجھے احساس ہوا کہ عصام کے بات کرنے کا دھیما، دھیما لہجہ، گریس فل شخصیت اور ان کے باوقار انداز نے مجھے تو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور میں......
اس روز عصام حسبِ معمول پڑھانے آئے تو خلافِ معمول میں بہت چپ، چپ تھی۔ اِدھر اُدھر کی کوئی بات نہ کی، بس سر جھکا کر غائب دماغی سے پڑھتی رہی۔ میری خامشی اور اداسی کو وہ بھی محسوس کر چکے تھے۔ تب ہی جب میں نے ایک بات کا بالکل غلط جواب دیا تو وہ پوچھ بیٹھے۔
''کیا ہوا اسمارا؟ اگر طبیعت خراب ہے تو آج نہیں پڑھتے۔'' انہوں نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔
''نہیں...... نہیں...... ٹھیک ہوں میں۔'' میں نظریں چراتے ہوئے جھوٹ بول گئی۔
''اسمارا...... اِدھر دیکھو۔'' پہلی بار عصام نے مجھے اس طرح مخاطب کیا تھا...... میں نے بے ساختہ نگاہیں اٹھائیں...... نہ چاہتے ہوئے بھی میری

آنکھیں بھیگنے لگیں۔
''جی۔'' میں نے نچلا ہونٹ دانتوں سے کچلتے ہوئے کہا۔
''کچھ تو ہے......'' ایک لمحے میں ان کی آنکھوں نے میری آنکھوں میں مچلتی نمی کو محسوس کر کے پُر یقین لہجے میں کہا۔
''وہ......وہ......میرے لیے پروپوزل آیا ہوا ہے۔''
''کیا......؟'' اس بار ہلکا سا دھچکا عصام کو لگا تھا۔ مجھے تو یہی محسوس ہوا تھا۔
''تو کیا سب راضی ہیں؟'' ان کے لہجے میں چھپی بے چینی اور بے قراری پر میں نے بغور انہیں دیکھا عین اسی لمحے عصام نے بھی گہری اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا، ہم دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں......اُف! ان کی آنکھوں میں نہ جانے کیا کچھ تھا...... وہ سب کچھ جو وہ گزشتہ کئی ماہ سے چھپانے کی کامیاب کوشش کر رہے تھے...... ان کی بے چینی میرے چونکنے کے لیے کافی تھی۔
''پتا نہیں...... مگر منع کرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا......'' میں نے دھیرے سے کہا۔
''اور تم......؟'' بے ساختگی ہنوز برقرار تھی...... جس نے مجھے حوصلہ دیا تھا۔
''میں...... میں تو آپ کو چاہتی ہوں عصام۔''
نہ جانے کیسے یہ جملہ میرے کانپتے لبوں سے پھسلا اور میں خود بھی شرمندہ ہونے لگی۔
''اسمارا کیا کہہ رہی ہو؟'' شاید انہیں مجھ سے اتنی بے باکی کی توقع نہیں تھی۔
''جی...... آپ نے ٹھیک سنا۔'' میں اپنے جواب پر مطمئن تھی۔
''یہ جانتے ہوئے بھی کہ جس زندگی کی عادی تم ہو، میں تمہیں وہ نہیں دے سکتا...... میرے کاندھوں پر گھر کا، اماں کا، چار بہنوں کی کفالت اور پھر ان کی شادیوں کا بوجھ ہے...... اور تم...... تم نازوں میں پلی، شہزادیوں جیسی زندگی گزارنے کی عادی ہو...... میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا اسمارا۔'' عصام کے لہجے میں دکھ بول رہے تھے۔
''عصام آپ جیسے بھی ہیں، جو بھی ہیں، مجھے کوئی پرابلم نہیں کیونکہ...... کیونکہ......شاید...... میں آپ سے محبت کرنے لگی ہوں اور کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔'' کتنی سادگی، معصومیت اور قدرے بے باکی سے میں اتنی بڑی بات کہہ گئی تھی......وہ آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھتے رہ گئے۔ ان کے چہرے پر بھی ایک لمحے کے لیے بڑے خوب صورت رنگ اتر آئے تھے مگر دوسرے ہی لمحے چہرے پر اداسی چھا گئی۔
''اسمارا! آئی لو یو...... بٹ؟'' وہ ایک لمحے کو رکے ان کی خوب صورت آنکھوں میں اداسی نمایاں تھی۔
''بٹ؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔
''تم......تم......کو میرا انتظار کرنا پڑے گا۔ کیا تم میرا انتظار کر لو گی؟'' ان کے سوال پر میں نے نگاہیں جھکا کر اثبات میں سر ہلایا۔ جتنا معصوم اظہار اتنا ہی معصوم اقرار ہوا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان۔
''لیکن......'' عصام نے اچانک کہا۔
''لیکن کیا......؟'' میرا ننھا سا دل دھڑک گیا۔
''ابھی اس کا تذکرہ کسی سے بھی مت کرنا...... ابھی جب تک میں کسی قابل نہیں ہو جاتا، تمہیں نہیں مانگ سکتا چند سالوں میں جب میں کسی قابل ہو جاؤں اور تمہارے والدین بہ خوشی تمہارا رشتہ دے سکیں تب تک ہمیں خاموش رہنا ہوگا۔''
''اوکے ٹھیک ہے۔'' مجھے بھی عصام کی بات سے اتفاق تھا۔ میں نے پڑھائی کا بہانہ کر کے آنے والے رشتہ کو منع کر دیا اور ہماری معصوم محبت پروان چڑھتی رہی۔ ہم دونوں کے دن رات موبائل کے ذریعے ساتھ، ساتھ گزرنے لگے۔ شب بخیر کا لاسٹ میسج اور صبح بخیر کا پہلا میسج ہمارا ایک دوسرے کے نام

ہوتا۔ رات دیر تک ہم باتیں کرتے رہتے۔ ایک دن عصام چھٹی کر لیتے تو میرا دل ڈوبنے لگتا۔ میں باؤلی ہو جاتی۔ ان سے ناراض ہو جاتی اور وہ مجھے منا لیتے، ہماری پسند، ناپسند ایک ہونے لگی کھانے میں، پہننے میں، خوشبو، موویز اور سونگ غرض سب کچھ ایک دوسرے کی پسند سے وابستہ ہونے لگا۔

☆☆☆

ڈھیر سارے دن بیت گئے اس دوران بھیا کی شادی ہو گئی۔ عصام کی جاب اچھی ہو گئی اور انہیں کمپنی کی طرف سے کویت جانے کی آفر ہو گئی...... عصام نے بتایا تو مجھے رونا آ گیا۔

''عصام! نہ جائیں ناں پلیز...... میں کیسے رہ پاؤں گی؟''

''ارے پاگل! کیا میں رہ پاؤں گا؟ مگر یہ گولڈن چانس ہے ہمارے لیے، دیکھو تین چار سال جھٹ پٹ گزر جائیں گے اور پھر میں آ کر ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے تمہیں لے جاؤں گا۔'' عصام کی بات پر مجھے شرم آ گئی...... بات بھی ٹھیک تھی۔

یوں عصام جانے کی تیاریاں کرنے لگے، جانے سے پہلے وہ مجھے ملنے آئے تو میرا دل بری طرح بھر آیا...... انجانے واہمے اور خدشے بری طرح ہولا رہے تھے۔ جیسے یہ ہماری آخری ملاقات ہو...... شاید ہم پھر کبھی نہ مل سکیں۔ دل تھا کہ بیٹھا جا رہا تھا اور آنسو تھے کہ بہے چلے جا رہے تھے۔ عصام بھی بہت آزردہ تھے۔ ڈھیر ساری دعاؤں، اندیشے، واہمے اور خدشات لیے وہ رخصت ہوئے اور جاتے، جاتے میری شوخی، شرارتیں اور چلبلا پن بھی ساتھ لے گئے۔

میں جلے پیر کی بلی کی طرح سارا سارا دن اِدھر اُدھر بے چین، بے چین گھوما کرتی۔ میرا رزلٹ بی ایس سی کا آ چکا تھا۔ وقت گزاری کے لیے میں نے اسکول میں جاب کر لی تھی ہر ہفتہ عصام کی کال آ جاتی اور ہم چپکے، چپکے ڈھیروں باتیں کرتے۔

اب اماں، ابا جی، میری شادی کے بارے میں کافی سنجیدگی سے سوچنے لگے تھے۔ رشتے بھی آ رہے تھے۔ رافع بھی ہماری فیملی سے تعلق رکھتے تھے اور عصام کے اچھے دوستوں میں سے تھے۔ معقول جاب تھی فیملی بھی چھوٹی تھی۔ وہ، اماں اور ایک شادی شدہ بہن۔

گھر والے رافع کے حق میں ووٹ دینے لگے تو میں نے فوراً عصام کو کال لگائی...... عصام نے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ بس تم تھوڑے دنوں کے لیے ان کو روک لو میں اماں سے کہتا ہوں وہ خود آ کر تمہارے والدین سے بات کر لیں گی...... میں نے اپنی سی کوشش کی...... پھر عصام کو کال بھی کی مگر عصام کا سیل آف ملا۔ ایک، دو اور بیسیوں بار میں نے کوشش کی مگر...... اُف! میری حالت پاگلوں جیسی ہو رہی تھی نہ عصام کی والدہ آ رہی تھیں اور نہ عصام سے بات ہو پا رہی تھی۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ عصام ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ یا اللہ یہ سب کیا ہے؟ کس سے کہوں؟ کیا کروں؟ ان لوگوں کو کیسے روکوں؟ کیا کہہ کر رشتے سے انکار کر دوں؟ کوئی بہانہ، کوئی عذر، کوئی جواز، کوئی وجہ...... یا کوئی انہونی ہو جاتی جو وقت کی لگام تھام لیتی...... وقت کو وہیں روک لیتی...... اور عصام سے رابطے کا...... ان کے لوٹ آنے کا کوئی جواز بن جاتا...... کئی بار دل چاہا بھیا سے صاف، صاف بات کروں مگر پھر فطری حیا آڑے آ جاتی...... میرے بے قراری، میری بے چینی اور رت جگے بڑھتے چلے گئے...... پہلے تو کبھی کبھار بھیا سرسری عصام کا ذکر کر دیتے تھے، میں کان لگا کر سنتی کہ شاید وہ...... وہ...... لوٹ آئے ہوں۔ اور اچانک سے آ کر مجھے حیران کر دیں گے۔ مگر...... ایسا کچھ بھی تو نہ ہوا۔ سب کچھ اسی طرح تھا۔ میری اداسی، بے چینی، بے قراری، منتظر نگاہیں اور

آنسوؤں سے بھیگا تکیہ..... ہاں بدل گئے تو بس عصام..... میرے دل کے گوشے گوشے میں، میری سوچوں میں، میری نیندوں میں، میرے خیالوں میں، میرے رت جگوں میں، ہر طرف، ہر جگہ بس عصام کا ہی راج تھا..... میرے حواسوں پر عصام چھائے ہوئے تھے..... میں کیسے اتنی جلدی انہیں ذہن و دل سے نکال کر ان کی جگہ رافع کو دے سکتی تھی..... یہ کوئی آسان نہ تھا میرے لیے.....

بہت بڑے دل کی ضرورت تھی..... مضبوط اعصاب اور کٹھن فیصلے کی ضرورت تھی اور میں ٹھہری ایک بے بس، مجبور اور کمزور لڑکی..... ایسی لڑکی جو کسی پیاسی چڑیا کو دیکھتی تو بے چین ہو کر اس کے لیے کٹورے میں پانی رکھ دیتی، جو کسی غریب اور بے سہارا انسان کو دیکھتی تو خود کو بے تحاشا رونا آ جاتا۔ دوسروں کے دکھ پر دکھی ہونے والی بے بس لڑکی..... خود کتنی دکھی تھی..... عصام نے ایسا کیوں کیا تھا؟ یوں بنا بتائے سارے ناتے توڑ ڈالے تھے..... سارے وعدے اور عہد و پیماں یکسر بھلا بیٹھے تھے..... میں آخر کب تک تنہا اس محاذ پر لڑتی..... جبکہ کوئی امید باقی نہ رہی، کوئی آس نہ بچی..... میں نے سر جھکا کر رافع کے حق میں فیصلہ دے دیا اور ایسا کرتے وقت میں کس بری طرح سے چُور، چُور ہوئی تھی کیسے میں نے اپنے ڈوبتے دل کو سنبھالا تھا۔ اس کی گواہی وہ رات دے سکتی تھی جو میں نے آنکھوں میں گزاری تھی۔ وہ تکیہ اور وہ در و دیوار جو میرے آنسوؤں اور میری سسکیوں کے سچے گواہ تھے۔

میری حالت جیسے زندہ لاش کی سی ہو گئی تھی مگر میں ضبط کی آخری حدوں سے گزرتی ہوئی خود پر قابو پانے کی ناکام کوششوں میں مصروف تھی۔ میری چپ اور افسردگی کو سب لوگ گھر چھوڑنے کا غم سمجھ کر میری دل جوئی کرتے رہتے اور میں اندر، اندر بکھرتی رہی۔

بڑی دھوم دھام سے میری شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میں، اماں، ابا جی کی اکلوتی بیٹی اور بھیا کی لاڈلی بہن تھی۔ سارے ارمان نکالے جا رہے تھے۔ لڑکے والوں کی طرف سے بھی بہت گرم جوشی دکھائی جا رہی تھی۔

مہندی کا کمبائنڈ پروگرام تھا۔ رافع میرے برابر میں آ کر بیٹھے تو میں خود میں سمٹ گئی۔ یوں تو کسی کے ساتھ بیٹھنے کا سوچا تھا تو صرف عصام کے ساتھ..... مگر میں نے محسوس کیا کہ رافع کی نظریں مسلسل مجھ پر ہیں۔ مایوں کے زرد سوٹ اور گیندے کے گندھے ہاروں کے درمیان میں بھی اداسی کا حصہ لگ رہی تھی جو صرف میرے اندر تھی باہر تو بہت شور، ہنگامہ، قہقہے اور خوشگوار ماحول تھا۔ میرے اندر سے قطعی مختلف..... مجھے عجیب سی الجھن ہونے لگی تھی۔ رافع کو میں نے پہلے بھی ایک آدھ تقریب میں دیکھا تھا۔ وہ اچھے خاصے گڈ لکنگ اور ہینڈسم تھے۔ خاندان کی کئی لڑکیاں ان سے شادی کرنے کی خواہاں تھیں مگر وہ مجھے پسند کرتے تھے..... یہ بات انہوں نے خود مجھے رشتہ طے ہونے کے بعد بتائی تھی۔

خاندان کے لڑکے، لڑکیاں آپس میں چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے رسموں پر بحث ہو رہی تھی۔ مووی میکرز اپنے، اپنے کام انجام دے رہے تھے۔ میرا دل بہت بوجھل ہو رہا تھا۔ دل کرتا تھا کہ اٹھ کر بھاگ جاؤں..... مگر بڑے حوصلے اور صبر کے ساتھ بیٹھی رہی، رات دیر تک یہ محفل بجی رہی۔ میں رسموں سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آئی اور جلدی سے الماری کھول کر اپنا سیل فون نکالا۔ آج بھی ایک چھوٹی سی امید تھی کہ شاید..... عصام کا کوئی میسج، کوئی مس کال ہو..... مگر..... وہی مایوسی تھی..... میں نے ہمتیں جمع کر کے خود کو مضبوط کر لیا۔ اب جبکہ مجھے زندگی کا نیا سفر شروع کرنا تھا گو کہ رافع میری پسند نہیں تھے مگر..... تقدیر نے انہیں میرے نصیب میں لکھ دیا تھا، ان کا ساتھ

ہمیشہ کے لیے میرا مقدر بننے جا رہا تھا۔ میں نے اپنے سیل سے سم نکالی اور اسے الماری کی دراز میں مقفل کر دیا۔ گویا عصام کو بھلانے کی ناکام سی کوشش...... میں شاید خود پر قابو پا لیتی...... اگر شادی کی صبح وہ جان لیوا انکشاف نہ ہوتا۔

شادی کے روز صبح سے ہی اماں بہت افسردہ تھیں، بات بات پر ان کی آنکھیں چھلکنے لگتیں۔ ظاہر ہے وہ ''ماں'' تھیں اور میں ان کی اکلوتی لاڈلی بیٹی جو آج رخصت ہونے جا رہی تھی...... پرائی ہو جائے تو بیٹی بس مہمان کی طرح کچھ دیر کے لیے آتی ہے۔ وہ گھر جہاں زندگی کے کئی سال گزارے ہوتے ہیں۔ شادی کے بعد وہی گھر پرایا ہو جاتا ہے۔ میں بھی آج جی بھر کے آنسو بہا لینا چاہتی تھی۔ سارے آنسو، دکھ اور یادیں یہیں اپنے کمرے میں، اپنی الماری اور اپنے رازداں تکیے میں دفن کر کے جانا چاہتی تھی۔ آنے والے وقت کے لیے خود کو تیار کر کے رافع کی زندگی میں داخل ہونا چاہتی تھی تاکہ خوشگوار زندگی کی ابتدا کر سکوں۔

میں، بھابی، اماں اور بھیا ہم سب ناشتا کر رہے تھے۔ میں چائے کا کپ اٹھائے دھیرے، دھیرے سپ لے رہی تھی کہ اچانک بھیا نے میرے سر پر بم پھوڑا تھا۔

''اماں وہ عصام تھا ناں! اس کا کویت میں بہت سیریس ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ بہت بری حالت ہو گئی تھی بیچارے کی گزشتہ دو، ڈھائی ماہ سے اسپتال میں پڑا ہوا تھا۔ اب اللہ کا شکر ہے کچھ بہتر ہے۔ میں آپ کو بتانا بھول گیا تھا جب میں کارڈ دینے گیا تو اس کی والدہ بتا رہی تھیں۔''

''اُف!'' بے ساختہ میرے ہاتھ سے چائے کا کپ چھلک گیا اور گرم، گرم چائے میرے ہاتھ پر گر پڑی۔

''ارے کیا ہوا......؟'' بے ساختہ سب میری طرف متوجہ ہوئے۔

دور اندیشی

ایک صاحب اپنے دوست کے سامنے اپنی بیگم کے خلاف دل کی بھڑاس نکال رہے تھے۔ ''کبھی کبھی اس کی اوٹ پٹانگ باتیں سن کر میرا دل چاہتا ہے کہ اسے اٹھا کر اوپر کی منزل سے نیچے پھینک دوں مگر مصیبت یہ ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔''

''کیوں؟'' دوست نے پوچھا۔ ''یقیناً اس کا وزن زیادہ ہوگا۔''

''نہیں یار'' ان صاحب نے چڑ کر کہا۔ ''سوچتا ہوں کہ وہ اگر بچ گئی تو میرا کیا ہوگا۔''

مرسلہ: ارم کمال، فیصل آباد

''کچھ نہیں......'' میں نے دل کے بے تحاشا درد کو چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ ''واہ بھیا! اتنی بڑی بات بھول گئے آپ......'' دل نے چپکے سے گلہ کر دیا۔ بھابی نے جلدی سے ٹوتھ پیسٹ لا کر میرے ہاتھ پر لگا دیا تھا۔ میری آنکھوں سے بے شمار آنسو بہتے چلے گئے کچھ ہاتھ کی جلن اور کچھ دل کی جلن نے میرے اندر انگارے بھر دیے۔

''اُف خدایا! یہ سب کیا ہے۔'' میں اپنے کمرے میں آ کر بکھرنے لگی۔ ''جب عصام کو یہ پتا چلے گا تو...... کیا گزرے گی ان پر...... وہ کیا سوچیں گے؟ یہ کیسا امتحان تھا مجھ جیسی ناتواں لڑکی کا...... میں اس قابل کہاں ہوں کہ تیرے امتحانوں پر پورا اتر سکوں میرے مالک۔'' میں جو بہ مشکل خود کو کنٹرول کر پائی تھی ایک بار پھر سے تنکا تنکا ہو کر بکھر چکی تھی۔ میرے وجود کے ٹکڑے، ٹکڑے ہو رہے تھے۔ ''کس طرح سمیٹ پاؤں گی میں...... خود کو...... میں جو عصام کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ وہ مجھے بھول گئے وہ غلط سوچ تھی...... وہ بیچارے تو موت اور

زندگی کی جنگ لڑتے رہے اور میں یہاں...... اپنے آپ سے لڑتی رہی...... وہ مجھے بے وفا سمجھے گا......؟ مجھے غلط سمجھیں گے میں نے تو وعدہ کیا تھا...... ان کا انتظار کروں گی...... میں بھی کیا کرتی......؟ کب تک انتظار کرتی، کوئی رابطہ بھی تو نہ تھا۔'' اس انکشاف نے مجھے حواس باختہ کرڈالا تھا۔ خود ہی سوال کرتی اور خود ہی جواز تلاش کرتی۔

''اسمارا کی شادی کا پتا چلا تو مبارک باد دے رہا تھا۔'' بھیا باہر اماں کو بتا رہے تھے۔ ''اور شکایت بھی کی...... کہ اسمارا کی شادی کے بارے میں بتایا بھی نہیں۔'' بھیا بے دھیانی میں ان کے ساتھ ہونے والی موبائل گفتگو بیان کررہے تھے اور اندر کمرے میں، میں عجیب کیفیت سے دوچار تھی۔

کب میں بیوٹی پارلر گئی، کب تیار ہوکر آئی مجھے کچھ احساس نہ تھا۔ بھاری بھرکم، خوب صورت جوڑے اور دیدہ زیب قیمتی جیولری میں، شہر کی ماہر بیوٹیشن کے ماہر ہاتھوں نے مجھے بہت حسین بنا دیا تھا۔ ہر آنکھ میرے حسن کو سراہ رہی تھی...... ہر زبان میری تعریف کررہی تھی مگر میرے دل پر جیسے کوئی بوجھ تھا...... بھاری اور تکلیف دہ بوجھ...... کچھ کھونے کا احساس مجھے اندر، اندر کچوکے لگارہا تھا۔

رافع بھی مردانہ وجاہت کا مکمل پیکر لگ رہے تھے۔ ہماری نظریں اتاری گئیں، صدقات دیے گئے اور میں بے شمار رسومات کے بعد رخصت ہوئی۔ سسرال میں بھی بہت تپاک سے خیر مقدم ہوا۔ یہاں پر بھی مختلف رسمیں ہوئیں پھر مجھے میرے کمرے میں پہنچادیا گیا۔

میں نے اِک لمبی سانس لے کر کمر سیدھی کی اور خود کو شیشے میں دیکھا۔ واقعی میں بہت حسین لگ رہی تھی۔ ''عصام...... آج...... کاش...... رافع کی جگہ آپ ہوتے۔'' میرے دل نے ہلکی سی سرگوشی کی ساتھ ہی ہلکی سی دستک کے ساتھ رافع بھی کمرے میں داخل ہوئے۔ ''اُف کیسے گزارہ ہوگا میرا؟ آج کے دن کے لیے لڑکیاں کتنے سپنے دیکھتی ہیں؟ کیا، کیا سوچتی ہیں اور میں۔'' عجیب سی کیفیت کا شکار تھی...... میں نے نگاہ اٹھائی۔ رافع بہت اچھے لگ رہے تھے۔ میں نے سر جھکالیا۔ وہ آکر بیڈ پر بیٹھے تو میرا سر مزید جھک گیا۔

''اسمارا! تم مجھے ہمیشہ سے اچھی لگتی تھیں۔ جب اماں نے رشتے کی بات چھیڑی تو میں نے جھٹ تمہارا نام لے دیا اور دیکھو میری لگن سچی تھی کہ آج تم...... میرے سامنے ہو...... میری ملکیت ہو...... میری دکھ سکھ کی ساتھی۔'' وہ ایک جذب سے بولے جارہے تھے۔

''تو کیا...... میرے اور عصام کے جذبوں میں کھوٹ تھا؟'' دل نے سوال کیا۔

''اسمارا!'' رافع نے محبت سے چُور لہجے میں پکارا تو میں چونکی۔

''جی۔''

''میں ساری زندگی تمہیں اسی طرح چاہتا رہوں گا...... مجھ سے تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی، انشاءاللہ...... بس میری چھوٹی سے گزارش ہے کہ مجھ سے کبھی جھوٹ مت بولنا...... کیونکہ جو رشتے سچائی پر قائم رہیں وہ پکے اور سچے ہوتے ہیں۔ میں سب کچھ برداشت کرسکتا ہوں مگر جھوٹ، دھوکا اور بے اعتباری برداشت نہیں کرسکتا۔''

''جی......'' رافع کے اس جملے پر میں نے گھبرا کر انہیں دیکھا۔ میرے اندر تو پورے کا پورا سمندر چھپا تھا۔ کیسے، کیسے منہ زور طوفان مچل رہے تھے۔

''اُف بہت حسین ہیں تمہاری آنکھیں، یوں تو مت دیکھو پلیز۔'' رافع کے مخمور لہجے پر بری طرح سٹپٹا گئی اور جلدی سے آنکھیں جھکالیں۔ میری اس بے ساختہ معصومیت پر وہ زور سے ہنس دیے اور میں ان کی محبتوں کے آگے بے بس ہوگئی۔

رافع بہت...... نائس انسان ثابت ہوئے انہوں نے

مجھے اتنی محبت دی کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ ان کی اماں سے بھی بے تحاشا محبتیں، شفقت اور پیار ملا، میں، رافع کے دل کے ساتھ، ساتھ ان کے گھر پر بھی راج کرنے لگی۔ اتنا سب کچھ ملنے کے بعد تو کوئی بھی لڑکی خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھے گی مگر میں...... میرے اندر جیسے کوئی پچھتاوا، کوئی دکھ موجود رہتا جو پل، پل مجھے اذیت دیتا رہتا۔

ہر لمحے، ہر پل، عصام کی یاد ایک ٹیس کی صورت میرے دل میں اٹھتی اور میں اسے دبانے کی کوشش میں ہلکان ہو جاتی۔ دن گزرتے چلے گئے۔

رافع، عصام کے اچھے دوست تھے۔ کبھی کبھی سرسری سا تذکرہ ہو جاتا۔ عصام نے تین بہنوں کی شادیاں کر دی تھیں اس دوران عصام آئے بھی مگر ہماری کوئی ملاقات نہ ہوئی اور میں خدا کا شکر ادا کرتی کہ میرا ان سے سامنا نہ ہوا۔ ایک کڑوا سچ جو میرے اندر چھپا تھا اور جسے چھپا کر میں بظاہر بہت اچھی ازدواجی زندگی گزار رہی تھی کہیں اس میں کوئی دراڑ نہ پڑ جائے۔

اس رات ہم سب کھانا کھانے کے بعد ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ رافع نیوز ضرور سنتے تھے بریک آیا تو انہوں نے اِدھر اُدھر چینل بدلنا شروع کیا۔ کہیں کسی چینل سے ''غزلیات'' کا پروگرام آ رہا تھا۔ وہ بھی جگجیت سنگھ کی غزل...... میرا گیت امر کر دو۔ اسٹارٹ ہوئی تو میں بری طرح چونکی۔ مجھے لگا میری سماعتوں میں عصام کی خوب صورت آواز گونجنے لگی۔ ان کے چہرے کا اتار چڑھاؤ اور مجھے دیکھتی وارفتگی بھری آنکھیں...... جیسے میرے اندر سوئیاں سی چبھنے لگیں، میری آنکھوں میں نمی جھلکنے لگی۔

''پلیز رافع ! چینل چینج کر دیں۔'' گڑیا کی نیپی چینج کرتے، کرتے میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔

''ارے کیوں یار! اتنی پیاری غزل ہے۔'' رافع نے حیرت سے مجھے دیکھ کر کہا۔

''ہو گی مگر...... مجھے نہیں سننی......'' میرا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی حد درجہ رُوڈ ہو گیا۔ تھا۔ میری بے وجہ بیزاری پر رافع نے کاندھے اچکا کر جھٹ سے چینل بدل دیا۔

''اٹس او کے یار! کوئی بات نہیں، تمہیں پسند نہیں تو نہیں سنتے ہیں۔'' وہ مسکرائے تو میں خود ہی اپنی حرکت پر شرمندہ ہونے لگی...... ''رافع کتنے پیارے انسان ہیں۔ میری ہر جائز ناجائز بات کو بھی جھٹ سے مان لیتے ہیں۔ جیسے میں کوئی بچہ ہوں۔ مجھے کانچ کی گڑیا کی طرح سنبھال کر رکھا ہے۔'' میں خود پر رشک کرنے لگتی۔

گڑیا کے بعد شانی نے آکر ہمارے گھر کی رونقیں مزید بڑھا دیں...... وقت کے ساتھ، ساتھ اماں اور ابا جی کا انتقال ہو گیا تھا۔ بھیا اور بھابی اپنے تینوں بچوں کے ساتھ باہر شفٹ ہو چکے تھے۔ میں، رافع اور بچوں کے ساتھ یوں تو اپنی زندگی میں مگن تھی مگر کبھی، کبھی ایک کسک ضرور ہوتی۔



عصام اپنی سب سے چھوٹی بہن کی شادی پر پاکستان آئے تھے اور اس بار رافع کا پکا ارادہ تھا ان کے ہاں شادی پر جانے کا...... میں چاہ رہی تھی کچھ ایسا ہو جائے کہ ہمارا جانا کینسل ہو جائے۔ مجھ میں آج بھی عصام کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ دل کے کسی کونے میں آج بھی بڑے دھڑلے کے ساتھ وہ موجود تھے۔

میں شادی والے دن بہت بے دلی سے تیار ہوئی۔ لائٹ سے کام کی آف وائٹ شیفون جارجٹ کی ساڑی پر موتیوں کا ہلکا سا سیٹ پہن لیا۔

''ارے واہ یار! اتنی سادگی میں بھی قیامت ڈھا رہی ہو تم۔'' رافع نے کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے دیکھ کر کہا اور مجھے بانہوں میں بھر لیا۔

''افوہ...... آپ بھی ناں......'' میں نے

شرماتے ہوئے انہیں خود سے الگ کیا۔
شادی بہت اچھے بینکوئٹ ہال میں ارینج کی گئی تھی کیوں نہ ہوتی عصام آج کافی صاحبِ حیثیت تھے۔ وہ سامنے ریسپشن پر ہی تھے۔ بلیک سوٹ میں نفاست سے بنائے ہوئے بالوں میں دراز قد عصام وقت کے ساتھ، ساتھ مزید گریس فل ہوگئے تھے گاڑی سے اترتے ہی میں بری طرح لڑکھڑا گئی۔ وہ بے تابانہ آگے بڑھے مگر...... رافع کی طرف... وہ رافع سے گلے مل رہے تھے بہت گرم جوشی کے ساتھ...... پھر مجھے دیکھا اور ہولے سے مسکرا دیے۔
''السلام علیکم!''
''وعلیکم السلام۔'' میں نے اپنی نگاہ اٹھائی۔ نہ جانے کیا کچھ تھا ان کی اداس آنکھوں میں۔ میں بری طرح سٹپٹا گئی۔
''عصام! یہ اسمارا ہے، میری جانِ عزیز، میری زندگی۔'' رافع نے میرا بازو تھام کر محبت سے چور لہجے میں میرا تعارف کرایا۔
''گڈ بہت اچھی ہیں تمہاری وائف!'' وہ پھیکی ہنسی کے ساتھ بولے اور میں ایٹی کیٹس بھلا کر بنا کچھ کہے تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ میری آنکھوں کے گوشے نم ہونے لگے تھے۔ اتنے سالوں بعد وہ ملے بھی تو اتنی اجنبیت اور رسمی ملاقات......
رافع کے بہت سے پرانے دوست احباب تھے، رافع ان سب کے ساتھ ملاقات کرنے لگے اور میں گڑیا اور شانی کے ساتھ ایک ٹیبل پر آبیٹھی...... گڑیا بھی رافع کے پاس چلی گئی تھی اور میں شانی کے ساتھ کھیلنے لگی۔ تب ہی عصام ہماری ٹیبل پر آئے۔
''اسمارا! تم نے تو وعدہ کیا تھا ناں کہ میرا انتظار کرو گی؟'' ان کے لہجے میں بے پناہ دکھ بول رہے تھے، میری پلکیں بھیگنے لگی تھیں۔
''عصام! میں نے بہت ٹرائی کیا آپ کا نمبر بند تھا۔'' میں نے صفائی دینے کی کوشش کی۔ ''مجھے تو خود آپ سے گلہ تھا مگر...... کافی بعد میں پتا لگا کہ آپ کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا مگر تب تک بہت دیر ہوچکی تھی عصام...... یہ سب اللہ کی طرف سے ہوا ہے۔ نہ آپ کی غلطی تھی اور نہ میرا قصور بلکہ شاید رب کو ہمارا ملنا منظور نہ تھا۔ میں خوش ہوں عصام...... پلیز آپ بھی شادی کرلیں۔'' میرا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔
''اللہ تمہیں خوش رکھے اسمارا! مگر تقدیر نے نہ جانے یہ کھیل کیوں کھیلا ہمارے ساتھ۔'' وہ دکھی لہجے میں بولے۔
''ارے یار! تو یہاں ہے، میں تجھے ڈھونڈ رہا تھا۔'' نہ جانے اچانک ہی رافع کہاں سے آگئے تھے۔
''وہ......وہ......میں......'' ہم دونوں ہی سٹپٹا گئے۔
''چل یار! اچھا کیا میری بیگم کو کمپنی دی۔'' رافع نے عصام کے کاندھے پر ہاتھ مار کر بے تکلفی سے کہا۔ شکر ہے انہوں نے ہماری باتیں سنی نہیں۔
''بیٹھو یار میں ذرا آتا ہوں ابھی۔'' عصام نے کہا اور آگے بڑھ گئے۔
واپس لوٹتے ہوئے رافع نے زبردستی عصام کو گھر پر کھانے پر مدعو کرلیا۔
''نہیں یار، اس کی ضرورت نہیں۔ آجاؤں گا کسی بھی دن۔'' عصام نے پس وپیش سے کام لیا۔
''ارے یار! میری بیوی جتنی خوب صورت ہے اتنی ہی بہترین کک بھی ہے۔'' رافع نے قہقہہ لگا کر مجھے مزید سراہا۔
''اچھا یار آجاؤں گا۔'' عصام نے بھی رافع کے بے انتہا اصرار پر حامی بھرلی۔
اس روز میں نے کھانے کا خاص اہتمام کیا۔ بریانی، دم کا قیمہ، چکن بروسٹ، سلاد اور ٹرائفل سب کچھ بنایا۔ کھانا تیار کرکے کمرے میں آگئی۔ آج کپڑے چینج بھی نہیں کیے۔ صبح کا پہنا ہوا لائٹ براؤن کاٹن کا عام سا سوٹ تھا۔
عصام آگئے تھے اور رافع کے ساتھ ڈرائنگ

روم میں بیٹھے تھے اور میں شانی کے ساتھ اپنے کمرے میں تھی۔ کھانے کا وقت ہوا تو میں نے کھانا ٹیبل پر لگا دیا۔ عصام، رافع، اماں بیٹھ گئے میں خواہ مخواہ کچن میں مصروف ہوگئی۔

''تم بھی آجاؤں ناں...'' رافع نے کچن میں آکر مجھے بلایا۔ تب مجھے بھی ٹیبل پر آنا پڑا۔ عصام نے ساری چیزیں کھائیں، کافی تعریف کی۔ کبھی کبھار ایک آدھ نظر مجھ پر ڈال لیتے کھانا کھا کر میں نے کافی بنائی اور سب لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے اماں جلدی سو جاتی تھیں سو وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

☆☆☆

اِدھر اُدھر کی باتیں چل نکلیں۔ ''ارے یار۔'' جیسے رافع کو اچانک کچھ یاد آیا، تم ایک زمانے میں غزلیں بہت سناتے تھے۔ چلو آج کچھ ہو جائے۔''

''نہیں یار، اب نہیں گاتا۔'' عصام نے پہلو بچایا۔

''نہ جی نہ! آج تو کچھ ہو ہی جائے۔ پرانی یادیں تازہ ہو جائیں۔'' رافع بھی اپنے نام کے ڈھیٹ تھے۔ ''ہماری بیگم کو بھی تو پتا چلے۔''

''مجھ سے زیادہ کس کو پتا ہوگا؟'' میں نے بیچارگی سے عصام کو دیکھا۔ ''یار! سناؤ ناں وہ والی جس پر تمہیں کالج میں ایوارڈ بھی ملا تھا۔ ہونٹوں سے چھولو تم میرا گیت امر کردو۔'' رافع اپنی روانی میں کہتے گئے۔

''پلیز رافع یار نہیں...... یہ والی نہیں سنا سکتا۔'' عصام کے سختی سے اس طرح انکار پر سب سے زیادہ رافع چونکے تھے۔ یکلخت وہ سنجیدہ ہوگئے اور غور سے عصام کو دیکھا...... کتنے ٹوٹے ہوئے لگے رہے تھے وہ دوسری نظر رافع نے مجھ پر ڈالی...... میری حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ رافع نے ایک گہری نظر مجھ پر ڈالی ان کی نظر کا تاثر بدل چکا تھا ابھی جو آنکھیں ہنس رہی تھیں یک دم سنجیدہ ہوگئی تھیں۔ حیرت اور تیز چبھتی ہوئی نظریں...... جو دل کے آر پار ہوئی جارہی تھیں۔ نظروں کی کاٹ سے جیسے بدن لہولہان ہونے لگا تھا۔ وہ ایک کمزور لمحہ تھا اور اسی کمزور لمحے کی گرفت میں عصام اور میں دونوں آچکے تھے۔ جس جذبے اور سچائی کو میں گزشتہ کئی سالوں سے اپنے اندر چھپا کر بظاہر مطمئن زندگی گزار رہی تھی۔ وہ یک دم ہی کھل کر سامنے آچکی تھی۔

''اوہو۔'' رافع نے ہونٹوں کو سکیڑ کر پہلے عصام کو اور پھر مجھے دیکھا۔ عصام کی بے ساختگی پر شاید انہیں کافی عرصہ پہلے میری بے ساختگی یاد آگئی تھی جب میں نے بھی تڑپ کر یہ غزل سننے سے انکار کر دیا تھا۔ فقط ایک لمحہ ہی سب کچھ عیاں کر گیا تھا۔ ہماری مشترکہ کمزوری نے ہمیں بے نقاب کر دیا تھا۔ میری حالت ایسی تھی جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ لگتا تھا چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہوں اور ہاں واقعی...... یہ چوری ہی تو تھی...... رافع نے جس انداز سے ہمیں باری، باری دیکھا تھا وہ میرے ڈوب مرنے کے لیے کافی تھا۔

''ارے یار! سیریس مت ہو۔'' دفعتاً عصام نے حالات کو سنبھالا دینے کی ناکام کوشش کی۔ ''سنا دیتا ہوں اگر تم کہتے ہو تو......''

''نہیں یار کوئی بات نہیں...... پھر کبھی سہی۔'' رافع نے بھی قدرے سنبھل کر کہا۔

''چلو اوکے یار، میں چلتا ہوں اماں بھی اکیلی ہیں گھر میں۔'' عصام نے اٹھنا غنیمت سمجھا۔

''چلو میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔'' رافع نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔ دونوں جا چکے تھے اور میں وہیں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

''مجھ سے کبھی کچھ جھوٹ نہیں بولنا، کچھ چھپانا نہیں، میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں مگر...... مگر...... جھوٹ، دھوکا اور بے اعتباری نہیں......'' رافع کے الفاظ کی بازگشت میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔

''اسمارا بیگم! آج تم...... بے وقعت ہوگئیں،

جس کمزور لمحے سے بچنے کے لیے تم نے کئی سال خود کو سنبھالے رکھا آج...... آج...... اس نے تمہیں اپنی گرفت میں لے لیا ناں۔'' اور اب کسی بڑے طوفان کی آمد تھی۔ ''سنا ہے مرد جتنی شدت سے پیار کرتا ہے اتنی ہی شدت سے نفرت بھی کرتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو......؟ میں...... میں تو مر جاؤں گی...... کیسے جی پاؤں گی اپنی انا، اپنی عزت اور وقار کو مجروح ہوتا دیکھ کر......'' رافع شاید واک بھی کرنے لگے تھے۔ اماں سو چکی تھیں۔ دونوں بچے سو چکے تھے۔ میں اپنی زندگی کے سب سے گھناؤنے پل کی منتظر بیٹھی تھی، اپنی بربادی اور تباہی کے آثار صاف دیکھ رہی تھی۔

''کیسے جی پاؤں گی میں اگر رافع نے دھتکار دیا تو...... کہاں جاؤں گی......؟ لوگ کیا کہیں گے؟ لوگوں کی طعنہ زنی اور دل چیرنے والے الفاظ تو پل، پل ماریں گے اور اگر...... رافع نے ساتھ بھی رکھا تو...... کتنی بے حیثیت رہوں گی...... اپنے آپ سے شرمندہ اور رافع کے سامنے کیسے رہ پاؤں گی......'' میں مختلف قسم کے سوالوں میں الجھی پاگل ہو رہی تھی۔ ''یوں ساری زندگی لحہ، لحہ مرنے سے تو بہتر ہے کہ اسی وقت ہی مر جاؤں......'' فیصلہ کر کے میں اماں کے کمرے میں گئی اور ان کی نیند کی گولیوں سے بھری بوتل لے کر اپنے کمرے میں آگئی۔ آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے بوتل کھولی اور ڈھیر ساری گولیاں ہتھیلی پر ڈال کر ابھی منہ میں ڈالنے ہی والی تھی کہ کسی نے زور سے ہاتھ مار کر گولیاں زمین پر گرا دیں۔ میں نے دھندلائی آنکھوں سے دیکھا تب تک رافع کا بھرپور تھپڑ میرے چودہ طبق روشن کر چکا تھا۔

''پاگل ہو گئی ہو کیا......؟ کیا ہے یہ سب؟'' انہوں نے کاندھے سے پکڑ کر مجھے جھنجوڑا۔

''رافع...... رافع...... مجھے معاف کر دیں۔'' میں رافع کے سینے سے لگ کر بری طرح رو دی۔

''میں نے آپ کو دھوکا دیا ہے ناں...... مجھے مر جانے دیں۔ میں بہت بری ہوں۔''

''دماغ خراب ہو گیا ہے کیا تمہارا......؟ تم تو میری جان ہو...... میں کیسے رہ پاؤں گا اپنی جان کے بنا...... تم میری زندگی ہو...... میری روح ہو...... میری حیات تم ہو...... اور...... تم...... جس بات کا ذکر کر رہی ہو مجھے پتا ہے اس کا...... اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تم ہو ہی اتنی حسین کہ کوئی بھی تمہاری تمنا کر سکتا ہے۔ تمہیں ٹوٹ کر چاہ سکتا ہے اور تمہارا ماضی کیا تھا...... مجھے اس سے کچھ نہیں لینا...... بس مجھے اتنا معلوم ہے کہ تم اب میری ہو...... میری جان...... میرے گھر اور میرے دل کی ملکہ...... اور تم کتنی آسانی سے مجھے چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کر بیٹھی تھیں۔ کیا کبھی میری محبت میں کوئی کمی دیکھی؟ کیا مجھ سے کبھی کوئی شکایت ہوئی تمہیں؟ تم نے تو خود غرضی کی حد کر دی۔'' رافع نے ایک جھٹکے سے مجھے خود سے الگ کیا اور منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔ اب کی بار وہ سچ، مچ خفا ہوئے تھے۔

''رافع پلیز...... مجھ سے منہ نہ موڑیں، میں مر جاؤں گی۔'' میں نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑے تو انہوں نے تڑپ کر میرے ہاتھ تھام لیے اور مجھے بانہوں میں بھر لیا۔

''اچھا آج سے یہ ٹاپک کلوز...... تم میری ہو اور میں تمہارا بس۔''

''رافع! آپ...... آپ...... سچ میں بہت عظیم ہیں۔ میں دنیا کی خوش قسمت ترین عورت ہوں کہ مجھے آپ جیسا ساتھی ملا۔'' آج پہلی بار میں نے دل سے یہ الفاظ کہے تھے۔

''چپ کرو زیادہ مکھن مت لگاؤ۔'' رافع نے مزاحیہ انداز میں کہہ کر اپنے لب میرے ماتھے پر رکھ دیے اور میری بے قراریوں کو قرار مل گیا تھا۔

زویا اسکول سے گھر پہنچی......تو حسبِ توقع اس کی بڑی آپا کا غصہ ہائی لیول پر تھا۔

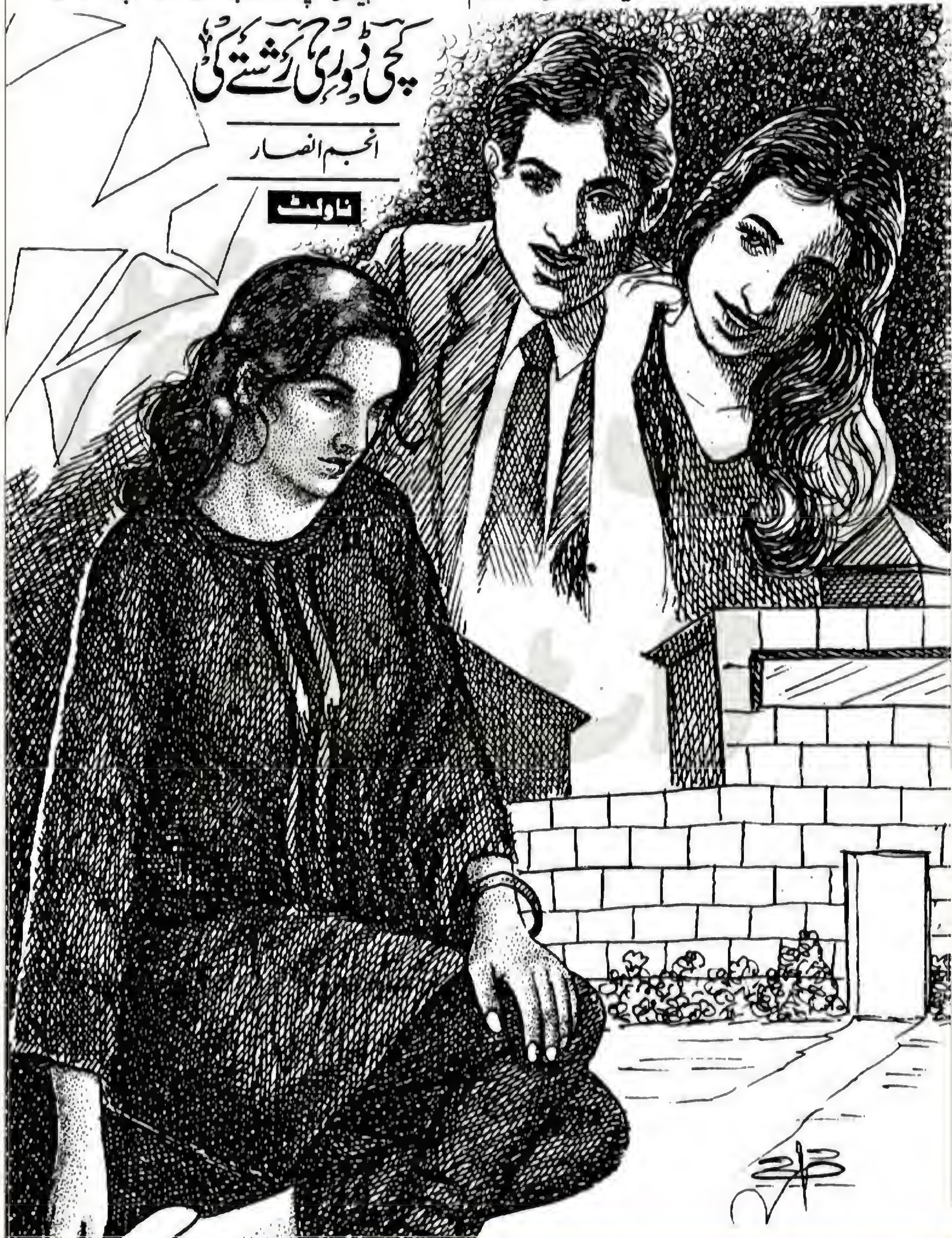
"تمہیں بتایا تھا ناں...... آج رشتے کے لیے کچھ خواتین تمہیں دیکھنے کے لیے آ رہی تھیں......اور تم نے آج بھی وہی کیا......جو دو سال سے کر رہی ہو۔ اتنی دیر سے گھر آئیں کہ مہمان مایوس و نامراد ہو کر واپس چلے گئے۔"

"پیاری آپا...... جب میں نے آپ کو بتا دیا

کچی ڈوری رشتے کی

انجم انصار

ناولٹ



ہے۔ اب میں دوبارہ شادی نہیں کرنا چاہتی تو نہیں چاہتی...... ایک مرتبہ آپ نے میری شادی کر کے دیکھ تو لی ناں...... تو پھر میں کاہے کو دوبارہ......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

''بیٹا...... اگر کبھی غلط بس یا غلط ٹرین میں بیٹھ جائیں تو کیا کبھی دوبارہ سفر نہیں کیا کرتے......؟ تمہاری شادی...... اگر ایک غلط شخص سے ہوگئی تھی تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہر مرد ہی شکی، وہمی ہوگا اور وہ زندگی کو خوش اسلوبی سے بسر کرنا ہی نہیں چاہے گا۔''

''ہاں، نہیں چاہے گا...... میرا تو یہی تجربہ ہے۔ ہر مرد شادی کے بعد...... ایک وہمی شخص کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے اور اس کا صرف یہی کام رہ جاتا ہے کہ اپنی بیوی کو بے ایمان ڈکلیئر کرے...... جیسا وقار نے کیا تھا...... بلکہ اس نے تو مجھے چور تک کہہ ڈالا تھا کہ میں اس کے والٹ سے پیسے نکالا کرتی ہوں۔ بھول گئیں کیا آپ، کیسا ذلیل کرتا تھا وہ......''

''اب وقار کا قصہ ختم ہو چکا ہے، وہ تمہیں طلاق دے کر جا چکا ہے اور تمہاری شادی کے ناکام ہونے کی ذمے داری تم پر بالکل نہیں ہے، تم نے آخری وقت تک نبھانے کی کوشش کی تھی۔'' اسے سمجھاتے، سمجھاتے آپا کی آواز بھرا گئی۔

''مگر اب میں سمجھوتوں کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتی...... الحمدللہ میرا اپنا اسکول چل رہا ہے...... مجھے مالی پریشانی ہے اور نہ ہی کوئی دوسری...... اس کے طفیل میرا وقت بہت اچھا گزر رہا ہے۔''

''مگر یہ مت بھولو...... تمہارے بزنس پارٹنر جاوید اور ان کی بیگم کافی چالاک ہیں، وہ بے شک تمہارے اسکول کے برابر کے حصے دار ہیں...... مگر میری چھٹی حس کہتی ہے کہ وہ اس اسکول کے منافع میں کبھی تمہیں برابر کا حصہ نہیں دیں گے...... ہاں نقصان میں تم ضرور شامل رہو گی۔''

''نہیں آپا...... ایسا کچھ نہیں ہوگا، پرنسپل کی سیٹ پر میں بیٹھتی ہوں، مسز جاوید نہیں بلکہ وہ تو اپنے پاؤں کی تکلیف کی وجہ سے کبھی کبھار ہی آپاتی ہیں...... تیز طرار وہ بے شک ہیں...... اسکول سے متعلق ہر معاملے پر ان کی نظر ہوتی ہے تو یہ کوئی بری بات نہیں ہے...... اگر ہمارا بزنس پارٹنر سمجھدار ہے تو یہ تو پازیٹو پوائنٹ ہے ناں......'' زویا نے کہا۔

''یہ سب باتیں میں نہیں جانتی...... مگر مجھے تمہارا صبح سے شام تک اسکول کی نگرانی کرنا پسند نہیں ہے۔ یہ کوئی زندگی نہیں ہے، وقت گزارنے کے لیے مشین بن جاؤ۔''

''مگر مجھے شاید...... اب مشین بن کر ہی رہنا ہے۔'' زویا نے کہا۔

''اگر مجھے حسن کے پاس امریکا نہ جانا ہوتا...... تو تم جو دل چاہے کرتی رہتیں...... مگر میرا بچہ مجھے بلا رہا ہے اور میں تمہیں یوں تن تنہا چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی۔''

''آپ چلی جائیں ناں...... کب تک چھوٹی بہن کا ساتھ دیں گی۔ اب اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھیے جو آپ کو خوشی، خوشی بلا رہا ہے۔ میں اب کوئی ٹین ایجر لڑکی نہیں رہی ہوں۔ جو اپنا خیال نہ رکھ سکوں ...... بہت خیال کر لیا آپ نے میرا...... مجھے تو اپنی ماں تک یاد نہیں کہ وہ مجھے دو سال کا چھوڑ کر بابا کے ساتھ ہی راہیِ ملک عدم ہوگئی تھیں۔''

☆☆☆

''نہیں اماں...... میں دوبارہ رسک نہیں لے سکتا...... ایک مرتبہ شادی کر لی تھی ناں...... اور اپنی پسند سے کی تھی...... جس کے ساتھ میری اچھی انڈر اسٹینڈنگ بھی تھی...... مگر کیا ہوا...... اس کا دم میرے گھر میں گھٹنے لگا...... میری گاڑی میں بیٹھ کر اس کی تذلیل ہونے لگی...... اور اس نے پیسے والی آسامی ڈھونڈ کر مجھ سے خلع لے لی۔''

''گدھا باندھ کر گھوڑا خریدنے والے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ چلو ماہین تمہاری پسند تھی، اس لیے

تمہاری شادی کامیاب نہیں ہوسکی اور اب زویا میری پسند کی لڑکی ہے اور وہ بھی ایسا ہی چرکہ کھا چکی ہے، تم اس کے ساتھ بہت خوش رہو گے۔'' اماں نے پیار سے اسے سمجھایا۔

''اماں...... میں اپنی موجودہ زندگی سے بہت مطمئن ہوں...... ہمارے مالی حالات بھی پہلے سے بہت بہتر ہوگئے ہیں۔ میں اپنے بزنس کے سلسلے میں گھومتا رہتا ہوں۔ میرا دل شاد رہتا ہے اور مجھے کبھی دوسری شادی کرنے کا خیال تک نہیں آتا۔'' فراز نے چڑ کر کہا۔

''بیٹا...... میں یہ بات جانتی ہوں کہ ہر لڑکی بری نہیں ہوتی۔ تم بھروسا تو کرو اپنی ماں پر...... میرا انتخاب تمہیں نہ صرف پسند آئے گا بلکہ تم اپنی ماں کے شکر گزار بھی ہو گے...... کہ سوتیلی ماں ہی سہی...... مگر تمہیں میں نے ہی پالا ہے اور تمہیں کبھی مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔''

''ایسا مت کہیے آپ... میرے لیے سب کچھ آپ ہی ہیں۔''

''زویا بہت اچھی لڑکی ہے...... اس کی بڑی آپا بے حد سلجھی ہوئی خاتون ہیں...... اور میرا یہ پکا خیال ہے کہ وہ لڑکی تمہیں سمیٹ لے گی...... اور تم اپنی گزشتہ تلخ زندگی کو بھول کر...... اپنی نئی زندگی شروع کرو گے۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں...... دوسری شادی... کرنے کے بعد زندگی کی تلخی ختم ہوجائے گی؟'' فراز کی تیوری چڑھ گئی۔

''بیٹا...... شادی زندگی میں تبدیلیاں لانے کا دوسرا نام ہی تو ہے۔''

''مگر ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ میری زندگی میں تلخیاں مزید بڑھ جائیں اور دوسرا تجربہ پہلے سے بھی زیادہ برا ہو۔'' فراز نے پھیکے سے لہجے میں کہا۔ ان کا دل...... کسی بھی انجانی لڑکی سے شادی کرنے کو نہیں چاہتا تھا۔ اور زویا ان کے لیے انجان ہی تو تھی۔

پہلی شادی ناکام ہونے کا سبب بھی وہ یہی سمجھتے تھے کہ انہیں ماہین کے بارے میں اتنی معلومات نہیں تھیں جتنی کہ ہونی چاہیے تھیں...... ورنہ وہ اس سے شادی کرنے کا ارادہ کبھی نہیں کرتے، ماہین سے انہوں نے کتنی محبت کی تھی...... کتنا اس کا خیال رکھا تھا مگر وہ بے وفائی کی مرتکب ہوئی تھی...... اور کیچڑ ان پر اچھال گئی تھی۔

''یہ محبت کرنے والیاں...... تن من نچھاور کرنے والیاں تو شاید اب ڈراموں اور فلموں میں ہی نظر آیا کرتی ہیں...... حقیقی زندگی میں تو اب ناپید ہوگئی ہیں۔'' انہوں نے سوچا...... اور ایک گہری سانس لے کر صوفے کی پشت سے سر لگا کر آنکھیں بند کر کے نیم دراز ہوگئے۔

''تم ذلیل ہو، تم اس قابل ہی نہیں کہ تم پر ٹرسٹ کیا جائے...... اور آج مجھے تم سے علیحدہ ہوتے، ہوتے اس بات کی خوشی ہو رہی ہے کہ میں نے تمہیں بتائے بغیر اپنا بچہ ضائع کروا کے انتہائی عقل مندی کا ثبوت دیا تھا...... ورنہ وہ بچہ میرے گلے کی گھنٹی بن جاتا۔''

''تم اس حد تک بھی گر سکتی ہو...... اس حد تک بھی...... میں کبھی سوچ نہیں سکتا تھا۔'' شدت دکھ سے وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''مت سوچو...... تمہیں سوچنا بھی نہیں چاہیے...... بغیر دماغ کے لوگ...... الٹ پلٹ ہی سوچا کرتے ہیں۔'' ماہین جاتے، جاتے بھی ان پر کچوکے لگاتے ہوئے گئی تھی۔

اور زندگی کے کتنے ہی برس...... انہوں نے یہی سب کچھ سوچتے ہوئے گزار دیے تھے کہ اب وہ اپنے ساتھ مزید برا نہیں ہونے دیں گے۔

مس عارفہ...... ان کی یونیورسٹی فیلو تھیں...... لاہور میں ان کا بوتیک کا بڑا بزنس تھا...... فراز جب اپنی فرم کے حوالے سے لاہور جاتے تو ہمیشہ مس عارفہ سے جا کر ملا کرتے...... وہ شادی کرنے کے سخت خلاف

تھیں..... انہوں نے جب مس عارفہ کو بتایا کہ ان کی والدہ.....ان پر شادی کرنے کے لیے خوب زور دے رہی ہیں تو وہ بے حد ہنسیں۔

''مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم سب لوگوں کے دماغوں پر شادی کا ہوّا کیوں سوار رہتا ہے..... کیا بغیر شادی کیے زندگی سکون اور اطمینان سے نہیں گزاری جاسکتی؟''

''ہاں..... زندگی تو گزر ہی رہی ہے۔ مگر سکون اور اطمینان تو کہیں ہے ہی نہیں۔''

''پھر بھی ان لوگوں سے زیادہ ہے جو شادی کرلیا کرتے ہیں، میں تو بھئی کبھی کسی مرد کی غلامی نہ کروں..... اسی لیے چین سے رہ رہی ہوں..... اور میرے لیے تو راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔''

''اگر تم مشورہ دو..... تو میں بھی والدہ کو منع کردوں.....'' فراز پر بھی مس عارفہ کی باتوں کا خاصا اثر ہونے لگا تھا۔

''مجھے لگ رہا ہے کہ اب تم خود شادی کرنا چاہ رہے ہو.....اس لیے مختلف تاویلیں گھڑ رہے ہو کہ اماں یہ چاہتی ہیں، اماں وہ چاہتی ہیں۔'' وہ ان کی نقل اتارتے ہوئے ہنستے ہوئے بولی۔

''اگر میں والدہ کی بات مان لوں ... تو کیا غلط بات ہوگی؟'' فراز نے بے حد سنجیدگی سے پوچھا۔

''مجھے کیا پتا.....؟ میں کیا جانوں.....؟ میں تو .....صرف اپنے دل کی سنا کرتی ہوں اور یہ دماغ کیا .....جمع، نفی، ضرب، تقسیم کرتا ہے اس سے کوسوں دور رہتی ہوں.....اور بے حد خوش رہتی ہوں۔ ہاں بے حد خوش۔'' اور فراز.....کو پہلی مرتبہ یوں لگا تھا جیسے مس عارفہ نے ان کا مسئلہ دل کے ساتھ حل نہیں کیا ہو.....دل کی باتیں کرنے کے باوجود..... ان کو دل سے جواب نہ دیا ہو.....یا پھر ان کی دل کی دُگی دماغ کے جوکر نے کاٹ دی ہو۔

☆☆☆

''سنا ہے تم شادی کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہو؟'' زویا مسز جاوید کی مزاج پرسی کو گئی تو ان کا پہلا سوال ہی یہی تھا۔

''آپ کو کس نے بتایا.....؟'' اس نے حیرت سے پوچھا کہ یہ بات اس نے سرسری سی جاوید صاحب کو تو ضرور بتائی تھی مگر باقی اسٹاف کو تو بالکل پتا نہیں تھی اور وہ جانتی تھی کہ اسٹاف کو اِدھر سے اُدھر کرنے کی عادت بھی ہے۔

''مجھے جاوید نے بتایا تھا اور کون بتائے گا.....!'' وہ صاف دلی سے بولی تھیں۔

''آپ کیا مشورہ دیں گی..... مجھے شادی کرنی چاہیے یا نہیں؟'' کچھ سوچ کر زویا نے پوچھا۔

''میں تو صاف منع کروں گی۔'' وہ بے دھڑک بولیں۔

''مگر کیوں.....؟''

''تمہارا پہلا تجربہ..... کون سا اچھا رہا ہے۔'' انہوں نے تمسخر بھرے لہجے میں کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں مگر آپا کہتی ہیں کہ ہر مرد ایک جیسا تو نہیں ہوتا۔''

''مگر زیادہ تر شوہر امتحانی ثابت ہوتے ہیں اور بیوی کی ساری زندگی امتحان گاہ بن جاتی ہے۔''

''کیا جاوید صاحب بھی ایسے ہی شوہر ہیں؟'' اس نے ڈرتے، ڈرتے پوچھا۔

''میں ایک عام بات کر رہی ہوں.....اپنی بات نہیں کر رہی اور دوسری خاص بات کہ یہ جب تمہاری شادی ہوجائے گی تو اتنی تندہی سے اسکول پر بھی توجہ نہیں دے سکوگی تو ہمارا بزنس بھی تو متاثر ہوسکتا ہے ناں!'' آخر انہوں نے اپنے دل کی بات کہہ ہی دی۔

''آپ کا اور میرا بزنس تو مشترکہ ہی ہے ناں.....آج اگر ہمارے اسکول میں دو ہزار بچے پڑھتے ہیں تو میں تو یہی چاہوں گی کہ ان کی تعداد میں اضافہ ہو نہ کہ کمی.....''

"پھر بھی شادی کی ذمے داریاں...... ایک عورت کو خاصا پابند بنا دیتی ہیں۔ اس وقت تم اسکول کی دونوں شفٹوں کو دیکھ رہی ہو، گھر سے صبح کی آئی شام کو دیر سے گھر پہنچتی ہو تو شادی کے بعد تو معمولات میں تو فرق آ ہی جائے گا ناں۔"

"میں کوشش کروں گی کہ بہت زیادہ فرق نہ پڑے۔"

"تم کچھ نہیں کر سکو گی اس لیے میرا تو یہی مشورہ ہے کہ اب تم شادی کے چکر میں مت پڑو......"

"میں نے تو منع کیا تھا مگر آپا مان ہی نہیں رہی ہیں۔"

"ارے بھئی انہیں سمجھاؤ تم...... اور اپنے اسکول کو دیکھو...... ہم تو یہ چاہ رہے تھے اپنے اسکول کی شاخیں پورے شہر میں پھیلا دیں اور دوسری برانچ کی تو بات چیت بھی چل رہی ہے...... اور تم پر خواہ مخواہ شادی کرنے کا شوق سوار ہو گیا ہے۔" زویا جھینپ کر رہ گئی۔

اور زویا جب گھر آئی تو اس نے فوراً آپا کو منع کر دیا کہ وہ کسی سے شادی نہیں کرے گی اگر اس نے شادی کر لی تو اس کے اسکول کا بزنس بڑھنے کے بجائے ٹھپ ہو جائے گا۔

آپا نے جہاں اس کو تو بے مہار سنائی ہی تھیں وہاں مسز جاوید کو بھی نہ بخشا تھا...... بلکہ انہیں سائیکی، پگلو اور چالاک قطامہ تک کہہ دیا۔

"آپا اگر آپ کے خطابات مسز جاوید سن لیں ناں تو اسی وقت اپنے بزنس سے مجھے نکال کر کہیں کہ آج سے تمہاری شراکت داری ختم...... اب ہم اپنا پارٹنر کسی اور کو بنائیں گے تمہیں نہیں۔"

"اچھا ہے اسی بہانے جان چھوٹ جائے گی تمہاری۔" آپا کا غصہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

زویا کی ہمت نہیں تھی کہ آپا کا غصہ برداشت کر سکے کہ جب وہ اپنی بات پر اڑ جاتی تھیں تو کھانا پینا سب کچھ چھوڑ دیا کرتی تھیں۔

"ٹھیک ہے آپا...... آپ جو کہیں گی میں وہی کروں گی۔ آپ کو ہرگز نہ نہیں کہوں گی۔"

"پاگل ہوئی ہے کیا، میں کیوں اپنی گڑیا جیسی بہن کی شادی کسی ایرے غیرے نتھو خیرے سے کروں گی۔ دیکھو فراز بہت ڈیسنٹ سا لڑکا ہے، پرسنالٹی تو ہے ہی اس کی شاندار...... اور اس کا بزنس بھی بہت اچھا ہے۔ ایک بڑی سی تو فرم ہے اس کی پچاس سے زیادہ ملازم ہیں۔ دیکھو تم نے تو تصویر تک نہیں دیکھی۔" آپا نے سرشار سے انداز میں اپنے پرس سے تصویر نکال کر اس کے ہاتھوں میں پکڑا دی اور تصویر اسے بری نہیں لگی۔ خاص طور پر چشمے کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی ذہین آنکھیں اسے ہمدردی لگیں۔

"کیسا لگا؟" آپا نے پوچھا۔

"ہاں، برا نہیں ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

☆☆☆

"ہاں ٹھیک ہے......" اُدھر فراز بھی زویا کی تصویر دیکھ کر ماں کو اپنی رضامندی دے رہے تھے۔

"صرف اچھی نہیں ہے بلکہ بہت اچھی ہے...... جب وہ تیرا خیال رکھے گی تو ماں کو یاد کرے گا تو......"

"پتا نہیں۔" فراز تصویر پر ایک نظر ڈال کر ماں کے کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

مگر ان کے لیے...... اتنا ہی کافی تھا...... فراز نے اس دفعہ انہیں منع نہیں کیا تھا...... اور یہ بہت بڑی بات تھی۔ اور وہ اسی انتظار میں تھیں کہ فراز حامی بھر لیں اور بالآخر وہ...کامیاب ہو ہی گئیں۔

☆☆☆

آپا نے کیسے اور کس، کس طرح تیاریاں کیں اسے کچھ پتا نہیں تھا...... ہاں جب شادی کی رات وہ سولہ، سترہ سنگھار کیے فراز کے ساتھ اس کے بیڈ روم میں داخل ہوئی تھی تو اس نے اس کی خوب صورتی کو سراہنے کے بجائے بڑے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا۔

"زویا آپ کو طلاق کس وجہ سے ہوئی تھی؟"

"اپنی قسمت کی وجہ سے۔" اسے غصہ ہی تو آ گیا

تھا کہ یہ رات ان سوالوں کے لیے کہاں ہوتی ہے۔
”اوہ...... بتانا پسند نہیں کر رہی ہیں شاید آپ۔“ لہجہ تمسخرانہ تھا۔
”جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے، میرا ناتا ایک شکی، وہمی اور سائیکی قسم کے مرد سے جڑ گیا تھا۔ ظاہر ہے کیسے برقرار رہ سکتا تھا۔“
”اور پھر آپ نے دس سال تک شادی کے بارے میں سوچا ہی نہیں......“ اب وہ اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔
”جی ہاں...... دل ہی نہیں چاہ رہا تھا اور اس بار بھی میری بڑی بہن اگر میرے پیچھے نہ پڑتیں تو میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ شادی کے نام سے ہی مجھے وحشت ہوتی تھی۔“ اس نے ایک گہری نظر اس کی شاندار پرسنیلٹی پر ڈال کر اپنے دل کی بات کہہ دی کہ کہیں موصوف کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں۔
”آپ میرے ماضی کے بارے میں کیا جانتی ہیں؟“ فراز...... اب دوستانہ لہجے میں بول رہا تھا۔ اور اس کے عین سامنے والے صوفے پر بیٹھ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھ رہا تھا۔
اس کا دل تو چاہا کہ وہ اسے سنا دے کہ آپ کو بھی ایک عورت خلع کا پتھر مار کر گئی ہے، آپ بھی کسی کی امیدوں پر پورے نہیں اترے تھے مگر بڑی آپا کی ساری باتیں، مشورے، اور ہدایتیں یاد آئیں اور اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔
”مجھے آپ کے ماضی سے کوئی سروکار نہیں ہے، آپ میرا آج ہیں اور آنے والا کل...... اور میں سمجھتی ہوں کہ آپ کی سابقہ اور میری پچھلی شادی شاید اسی لیے ختم ہوئی تھیں کہ ہم دونوں کا ملنا نصیب میں لکھ دیا گیا تھا۔“ زویا کا خیال تھا کہ اس کے اس قدر محبت بھرے ڈائیلاگ کو سن کر وہاں سے بھی کوئی ایسی ہی جوابی کارروائی ہوگی۔ مگر وہ تو خاموش سا ہو گیا تھا۔ اور ایک گہری ہوں کہہ کر وہ صوفے سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا تھا۔
وہ جب کپڑے چینج کر کے آئی تو وہ اسی حلیے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔
”ایک بات آپ سن لیں زویا......“ وہ گہرے اور جذبات سے عاری لہجے میں بولا۔
”جی......“ وہ حیرت سے اس کے کٹھور سے لہجے پر چونکی۔
”یہ میرا گھر ہے، یہاں آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی...... مگر آپ یہ کبھی کوشش بھی مت کیجیے گا کہ میں آپ کے حساب سے اپنی زندگی بسر کروں۔ میری زندگی میری اپنی ہے اور اس پر کسی کو کوئی اختیار نہیں ہے۔ میں کیا کرتا ہوں اور کیا نہیں کرتا...... یہ سب آپ کا نہیں میرا مسئلہ ہے۔“
”کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم نے شادی تو کر لی ہے مگر زندگی اپنے، اپنے خانوں میں ہی بسر کریں گے؟“
”تمہارا جواب گو تلخ ضرور ہے مگر میرے جواب کے قریب ترین ہے اور تمہاری یہ ذہانت مجھے اچھی لگی۔“ وہ اب اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا...... اور اپنا والٹ اس کو دیتے ہوئے بولا۔
”اپنے لیے جو دل چاہے گفٹ لے لینا، مجھے معلوم نہیں کہ تمہاری پسند کیا ہے...... اور کیا چیز لینا پسند کرتی ہو۔“
”مجھے کچھ نہیں چاہیے...... ہر چیز میرے پاس موجود ہے، میں خود کماتی ہوں، آپ کے پیسے کی نہ مجھے ضرورت ہے اور نہ میں محتاج ہوں۔“ مارے غصے کے اس کے جو دل میں آیا وہ بولے چلی گئی اور آنسو تو لگ رہا تھا کہ بند توڑ کر نکل آئے ہوں۔
”یہ دوسری شادی بھی غلط ہی ہوئی۔“ اس کے دل میں یہی خیال آ رہا تھا۔
”ارے آپ کو میری بات بری لگی، ویری سوری...... پلیز مت روئیں، میں کسی کے آنسو نہیں دیکھ

سکتا۔" اس نے پاس آکر اپنے رومال سے اس کے آنسو بڑی دلجوئی سے پونچھے...... اور پھر اپنے والٹ سے بغیر گنے پانچ ہزار کے کافی نوٹ اس کے پرس میں ڈال دیے اور وہ خاموش ہوگئی۔ مگر اب اس کے آنسو اس کے دل پر گر رہے تھے۔

☆☆☆

شادی کے بعد زویا کو جلد ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ دوسری مرتبہ بھی اس کی شادی کسی نارمل شخص سے نہیں ہوئی ہے۔ ہاں وہ شکی نہیں تھا، وہمی نہیں تھا...... کنجوس نہیں تھا...... وہ اس کے معاملات میں نہ دلچسپی لیتا تھا اور نہ ہی پوچھ گچھ کرتا...... وہ اسکول سے تاخیر سے آتی تب بھی کوئی لفظ اس کی زبان پر نہیں آتا...... اور زویا...... اس کی اس بے حسی کو خوبیوں کا نام دے کر...... اپنے آپ کو خوش رکھنے لگی تھی۔ اس کے اسکول کی دوسری برانچ قائم ہوگئی تھی...... اب اسے دونوں اسکولوں میں جانا پڑ رہا تھا۔ وہ مطمئن تھی کہ شادی کے بعد فراز نے اس کے اوپر کسی قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں کی تھی۔

اس کے بزنس پارٹنر جاوید صاحب کو اکثر اس کی شادی شدہ زندگی پر ترس آتا اور وہ اس سے کہہ دیا کرتے۔

"زویا...... آپ کے شوہر واقعی بدنصیب ہیں، جنہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ ان کی بیوی کتنی ٹیلنٹڈ ہے۔"

"اب کیا کرسکتی ہوں میں۔ ان کی سوچ میں، کوئی تبدیلی تو نہیں لاسکتی ناں، وہ جس ڈھرّے پر چلنے کے عادی تھے، چل رہے ہیں...... انہیں اپنے بزنس سے دلچسپی ہے اور مجھے اپنے اسکول سے۔"

"پھر بھی...... آپ کو ان کے معمولات میں دلچسپی لینی چاہیے...... اگر وہ ہفتے میں دو تین دن...... اسلام آباد اور لاہور جاتے ہیں تو آپ کو بھی کبھی ان کے ساتھ جانا چاہیے۔" جاوید صاحب اسے سمجھاتے۔

"نہیں سر...... میں ایسا نہیں کرسکتی۔ میں تو بغیر دیے کوئی چیز نہیں لیا کرتی تو اپنے آپ کو کسی پر سوار کیسے کرسکتی ہوں۔ ہرگز نہیں...... کیا آپ میری عادت نہیں جانتے؟"

"کاش میرا کوئی چھوٹا بھائی ہوتا ناں...... تو اس کی شادی آپ سے کرتا...... اس فراز کو...... آپ تک آنے ہی نہیں دیتا...... ایسی ہیرا لڑکی کو واقعی پتھر ملا ہے۔"

"اور آپ کا کوئی بھائی ہے ہی نہیں تو معاملہ یہیں ختم کردیجیے۔" زویا نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جاوید صاحب کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

یوں بھی وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اس کی ذات کو موضوعِ گفتگو بنائے...... نہ وہ کسی کی ذاتیات میں دلچسپی لیا کرتی تھی اور نہ ہی وہ ایسا چاہتی تھی۔

اسکول میں بیٹھ کر...... اسے اسکول کے ہی معاملات کو ڈسکس کرنا اچھا لگتا تھا۔

شادی کے بعد ہر ہفتے ہی وہ بڑی آپا کے پاس جاتی...... فراز شاذ و نادر ہی اس کے ساتھ ہوتے...... اگر آپا کبھی انہیں بطورِ خاص بلانا چاہتیں تو وہ اس سے کہہ دیتے۔

"بھئی تم خود ہی معذرت کرلیا کرو...... جانتی تو ہو تم...... کہ مجھے...... اِدھر اُدھر جانا زیادہ پسند نہیں ہے۔" وہ اسے سمجھاتے۔

"اِدھر اُدھر جانا تو آپ کو اچھا لگتا ہے، جب آپ لاہور جاتے ہیں...... تو آپ کی خوشی دیدنی ہوتی ہے۔"

"یہ بات تو، تمہیں میں نے پہلے ہی بتادی تھی کہ مجھے اپنے کام سے عشق ہے۔" وہ ایک، ایک لفظ چبا کر یوں بولے جیسے اسے حتمی طور پر باور کرا رہے ہوں۔

"عشق و عاشقی والے شخص تو آپ نہیں لگتے۔" زویا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"اچھا...... وہ کیسے ہوتے ہیں؟" وہ پلٹ کر اب اس کے سامنے کھڑے پوچھ رہے تھے۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم مگر آپ جیسے نہیں ہوتے۔" باز آنے والی وہ بھی نہیں تھی۔

''اور تم بھی روایتی بیوی ہی بن کر رہیں۔ جملے مارنے سے باز نہیں آتیں۔''
''بیوی تو بیوی ہی بن کر رہے گی ناں...... میں تو نارمل بات کہہ رہی ہوں۔''
''اب تمہاری شادی ایک اپنے آپ میں گم رہنے والے شخص سے ہوگئی ہے تو بھگتو۔'' لہجہ تمسخر آمیز سا تھا۔ جیسے دبے، دبے لہجے میں اسے جتا رہے ہوں کہ اپنی حد کراس مت کرو۔
''اپنے آپ میں گم رہتے ہیں تو کہیں گم نہ ہوجایئے گا...... میں کہاں تلاش کرتی پھروں گی۔ آج تک آپ کے ساتھ شہر سے باہر تک گئی نہیں ہوں میں۔''
اور فراز رکے، کچھ سوچا...... مگر پھر کچھ کہے بغیر وہ باہر نکل گئے کہ بحث و مباحثے کے نہ وہ عادی تھے اور نہ ہی یہ سب انہیں پسند تھا۔

☆☆☆

اسکول کے سالانہ فنکشن کی تیاریاں زور شور سے ہورہی تھیں۔ شہر کی معزز شخصیات کو بطور مہمانانِ خاص کے مدعو کیا گیا تھا۔ اس تقریب کی اینکر زویا ہی تھی کہ وہ اپنے زمانۂ طالب علمی سے ہی ایک بہترین ڈیبیٹر رہی تھی اور یوں وہ اپنے اسکول کے اس اینول فنکشن کی نظامت کے فرائض بھی خود ہی انجام دے رہی تھی۔ مسز جاوید کو ڈرامے کے شعبے سے دلچسپی تھی اور وہ اپنے پیر کی تکلیف کو بالائے طاق رکھتے ہوئے روزانہ وہیل چیئر پر اسکول آرہی تھیں اور میٹرک کی طالبات کی جانب سے پیش کیے جانے والے ڈراموں اور ٹیبلوز کی نگرانی کررہی تھیں۔
''تمہارے شوہر جب ہمارے اسکول میں آئیں گے تو وہ حیران رہ جائیں گے کہ ان کی بیگم زویا کس قدر قابل شخصیت کا نام ہے۔''
''ان کا تو آنا ہی مشکل ہے۔'' زویا نے پھیکے سے لہجے میں کہا۔
''کیا تم نے انہیں مدعو نہیں کیا ہے؟'' مسز جاوید نے حیرت سے پوچھا۔
''میں نے تو کہا تھا...... مگر وہ کہیں جاتے ہی نہیں ہیں۔''
''اس کا مطلب ہے کہ تم میں اپنے شوہر سے بات کرنے کی لیاقت ہی نہیں ہے۔'' مسز جاوید نے مسکرا کر کہا۔
''کیوں بھئی......؟ کیا شوہر سے گفتگو کرنے کے لیے کوئی ڈپلوما وغیرہ لینا پڑتا ہے۔'' اسے مسز جاوید کی بات خاصی بے تکی لگی تھی۔
''مگر مکھن تو لگانا پڑتا ہے۔'' وہ ہنسیں۔
''ایسی چیزیں ہمارے میاں صاحب کو پسند نہیں ہیں۔ ویسے بھی انہیں کولیسٹرول کا مسئلہ ہے۔ عام زندگی میں بھی وہ مکھن، بالائی سے دور ہی رہتے ہیں۔''
''ان کا سیل نمبر مجھے دو تم...... میں انہیں انوائٹ کرتی ہوں۔ دیکھ لینا وہ سر کے بل آئیں گے۔'' مسز جاوید نے کچھ سوچ کر کہا۔
زویا نے انہیں نمبر دے دیا...... اور مسز جاوید نے کوئی آدھا گھنٹا ان سے بات کی اور پھر فخر آمیز لہجے میں زویا کو بتایا۔
''تمہارے میاں نے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ اسکول کے اینول فنکشن میں ضرور آئیں گے۔ جہاں آکر وہ تمہاری نظامت اور گلوکاری سے بھی لطف اندوز ہوں گے۔''
''کیا واقعی......؟'' زویا کو حیرت ہورہی تھی۔
''میری پانچ چھوٹی بہنیں...... ان کی خانگی زندگی کے مسائل اگر میں حل نہ کروں تو ان کے شوہر ان کی زندگیاں اجیرن کردیں۔''
''اس کے لیے آپ کیا کرتی ہیں؟''
''ارے بھئی بہت پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، میں نے تمہارے شوہر کو یہاں تک لالچ دیا ہے کہ ایوارڈ یافتہ طالبات کو صوبائی وزیر کے ہمراہ وہ بھی ایوارڈز دیں گے۔''
''مگر فراز تو کسی بھی معاملے میں لالچی نہیں ہیں۔''
''اپنی تعریف و توصیف سب کو اچھی لگتی ہے اور

میں نے انہیں شیشے میں اتار لیا ہے۔''

''شاید مجھ میں یہ کشش ہی نہیں ہیں۔'' مسز جاوید کی بات سن کر وہ ٹوٹ سی گئی کہ اس بار بھی اس کی شادی شدہ زندگی کو کامیاب نہیں کہا جاسکتا تھا۔ دونوں میاں، بیوی ایک ساتھ ہوتے ہوئے بھی الگ، الگ پٹریوں پر گامزن تھے۔ جو بات اس نے کی تھی وہ رد کی جا چکی تھی اور وہی بات جب مسز جاوید نے کی تو انہوں نے قبول کرلی۔ اسے فراز کے آنے کا سن کر کوئی زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔

مقررہ دن...... وہ صبح، صبح تیار ہو رہی تھی۔ اور فراز بھی تب اس نے ان سے کہا۔

''تقریب تو گیارہ بجے تک شروع ہوگی ...... آپ کو اتنی جلدی آنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''کون سی تقریب؟'' ان کے لہجے میں حیرت گھلی ہوئی تھی۔

''ہمارے اسکول کے اینول فنکشن کی۔''

''مجھے تمہارے اسکول کی تقریب سے کیا واسطہ......؟'' لہجے میں اکتاہٹ سی رچی ہوئی تھی۔

''مگر آپ نے تو مسز جاوید کو اپنے آنے کی رضامندی دے دی ہے۔ مجھے تو ان سے ہی پتا چلا تھا۔''

''اگر کوئی پاگل پیچھے پڑ جائے تو اس سے جان چھڑانے کا کوئی نہ کوئی طریقہ تو اختیار کرنا پڑتا ہے ناں...... تو بہ وہ عورت تھی یا ٹی وی کے کسی ٹاک شو کی میزبان...... اس قدر بول رہی تھی تو میں کیا کرتا۔''

''تو آپ نے اپنی جان چھڑانے کے لیے جھوٹ بول دیا کہ آپ آرہے ہیں؟''

''میں نے یہ سب کہاں کہا...... انہوں نے خود ہی اخذ کرلیا ہوگا...... میں تو صرف ہوں، ہاں کر رہا تھا''

''تو پھر اتنی صبح صبح تیاری کہاں کی ہے آپ کی۔''

''لاہور کی...... تین دن بعد آؤں گا۔''

''آپ ایک ہفتہ رہ لیں، میں بڑی آپا کے پاس رہ آؤں گی، ایک ماہ کے بعد تو وہ جانے والی ہیں۔''

''مجھے جب آنا ہوگا آجاؤں گا۔ اور تمہیں جانا ہو تو میری موجودگی میں بھی جاسکتی ہو، میں نے کہیں تمہارے آنے جانے پر کوئی پابندی تھوڑی ناں عائد کی ہے۔''

''مگر میرا دل تو یہ چاہتا ہے کہ ایسی پابندیاں آپ پر عائد کروں۔''

''اب اگر تمہارا دل غلط، غلط باتیں سوچا کرتا ہے تو کسی دن بیٹھ کر اسے آرام سے سمجھاؤ اور اگر نہ سمجھے تو اسے ڈانٹو، ڈپٹو...... اس کے کان مروڑو۔'' وہ بریف کیس ہاتھ میں لے کر دھوپ کا چشمہ لگا کر اس پر ایک تحقیر بھری سی نظر ڈال کر چلتے بنے۔

اور اس سے زویا کا دل چاہا کہ وہ پھوٹ، پھوٹ کر روئے، اس کا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا کہ اپنے اسکول کے اینول فنکشن میں شرکت بھی کرے، جس کی تیاری میں وہ گزشتہ پندرہ دنوں سے مصروف تھی۔ کتنی ہی دیر وہ اپنے بستر پر پڑی سسکتی رہی۔ اور جب اس کے موبائل پر لگاتار بلانے کے میسجز آنے شروع ہوئے تو وہ بے دلی سے اسکول کی جانب روانہ ہوگئی۔

''حیرت ہے بھئی، آنے کا پکا وعدہ کیا اور پھر بھی نہیں آئے، مجھے تو دال میں کچھ کالا لگتا ہے۔'' تقریب ختم ہونے کے بعد مسز جاوید اس سے رازدارانہ لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

''کیسا دال میں کالا......؟'' وہ حیرت زدہ تھی۔

''میرا خیال ہے کہ تم اپنے شوہر پر نظر نہیں رکھتی ہو......''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''یہ میرا پکا خیال ہے کسی دوسری عورت کا چکر ہے۔''

''اگر ایسا چکر ہوتا تو وہ اسی سے ہی شادی کرلیتے۔''

''تم نہیں سمجھوگی، بعض مرد ٹھرکی قسم کے ہوتے ہیں وہ شادی کے بعد بھی...... ایک عدد معشوقہ رکھتے ضرور ہیں۔

''مگر اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ایسے ذوق شوق رکھنے کی وجہ کوئی تو ہوگی۔''

''ارے میری بے وقوف سی بہن...... مردوں کی نفسیات میں جانتی ہوں کہ ہر دوسرے مرد کو پھنّے خان بننے کا شوق ہوتا ہے اور اپنا یہ شوق یہ لوگ مختلف طریقوں سے پورا کرتے ہیں۔ یہ شوہر نامی قوم سب سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے ہاں۔''

''کرتے ہوں گے، مجھے کیا......'' وہ بے پروائی سے بولی۔

''بیویوں کی اسی قسم کی بے پروائی تو انہیں نقصان پہنچایا کرتی ہے۔ تم ایسے کس طرح کہہ سکتی ہو...... کیا تمہیں دکھ نہیں ہوا؟''

''مگر میں کر بھی کیا سکتی ہوں...... اب ان کے پیچھے، پیچھے ان کی جاسوسی تو نہیں کرواسکتی...... کہ مجھے معلوم ہے کہ ایسی کوئی بات ہوگی ہی نہیں۔'' وہ پھیکی سی ہنسی ہنستی چلی گئی۔

''یہ تمہاری خام خیالی ہے، تم معلومات کرواؤ، میں بھی کرلوں گی مگر تم ان کے آفس کے لوگوں سے رابطے میں رہو۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی نہ الگ ہوجائے تو میرا نام بدل دینا۔'' وہ ہنسیں اور زویا کے دل سے بے اختیار نکلا۔

''اللہ نہ کرے کہ ایسا کچھ ہو......'' زندگی گرتی پڑتی چل رہی تھی مگر چل تو رہی تھی...... نہ فراز سے اسے کوئی شکایت تھی اور نہ فراز کو اس سے...... اور یہ بات تو پہلے ہی دن طے ہوگئی تھی کہ وہ دونوں اپنے، اپنے معمولات میں مصروف رہیں گے اور کوئی کسی کے بارے میں دخل نہیں دے گا اور وہ تو بالکل بھی اپنی چلانے کی کوشش نہیں کرے گی۔

''ایسے میں مسز جاوید کی باتیں صرف اس کی ٹینشن بڑھا رہی تھیں جبکہ وہ جانتی تھی کہ اس کی حد کہاں تک کی ہے مگر کسی غیر کو یہ سب بتانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ سب کے سامنے وہ خود بے عزت ہوجاتے...... اور یہ سب اسے کسی صورت منظور نہیں تھا۔ اور وہ مسز جاوید کی باتوں پر اس قدر ہنسی...... اس قدر کہ اسے اچھو ہوگیا۔

☆☆☆

گھر آکر بھی اسے مسز جاوید کی باتیں بچھو بن کر ڈنک مارتی رہیں۔ شکر ہے اگلے دن اسکول کی تعطیل تھی ورنہ اس کی ذہن کی حالت بالکل اس قابل نہیں تھی کہ وہ اسکول جاسکے...... اسے تو بس ہر طرف لڑکیاں ہی لڑکیاں نظر آرہی تھیں جن کے گروپ میں فراز کسی راجا اِندر کی طرح بیٹھا ہوا ان سے خوش گپیاں کرتا ہوا مصروف تھا۔ فراز کی شخصیت کا دوسرا رخ مختلف تھا۔ جہاں وہ گھر میں سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے رہتا تھا، اپنی من پسند لڑکیوں کے ساتھ وہ بے حد خوش تھا، بات، بات پر قہقہے لگا رہا تھا، جوک سنا رہا تھا ایسا خوش باش فراز تو اس نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ یہ تو کوئی دوسرا ہی فراز تھا...... مسز جاوید کی باتیں سننے کے بعد...... اسے ہر طرف وہی نظر آرہا تھا۔ جو سب کا تھا مگر اس کا نہیں...... اور زویا کا ڈپریشن بڑھ رہا تھا۔

فراز...... اپنی فرم کے کاموں سے فارغ ہوئے تو مس عارفہ کے پاس پہنچے اور وہ اسے دیکھتے ہی بولیں۔

''کیا بات ہے فراز...... کیا تمہیں اپنی دوسری بیوی بھی راس نہیں آئی جو گھومنا پھرنا ابھی تک تنہا، تنہا ہے؟''

''پتا نہیں...... اس سے بات کرکے مجھے وہ لطف اور طمانیت محسوس ہی نہیں ہوتی جس کا میں تمنائی ہوں۔''

''جب شادی کی ہے تو اسے وقت دو تاکہ وہ تمہیں سمجھے۔''

''کیسی باتیں کررہی ہو عارفہ...... آج کی بیوی اپنے شوہر کو سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہے، وہ تو بس اپنی سمجھانے کی فکر میں رہتی ہے۔ بات کرنے کی اگر غلطی کرلو تو نان اسٹاپ بولے چلی جائے گی۔''

''تو پھر اس سے بھی خلاصی کرلو۔''

''نہیں...... اب ایسا ہونا شاید مشکل ہو، اس کی بڑی بہن...... مستقلاً باہر جانے والی ہیں۔ اگر میں نے

اسے چھوڑ دیا تو وہ اکیلی کیسے رہے گی؟'' وہ پریشان سے لہجے میں بولے۔

''اوہ...... تو ہمدردی تو ہوگئی ہے تمہیں...... یہ اچھی بات ہے، گڈ......'' وہ ہنسیں۔

''تمہاری ایسی ہی باتوں پر مجھے غصہ آجاتا ہے۔'' وہ مسکرایا۔ ''اور یوں بھی میری جان جلانے کا تو تم نے شاید ٹھیکا لے رکھا ہے۔''

''فراز! تمہیں مجھ پر غصہ اس وجہ سے بھی آتا ہے ناں کہ میں نے تم سے شادی کیوں نہیں...... تو مائی ڈیئر فرینڈ...... لفظ شادی میری زندگی میں ہے ہی نہیں...... اور جب میں پُرسکون، پُرطمانیت زندگی گزار رہی ہوں تو مجھے شادی کا بکھیڑا پالنے کی کیا ضرورت تھی۔''

''اگر تم شادی کرلیتیں تو آج یہ سب بکواس نہ کررہی ہوتیں۔'' فراز جھلائے۔

''ٹھیک ہے میں نے تو غلطی کی...... آخر غلطیاں انسانوں سے ہی ہوا کرتی ہیں۔ اور پھر میرے ہاتھ میں تو شادی کی لکیر ہی نہیں تھی مگر تم نے تو دو، دو شادیاں کیں، تمہیں کیا حاصل ہوا۔ جس طرح تم پہلے تنہا تھے، آج بھی تنہا ہی ہو۔ تمہیں تو اپنی بیوی پر اتنا ٹرسٹ بھی نہیں ہے کہ اسے اپنے دل کی بات تک بتا سکو۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' فراز نے اپنا سر جھکالیا۔

''تمہاری بیوی تم سے محبت کرتی ہے؟'' تمسخر سے پوچھا گیا۔

''شاید نہیں......''

''اور تم......؟''

''میں بھی نہیں......''

''تو پھر تمہیں اس سے شکایت تو نہیں ہونی چاہیے۔''

''مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔''

''تو پھر پریشان کیوں ہو؟''

''اکثر لوگوں کی زندگیاں...... ایسے ہی رانگ نمبر پر گزر جایا کرتی ہیں۔ مگر میری پریشانی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔'' فراز کے لہجے میں تاسف تھا۔

''جب ہی تو کہہ رہی ہوں...... فارغ کردو، تمہارے ذہن کا بوجھ از خود ختم ہوجائے گا۔''

''ختم نہیں ہوگا، مزید بڑھ جائے گا۔'' فراز اٹھ کھڑے ہوئے آج اسے عارفہ کی باتوں میں پھولوں جیسی خوشگواریت نہیں بلکہ شرارے سے محسوس ہورہے تھے۔

☆☆☆

''ارے نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔'' زویا کو وہ تصویر نہیں کوئی جلتا ہوا کوئلہ لگا جو مسز جاوید نے اس کی ہتھیلی پر دھر دیا ہو۔

''یہ ہے وہ لڑکی عارفہ...... جس سے ملنے تمہارا شوہر بار، بار لاہور جاتا ہے اور اس سے دوستی آج کی نہیں برسوں سے ہے۔''

''مگر فراز تو یہ کہتے تھے کہ وہ اپنی فرم کے کام سے لاہور جاتے ہیں۔''

''جب تم اندھی اور بہری بن کر اس کی ہر بات کا یقین کررہی تھیں تو اسے اور کیا چاہیے تھا۔''

''مگر یہ تو اچھی بات نہیں ہے، بیوی کو چھوڑ کر غیر عورتوں سے دوستانہ نبھایا جائے۔''

''اب اپنی ہر غلط بات کو کون غلط کہا کرتا ہے مگر دیکھو...... جیسا میں نے تم سے کہا تھا ویسا ہی ہوا ناں؟''

''ہاں......'' زویا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کہے تو کیا کہے اور کرے تو کیا کرے۔

فراز کو لاہور سے واپس آئے تین دن ہوچکے تھے۔ مگر وہ دیکھ رہے تھے کہ زویا بے حد خاموش سی تھی...... بے وجہ بولنے کی عادت بھی ختم ہوگئی تھی اور سب سے خاص بات کہ وہ اسکول سے بھی ایک آدھ گھنٹے میں واپس آجاتی تھی۔

''تم اپنی آپا کے گھر نہیں گئیں؟'' فراز نے پوچھا تھا۔

''نہیں......''

''اب وہ امریکا جانے والی ہیں۔ ان کے پاس جا

کررہ آئیں۔‘‘

’’دل نہیں چاہ رہا میرا کہیں بھی جانے کو۔‘‘

’’کیوں، دل کو کیا ہوا......؟‘‘ کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے یوں ہی پوچھ لیا۔

’’کچھ نہیں......‘‘ بیزاری سے کہا گیا۔

’’کیا بات ہے، طبیعت تو خراب نہیں ہے تمہاری......‘‘ کتاب بند کرکے انہوں نے پوچھا۔

’’اگر خراب بھی ہے تو آپ کو کیا...... میرا مرنا یا جینا آپ کے لیے کیا اہمیت رکھتا ہے؟‘‘

’’نہیں بھئی ایسی بھی بات نہیں ہے۔‘‘ اب وہ اس کے عین سامنے آبیٹھے۔

’’آپ لاہور جاتے ہیں تو ایک فون بھی نہیں کرتے، خیریت تک معلوم نہیں کرتے۔‘‘

’’ہاں اس دفعہ فرم کی مصروفیت بہت زیادہ رہی۔‘‘ ہمیشہ کی طرح بولے۔

’’کیا اتنی زیادہ مصروفیت تھی کہ اپنے کسی دوست سے ملنے بھی نہیں گئے ہوں گے؟‘‘ وہ بظاہر بے پروائی سے پوچھ رہی تھی۔

’’ہاں، اتنی تو نہیں تھی...... میں ہمیشہ کی طرح عارفہ کے پاس تو گیا تھا۔‘‘ وہ سادگی سے بولے۔

’’کون عارفہ......؟‘‘ وہ سوالیہ لہجے میں بولا۔

’’بتایا تو تھا تمہیں...... عارفہ میرے کالج سے یونیورسٹی تک ساتھی رہی ہے۔ جب بھی جاتا ہوں اس سے ملاقات رہتی ہے۔‘‘

’’اس کے شوہر سے بھی دوستی ہے کیا......؟‘‘ دھیرے، دھیرے وہ کرید رہی تھی۔

’’اس نے شادی ہی نہیں کی، اپنے حال میں مست رہنے والی عورت ہے۔ مگر ہے بہت نائس......‘‘

’’کیا شادی کے بعد بھی خواتین کے ساتھ دوستیاں نبھائی جاتی ہیں؟‘‘

’’میری دوستی کوئی معیوب نہیں ہے جو میں چھپاتا یا اسے چھوڑ دیتا۔‘‘

’’پھر بھی بیوی کی موجودگی میں...... کسی خاتون کو دوستِ خاص بنانا...... کوئی مناسب تو نہیں۔‘‘

’’میں تمہاری باتوں سے اتفاق نہیں کرتا اور نہ ہی میں نے تم پر ایسی کوئی پابندی عائد کی...... اپنے اسکول کے بزنس میں تم میل ورکرز سے دوستی نہ رکھو یا اُن سے بات چیت بند کردو۔‘‘

’’کاش آپ ایسا کہتے...... کاش آپ اپنا حق جتاتے......‘‘ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے لبوں کو اپنے دانتوں تلے کچل ڈالا۔

’’اگر ایسا کہتا...... تو تم مجھے چھوٹی ذہنیت کے مرد کا خطاب دے ڈالتیں۔‘‘

’’مگر میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں واقعی چھوٹی ذہنیت کی ہوں...... اس لیے مجھے آپ کی اور اس عارفہ کی دوستی پر اعتراض ہے۔‘‘ اس نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

’’اپنے کام سے کام رکھو...... اور اپنے آپ کو میرے دماغ پر مسلط کرنے کی کوشش نہ کرو۔‘‘ سفاکی سے کہہ کر وہ اٹھ کر بیڈروم میں چلے گئے۔ اس کا مطلب تھا کہ اب وہ مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتے تھے۔

تب زویا نے یہ اندازہ لگا ہی لیا کہ اس کا یہ رشتہ شاید ایک کچی ڈور سے بندھا ہے...... فراز کی زندگی میں جب بھی جذبات کی آندھی، خواہشات کے جھکڑ چلیں گے تو اس کی کچی ڈور سے بندھی یہ شادی فوراً ٹوٹ جائے گی۔ اس ڈور کو پکا کرنے کے لیے جب فراز ہی تیار نہیں تھا تو از خود وہ کچھ نہیں کرسکتی تھی۔

’’اب مجھے کچھ کرنا چاہیے۔‘‘ مسز جاوید کے مشورے اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسانے لگے۔

’’نہیں۔ کسی کی محبت کبھی زبردستی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ یہ تو بڑا لطیف سا جذبہ ہوتا ہے، خود ہی اپنی جگہ بناتا ہے اور ننھے سے پودے سے ایک شجر کا روپ دھار لیتا ہے۔ اور یہ فراز جس مزاج کے ہیں، جتنی سختی ان کے سبھاؤ میں ہے وہ چت بھی اپنی اور پٹ بھی اپنی والا برتاؤ ہے۔‘‘

بڑی آپا کے جانے کے دن قریب آرہے تھے اور

وہ اسے فون کرکے روزانہ ہی بلا رہی تھیں۔

''زویا...... اب پتا نہیں، میرا کب آنا ہو، میں چاہ رہی ہوں اپنا یہ گھر کرائے پر دے دوں تاکہ تمہیں ہر ماہ کرایہ ملتا رہے۔''

''کرائے کا مجھے کیا کرنا...... پیسے کی مجھے کوئی کمی ہے کیا؟'' وہ اداس سے لہجے میں بولی۔

''بیٹا...... پیسے میں بہت طاقت ہوتی ہے، تمہارے پاس ہوگا تو تمہیں ایک آسودگی سی محسوس ہوگی۔''

''آپا...... اگر یہ گھر خالی ہی رکھیں تو کیا حرج ہے......؟''

''خالی گھر میں کون رہنے کے لیے آئے گا جو میں اسے خالی رکھوں۔''

''کیا پتا مجھے یہاں آنا پڑ جائے تو؟'' وہ زبردستی کی ہنسی ہنستے ہوئی بولی۔

''کیا بات ہے زویا؟'' وہ فکر مندی سی ہوگئیں۔

''کوئی خاص تو نہیں ہے...... مگر ہے ایک بات......''

''مجھے نہیں بتاؤ گی......؟'' اب وہ اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بیٹھ گئیں۔

''فراز کا ایک خاتون کے ساتھ افیئر چل رہا ہے، یہ سب مسز جاوید نے معلوم کرکے مجھے بتایا ہے۔''

''ارے وہ پگلو...... اپنے آپ کو تو جانتی نہیں ہے، دوسروں کے بارے میں باتیں بناتی ہے، مجھے اس عورت کی رائے سے ذرہ برابر بھی اتفاق نہیں ہے۔'' آپا نے بے پروا سے لہجے میں کہا۔

''مگر فراز نے اعتراف کرلیا ہے، عارفہ نامی عورت سے ان کی دوستی ہے۔'' زویا نے رنجیدگی سے کہا۔

''زویا ہمیشہ میری یہ بات یاد رکھنا، مرد ہمیشہ سچی بات کا اعتراف کرتا ہے، اگر اس کا عارفہ کے ساتھ کوئی غلط رشتہ ہوتا تو وہ نہ اعتراف کرتا...... اور نہ ہی اس بات کا اقرار کرتا کہ عارفہ نامی کسی خاتون کو وہ جانتا بھی ہے۔''

''اس کے باوجود بھی اگر میرے دل کو یہ دھڑکا لگا رہے کہ کب یہ شادی ٹوٹ جائے تو پھر کیا مجھے کوئی ہاسٹل دیکھنا چاہیے؟''

''اگر ایسی بات ہے تو مکان کا نیچے کا پورشن کرائے پر دے دو...... اور اوپر کا تم اپنے لیے رکھ لو...... مگر تم ہر بات مجھے بتاؤ گی کہ تم اکیلی نہیں...... میرے ساتھ رہو گی۔ میں بیٹے کو چھوڑ سکتی ہوں اپنی بہن کو نہیں۔''

''مگر لوگ تو کہتے ہیں کہ ماں پر اولاد کا حق زیادہ ہوتا ہے۔ بہن، بھائیوں سے بھی زیادہ...... تو پھر آپ واپس کیوں آئیں گی، بیٹے کو چھوڑ کر؟''

''ہاں ٹھیک کہتے ہیں...... اور میں تمہاری بہن سے زیادہ ماں ہی تو ہوں...... دو سال کی تھیں جب میں نے تمہیں سنبھالا تھا تو پھر کیسے تمہیں یوں تن تنہا چھوڑ سکتی ہوں؟''

''آپا...... میری وجہ سے آپ کی زندگی بھی خوار ہو رہی ہے ناں۔'' زویا کو بلاوجہ رونا آرہا تھا۔

''پاگل ہو تم جو ایسا سوچتی ہو...... کوئی ایسی بات نہیں ہے اور تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔''

آپا کے جانے کے دن فراز بھی انہیں خدا حافظ کہنے کے لیے موجود تھے۔

''فراز......! تم زویا کا خیال رکھنا، اللہ کے بعد تمہیں سونپ کر جا رہی ہوں۔''

''آپ پریشان مت ہوں...... زویا تو بہت ایکٹو لڑکی ہے اور اتنی انرجی والی لڑکیاں میں نے تو بہت کم دیکھی ہیں۔''

''ہونہہ...... تم نے عارفہ کے علاوہ دیکھا ہی کیا ہے، جب ہی تو تمہاری پہلی بیوی تمہیں چھوڑ کر چلی گئی......'' زویا نے دل میں سوچا مگر کچھ بولی نہیں۔

بڑی آپا کے جانے کے بعد اسے ایسا لگ رہا تھا کہ پورا شہر ہی خالی ہو گیا ہو...... کہیں جانے کو اس کا دل ہی نہیں چاہتا تھا اور فراز کو کہیں باہر جانے کا بالکل بھی شوق نہیں تھا...... آفس سے آنے کے بعد ٹی وی کے سامنے جم کر بیٹھ جاتے ...... وہیں بیٹھ کر چائے پیتے...... وہیں کھانا کھاتے...... اور پھر رات گئے سونے کے لیے آجاتے۔

زویا پٹر پٹر بولنے والی...... اور وہ ایک اچھے سامع تھے، چپ چاپ ہوں، ہاں کر کے سنتے رہتے...... مگر آپا کے جانے کے بعد اسے چپ سی لگ گئی...... کہ فراز نے بھی پوچھا۔

''تمہاری طبیعت کہیں ناساز تو نہیں ہے؟''

''ہاں اگر میری طبیعت خراب ہے تو پھر...... آپ کیا کرلیں گے؟'' زویا نے خاصا چڑ کر کہا۔

''میں تو کچھ بھی نہیں کر سکتا...... میں ڈاکٹر جو نہیں ہوں۔''

''تو پھر پوچھیں بھی مت......'' اسے غصہ سا آگیا۔

''میں تو اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ اگر طبیعت خراب ہے تو ڈاکٹر کے پاس چلی جاؤ یا کال کر کے بلالو۔''

''آپ کے مشورے کا شکریہ......'' وہ تپ سی گئی۔

''اس کا مطلب ہے کہ طبیعت ٹھیک ہے۔'' وہ مسکرائے۔

''جی نہیں بخار ہے مجھے...... اور کئی دن سے ہے۔'' وہ غصے سے بولی۔

''رئیلی......!'' انہیں حیرت ہوئی...... کہ وہ بخار میں اسکول بھی جا رہی ہے، کک کی چھٹی تھی اور وہ کھانا وغیرہ بھی بنا رہی تھی۔

''نہیں، میں جھوٹ بول رہی ہوں۔''

اپنی بات کو جھوٹا ثابت ہوتا دیکھ کر اس نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر اپنے ماتھے سے لگا دیا جو بری طرح جل رہا تھا۔

''ارے...... تمہیں تو واقعی بہت تیز بخار ہے۔'' وہ فکرمند سے ہو گئے۔

''اور آپ سمجھ رہے تھے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔''

''ایسا کب کہا میں نے؟''

''تو پھر مسکرا کیوں رہے تھے؟''

''وہ تو موبائل پر عارفہ کے اوٹ پٹانگ میسج کو پڑھ کر مسکرا رہا تھا۔''

''ہونہہ...... ایسے ہوتے ہیں شوہر...... جس کی بیوی بخار میں پھنک رہی ہو اور اسے اٹکھیلیاں سوجھ رہی ہوں۔''

''بیوی بتائے گی تو علم ہوگا ناں۔'' وہ موبائل پر

میسج کرتے ہوئے بولے۔
''بتانے کا جب فائدہ نہیں ہوتا تو بتانا ہی نہیں چاہیے..... اور بخار تو خود ہی اتر جاتا ہے۔ دوا کھاؤ یا نہ کھاؤ۔'' وہ غصے سے بولی۔
''میں نے ڈاکٹر نعیم کو میسج کر دیا ہے اور وہ پانچ منٹ میں آ رہے ہیں۔'' فراز اس کے جواب میں کہہ کر اٹھ گئے..... کہ یہ وقت ان کے آفس جانے کا تھا..... اور انہیں بیوی کو منانے کے مکالمے بولنے آتے ہی نہیں تھے کہ شاید انہوں نے کبھی بولے بھی نہیں ہوں..... تو وہ کیسے..... اس سے کوئی محبت بھرا جملہ..... شہد میں ڈوبا کوئی لفظ کہہ پاتے۔

☆☆☆

مسز جاوید کے پیر کا زخم کافی بڑھ گیا تھا۔ وہ پورے اسٹاف کے ساتھ جب ان کی عیادت کو گئی تو انہوں نے اس کی شکل دیکھتے ہی کہا۔
''زویا کیا تم بیمار تھیں؟ شکل دیکھو کیسی اتری ہوئی لگ رہی ہے؟''
''ہاں ہوسی بخار تھا مگر اب ٹھیک ہوں۔''
''سنو..... اس سے پہلے کہ فراز تمہیں اپنے گھر سے نکال دے، تم خود اسے چھوڑ دو۔ آخر پہلی بیوی نے اس شخص سے خلع لی تھی تو کوئی ایسی وجہ ہوگی ناں جو ایسے خوب صورت شخص کو اس نے چھوڑا تھا۔'' اپنی بیماری کے باوجود..... وہ انتہائی راز داری سے اسے مشورے دے رہی تھیں۔
''جی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہیں کیا جواب دے۔
جواب تو وہ اپنی آپا کو بھی نہیں دے پاتی تھی..... جب وہ فون پر اس سے کرید، کرید کر چھوٹی، چھوٹی باتیں پوچھا کرتی تھیں۔
''تم لوگ ایک ساتھ ناشتا کرتے ہو ناں.......؟ اور... تم نے فراز کی سالگرہ پر اس کے لیے کوئی گفٹ خریدا یا نہیں.....؟ اس کی ڈائری پڑھ کر اس کی پسند ناپسند..... معلوم کرنے کی کوشش کرو۔ میرا خیال ہے اس کا پسندیدہ کلر گرے ہے، تم اس کے پسندیدہ کلر میں اس کے لیے کوئی جرسی لے سکتی ہو۔'' اور جب اس کی غیر موجودگی میں پہلی مرتبہ اس کا بریف کیس کھول کر اس نے اس کی ڈائری نکالی تو ہر صفحے پر عارفہ، عارفہ، عارفہ لکھا ہوا تھا..... اور آخری صفحے پر کہیں ایک جگہ چھوٹا سا زویا لکھا ہوا تھا جو اسے اپنے آنسوؤں کے ریلے میں نظر ہی نہیں آیا۔ وہ پتا نہیں کب تک وہیں بیٹھی آنسو بہاتی رہتی کہ اس کے بہت قریب فراز کی غصے سے بھری آواز ابھری وہ سہم ہی تو گئی..... وہ تو کچھ دیر پہلے تو آفس کے لیے نکلے تھے..... مگر وہ اس کے سر پر کھڑے دہاڑ رہے تھے۔
''زویا..... میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم میری پرائیویسی تک میں دخل دو گی..... میں تو آج اپنی ایک اہم فائل لینے واپس آ گیا تو مجھے پتا بھی چل گیا۔ ورنہ میری غیر موجودگی میں میری پرسنل چیزوں کو چیک کرنے کا حق تم کو کس نے دیا ہے؟ تمہاری یہ ہمت ہوئی کیسے.....؟ بولو..... کیوں کر رہی ہو تم یہ سب؟ اور کب سے؟''
وہ پتا نہیں کیا، کیا کہہ رہے تھے اور زویا کو تو بس یاد تھا تو صرف ایک ہی نام..... عارفہ..... عارفہ..... جو ان کی ڈائری، ہی نہیں..... شاید ان کی کوئی شناختی علامت تھی۔

☆☆☆

اپنی سالگرہ سے چار دن پہلے جب انہوں نے اسے اپنے لاہور جانے کے بارے میں بتایا تو وہ فوراً سمجھ گئی کہ وہ اپنی سالگرہ عارفہ کے ساتھ منانے جا رہے ہیں۔
''میرا خیال ہے اس مرتبہ آپ کا لاہور میں قیام زیادہ رہے گا؟'' اس نے ان کی شیلف سے نکالی ہوئی بکس ان کے سفری بیگ میں رکھتے ہوئے کہا۔
''ارے تمہیں کیسا پتا چلا؟'' وہ خوش دلی سے مسکرائے..... یوں بھی ایک بات ان کی اچھی تھی، ان کا غصہ جب اتر جاتا تھا تو ان کا موڈ بحال ہو جاتا تھا۔ پرانی باتوں کے تانے بانے وہ بطور طعنوں کے استعمال نہیں کیا

کرتے تھے سو اس وقت بھی ان کا لہجہ خوشگوار سا تھا۔

''میں تو ایسے ہی کہہ رہی ہوں...... اس مرتبہ آپ لاہور پورے دو ماہ بعد جو جا رہے ہیں۔ ورنہ آپ کا چکر...... تو ایک ماہ میں دو مرتبہ لگا کرتا تھا۔''

''آفس کی میٹنگز جب کینسل ہو گئیں تو بلاوجہ جا کر کیا کرتا۔'' وہ سادگی سے بولے۔

اور ان کے اس جھوٹ پر اسے غصہ سا آیا کہ میٹنگز کا کیا بہانہ...... ان کا تو لاہور جانا ہی صرف عارفہ کی وجہ سے ہوا کرتا تھا...... جس کی باتیں ان کو اچھی لگا کرتی تھیں اور جس سے ہر موضوع پر وہ بات کر سکتے تھے ورنہ بیوی بیچاری تو اس قابل بھی نہیں تھی کہ وہ اس سے اپنے آفس کا کوئی مسئلہ بھی شیئر کر سکتے۔

اور جب انہوں نے کڑھائی والا فینسی کُرتہ اپنے بیگ میں رکھا تو اسے یہ یقین آ گیا...... فراز اپنی سالگرہ کے دن یہی کُرتہ زیب تن کریں گے۔ اور بے اختیار اس کے لبوں سے ایک آہ سی نکل گئی۔

☆☆☆

مسز جاوید کے پیروں کا انفیکشن اتنا بڑھا کہ ڈاکٹر نے ان کے پاؤں کاٹنے کے لیے کہہ دیا تھا اور وہ شدید ڈپریشن میں چلی گئی تھیں۔ مسز جاوید کی طبیعت میں کسی صورت افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ جاوید صاحب بھی ان کی وجہ سے اسکول نہیں آ پا رہے تھے...... اور پندرہ دن بعد آئے تو ان کے ماتھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

''ارے رے، خیریت تو ہے، آپ کے ساتھ کیا حادثہ ہوا؟'' زویا ان کے آفس میں آئی تو حیران ہو کر بولی۔

''بیماری کی وجہ سے بیگم چڑ چڑی زیادہ ہو گئی ہیں...... میں نے ایک ٹیچر کی غیر ارادی طور پر شاید کچھ زیادہ تعریف کر دی جس کو سن کر انہوں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس میرے اوپر کھینچ مارا۔''

''حیرت ہے صبیحہ آپا تو ایسی نہیں ہیں۔'' زویا کو خاصا ملال سا ہوا۔

''آپ کو کیا پتا...... وہ کیسی ہیں...... جب سے شادی ہوئی ہے وہ اور ان کی بیماری ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ مگر بعض دفعہ ایسی اوچھی حرکتیں کر جاتی ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ کہیں دور چلا جاؤں......''

''ارے آپ ایسی باتیں مت کیجیے...... جب یہ جانتے بھی ہیں کہ بیگم بیمار ہیں...... آپ کے ثواب میں کمی ہو جائے گی۔''

''زویا...... میں آپ کو بتا نہیں سکتا...... کہ میری بیگم مجھے کس کس طرح پریشان کیا کرتی ہیں...... مانا کہ شادی کے وقت میں ایک غریب شخص تھا...... مگر ان کے پیسے کو چار سے ضرب کر کے بڑھایا تو میں نے ہی ہے...... مگر کبھی نہیں مانیں گی۔ بلکہ مارے ہوس کے ہر چیز اپنے نام کر رکھی ہے۔'' آج وہ دل کھول کر اپنی بیگم کی برائیاں کر رہے تھے...... اور زویا نے یہی مناسب سمجھا کہ ان کے آفس روم سے اٹھ جائے...... کہ اسے کسی کے پرسنل معاملات سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی...... اور بیچاری مسز جاوید اگر مسلسل بیماری کی وجہ سے چڑ چڑی ہو بھی گئی تھیں تو ان کی باتیں انہیں یوں دوسروں کو ہرگز نہیں بتانی چاہیے تھیں۔ زویا کو جاوید صاحب کا یہ انداز بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔

☆☆☆

اپنے آفس کے کام سے فراغت پا کر...... جب فراز، عارفہ بیگم کے گھر پہنچے تو ان کے گھر کا سامان ٹرکوں پر رکھا جا رہا تھا۔

''کہیں جا رہی ہو کیا تم......؟'' فراز نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں!'' عارفہ خوش دلی سے مسکرائیں۔

''مگر کہاں جا رہی ہو......؟ اور یہ سب سامان کہاں شفٹ ہو رہا ہے!''

''سامان تو میں نے سب سیل کر دیا ہے اور یہ گھر بھی...... اور میں ورلڈ ٹور پر جا رہی ہوں۔''

''جا رہی ہو تو پھر واپس تو آ جاؤ گی...... یہ گھر اور

سامان وغیرہ سیل کرنے کی نوبت کیوں آ گئی۔‘‘
’’فراز...... میں نے تمہیں بتایا نہیں...... میں نے شادی کر لی ہے۔‘‘
’’مذاق تو نہیں کر رہی ہو تم مجھ سے......؟‘‘ وہ ہنسے۔
’’نہیں بھئی...... میں کیوں مذاق کروں گی۔ شادی کر لی ہے تو جا رہی ہوں۔‘‘
’’مگر تم تو ساری زندگی شادی کے خلاف تھیں، یہ یکایک مرد کی غلامی میں جانے کو تمہارا دل کیونکر راضی ہو گیا؟‘‘ فراز کو اب بھی ایسا لگ رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہیں۔
’’فراز......! بہت ساری باتیں ہمیں بہت دیر سے سمجھ میں آیا کرتی ہیں۔ مجھے وہ نکتہ جو پہلے سمجھ میں نہیں آیا تھا وہ اب چالیس سال کی عمر میں آ کر سمجھ آ گیا...... کہ دیر سے تو آیا...... مگر پھر بھی اتنی دیر نہیں ہوئی۔‘‘
’’ایسا کیا سمجھ میں آ گیا...... کون افلاطون مل گیا تمہیں؟‘‘ فراز تمسخر بھرے لہجے میں پوچھ رہے تھے۔
’’فراز اگر زندگی گزارنے کے لیے ہم سفر اچھا مل جائے تو اس سے ضرور شادی کر لینی چاہیے۔ یوں زندگی کا سفر سہل بھی ہو جاتا ہے اور خوب صورت بھی۔‘‘ عارفہ کا لہجہ خوشیوں سے مزین تھا۔
’’واہ...... یہ کیا نئی بات تم نے کہہ دی...... ایسی بات جو اس سے قبل کسی نے سنی ہی نہیں ہو۔‘‘ فراز کا طنز بڑھتا ہی جا رہا تھا کہ ایک عورت جس نے ساری زندگی انہیں بھی شادی نہ کرنے اور شادی توڑنے کا مشورہ دیا۔ اب وہ خود شادی رچا کر بیٹھ گئی تھی۔
’’میرے شوہر بہت اچھے ہیں۔ بے حد سوئٹ...... اور اب میں ان کے ساتھ ورلڈ ٹور پر جا رہی ہوں...... پاکستان بھی آتی جاتی رہوں گی مگر ہمارا قیام زیادہ تر دبئی میں رہے گا۔ اس لیے اب میں اپنا بوتیک کا بزنس بھی وہیں شفٹ کر لوں گی کہ وہاں چلے گا بھی زیادہ اچھا۔‘‘
’’اور تم سے ملاقات کی اب کیا صورت رہے گی؟‘‘ انہوں نے بے صبری سے پوچھا۔
’’تم سے اب دوستی ختم......!‘‘ عارفہ کا لہجہ حتمی سا تھا۔
’’یار، اس وقت میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔‘‘ وہ جھلا کر بولے۔
’’میں بھی مذاق نہیں کر رہی...... رئیلی میں اب ہرگز نہیں چاہوں گی کہ تم پاگلوں کی طرح آ کر مجھے اپنی داستانِ الف لیلیٰ سناؤ...... کہ میرے پاس اب وقت ہی نہیں ہوگا۔ اور یوں بھی ہر شخص کو اپنے، اپنے پرابلم خود فیس کرنے چاہئیں...... اب اگر تمہیں دوسری بار بھی...... بیوی اچھی نہیں ملی تو یہ تمہاری قسمت...... میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں نے تو تمہاری شادی نہیں کروائی تھی...... ہے ناں؟‘‘
’’مگر تم تو اسکول سے کالج تک اور کالج سے یونیورسٹی تک میری کلاس فیلو اور قریبی دوست رہی ہو...... اور دوستی کو تو پروان چڑھایا جاتا ہے...... نہ کہ ختم...... یہ سب باتیں تم ہی مجھ سے کہا بھی کرتی تھیں۔ کیا بھول گئی ہو...... کہا تھا ناں؟‘‘ وہ ملتجی سے لہجے میں بولے۔
’’ہاں، کہا ہوگا...... مگر اب میں ہی تمہیں منع کر رہی ہوں...... کہ تم کسی بھی پرانے حوالے سے میرے پاس نہیں آؤ گے؟‘‘
’’مگر کیوں......؟ یہ تم کیسی قدغن لگا رہی ہو؟ کیا تم جانتی نہیں ہو کہ میں اپنی ہر بات، اپنے بزنس کا ہر مسئلہ صرف اور صرف تم سے شیئر کرنے کا عادی ہوں...... اور اپنی برسوں کی یہ عادت ختم کرنا کیا میرے لیے آسان ہوگا؟‘‘
’’فراز، تم شاید شوہر کے منصب پر صحیح طرح بیٹھے نہیں...... اور اپنی کسی بیوی سے محبت تک نہیں کی...... اس لیے تم شاید جانتے بھی نہیں ہو گے مگر میں جانتی ہوں...... محبت کرنے والا شوہر اپنی بیوی کو صرف اپنی ملکیت سمجھتا ہے...... اور وہ چاہے کتنا ہی وسیع دل و دماغ کا ہو اپنی بیوی کی دوستی کسی بھی مرد کے ساتھ برداشت نہیں کر پاتا۔ بات کچھ بھی نہ ہو تو اس کے لیے وہ بات

بن جاتی ہے۔''

''اچھا کبھی کبھار ملنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔'' فراز کا لہجہ کسی ضدی بچے کی طرح شدید تھا۔ جو چاہ رہے تھے کہ ہر صورت میں اس کی بات مانی جائے۔

''نہیں ہر گز نہیں...... کسی صورت نہیں۔'' عارفہ حتمی لہجے میں بولیں۔

''مگر تم ایسا کیوں کر رہی ہو؟ میں نے تمہارے ساتھ ایسا کیا غلط کیا ہے...... جو تم مجھے یوں پیچھے دھکیل رہی ہو...... جیسے جان پہچان کے تمام حوالوں کو یک دم آگ میں جھونکنا چاہتی ہو۔ میں تو تمہارا صرف دوست تھا...... کیا اب دوستی کو بھی آگ لگا دینی چاہیے۔ کیا اب شناسائی کے ہر نکتے کو تم سمندر میں ڈبونا چاہتی ہو؟''

''ہاں...... ہاں......'' وہ چیخ کر بولی۔

''مگر کیوں...... کوئی وجہ...... کوئی جواز......؟''

''سب سے بڑی وجہ تو یہ کہ میں جینا چاہتی ہوں۔ میں اپنی زندگی خوشیوں کے ساتھ ہلکی پھلکی ہو کر بسر کرنا چاہتی ہوں۔ اور اس سے بھی بڑی وجہ یہ کہ مجھے جینے کا شعور ہی ابھی آیا ہے تو میں کسی قسم کا کوئی بھی رسک نہیں لینا چاہتی۔ اور یوں بھی اب ہم مستقلاً یہاں تو رہیں گے نہیں...... تو تمہیں کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔''

''تمہیں بے شک کوئی فرق نہ پڑے...... مگر میں تو ساری زندگی تمہیں مس کروں گا۔ عارفہ تم نے تو اپنی دوستی سے محروم کر کے میرا ناقابلِ تلافی نقصان کر دیا ہے۔''

''مجھے افسوس ہے فراز...... تمہیں میری وجہ سے دکھ پہنچا...... مگر مجھے امید ہے کہ تم میری خوشیوں کی خاطر یہ سب ضرور سہو گے۔'' عارفہ...... اسے دلاسہ دیتے ہوئے بولی ...... اور ہاتھ سے ٹرکوں کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ ٹرک کے بھاری انجن اسٹارٹ ہو کے اب وہ وہاں سے جا رہے تھے اور ان کی یہ آوازیں فراز کے دماغ پر سنگ باری کر رہی تھیں۔

اپنی گاڑی میں بیٹھنے سے قبل کچھ سوچ کر عارفہ بیگم نے اپنے گلے سے سونے کی چین اتاری اور کمالِ محبت سے فراز کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اب اس طرح کی چین مرد بھی پہنا کرتے ہیں۔''

''میں کیوں پہنوں تمہاری چین......؟'' فراز رنجیدگی سے بولے۔

''تم اس لیے پہننا کہ تم ہمیشہ یہ محسوس کر سکو کہ میں تمہارے دل کے آس پاس ہی ہوں...... میں دور جا کر بھی تمہارے پاس ہوں، او کے...... بی بی......'' وہ ہاتھ جھلاتی ہوئی اپنی گاڑی میں بیٹھ گئیں...... اور فراز کبھی عارفہ کو اور کبھی اس کی دی ہوئی چین کو دیکھتے رہ گئے۔ اور وہ کبھی نہ ملنے کے لیے ان سے جدا ہو گئیں۔

☆☆☆

فراز واپس گھر آئے تو زویا اسکول گئی ہوئی تھی...... وہ سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

''عابد کیتلی بھر کے کافی میرے کمرے میں پہنچا دو۔'' انٹرکام پر انہوں نے کک سے کہا اور اٹوائی کھٹوائی لے کر بستر پر دراز ہو گئے۔ عارفہ سے دوستی کا ٹوٹنا...... ان کے لیے کسی سانحے سے کم نہیں تھا۔

''اپنے مفاد اپنی خاطر...... کیا کسی کو بدل جانا چاہیے؟'' فراز نے اپنے آپ سے پوچھا۔

''ہاں سب سے پہلے تو ہمیں اپنا خیال رکھنا ہے، ہم پر پہلے ہمارا حق ہے۔'' یہ جواب ان کے دل نے ہی ان کو دیا...... اور یہ بھی باور کرایا کہ انہیں بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔

''اگر عارفہ اپنے شوہر کے لیے اپنے آپ کو بدل رہی ہے تو یہ اچھی بات ہے۔'' اپنے دل کے دیے ہوئے جوابات پر پہلے تو وہ ششدر ہوئے...... اور پھر خاموش ہو گئے۔ اور دماغ میں ابلتے ہوئے لاوے کا کافی کے گرما گرم مگ سے مقابلہ کرنے لگے۔

زویا...... ان کی اتنی جلدی واپسی پر حیران ہوئی اور کھانے کی ٹیبل پر خاموش بیٹھا دیکھ کر بولی۔

''آپ اتنے اداس کیوں ہیں؟ کیا اس دفعہ لاہور میں دل نہیں لگا؟''

''کیا یہ آپ واقعی میرے لیے لائے ہیں؟''
جب اس نے تیسری مرتبہ پوچھا تو وہ ایک دم افسردہ سے ہو گئے۔ ان کی بیوی جوان کے ساتھ دس گیارہ ماہ سے رہ رہی تھی اسے ان پر کوئی ٹرسٹ ہی نہیں تھا۔
''بھئی اس گھر میں تمہارے علاوہ کوئی دوسری لڑکی تو نہیں ہے، تم ہی ہو ناں..... تو میں تمہارے لیے ہی لایا ہوں۔''
''مگر میں میکسی پہن کر تو اپنے اسکول نہیں جا سکتی ناں!''
''تم سے کس نے کہا ہے کہ یہ میکسی پہن کر تم اپنے اسکول جاؤ۔''
''اسکول جانے کے علاوہ میں کہیں اور کہاں جاتی ہوں..... اب تو بڑی آپا بھی یہاں نہیں ہیں..... تو پھر میں یہ میکسی کہاں پہن کر جاؤں؟''
''کیا تم یہ میکسی صرف میرے لیے نہیں پہن سکتیں؟''
''جی.....؟'' پانی پیتے ہوئے اس کے گلاس کا سارا پانی چھلک گیا۔
''یقین نہیں آرہا.....؟ وہ پھر اداس ہو گئے۔
''کیوں نہیں آرہا بھلا..... بالکل آرہا ہے اور میں سمجھ گئی ہوں، میں یہ میکسی آپ کی سالگرہ پر پہنوں گی..... اور پھر ہم دونوں ڈنر کرنے باہر جائیں گے۔ اور موسم کے حوالے سے آپ بھی اپنا بلیک سوٹ پہنیں گے..... ہے ناں؟'' وہ سوچ، سوچ کر بول رہی تھی۔
''ٹھیک ہے..... جیسا بھی پروگرام تم بنالو۔'' وہ اس کے ہاتھ تھپ تھپا کر اپنی اسٹڈی کی طرف چلے آئے۔ جہاں رکھے ہوئے عارفہ کے سارے خطوط اور پرانی تصویریں انہوں نے آتش دان میں ڈال دی تھیں۔
''عارفہ..... میں آج بھی تمہارا ہی شکر گزار ہوں کہ صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق بھی مجھے تمہارے رویے کی وجہ سے ملی۔'' وہ اپنے آپ سے کہہ رہے تھے۔
''میں اپنی پہلی بیوی کا بھی ایسا ہی خیال رکھتا تو شاید وہ مجھ سے خلع نہ لیتی۔ اور اب میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا..... کہ زویا مجھے چھوڑ کر چلی جائے..... اور

''نہیں تو.....'' وہ اچھل ہی تو پڑا۔
''میرا خیال تھا آپ اپنی سالگرہ لاہور میں منا کر آئیں گے۔''
''ایسے غلط سلط خیالات آپ کے دل میں کیوں آتے ہیں؟'' اب وہ اپنے آپ پر قابو پا چکے تھے اور سلاد کھاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔
''پتا نہیں..... بس خیال ہی تھا.. جو غلط ثابت ہوا۔''
''مگر میں تو اپنی سالگرہ مناتا ہی نہیں ہوں۔ یہ بات آپ کو شاید معلوم نہیں ہے۔''
''اس مرتبہ آپ کی سالگرہ منائی جائے گی، یہ بات آپ کو بھی نہیں معلوم ہے۔''
''اچھا.....'' وہ پھر کھو سے گئے جو اسے معلوم تھا، وہ تو کہیں کھو گیا تھا اور ان دنوں وہ اپنے آپ کو تہی دست سا سمجھ رہے تھے۔
ماں گو سوتیلی تھیں مگر انہوں نے سگوں سے بڑھ کر پیار دیا تھا..... وہ ہمیشہ یہی کہتی تھیں کہ زویا کے آجانے سے ان کے ویران دل میں بہار آجائے گی۔ مگر انہوں نے تو زویا کو اپنے دل کا مکیں بننے ہی نہیں دیا تھا تو پھر بہار کہاں سے آتی اور کیسے آتی۔ اب انہیں اپنی کوتاہیوں کا احساس ہونا شروع ہوا تو پوری تین راتیں انہوں نے اپنا محاسبہ کرنے میں گزار دیں..... اور ہر، ہر معاملے میں اپنے آپ کو غلط اور زویا کو صحیح پایا۔
''جس طرح عارفہ کو اپنی نئی، نئی زندگی بھرپور ایمانداری سے گزارنے کا حق ہے تو اسی طرح زویا کو بھی تو ہے.....'' مگر وہ تو اس کو اپنی جانب بڑھنے ہی نہیں دیتے تھے..... شادی ہونے کے ناتے وہ ایک ساتھ تو ضرور تھے..... مگر ایک ساتھ رہنے کے باوجود ان کے دل ایک دوسرے سے کتنے فاصلے پر تھے..... یہ وہی جانتے تھے کہ اس کے اصل ... ہی تھے۔
... ن کے لیے ڈارک
... ئے جس پر کالے نگوں کا
... حیرت زدہ سی رہ گئی۔

میں تنہائی کے صحرا میں بھٹکتا پھروں......"

زویا...... ملازمہ کو ساتھ لے کر آپا کے گھر کے اوپر کے پورشن کی صفائی کروانے گئی تو فراز نے حیرت سے پوچھا۔

"مکان تو کرائے پر اٹھ گیا تھا...... تو یہ اوپر کا پورشن کیا کرائے داروں کے استعمال میں نہیں ہے؟"

"میں نے اسٹیٹ ایجنٹ سے نیچے کا پورشن کرائے کے لیے کہا تھا۔"

"اوپر کا خالی رکھنے کا کیا آپا کہہ کر گئی تھیں۔"

"نہیں...... وہ تو میں نے ایسے ہی رکھ لیا تھا...... کہ کبھی دل چاہے تو وہاں جا کر بھی رہ لیا کروں گی۔"

"وہاں جا کر کیوں رہو گی، کیا تمہارا اپنا گھر نہیں ہے؟"

"مگر اس گھر میں میرا ماضی ہے، بچپن سے جوانی وہیں تو گزاری ہے۔" زویا جذبات سے بوجھل لہجے میں بولی۔

"اچھی لڑکیاں...... شادی کے بعد صرف حال سے جڑی رہتی ہیں یا مستقبل کو دیکھتی ہیں جو چیز گزر جائے اچھی یا بری...... اس میں جیا نہیں جاتا۔" انہیں عارفہ کی باتیں پھر یاد آرہی تھیں۔

فراز کا یک دم تبدیل ہو جانا...... زویا کو ہضم نہیں ہو رہا تھا جب وہ اپنے آفس کے کام سے حیدر آباد گئے تو اس نے پھر اُن کی ڈائری ٹٹولی...... تو ڈائری کے بہت سے صفحات پھاڑ دیے گئے تھے...... اور اب کسی صفحے پر عارفہ کا نام درج نہیں تھا۔

"اللہ کا شکر...... عارفہ اگر ڈائری سے نکل گئی...... تو شاید...... فراز کے دل سے بھی......"

وہ زویا کو اہمیت دے رہے تھے۔ کہاں وہ اس کی بات کا جواب بھی ہوں ہاں میں دیا کرتے تھے اور اب وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر خوب باتیں کیا کرتے...... اسے ملال تھا کہ وہ شادی کے بعد اسے کہیں گھمانے نہیں لے جا سکے...... اور اب وہ اس کی پسند کے حوالے سے سیر و تفریح کا پروگرام بنا رہے تھے۔

دوسری جانب بڑی آپا خوش تھیں...... ان کا خیال تھا کہ شادی کے بعد شروع کا دورانیہ شاید ہر لڑکی کے لیے مشکل ہوتا ہے اور جب وہ اس بھنور سے نکل جاتی ہے تو راوی چین ہی چین لکھا کرتا ہے۔

اب زویا کا اسکول میں بھی زیادہ دل نہیں لگا کرتا تھا۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ دوڑ کر گھر جائے...... اور فراز سے باتیں کرے...... ان کے لیے گھر کو سجائے...... اور اپنے آپ کو سنوارے۔

ایک دن وہ...... بیڈ کی سائڈ ٹیبل کی درازیں صاف کر رہی تھی کہ سونے کا لاکٹ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ عجیب سا پینڈنٹ تھا۔ بدنما سا مگر چین اچھی تھی...... یکبارگی اس نے اسے اپنے گلے میں ڈال لیا...... فراز کمرے میں داخل ہوئے تو اس کے گلے میں عارفہ کی چین دیکھ کر بے چین ہوئے۔

"میں اچھی لگ رہی ہوں ناں...... یہ چین پہن کر......" ناز سے وہ کہہ رہی تھی۔

"تم تو ہو ہی اچھی...... مگر اس چین کا ڈیزائن مجھے پسند نہیں ہے۔ میں اس کو چینج کر کے تمہیں دوسری لا دوں گا۔"

"آپ کو یہ ڈیزائن پسند نہیں آیا تھا تو آپ نے اسے لیا ہی کیوں......؟" وہ معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

"کیا غلطیاں مجھ سے نہیں ہو سکتیں؟ مجھ سے بے شمار غلطیاں سرزد ہوئی ہیں مگر اب میں بالکل نہیں چاہتا کہ مجھ سے کوئی کوتاہی یا غلطی سرزد ہو...... اسے تم مجھے واپس کر دو...... میں انشاء اللہ اس سے کہیں خوب صورت لاکٹ تمہارے لیے لا کر دوں گا۔" اور اگلے دن وہی چین چیریٹی میں دینے کے بعد وہ زویا کے لیے لاکٹ کا خوب صورت ترین سیٹ لے آئے تھے۔ جس کو پہن کر زویا بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔

☆☆☆

سب کچھ اچھا ہی اچھا ہو رہا تھا۔ زویا خوش تھی، فراز کے روپ میں اسے ایک محبت کرنے والا شوہر مل

گیا تھا، فراز خوش تھے...... کہ زویا جیسی آئیڈیل لڑکی ان کی بیوی تھی...... مگر فلک کو ابھی کچھ اور بھی دکھانا تھا۔

ایک دن فراز آفس سے دیر سے آنے کا کہہ کر گئے تھے مگر اچانک طبیعت خراب ہونے کے باعث وہ جلدی گھر آگئے۔ پورچ میں جاوید صاحب کی گاڑی دیکھ کر وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھے۔ جاوید صاحب اکثر اسکول کے معاملات کے بارے میں ڈسکشن کے لیے گھر بھی آجاتے تھے۔ فراز نے دیکھا۔ اسکول کی فائل جاوید صاحب کے ہاتھ میں تھی۔ اور وہ بڑے رازدارانہ لہجے میں زویا سے کچھ کہہ رہے تھے۔

فراز کو تجسس سا ہوا...... کہ اسکول کے معاملات کیا اتنے پریشان کُن ہوگئے ہیں جو جاوید صاحب کے چہرے پر بارہ بج رہے ہیں...... کہیں پیسے کے مسائل تو نہیں ہیں۔ اخراجات بڑھ گئے ہوں، وہ سوچ رہے تھے۔ ان کی طرف ان دونوں کی پشت تھی اور فراز ان کے پیچھے ستون کے ساتھ کھڑے ہوگئے تھے۔

وہ دیکھنا چاہ رہے تھے۔ آخر اسکول کی کون سی ایسی پریشانی ہے اور جب فراز نے کان لگائے تو زویا کی آواز سنائی دی۔

''جاوید صاحب میری سمجھ میں نہیں آرہا...... آپ کی لمبی سی تمہید کا مطلب کیا ہے؟ ہوا کیا ہے...... پلیز آپ مجھے بتائیں ناں بلکہ صاف، صاف بتائیں۔''

''زویا اب میں کس منہ سے آپ کو بتاؤں...... میری بیگم آئی سی یو میں ہیں انہیں نگلیریا ہوگیا ہے اور ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ ان کے بچنے کی امید دو فیصد بھی نہیں ہے۔''

''جی......؟'' زویا کی حیرت بھری آواز سنائی دی۔

''او میرے خدایا! اب کروڑوں کی جائداد جو بیوی کے نام ہے وہ میری ہونے والی ہے۔ اب تم فراز سے جلدی سے خلع لے کر میرے ساتھ شادی کرلو کہ ہمارا کپل مثالی ہوگا۔ فراز نے تو تمہیں کبھی خوش ہی نہیں رکھا۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھے بے حد پسند کرتی ہو اور میں تمہارے لیے فراز سے ہزار گنا بہتر شوہر ثابت ہوں گا۔ ہم دونوں کی پسند ناپسند سب ایک ہی ہے۔'' اور فراز کو یوں لگا جیسے وہ کھڑے قد سے نیچے آگریں گے۔

یہ جاوید صاحب زویا کی خوشی ناخوشی کے بارے میں کب سے جانتے تھے۔ وہ جو زویا پر ٹرسٹ کر بیٹھے شاید وہ غلط تھے۔ وہ تو کسی اور سے دل لگائے بیٹھی تھی۔

''ہونہہ...... میری قسمت میں دو بے وفا عورتیں ہی لکھی تھیں۔ جنہوں نے کبھی مجھ سے پیار کیا ہی نہیں۔ کیا تھا اگر میں دوسری شادی ہی نہیں کرتا......'' لمحے کے ہزارویں حصے میں انہیں بے وفا زویا ہر طرف نظر آرہی تھی۔ جاوید صاحب کے ساتھ ہنستی ہوئی، باتیں کرتی ہوئی اور پھر ان کے ساتھ جاتی ہوئی۔ اس سے قبل کے وہ گرپڑتے اپنی اسٹڈی میں جا کر خود کو قید کرلیا۔ ایک زوردار آواز پر وہ واپس گھومے اور چند لمحے کے لیے گنگ سے بھی رہ گئے۔ زویا نے ایک بھرپور تھپڑ جاوید صاحب کے منہ پر مارا تھا اور وہ بری طرح دھاڑ رہی تھی۔

''آپ کو شرم نہیں آتی ایک شادی شدہ عورت سے ایسی بے ہودہ گفتگو کرتے ہوئے۔ آپ کو پتا بھی ہے کہ آپ نے کیا بکواس کی ہے میں تو آپ کو ایسا ہرگز نہیں سمجھتی تھی۔ میں تو آپ جیسے شخص کو اپنا اسکول کا پارٹنر تک نہیں بنانا چاہوں گی۔ آپ کی ہمت کیسے ہوئی میرے شوہر کے بارے میں ایسا کچھ کہتے ہوئے۔ میں فراز سے آج ہی کہوں گی کہ آپ کے ساتھ ہماری پارٹنرشپ کینسل کی جائے۔ ایک مرتی ہوئی بیوی کے لیے پریشان ہونے کے بجائے آپ یہ کررہے ہیں۔ براہِ مہربانی اپنی خوشیوں کے پروگرام اپنے گھر جا کر بنائیں اور میرے گھر سے فوری دفع ہوجائیں...... ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے۔''

جاوید صاحب گرتے پڑتے بدحواس سے باہر جارہے تھے اب .... فراز احمد کو اپنی پیاری سی بیوی کو سنبھالنا تھا جو بری طرح روتے ہوئے نڈھال ہورہی تھی۔ اور اس کے دل میں اس کی محبت کی ڈوری اب آہنی بن چکی تھی۔





قسط 4

رنگِ خلش

رفاقت جاوید

کتنی عجیب بات ہے کہ ہماری زندگی کے حسین لمحے
بھی خلش کی نذر ہو جاتے ہیں اور ہم جوں جوں اس احساس کو من کے
اندر گہرائیوں میں دفن کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو خلش کے بے حساب رنگوں
کی پردہ کشائی ہمیں مضطرب کرنے لگتی ہے اور مکافاتِ عمل کا کبھی نہ ختم ہونے والا
سلسلہ شروع ہو جاتا ہے... گناہ چاہے چھوٹا ہو یا بڑا... سزا تو لازم و ملزوم ہے۔ اس
کے باوجود اسیرِ شجر سے گہرا ربط و تعلق رکھنا دوا بھی ہے اور عبادت
و ریاضت بھی ہے، نشاطِ وصل بھی اور وجدان بھی ہے۔

ممکن ہے ایسا وقت ہو ترتیبِ وقت میں
دستک کو تیرا ہاتھ بڑھے میرا در نہ ہو



''نمرا تم اتنی پریشان کیوں ہو؟ پتا ہے مجھے سر عادل صرف ایک نظر بھی دیکھ لیں تو قسم سے ان پر جان نثار کردوں۔'' حمیرا نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تم بہت ناشکری لڑکی ہو۔''

''مجھ سے ایسی باتیں مت کرو۔ میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتی ہوں، حیران ہوں کہ اس بندے کو مسئلہ کیا ہے؟ لیکچر کے دوران میں کانشس ہو جاتی ہوں اور بے اختیار ہو کر دائیں، بائیں دیکھنے لگتی ہوں کہ کہیں کلاس روم خالی تو نہیں جو میں ہی سر عادل کی نظروں کا محور ہوں۔'' وہ حیرت سے بولی۔

''تم جتنا اگنور کرو گی، وہ اتنا ہی تمہیں ستائیں گے۔ نظریں جھکانے اور نظر انداز کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ میرا مشورہ مانو تو انہیں ذرا اپنے قریب آنے دو۔ آخر ان کے ذہن میں کیا چل رہا ہے، یہ سمجھ آجائے تو اس کے بعد ہی کچھ سوچتے ہیں کہ کیا، کیا جائے۔'' حمیرا کافی سوچ کر اس سے کہنے لگی۔

''بالکل ہی بوگس مشورہ...... بھلا میں کیوں ان سے قریب ہونے لگی...... فقط گرل فرینڈ بنانا چاہتے ہوں گے...وقت گزاری کے لیے...... اگر جناب اتنے ہی سیریس ہوتے تو اپنی اماں کو میرے گھر بھیج چکے ہوتے۔'' وہ تیکھے انداز میں ابرو چڑھاتے ہوئے بولی۔

''پگلی اب زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ پہلے انڈر اسٹینڈنگ ہوتی ہے تب شادی کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ خدا کے لیے اپنی فرسودہ روایات سے باہر نکل کر آج کل کے دور کے اصولوں اور رواجوں کو سمجھنے کی کوشش کرو جانِ من۔'' حمیرا نے سنجیدگی سے کہا۔

''آج کل کے دور کی بات مت کرو حمیرا...... کیا رکھا ہے اس میں سوائے بے حیائی، بے باکی اور بدلحاظی کے۔ نہ بڑے کی عزت و تکریم ہے، نہ ہی چھوٹے سے نرمی و شفقت ہے۔ نفسانفسی کے اس عالم میں سراسر تباہی اور بربادی ہے۔ مجھے آج بھی اسی محبت پر اعتماد اور یقین ہے جو شادی کے بعد شروع ہوتی ہے اور قبر تک ساتھ نہیں چھوڑتی۔'' نمرا بھی سنجیدگی سے بولی۔

''نان سینس...... میں تمہارے ان دقیانوسی خیالات سے اگری نہیں کرتی...... محبت کا پہلا اصول ہی انڈر اسٹینڈنگ ہے، میرا وقت آنے دو...... بی لیوی...... اگر کسی سے انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی تو پھر مجھے اس کے خاندانی اسٹیٹس، دولت اور شکل صورت نہیں بلکہ اعلیٰ تعلیم کے سوا اور کچھ نہیں چاہیے۔ آئی ایم ویری کلیئر ان مائی مائنڈ...... تمہیں ایک گولڈن چانس ملا ہے۔ اس کی تمام خوبیوں اور خامیوں کو برطرف کر کے اسے سمجھنے کی کوشش تو کرو۔'' وہ جز بز ہو کر اسے پھر سمجھانے لگی۔

''تم اپنی منطق اپنے پاس ہی رکھو...... والدین میرے لیے جو فیصلہ کریں گے، بہت بہترین ہوگا...... میں خواہ مخواہ ہی اپنی زندگی کو عذاب میں ڈال کر اپنے خاندان کی نظروں میں بھی گر جاؤں اور پتا چلے کہ میں نے جناب سے ایسے منہ کی کھائی ہے کہ کسی کو چہرہ دکھانے کے قابل ہی نہیں رہی۔'' وہ مستحکم لہجے میں بولی تو حمیرا اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

☆☆☆

''عالیہ میرے منع کرنے کے باوجود تم نے سعود کا کمرا سیٹ کرنے میں حد ہی کردی ہے۔ اس کا بے دین دوست نہ ہوا جیسے کوئی بہت بزرگ ہستی کی تشریف آوری ہو رہی ہے کہ تم نے اپنا اور میرا سکون برباد کر دیا ہے۔ اچھی طرح جانتی بھی ہو کہ اس کے اگلے سمسٹر کی فیس کا وقت سر پر منڈلا رہا ہے۔ تم ہو کہ پھر بھی کوئی احساس نہیں...... بیسیوں بار التجا کی ہے میں نے کہ سعود کی شادی تک ذرا صبر کر لو۔ پھر پردے اور کارپٹ بدل لینا۔ فرنیچر بدل لینا مگر کیا مجال کہ بات مان جاؤ۔ اب تم ہی اپنے لاڈلے سے کہنا کہ فیس کا انتظام خود کر لے۔'' رحمان آفس سے آتے ہی عالیہ پر پھٹ پڑے تھے۔ اس نے خاموشی میں ہی عافیت جانی۔ وہ مسلسل سعود کی نالائقیاں اور گستاخیاں

گنوار ہے تھے اور عالیہ کان دبائے سنتی رہی۔
''رنگ میں بھنگ ڈالنا تو کوئی آپ سے سیکھے...... خدا کے لیے مجھے جی بھر کر خوش تو ہونے دیتے۔ میرا بچہ ایک سال دو مہینے اور چار دن بعد تشریف لا رہا ہے۔ ایسی باتیں مت کریں۔ کیا میں ہر وقت روتی بسورتی ہوئی آپ کو اچھی لگتی ہوں کہ میرے چہرے پر مسرت کی ہلکی سی رمق دیکھ کر آپ بے قابو ہو جاتے ہیں۔'' وہ ہاتھ جوڑ کر بیزاری سے بہ مشکل بولی۔
''عورت ذات ہے ہی ایسی ذراسی بات پر ایسے خوش کہ جان تک قربان کر ڈالے اور معمولی سی بات پر ایسے ناخوش ہو جاتی ہے جیسے آسمان سر پر آ گرا ہو۔ خدا کے لیے گہرائی میں سوچو، مت بناؤ خود کو بے وقوف...... اپنی اس بدتمیز اور خود سر و نافرمان اولاد کو کچھ...... سمجھاؤ مگر اس کی ناراضی کا خوف تمہارے اوپر غالب آ چکا ہے۔ اپنے رب کو کیا جواب دو گی۔ جس کے جلال کا تمہیں ہلکا سا ڈر و اندیشہ تک نہیں۔ ایک بچے کے بگڑنے کا مطلب تو جانتی ہو کہ ایک معاشرہ اس کی زد میں آ جاتا ہے۔ تمہاری اپنی خاطر داریوں سے وہ اس حد تک جا پہنچا ہے۔'' وہ تاسف بھرے لہجے میں بولے اور بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

☆☆☆

''ابو جی آپ ابھی تک سوئے نہیں...... یہ تبدیلی سعود کی آمد کی خوشی میں ظہور پزیر ہوئی ہے یا کوئی اور وجہ ہے؟'' وہ سلیقے سے دوپٹا درست کرتے ہوئے بولی۔
''وجوہات دونوں طرح کی ہو سکتی ہیں۔'' وہ اس کے سر پر بوسہ دیتے ہوئے بولے۔
''دوسری وجہ امی سے لڑائی کی بھی ہو سکتی ہے۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''میرا اندازہ درست ہے ناں؟''
''یوں ہی سمجھو...... تمہاری ماں کی سمجھ دانی بہت چھوٹی ہے، اس میں ایک کے بعد دوسری بات سما نہیں پاتی۔ کیا کروں......؟ مجھے ایوارڈ ملنا چاہیے کہ میں نے اس عورت کے ساتھ اپنی زندگی کا پرائم ٹائم گزار لیا۔'' وہ مزاحیہ انداز میں بول رہے تھے۔ ''اس سے بات کسی اور موضوع پر شروع ہوتی ہے، انجام کسی اور ٹاپک پر ہوتا ہے۔'' وہ ہنسنے لگے تو نمرا بھی مروتاً ہلکا سا مسکرائی۔
''ابھی تو مجھ سے لڑ جھگڑ کر بہت خوش بیٹھی ہو گی۔''
''ابو ایسے تو نہ کہیں...... امی کوئی جاہل خاتون نہیں...... دنیا کے نشیب و فراز کو پہچانتی ہیں۔ آپ انہیں under estimate کیوں کرتے ہیں۔ ابو جی میں کئی بار سوچتی ہوں کہ ہم شادی کی کلفتوں اور آزمائشوں کو جانتے ہوئے بھی شادی کرنے کی غلطی کیوں کر بیٹھتے ہیں؟ کیا شادی کے بغیر اکیلے زندگی گزارنا بہت کٹھن ہے؟ یا گھر آباد کرنے اور نئی زندگی کا تجسس اور شوق ہمیں غلطی کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔'' وہ متذبذب لہجے میں بولی تو رحمان نے چونک کر بیٹی کے معصوم چہرے کی طرف دیکھا۔
''بیٹا، اصل میں یہ غلطی نہیں ہوتی، یہ جو جیون بھر کا ساتھی ہوتا ہے ناں اس کے بغیر اس دنیا کا طویل سفر کاٹے نہیں کٹتا۔ وہی تو دکھ اور سکھ، خوشی اور غمی کا ہمراہی ہوتا ہے۔ والدین کے بعد یہی رشتہ تو اپنا اور بے حد پیارا لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے اسی مانوسیت اور اپنائیت کو ہم فار گرانٹڈ لینے لگتے ہیں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ میں تمہاری ماں کو طنز و مزاح اور میٹھی، کڑوی باتوں سے تنگ کر کے محظوظ نہیں ہوں گا تو کیا اپنی سیکرٹری کو یہ اعلیٰ شرف بخشوں گا؟ بیٹے تم بہت جلد گھبرا جاتی ہو، جیسے ہمارا گھر برباد ہونے لگا ہو۔ میاں، بیوی کی نوک جھوک اور چھیڑ چھاڑ میں ہی اپنا پن ہے۔ تمہاری زندگی میں بھی یہ سب کچھ اسی طرح چلے گا۔ یہ رشتہ ہے ہی ایسی قربت کا...... تکلف اور بناوٹ سے بے بہرہ......''
''ابو جی......! وہ ذرا شرما کر بولی۔ ''میں آپ کے پاس ہی رہوں گی۔ یہ بہت مشکل اور بے اعتباری کا رشتہ ہے۔ کیوں کر غلطی کروں...... ویسے بھی مجھے ہر وقت آپ دونوں کا خیال رہتا ہے کہ سعود نہ تو کل ہمارا تھا نہ ہی آج ہمارا

ہے، نہ ہی آنے والے کل میں ہمارا ہوگا۔ ہم اسے کھو چکے ہیں۔ آپ کے پاس کسی کو تو ہونا چاہیے ناں......''
''بیٹا سعود کی فکر کرنا چھوڑ دو۔ وہ ہمارا نہ سہی، ہم تو مرتے دم تک اس کے ہیں ناں...... ایک نہ ایک دن ضرور پلٹے گا۔ اس کے دل میں ہمارے لیے ہمدردی اور پیار بھی اجاگر ہوگا۔ اپنی ذمے داریوں کو بھی پہچان جائے گا۔ بس ہمیں تمہاری تعلیم ختم ہونے کا انتظار ہے۔ بس اتنا ہی ساتھ ہے ہمارا اور تمہارا۔'' وہ ایک دم سے اداس نظر آنے لگے تھے۔ نمرا نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔ اپنے ابو کی زبان سے اپنی شادی کے تذکرے پر قدرے حیران بھی تھی اور پریشان بھی...... کیونکہ انہوں نے آج تک اشارتاً بھی اس کے سامنے ایسی باتیں نہیں کی تھیں۔ آج شاید دل کچھ زیادہ ہی مضطرب تھا۔
''بیٹا جب کم عقل اور عاقبت نااندیش انسان شب و روز کی عبادتوں میں ایک ہی دعا مانگتا رہے تو اللہ تعالیٰ قبولیت کے وقت بے صبرے انسان پر ہنستا ضرور ہوگا کیونکہ یہ راز تو وہی جانتا ہے کہ ہمارے لیے کیا بہتر ہے اور کہاں خسارہ ہے؟ یہی حال ہمارا تھا کہ ہر وقت بچے کی آرزو جس کا انجام ہمیں معلوم نہیں تھا۔ ایک سال بعد تمہیں بن چاہے، بن مانگے اس نے ہمیں انعام کی صورت میں دے دیا۔ اب تم اپنا اور سعود کا موازنہ نہ کرلو۔ اور بیٹا میری ایک بات پلے باندھ لو کہ خواہشات کے پورا کرنے کے پیچھے حد سے تجاوز مت کرنا۔ اپنے تمام معاملات اوپر والے کے سپرد کر کے حقیقی سکون سے ہمکنار رہنا اور اس کے فیصلے پر راضی بہ رضا ہو کر سربسجود ہو جانا۔ یہ سب کہنا جتنا آسان ہے عمل کرنا اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولے تو نمرا نے ہنستے ہوئے کہا۔
''ابو جی......! آج امی سے خاطر مدارت کچھ زیادہ ہی ہوگئی ہے جو میں یاد آگئی۔ اور بہت سی غیر ضروری باتیں بھی آپ کو تنگ کرنے لگیں۔ چلیں آپ یہاں ہی لیٹ جائیں۔ میں آپ کے لیے چائے اور مزیدار کباب لے کر آتی ہوں۔'' وہ کمپیوٹر بند کر کے کھڑی ہوگئی۔
''بیٹا تمہاری ماں نے تو زندگی کے ہر موڑ پر ہی میری بے پناہ خاطر مدارت کی ہے۔ اس میں تو شک نہیں...... اگر میریڈ لائف میں اس قسم کی چھیڑ خانیوں اور شرارتوں کا گزر نہ ہو تو زندگی روکھی پھیکی اور تھکی ماندی ہو جاتی ہے مگر افسوس کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کے حصے کا سارا سینس آف ہیومر مرد کو ہی بخش دیا ہے۔ اس لیے تو ہمارا مذاق جھگڑے کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔'' وہ خوشگوار لہجے میں بولے۔ ''تم اپنا کام کرو میں چلتا ہوں۔ تمہاری امی ابھی تک کھول رہی ہوں گی۔''
''ابو جی......! امی کو تو انٹیریر ڈیکوریٹر ہونا چاہیے تھا۔ سعود کا کمرا دیکھا ہوگا آپ نے...... بس اب دلہن کی کمی رہ گئی ہے۔'' وہ شگفتہ لہجے میں بولی۔
''بھئی ہمارے بچے پہلے کماتے تھے تو دلہن آتی تھی۔ اب تو زمانہ ہی بدل گیا ہے۔ والدین بیٹے، بہو کی ذمے داری بھی اٹھا لیتے ہیں اور مزے کی بات یہ کہ پسند بھی اپنی نہیں کیونکہ وہ والدین کی پسند کو نہایت آسانی سے ری جیکٹ بھی کر دیتے ہیں۔ مجھے تو سعود سے ایسے ہی ردعمل کی توقع ہے۔ ایسا ظالم وقت ہے کہ اب بچے یہ تکیہ کلام بنا چکے ہیں کہ ہماری اپنی زندگی ہے کسی کی دخل اندازی کی ضرورت نہیں...... تم فی الحال دلہن کی کمی پر ہی اکتفا کرو۔''
''ہے تو ایسا ہی...... لیکن ابو جی میں تو سرے سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتی۔ اس لیے پسند اور ناپسند کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ پھر قدرے چھیڑتے ہوئے بولی۔
''چپ...... برادری میں کسی نے سن لیا ناں...... تو انہیں موت لاحق ہو جائے گی کہ باپ، بیٹی کیسی عجیب سی باتیں کر رہے ہیں۔'' وہ بھی مذاقاً بولے۔
''ہماری مڈل کلاس کی مینٹلٹی بہت گھٹیا ہے ابو جی...... اپر کلاس میں ایسا کوئی ڈر، خطرہ نہیں ہوتا۔ سب

سب ایک دوسرے سے کھل کر بات کرتے ہیں۔ کہیں بھی ہلکی سی پردہ داری نہیں ہوتی۔ میں نے اپنی کئی سہیلیوں کو اپنے باپ، بھائی، منگیتر اور کزنز کے بارے میں بہت کچھ کہتے سنا ہے۔ مجھے ان کے درمیان فاصلہ کم، اپنائیت و انسیت کا رشتہ بہت مضبوط لگا ہے۔'' وہ حسرت سے بولی۔

''بیٹے ایسا تو ہرگز نہیں...... انہیں کریدو گی تو اندر سے کھدو (بال) کی طرح پرانے چیتھڑے ہی پاؤ گی۔ حد درجے کی غلاظت اور ذلالت ہے ان کے آزادانہ و خود مختارانہ فیصلوں میں۔ اپنے اسلامی نقطۂ نظر کو پسِ پشت ڈال کر اپنے ہی دین و مذہب میں کیڑے نکالنا اور حجتیں کر کے خود کو بری الذمہ قرار دینا ان کا شیوہ ہے۔ میری جان ایسی لڑکیوں سے دور ہی رہا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی دوستی سے تم پر ان کی سوچ کا ہلکا سا بھی سایہ پڑ جائے۔ سعود کی مثال تمہارے سامنے ہے۔'' وہ لرز سے گئے تھے۔

''ابو جی...... میری شخصیت پر آپ کے رنگ کی چھاپ بہت گہری ہے۔ ان کی قربت میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ جس دن میں کمزور پڑ گئی اور میری ذات کا اپنا رنگ دھندلا پڑ گیا، اس دن مجھ پر ان کی قربت کا ہر بھیانک، بدنما اور گھٹیا رنگ چڑھ جائے گا... اور ایسا کبھی نہیں ہوگا۔'' وہ انہیں تسلی دینے کے انداز میں بولی۔

''ابو جی کچھ ہماری کلاس کی برائیاں اور کچھ اس کلاس کی خامیاں مجھے قطعاً قبول نہیں۔ ہم ان دونوں کے درمیانی راستے کا چناؤ کیوں نہیں کر لیتے؟ زندگی آسان اور سہل ہو جائے گی۔ سعود تو ہمارے ہاتھ سے مکمل طور پر نکل چکا ہے۔ اسے اپنے خاندان سے نفرت ہو گئی ہے۔ ابو جی ایک دن وہ مجھ سے بھی نفرت کرنے لگے گا کیونکہ میں اس کے ساتھ اس کی ڈگر پر نہیں چل سکتی۔ امی کا منتخب کردہ رستہ بہت حسین ہے، وہی میں نے ورثے میں لیا ہے۔ اسی پر مجھے مان ہے، فخر بھی۔''

''ہاں بیٹا، تم ٹھیک کہتی ہو، میرا تو یہ حال ہے کہ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پینے میں اپنی بھلائی سمجھتا ہے۔ ہمیشہ سے مجھے تمہاری طرف سے بھرپور تسلی کے ساتھ فکر بھی رہی ہے۔ بس بچے ضد کرنا اور ایک بات پر اڑ جانا بھی تو بہت بڑی خامی ہے۔ ہزارہا خوبیوں کو نگل جاتی ہے، اس کا خیال رکھنا۔ دوسروں کی بات سننے والے... بے وقوف بھی اینڈ آف داڈے نہایت سمجھدار ثابت ہوتے ہیں۔'' وہ اسے پیار کرتے ہوئے بولے۔

''ابو جی......! ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کو ضد کا نام دینا تو زیادتی ہے ناں...... مثال آپ کے سامنے ہے کہ میں نے اپنی بساط کے مطابق اس یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی خواہش کی تھی۔ کو ایجوکیشن کا ایکسپوژر لڑکیوں کو اسٹرانگ بناتا ہے، ذہن کو وسیع کر کے دنیا کو پرکھنا سکھاتا ہے۔ میری یہ تمنا جائز تھی۔ اس لیے میں اس پر ثابت قدم رہی۔ یہ ضد تو نہ ہوئی۔ سعود نے ضد کا سہارا لیا۔ آپ کو مالی طور پر پریشان بھی کیا اور ذہنی خلفشار میں بھی مبتلا کر ڈالا۔ مگر آپ کی ایک نہ سنی۔ آپ اس کا اور میرا موازنہ نہ کریں گے تو میں آپ کو ایک لاابالی، ضدی، اور ناقابلِ فہم لڑکی نہیں لگوں گی۔ مستقل مزاج اور ایک کمٹ منٹ کرنے کے بعد اس پر ثابت قدم ملوں گی۔'' وہ سمجھانے کے انداز میں بولی۔ ''امی کی آنکھوں پر...... ممتا کے پیار کی جو پٹی بندھی ہوئی ہے اسے کون کھولے۔ سعود ان کی آڑ میں ہی تو آپ سے بچا ہوا ہے لیکن اس پر مہر مت لگائیں۔''

''درست کہہ رہی ہو، والدین بھی کبھی کبھار بغیر سوچے سمجھے ہی اولاد پر لیبل چسپاں کر ڈالتے ہیں۔ نمرا ہو سکتا ہے سعود بھی اپنی سوچ کے مطابق کسی حد تک درست ہو؟'' وہ سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

''تُو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی تھا

وہ مذاقاً بولا۔

''ممی یہ شعر آپ کے لیے علامہ اقبال صاحب نے لکھا تھا۔ میرے لیے ہرگز نہیں لکھا گیا۔ ڈیڈی کے فیورٹ شاعر کا یہ پیغام آپ میری طرف سے ان تک پہنچا دیجیے گا کہ مجھے قناعت، صبر و تحمل سے نفرت ہوگئی ہے، آپ کی حالت دیکھ کر اس لیے... عادل علی رضا، وردہ پر قناعت کرنے والا نہیں۔'' وہ بڑے موڈ میں کہہ رہا تھا۔

''دل کے بہلانے کو خیال تو اچھا ہے'' سائرہ بھی مسکرا کر بولی۔

''ممی! اگر آپ نے میرا ساتھ نہ دیا تو سوچ لیں اس کا انجام!'' عادل نے خفگی سے ماں کی طرف دیکھ کر دھمکی دینے کے سے انداز میں کہا۔

''تو بیٹا ایسا کرو، جاؤ اپنے باپ سے خود بات کرو...... شاید تمہیں ان کی باتیں سمجھ آجائیں۔ میں درمیان میں ثالث بن کر دونوں طرف سے بے عزت ہو رہی ہوں، نہ تو ایک بات سننے کو تیار ہے اور نہ دوسری طرف میری بات پر یقین ہے۔ باپ، بیٹے نے تو ٹینشن کی بال بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔'' وہ بھی ناراضی سے بولی۔

''ممی......! آپ کو میرے اور وردہ کے ریلیشن شپ کی غلط فہمی نہ ہوتی تو مجھے اس کربناک صورتِ حال کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔'' وہ دکھ کے مارے صوفے پر بیٹھا سر کے بالوں کو ہلکے، ہلکے نوچتے ہوئے بولا۔ ''دس از ناٹ فیئر ممی۔''

''تمہارے ڈیڈی کا فیصلہ بھی تو ایک غلط فہمی کی بنیاد پر ہوا ہے، وہ بار، بار ایک ہی راگ الاپتے ہیں کہ اگر عادل اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا تو پھر اس سے فلرٹ کر کے اس کے دل میں جگہ کیوں بنائی تھی۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ شادی تو ہو کر ہی رہے گی۔ اس نا ہنجار نے اپنے ہی خاندان میں اتنا بڑا ناٹک کھیلا ہے۔ اب وہی اس ڈرامے کا ازلی اور ابدی کردار بن کر زندگی گزارے گا۔'' سائرہ نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''میں نے ہزار دفعہ آپ سے معافی مانگی ہے کہ میری حد درجہ توجہ کی وجہ سے ان تمام مسائل نے جنم لیا ہے۔ میں تو اس کی احسان مندی... کی وجہ سے اس کی عزت بھی کرتا تھا اور چھوٹی بہن سمجھ کر پیار بھی کرتا تھا۔ اب اسے بھی آپ دونوں کی طرح غلط فہمی ہوگئی۔ ممی مسئلہ آپ تینوں کی ذہنی اختراع کا ہے، میرا تعلق تو آج بھی اسی طرح بہت فیئر ہے۔ اس نے ہی فون کرنا اور اٹھانا بند کر دیا ہے، خواہ مخواہ ہی پڑھ لکھ کر گنوایا اس نے۔ اس کی عقل اور سمجھ کا اندازہ یہیں سے لگالیں کہ ایک طرف لٹھ مار اور دوسری طرف موم کی گڑیا۔ میں دو متضاد عادات کے ساتھ نہیں رہ سکتا ممی...... پلیز......'' وہ پریشانی میں اپنی انگلیاں بری طرح مروڑنے لگا تھا۔ سائرہ نے اس کے ہاتھوں کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ اسے قابو نہ کرسکی۔ سائرہ پژمردگی کے عالم میں اٹھی اور فریج سے جوس کا کین نکال کر کھولنے لگی اور اس کے قریب جا کر اس کی طرف خاموشی سے بڑھایا تو اس نے زور سے ہاتھ مارا اور جوس کمرے کے فرش پر پھیل گیا۔

سائرہ اس کی طرف رحم لانہ نظروں سے دیکھنے لگی۔



''بیٹی کے سامنے کیسے پولائیٹ بن کر مجھ سے بات کرتے ہیں جیسے آپ سے بہترین شوہر تو اس روئے زمین پر آیا ہی نہیں۔ ویسے رحمان جی، آپ ایکٹنگ کے شعبے میں خوب ترقی کرتے، دنیا بھر سے پذیرائی سمیٹتے۔ خواہ مخواہ ہی زندگی پرائے نوٹوں کو گنتے گزار دی۔ ہاتھوں میں کروڑوں آئے مگر جیب خالی ہی رہی۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولی تو وہ مسکرا دیے۔

''معمولی سی بات پر آپ نمرا کے پاس کیوں بھاگے جاتے ہیں؟ ذرا اس کا جواب چاہیے۔'' وہ ان کی پلیٹ میں ناشتا نکالتے ہوئے بولی۔ ''آپ جیسا شکایتی اور فتنے باز میں نے آج تک نہیں دیکھا۔'' وہ دل ہی دل میں ہنس رہی تھی۔

''تو کس کے پاس جاؤں...... دل کے پھپولے دکھانے۔ دکھا دو کوئی نیا رستہ...... تمہاری اولاد کے کرتوتوں کی وجہ سے اپنوں سے دور ہونا پڑا۔ اب سب کے ساتھ ناشناسائی کا رشتہ ہے۔ ایک ہی شناسا ہستی باقی رہ گئی ہے۔ اس پر بھی اعتراض ہے، حد کرتی ہو۔'' وہ کاٹ دار لہجے میں بولے۔

''سچ ہی تو کہا ہے کہ کوئی دل کا دکھڑا سننے کو نہیں رہا۔ بیوی تو دشمن ہوتی ہے، مرجائے تو دھوم دھڑکے سے جمعراتیں کرا کر داد کماؤ، زندہ ہے تو خوب سوگ مناؤ، چولھا ٹھنڈا کیے رکھو......'' وہ چھیڑنے کے انداز میں بولی۔

''خوب پکڑ ہوگی جناب کی۔''

''ہاں تو اب سمجھ آئی تمہارے سینس آف ہیومر کی...... اب مجھ سے اور پیسوں کی فرمائش مت کرنا۔ بیٹا نہ ہوا پتا نہیں کون آرہا ہے۔ اور ساتھ میں بے دین نامراد جس کے بعد ہم گھر کو پاک کرتے رہ جائیں گے...... پھر اس میں تمہارا بھی قصور نہیں...... اولاد کی ترسی ہوئی ماں کا رویہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ دو چار اور بچے تمہاری آغوش میں آجاتے تو تم نارمل ہوتیں۔ اب لے دے کے دو ہی تو ہیں۔ ہر وقت انہی کے بارے میں سوچتی رہتی ہو۔ اللہ کی بندی کچھ اپنے بارے میں کچھ میرے بارے میں بھی سوچو۔ مدت ہوگئی مل کر کہیں باہر جانا ہی نہیں ہوا۔'' ان کا لہجہ غیظ وغضب کی راہوں سے گزرتا ہوا ایک دم ٹھنڈے پانیوں میں جا ڈوبا...... تو وہ مسکرا کر چائے بنانے لگی۔

''بچوں کی پڑھائی سے فارغ ہو کر گھومنے نکلیں گے۔ زیادہ دور تو جانے کی استطاعت نہیں...... مری، نتھیا گلی تک تو جا ہی سکتے ہیں ناں۔'' وہ خوشگوار لہجے میں بولے۔

''پڑھائی کے بعد آپ اگلے فرض کو بھول گئے ہیں۔ ان کی شادیاں، ان کو سیٹل کرنا بھی تو ہمارے فرائض میں آتا ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''میرے خدایا، میں کیا کروں؟ مڈل کلاس کے تمام مسائل خود ساختہ ہیں۔ ان کا مربوط تسلسل مرتے دم تک بڑھتا چلا جاتا ہے۔ عالیہ اس کیفیت سے باہر نکل آؤ، ورنہ تو ہاتھ میں نہ یہ تھوڑا سا پیسہ رہے گا' نہ ہی جسم میں طاقت رہے گی اور بڑھاپا اسی اولاد کے ہاتھوں ذلیل ہو جائے گا۔ نمرا تو پرایا مال ہے، وہ ہماری لک آفٹر تو نہیں کرسکے گی ناں اور بیٹا...... ہاں اس کو تو میں نے پرکھ لیا ہے۔ حد درجے کا خود غرض اور بے فیض، ہر چیز اپنا حق سمجھ کر وصول کرتا ہے۔ کیا مجال کہ ایک بار شکریے کا لفظ ہی بول کر ہمیں خوش کر دیا ہو۔ مگر تم ہو کہ اسی کے نام کی مالا جپتے تھکتی نہیں۔'' وہ الجھ کر بولے۔

''جب سے بچہ لندن گیا ہے آپ کے تو تیور ہی بدل گئے ہیں۔ تھوڑا سا انتظار کرلیں۔ آپ جتنا پیسہ اس پر خرچ کریں گے، وہ آپ کو منافع کے ساتھ واپس لوٹائے گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ پھر اس پیسے سے محل تعمیر کر لیجیے گا۔'' وہ خفگی اور طنز سے بولی۔

''چلو وہ دن بھی دیکھ ہی لیں گے۔ اللہ کرے تمہاری خوش گمانیاں پوری ہوں۔ میری تو کمر تم نے توڑ دی ہے۔'' وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولے۔ ''تم آج ڈنر پر میرا انتظار نہ کرنا، آفیشل ڈنر ہے۔ واپسی میں دیر ہو جائے گی۔''

''خود تو آئے دن کبھی لنچ تو کبھی ڈنر سرینا میں اور برنچ پی سی میں...... پھر بھی آہ وفغاں کرتے تھکتے نہیں۔ کبھی میرے بارے میں بھی سوچا ہے کہ دن، رات، ہفتے، مہینے اور سال بھر سے گھر میں ہی قید با مشقت میں گھل گئی ہوں۔ کیا مجال کہ رتی بھر احساس ہو...... یہاں تو نمک اور پانی والا حساب چل رہا ہے۔ جو گھل گیا وہاں خاموشی ہے۔ جو اپنی جگہ پر ہے اس کا شور شرابا دوسروں کو جینے ہی نہیں دے رہا، آہ...... عجیب ہی مخمصے میں پھنس کر رہ گئی ہوں، اب سعود کو بیچ منجدھار کیسے چھوڑ دوں...... ایک ڈیڑھ سال کی بات ہے۔ اس کے بعد تو وارے نیارے ہی ہوں گے۔ تم اول فول بکتے جاؤ، باپ جو ٹھہرے، ماں تو کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے گی۔ ایسی بکواس سننا بھی اولاد سے بے انصافی اور ستم گیری کی نشانی ہے۔'' وہ رحمان کے جانے کے بعد میز سے ناشتے کے برتن اٹھانے لگی تو

سامنے سے نمرا آتی ہوئی نظر آئی۔ اسے دیکھ کر موڈ قدرے بدل گیا تھا۔
''ناشتا بنادوں بیٹا۔'' وہ اسے بوسہ دے کر پوچھنے لگی۔
''امی میرے ناشتے کی فکر نہ کریں۔ میں خود بنالیتی ہوں، آپ سارا دن کام کر کر کے نڈھال ہو جاتی ہیں۔ تھوڑے دنوں کی بات ہے، ایک دم سے دن پھر جائیں گے۔ ذرا پڑھائی ختم ہونے دیں اور پھر ایک فٹ سی میری نوکری تو لگنے دیں۔ سب سے پہلے فل ٹائم ملازم رکھ کر دوں گی اپنی امی کو...... آپ بیٹھے، بیٹھے حکم چلائیں گی اور جن حاضر ہو جائے گا۔'' وہ ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔
''بیٹے تمہاری نوکری کے فائدے تو تمہارے شوہرِ نامدار کو ہوں گے۔ اللہ تجھے لمبی اور با مقصد عمر دے۔ والدین تو فقط دعاؤں کے لیے ہی بنائے گئے ہیں۔ بیٹا بس اب یہی تمنا ہے کہ تم اپنے گھر کی ہو جاؤ۔ قدر دان لوگوں سے تمہارا واسطہ پڑے۔ بس دل میں بڑے ہی ارمان ہیں، اللہ تعالیٰ پورے ضرور کرے گا۔''
''امی میں شادی نہیں کروں گی۔''
''بیٹا...... ایسی باتیں ہمیں زیب نہیں دیتیں۔ ایسے فیصلے ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو کرنے کا کوئی حق نہیں، ان کے والدین کو تمام اختیارات حاصل ہوتے ہیں کیونکہ وہ اپنی اولاد کا کبھی برا نہیں سوچتے۔'' عالیہ نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ''شادی تو اک فریضہ ہے جسے بہر حال نبھانا پڑتا ہے۔''
''آپ کی نصیحت سر آنکھوں پر...... مگر امی میں ایک پڑھی لکھی، روشن دماغ لڑکی ہوں۔ اپنے اچھے، برے کی شناخت رکھتی ہوں۔ اس لیے فیصلہ وہ بھی میری اپنی زندگی کا کم از کم اس پر تو میرا حق ہونا چاہیے ناں۔'' وہ مؤدبانہ انداز میں بولی۔
''میری جان اپنے باپ کے سامنے ایسے ماڈرن خیالات کا انکشاف مت کرنا، انہوں نے سعود کی حرکات کی وجہ سے پہلے ہی میری ناک میں دم کر رکھا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ ان کی زبان پر تمہارا نام بھی ان معنوں میں اچھلنے لگے۔ ویسے آپس کی بات ہے، میں بھی یہی کہا کرتی تھی۔'' عالیہ ایک دم سے ہنسنے لگی۔
''امی آپ بھی خوش رہیں اور مجھے بھی ایسے ہی خوش رہنے دیں۔ مجھے نہیں کرنے زبردستی کے سمجھوتے......''
''آج کے بعد تم نے ایسا سوچا بھی تو میں ناراض ہو جاؤں گی، تم ہم سے بڑی نہیں ہو کہ اتنا بڑا فیصلہ کر بیٹھو۔ خدا کے لیے ہمارا منہ ہی کالا نہ کر دینا۔ برادری سمجھے گی کہ بیٹی کے لیے کہیں سے رشتہ ہی نہیں آیا۔ جو ماں، باپ کی دہلیز پر ہی عمر کھا بیٹھی۔ تم جونہی یونیورسٹی سے فارغ ہوگی، انشاء اللہ تمہارے ہاتھ پیلے کرنے کی دلی آرزو کو پورا ضرور کروں گی۔ چاہے تم جتنا بھی ہنگامہ کرو، ایک نہیں مانوں گی تمہاری۔'' عالیہ اب کے سختی سے بولی، ساتھ ساتھ توے پر بیلے ہوئے پراٹھے کو ڈال دیا۔
''امی یہ خوب رہی۔ مجھے اپنی زندگی گزارنے کا کچھ تو حق ہے ناں...... میں جائز بات کہہ رہی ہوں، اس میں برا ماننے کی تو ضرورت ہی نہیں...... آپ نے آج تک کسی بیوی کو مکمل طور پر خوش دیکھا ہے اور کسی ماں کو مطمئن پایا ہے۔ دونوں معاشرے کی ڈسی ہوئی عورتیں ہیں۔ بیوی بنو نہ ماں کا روپ اپناؤ بس یہی رستہ بہتر ہے۔''
''خدا کے لیے سعود کی طرح اپنی بات کو ہی صحیح مت سمجھو۔ مرد کے بغیر کسی بھی معاشرے میں عورت دو گام چلنے کی ہمت نہیں رکھتی۔ بیٹا اگر تم تہجد کے لیے بھی آدھی رات کو اٹھو گی تو لوگ سمجھیں گے کہ تم نے کسی کو اپنے کمرے میں بلا کر رات گزاری ہے۔ تمہیں یہ ظالم دنیا والے سات ستر میں بھی ننگا کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔ مجھے تم اتنی پیاری ہو جان کہ میں تمہاری ایسی زندگی کے انتخاب پر ہر صورت مخالفت کروں گی۔ ہر گز ایسا نہیں ہونے دوں گی۔'' اس نے توے سے پراٹھا اتارتے ہوئے کہا اور بیٹی کے لیے چائے بنانے لگی۔

''یعنی آپ نے اپنی زندگی کے اس تلخ تجربے سے کچھ نہیں سیکھا۔ جو غلطی آپ سے سرزد ہوئی تھی۔ وہی غلطی مجھ سے کرواکر اپنی غلطی کی تلافی کرنا چاہ رہی ہیں۔ آپ کی غلطی کی سزا مجھے نہیں ملنی چاہیے۔'' وہ نہایت سنجیدگی سے بولی۔

''شادی غلطی نہیں بیٹا...... اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ ہماری بہتری کے لیے کیا ہے۔ نہ جانے آج کل کی نسل میں یہ غیر ذمے داری، ڈر، خوف اور آزاد و بے مہار رہنے کا شوق کیوں بڑھ گیا ہے۔ استغفار پڑھو، اللہ تعالیٰ کے احکامات سے انکار کفرانہ حرکت ہے۔'' وہ یہ کہہ کر ایک ہی نقطے پر منجمد ہو کر سوچنے لگی۔

''واہ میرے مولا...... کیا یہ زندگی صرف دکھوں کی آماجگاہ ہے؟'' وہ آہ بھر کر رہ گئی۔

☆☆☆

''امی! میں ائرپورٹ کے لیے نکل رہا ہوں۔ سوچا آپ کو اپنا پروگرام بتاتا چلوں۔'' سعود نے ماں سے نہایت پیار سے بات کی اور اپنا شیڈول اس کے گوش گزار دیا۔ عالیہ کا پاؤں زمین پر ٹکنا مشکل ہو گیا تھا۔ رحمان بظاہر نارمل تھے مگر چہرہ ہر طرح کی خوشی اور تجسس سے عاری تھا۔ عالیہ کھول کر رہ گئی۔

''خدا کے لیے اپنا مزاج درست کریں۔ بچہ ایک سال بعد آرہا ہے، آپ ہیں کہ ناخوش اور ناراض...... مہمان دوست کے آنے پر اتنا غصہ...... توبہ استغفار......''

''اس نانہجار کو علم نہیں ہمارے حالات کا...... اسے اس گھر میں کیسے ٹھہرا سکتے ہیں۔ ہم روکھی سوکھی پر گزارہ کرنے والے لوگ اس غیر ملکی مہمان کی آؤ بھگت کیسے کر سکتے ہیں؟ اللہ جانے اس کی رہی سہی عقل بھی کہاں چلی گئی ہے؟'' وہ دانت پیستے ہوئے بولے۔

''میاں جی......! وہ پیسوں کا طلبگار نہیں ہے...... آپ کو ہر وقت جمع، تفریق کی ہی پڑی رہی ہے، کسی بینکر سے تو کسی دشمن کی بیٹی کی بھی شادی نہ ہو...... میں تو بینک کی تجوریوں کی نذر ہو گئی ہوں۔ خوشی کو سیلی بریٹ کرنا تو آپ نے سیکھا ہی نہیں...... اس کا دوست میری ذمے داری ہے۔ میں خود ہی نپٹ لوں گی۔ آپ کو فقط اپنے چہرے پر شگفتہ سی مسکراہٹ سجائے رکھنی ہے۔ کیا آپ اتنی سی مہربانی نہیں کر سکتے؟ کیسے عجیب باپ ہیں آپ...... بگاڑنے میں بکری کے سدھارنے میں چیتے...... اولاد کو سنوارنے کے لیے شیر کے خول کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پیار کی شفقت ہی بہت طاقتور ہوتی ہے۔'' وہ چڑ کر بولی۔

''ٹھیک ہے، جاؤ یہ اپنی دو چوڑیاں بیچ کر اسے پاکستان کی سیر کرا دو۔'' وہ اس کی کلائی کی طرف دیکھ کر نہایت تلخی سے بولے۔ ''وہ لڑکا گھر میں قید ہونے سے تو رہا۔ تمہارا ملک دیکھنے آرہا ہے۔ گھماؤ پھراؤ اور خود بھی عیش کرو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں بابا۔'' طنزیہ ہنسی اُن کے چہرے پر پھیل گئی تھی۔

☆☆☆

عالیہ بجھے ہوئے دل کے ہمراہ چہرے پر بناوٹی خوشی سجائے سعود کے انتظار میں ائرپورٹ کے لاؤنج میں کھڑی تھی۔ رحمان بھی خود کو قابو میں رکھے ہوئے تھے۔ بیچارے کیا کرتے...... اب تو بیوی سے بحث مباحثہ کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ نمرا دونوں کی دلی کیفیت سے واقف تھی۔ اس کے چہرے پر بھی اِک جامد خاموشی تھی۔

''عالیہ چھیر اپ...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سعود ہمارے اترے ہوئے چہرے دیکھ کر پریشان ہو جائے گا۔ نمرا تم بھی بیٹا اپنی لٹکی ہوئی شکل کو درست کرو۔'' رحمان نے دونوں کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

''میں ٹھیک ہوں...... بلکہ بے انتہا خوش ہوں۔ میرا سعود آرہا ہے۔ کوئی چھوٹی موٹی خبر نہیں۔'' لہجے کی تلخی کو چھپاتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ''خوشی میں بھی آنسو...... کیسا عجیب ہے یہ انسان۔'' وہ آنسو صاف کرتے ہوئے مسکرا کر بولی تو نمرا نے ماں کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

''وہ دیکھیں امی...... سعود بھائی چلے آرہے ہیں......'' نمرا نے چونک کر بے اختیاری میں کہا تو والدین کی نظریں سامنے گیٹ پر سعود کو ڈھونڈنے لگیں۔ مگر سعود کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ وہ ماں کے... گلے آلگا تو عالیہ آواز کو پہچان کر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔
سعود کا حلیہ دیکھ کر دونوں سکتے میں چلے گئے۔ کان بالی اور بالوں کی پونی ٹیل، گلے اور بازو میں میٹل کی موٹی چین دیکھ کر نظر اس کے بدن کے پہناوے پر اٹک گئی۔ لیدر کی چپل اور پٹس سے لٹکی ہوئی برمودہ کے اوپر پیچز لگی کالی ٹی شرٹ اور بڑھی ہوئی شیو دیکھ کر وہ اللہ تعالیٰ کے اس تخلیق کردہ نمونے کی شناخت کے بعد اس کی بغل میں کھڑے آئزک کو دیکھنے لگے جو اس سے مختلف پیس تھا۔ آنکھوں میں حد درجے بے باکی تھی۔
اس کی کلین شیو اور میک اپ دیکھ کر انہیں سمجھ نہ آئی کہ یہ دوست لڑکا ہے یا لڑکی...... لال پھولدار شرٹ اور جگہ، جگہ سے پھٹی ہوئی جینز اور سر کو ریڈ کلر کے bandanna سے کس کر باندھ رکھا تھا۔ بازو میں کڑا اور ہاتھوں کی انگلیاں انگوٹھیوں کی قید میں پریشان حال اور کمر تک جھولتے ہوئے گولڈن الجھے ہوئے بال۔ دو نمونے ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔
نمرا نے دونوں کو حقارت سے دیکھا اور بڑبڑاتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔
''بیٹا تم کہاں جارہی ہو؟ بھائی سے ملو...... ذرا دیکھو تو کیسا ماڈاسکا ڈلگ رہا ہے۔'' عالیہ کے لہجے میں کھوکھلا پن تھا۔
''نمرا تم گاڑی میں بیٹھو۔ ہم آتے ہیں۔'' رحمان اپنے خونخوار تیوروں پر قابو نہ رکھ سکے۔ وہ سنجیدگی سے گویا ہوئے۔ وہ حیران و پریشان ان کی اذیت اور تکلیف کا اندازہ لگاتے ہوئے وہاں سے باہر نکل آئی۔
رحمان نے اپنے گردو پیش پر نظر دوڑائی۔ ورنہ ان کے جاننے والوں سے آنکھیں چار ہونے کا مطلب واضح تھا۔ درد اور دکھ کی چبھن میں وہ بے بس کھڑے تھے کہ چھوٹا بھائی فرقان سامنے سے آتا ہوا نظر آیا۔ انہوں نے آنکھیں چرائیں۔ اسے نظر انداز کیا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر عالیہ کو بھی جانے کا اشارہ کیا...... مگر فرقان تو ان کے قریب آکر مبارک دینے لگا۔
''بھائی جان آپ بھی عید کا چاند ہی ہوگئے۔ سعود کے آنے کی ہمیں خبر ہی نہیں ہوتی۔ اگر میں یہاں نہ آتا...... یہ تو بات نہ ہوتی۔ آپ تو بالکل ہی اجنبی بن گئے ہیں۔'' وہ سعود اور اس کے دوست کا بغور جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ رحمان کے چہرے کے ہر مسام سے عرقِ ندامت ابل کر بہنے لگا تھا۔ اس شدید سردی میں ان کے تن بدن میں شعلے اور آنکھوں میں چنگاریاں بھڑک رہی تھیں۔
''سعود، چاچو سے ملو۔ مجھے لگتا ہے تم نے اپنے چاچو کو پہچانا نہیں۔'' عالیہ نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا تو فرقان نے طنز سے بھرپور قہقہہ لگایا۔
''میں ویسا ہی ہوں...... کچھ بدلا نہیں...... بھابی آپ کی لطیفے سنانے کی عادت نہ گئی۔''
''ہاں تم نے سچ ہی کہا ہے۔'' وہ بھی قہقہہ لگا اٹھی۔ کھوکھلا، ندامت سے بھرپور شرمندگی سے لبریز قہقہہ...... سعود طوعاً و کرہاً چچا سے بغل گیر ہوا اور ماں کے ہمراہ گاڑی کی طرف چل پڑا۔
وہ لوگ گاڑی کی طرف آئے جہاں نمرا پہلے سے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں روئی ہوئی لگ رہی تھیں۔ سعود بہن کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ وہ بھائی کے گلے میں بانہیں ڈال کر پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔ آئزک حیرت و تجسس سے انہیں دیکھنے لگا کہ اس میں رونے کی بات کون سی ہے۔ ایسے لوگوں میں رہنا تو بہت مشکل ہے جو خوشی کے موقع پر بھی روتے ہیں۔ مسئلے کو سمجھنا اس کے لیے محال ہو گیا تھا۔
''آئزک گھبرانے کی بات نہیں...... آنسو خوشی میں بھی بے اختیار ہو جاتے ہیں۔ ہم ذرا جذباتی قسم کے لوگ

ہیں۔ ہمارا کام رونے سے شروع ہوتا ہے اور اختتام بھی رونے دھونے پر ہوتا ہے۔'' سعود نے اسے انگریزی میں سمجھانا شروع کر دیا۔

یہ سن کر نمرا نے ایک دم سے اپنی سسکیوں کو مدھم کیا اور آنسوؤں کو باہر کے بجائے اندر ہی گرانے لگی۔ اتنی دیر میں رحمان بھی نظریں جھکائے بوجھل قدموں اور بجھے ہوئے دل کے ساتھ گاڑی تک پہنچ گئے۔ اور خاموشی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ گاڑی میں مکمل طور پر خاموشی کو سعود کی وسل نے توڑا۔ وہ کسی انگلش سانگ کی دھن بجا رہا تھا۔

☆☆☆

تین بیڈ روم کے اس گھر میں گیسٹ روم تو تھا نہیں کہ آئزک کو الگ کرا دے دیا جاتا سو سعود اور آئزک کو ایک ہی کمرے میں ٹھہرا دیا۔ سعود، اپنے کمرے کا نیا پن دیکھ کر خوشی کے مارے چیخ اٹھا اور پھر بڑھ کر آئزک کے گال پر بوسہ دے ڈالا۔

''سعود...... تم ہوش میں تو ہو، کیا تمام مینرز، ایٹی کیٹس لندن میں ہی چھوڑ آئے ہو۔'' رحمان نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے پُرملال لہجے میں کہا۔

''عالیہ! اپنے بیٹے کو ڈھنگ کے کپڑے نکال کر دو اور مہربانی فرما کر تم بار بر سے ہیر کٹ اور شیو کروا کر آؤ۔ اور اتارو یہ بالی والی نامراد کہیں کے...... میں نے تمہیں وہاں اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجا تھا نہ کہ ہپی بننے کی ٹریننگ پر...... اور کان کھول کر سن لو کہ اگر اپنے دوست کو اس گھر میں ٹھہرانا چاہتے ہو تو وہ بھی اپنا حلیہ درست کر لے۔ ورنہ تم دونوں کو ابھی اور اسی پل کھڑے، کھڑے نکال دوں گا۔ مجھے تم جیسا بے غیرت اور بے حیا بیٹا نہیں چاہیے۔''

''ڈیڈی...... مسئلہ کیا ہے؟'' وہ حیرت سے بولا۔ ''مجھ میں کچھ بھی انہونا نہیں۔''

''ڈیڈی نہیں...... ابو جی کہو...... جو تم بچپن سے پکارتے آئے ہو۔ ایک سال کے عرصے میں سب کچھ بھول گئے ہو، ہمارے اصول کیا ہیں؟ رسم و رواج کیا ہیں؟ ہم کس سوسائٹی کے پروردہ ہیں؟''

''ہاں، ہاں میں آپ کا مسئلہ سمجھ گیا ہوں۔ وہی مڈل کلاس کے ایشوز اور کمپلیکسز...... او مائی گاڈ...... دنیا بدل گئی...... مگر میرے ڈیڈ نہ بدلے۔ ویری سیڈ......'' وہ حقارت سے بولا۔

''آپ بچے کو بیٹھنے تو دیں۔ سمجھ جائے گا کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ آتے ہی اپنی بھڑاس نکالنے پر تل گئے ہیں۔ خدارا کچھ تو سوچیں۔ مہمان ساتھ ہے۔ وہ کیسے حیرت سے ہمیں گھور رہا ہے۔'' وہ التجائیہ لہجے میں بولی۔

''تم چپ رہو...... آج کا یہ منحوس دن مجھے تمہاری وجہ سے دیکھنا پڑا ہے۔ یہ تربیت دی ہے تم نے اپنی اولاد کو۔ کیسا جوکر، ہونق اور غیر مہذب بن کر آیا ہے۔'' وہ کھولتے ہوئے غصے کو نکال کر اب قدرے بہتر محسوس کرنے لگے تھے ورنہ دل ہی پھٹ جاتا۔ سعود خاموش کھڑا تھا۔

''جاؤ پاک صاف کپڑے پہن کر میرے ساتھ جمعے کی نماز کے لیے چلو اور اپنے اس بے دین ساتھی کو بھی ساتھ لے لینا۔ میں تمہیں ایک گھنٹا دیتا ہوں اس تمام کارروائی کے لیے۔'' وہ پھر چیخ کر بولے۔

''آپ اپنے کمرے میں چلیں، میں آپ کے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔ فی الحال ٹھنڈے پانی سے غصے کو کم کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ یہاں سے جائیں پلیز، میں پانی بھی لے کر آتی ہوں۔'' عالیہ نرم لہجے میں کہہ کر پانی لینے چلی گئی۔

''رحمان جی...... آپ پانی پئیں...... اتنا غصہ اچھا نہیں، اس عمر میں۔ سعود آپ کی ڈانٹ ڈپٹ کا مدعا سمجھ چکا ہے۔ خدارا خاموش ہو جائیں۔ میں سب سنبھال لوں گی۔ مسئلہ ایسا سیریس نہیں ہے کہ مرنے مارنے پر تل جائیں۔'' وہ انہیں پانی کا گلاس پکڑاتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

شریکِ سفر کے نام............سیما سراج

سنیئے یہ خط میں آپ کے نام لکھ رہی ہوں لیکن مجھے پتا ہے کہ آپ کہیں گے کہ خواتین کا رسالہ میں پڑھتا نہیں ہوں پھر میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر مسکرائیں گے اور کہیں گے کہ اچھا یہ بتاؤ کہ کیا لکھا ہے۔ اب مجھے یہ بھی بتانا پڑے گا کہ سال ختم ہوا۔ ذرا سامنے سے اخبار کا بزنس پیج تو ہٹائیں۔ جب محبت کی بات ہو رہی ہو تو اسٹاک مارکیٹ کا اتار چڑھاؤ مزہ نہیں دیتا۔ خیر فکر کی کوئی بات نہیں۔ نئے سال میں مارکیٹ چڑھنے کا امکان ہے۔ جی جناب یہ میری پیش گوئی ہے۔ ابھی تو مجھے نئے سال میں اپنا سیارہ بھی تلاش کرنا ہے۔ کہاں، کہاں اپنی چمک دکھائے گا ابھی تو فی الحال آپ مجھے وہ آتش بازی دکھا کر لائیں جو سالِ نو کی آمد پر ہوگی۔ اب آپ مجھ سے کہہ دیں گے ہوائی فائرنگ ہوتی ہے، رات کو نکلنا مناسب نہیں...... ساحل پر تماش بینوں کو دیکھتے ہوئے جانا مناسب نہیں...... پھر مناسب کیا ہے؟ خواب دیکھنا...... ویسے میں نے سالِ نو پر ترقی کے خواب دیکھے ہیں۔ ہاں اگر ایسا ہو گیا تو گھر میں ایک پارٹی ارینج کروں گی۔ مجھے پتا کہ آپ ہمیشہ کی طرح مجھے ہوٹل کا مشورہ دیں گے لیکن گھر کا۔۔۔ ڈرائنگ روم / جو میں نے جدید انداز سے سیٹ کیا ہے اس کا پتا لوگوں کو کس طرح چلے گا اور ہاں اب کی

''تم ہمارے درمیان آنے کی کوشش مت کرو۔ مجھے اولاد کے سامنے بے بس اور مجبور ہو جانے والدین سے سخت نفرت ہے۔ یہ جو تمہاری ماماتا ہے ناں، سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ جذبات میں بہہ جانے والا ایسا جادو جو گھاٹے اور خسارے کے سوا اولاد کو اور کچھ نہیں دے سکتا۔ نہ مادی فائدہ نہ ہی دینی اور دنیاوی فائدہ اور نفع...... اپنے اندر سے اس ماماتا کی مضبوط جڑوں کو اکھاڑ پھینکو...... اور سخت ہو جاؤ اگر اولاد کا بھلا چاہتی ہو تو...... اس نامراد کو تمہارے اسی بے جا لاڈ پیار نے ایک دھیلے کا نہیں چھوڑا۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولے۔

''توبہ! صبر نام کی ہلکی سی رمق بھی آپ میں نہیں ہے۔ بیچارے کی آتے ہی ایسی درگت بنا ڈالی ہے آپ نے کہ وہ خود ہی یہاں سے چلا جائے گا۔ اور پھر میں زہر کھا کر مر جاؤں گی۔'' وہ بھی غصے سے بولی۔

''اس نامراد کو زہر دو...... پھر خود کھانا۔'' وہ دھاڑے اور ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر جڑ کر اپنے ہاتھ...کو پُرملال نظروں سے دیکھتے ہوئے لاؤنج سے باہر نکل گئے۔ آئزک حالات کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا مگر وجوہات سے بے خبر سب کو حق دق دیکھے جا رہا تھا۔ سعود کے چہرے پر پریشانی کے ساتھ ندامت ہویدا تھی۔

عالیہ گال سہلاتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ نمرا وہاں موجود نہیں تھی...... لیکن ابو کا تمام ردِعمل اور ہیجانی کیفیات اس کے دل و دماغ میں ہلچل مچانے اور آہ و بکا کرنے کے لیے کافی تھیں۔ ماں کے لیے وہ تڑپ اٹھی تھی۔ اس کے آنسو گرتے جا رہے تھے۔ عالیہ کمرے میں سرتاپا لرز رہی تھی۔ وہ خود اپنی اس کیفیت سے ناآشنا تھی کہ وہ شوہر کی توہین کی وجہ سے یا بیٹے کی ناگفتہ بہ حالت کی وجہ سے ایسی وحشت کا شکار ہو گئی ہے۔ وہ واش روم میں ٹھنڈے پانی کے چھینٹے اپنے چہرے پر مارتے ہوئے روتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

''ایکسکیوزمی......!'' بھاری مردانہ آواز پر اس نے چونک کر سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ سر عادل اس کے سامنے کھڑے تھے اور اسے انہماک سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔

''سر آپ......!'' وہ استفہامیہ لہجے میں کہتے ہوئے احتراماً کھڑی ہو گئی۔

''یس نمرا...... اِف یو ڈونٹ مائنڈ......'' وہ کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا یہاں بیٹھنے کی اجازت ہے؟''

سال میں اپنی سالگرہ شاندار طریقے سے کروں گی۔ کتنے دن ہو گئے ہیں اپنے میکے والوں کی کوئی دعوت نہیں کی ہے۔ ویسے اس مرتبہ آپ مجھے تحفے میں ویسا ہی سیٹ دیجیے گا جو پچھلے سال بھابی نے پہنا تھا۔ جب ان کے میاں دلا سکتے ہیں تو میرے میاں کیوں نہیں...... اچھا سنیں اس سال گاڑی کا ماڈل بدل دیں گے۔ مسز نمیرہ احتشام کے میاں ہر سال نئے ماڈل کی گاڑی بیوی کو خرید کر دیتے ہیں۔ اب دیکھیں ناں بالوں کا رنگ بھی بدل رہا ہے، کالے سے بال سفید ہو رہے ہیں۔ اس سال میں بال ڈارک براؤن کرالوں گی۔ ہیر اسٹائل سے بندہ اسمارٹ لگتا ہے۔ مسکرانے کی ضرورت نہیں ابھی کوئی خاص ایسا بڑھاپا بھی نہیں آیا ہے۔ کل ہی تو مسز شمشاد نے کہا کہ سیما تم پرنسپل نہیں لیکچرر لگتی ہو۔ قسم سے مجھے وہ بہت اچھی لگیں، جی چاہا پیشانی چوم لوں۔ ذرا جلدی سے رسالے میں دیکھ کر بتائیں عقرب اور اسد کے لیے یہ سال کیسا رہے گا؟ ارے میرا تو خط ابھی خواہشات کی طرح ادھورا ہے اور میاں جی کہ خراٹے گونجنے لگے اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے اپنی خواہشات کو لانگ پلے کے بجائے قسط وار کر دینا چاہیے۔ آخر کو سالِ نو کے 365 دن ہیں، ہر دن کے آغاز پر نئی امنگ، نئی صبح، نئی آرزو نئی امید، میں صبح کی پہلی کرن اپنے میاں کے نام کرتی ہوں کہ آپ کے خراٹے یونہی میری نیند کے دروازے پر دستک دیتے رہیں اور میری آنکھیں عالمِ بیداری کے ساتھ ان کے چہرے کا طواف کرتی رہیں۔ آمین

''وائے ناٹ سر...... پلیز آپ تشریف رکھیں۔'' وہ اس سے پرے ہٹتے ہوئے بولی۔

''آپ بھی تشریف فرمائیں۔'' وہ شگفتہ لہجے میں مذاقاً بولا۔ تو وہ تذبذب کے عالم میں اسے دیکھنے لگی۔

''کیا پڑھ رہی ہیں آپ؟ ذرا ہم بھی تو دیکھیں۔ ہر بار ٹاپ کرنے کے بعد اپنے رقیبوں میں اضافہ کرنے کی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔'' وہ نہایت اپنائیت سے بول رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے بے تکلفانہ لہجے پر غور کرنے لگی۔

''رٹے کا کمال ہے سر...... ورنہ میں اس قابل کہاں...... عام سا ذہن ہے میرا۔ بس کچھ میٹریل اکٹھا کر رہی ہوں۔'' وہ ہلکا سا مسکرا کر بولی۔

''ویری نائس...... اس مصنف کا جواب نہیں۔ کیا برین تھا اس کا۔ کیا مثبت سوچ تھی اس کی۔'' وہ کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولا۔ گفتگو کو طوالت دینے کا اِک بہانہ تھا۔ ''ہماری لائبریری میں دنیا کے بہترین authors (مصنفوں) کی کتابیں موجود ہیں مگر بدقسمتی سے پڑھنے والوں کا فقدان ہو گیا ہے۔ میڈیا اور انٹرنیٹ نے لوگوں کے مطالعے کے انداز بدل ڈالے ہیں۔ بات تو خوب ہے کہ ہر انفارمیشن پل بھر میں انٹرنیٹ سے مل جاتی ہے۔''

''یس سر...... کچھ ایسا ہی ہے۔ آپ نے درست فرمایا ہے۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''آپ کو کتاب ہاتھ میں لے کر پڑھنا پسند ہے کہ اسکرین مزہ دیتی ہے؟'' وہ اسے گہری نظروں سے دیکھ کر بولا۔

''دونوں طریقے ہی درست ہیں۔ مقصد پورا ہونا چاہیے۔'' وہ نپے تلے الفاظ بول کر سوچ میں پڑ گئی کہ آج سر آپے سے کچھ باہر لگ رہے تھے جو سوال پر سوال کیے جا رہے تھے۔ اسی اثنا میں لائبریری میں آفس بوائے داخل ہوا۔ اور مؤدبانہ انداز میں ان کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

''دو کافی......'' سر عادل نے دو انگلیوں کے اشارے سے کہا۔

''سر مجھے کافی پسند نہیں ہے۔ آپ اپنے لیے منگوا لیجیے۔'' اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''چائے تو ہر ایک کی دوست ہے ہر بھلے اور برے وقت کی ساتھی...... اب اس سے انکار مت کیجیے گا۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''سوری سر...... میں چائے کی بھی شوقین نہیں...... آپ تکلف میں......''

''تکلف میں ہے تکلیف بہت اور تکلیف میں ہے لذت بہت......'' وہ اس کی بات کے مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑا تو وہ اچنبھے سے اسے دیکھنے لگی۔

''خواہ مخواہ ہی فری ہونے کی کوشش کررہا ہے، کم عقل کہیں کا۔'' یہ نظروں سے ہضم کرنے کے بعد کا اسٹیپ اسے ہراساں کرگیا تھا۔

''ویل ایجوکیٹڈ لوگ پسند اور ناپسند کے اسیر ہوکر زندگی کی رنگینیوں کو گنوایا نہیں کرتے۔ سب کچھ جائز اور درست ہوتا ہے۔ زندگی کے کامیاب حصول کے لیے۔'' وہ نہایت راز داری کے انداز میں بولا تو نمرا کے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

''کیسا عجیب انسان ہے کہ چند لمحوں کی سرسری سی ملاقات میں اپنے خیالات میرے ذہن میں انڈیلنے والا یہ کون ہوتا ہے۔'' وہ فہمائشی انداز میں اسے دیکھنے لگی۔ ''خواہ مخواہ راہ چلتے سلام میں تیرا مہمان جسٹ اگنور ہم...... ذرا اس کی بے باکی اور بے تکلفانہ پن تو کوئی ملاحظہ فرمائے۔'' اس کی تیوری چڑھ گئی۔ پیشانی پر بل ناگواری کی غمازی کررہے تھے۔ جنہیں عادل محسوس کیے بنا نہ رہ سکا۔ اسے تذبذب کے عالم میں دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔

''لڑکیاں تو مجھ سے بات کرنے کے لیے بے چین ہوتی ہیں۔ بہانے بنا کر میرے آفس کے چکر لگاتی ہیں اور یہ محترمہ بیزار نظر آرہی ہے۔ میں بھی جب تک تمہیں رام نہیں کرلیتا، چین سے نہیں بیٹھوں گا۔'' وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے سوچنے لگا تو نمرا جانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔

''بیٹھ جائیں۔'' لہجہ تحکمانہ تھا۔ وہ پھر فہمائشی انداز میں اسے دیکھنے لگی۔ کیونکہ اس کے ایکسپریشنز بالکل بدل چکے تھے۔

''خواہ مخواہ تم سے جھگڑا مول لینے کی تک نہیں بنتی۔ تم تو مجھے ہر سمسٹر میں فیل کردوگے۔ کیونکہ ایسا کرنے کے اختیارات تمہارے ہاتھ میں جو ہیں۔ بدقسمتی ہے میری کہ تمہاری نظر کرم مجھ پر آکر رک گئی۔ خدا کے لیے اپنی نظروں کو ادھر اُدھر گھما کر تو دیکھو...... کیسی کیسی اسٹائلش اور امیر کبیر گھرانے کی لڑکیاں تمہیں نظر آئیں گی۔ مجھ میں کیا رکھا ہے؟ ایک مڈل کلاس لڑکی جس کا حسن بھی چند دنوں کا مہمان ہے۔ جسے برقرار رکھنے کی مجھ میں استطاعت ہی نہیں۔'' وہ خود پر قابو پا کر بیٹھ گئی۔ اور وہ مسلسل آنکھیں جھپکتے ہوئے سوچے جارہا تھا۔ کافی دیر بعد انگلیاں مروڑتے ہوئے بولا۔

''گڈ گرل......!'' وہ ذرا سا مسکرایا۔ اسی اثنا میں کافی اور فریش جوس ٹرے میں رکھے آفس بوائے ان کے قریب پہنچ گیا۔ عادل نے سرعت سے جوس کا گلاس اٹھا کر نمرا کے سامنے رکھ دیا اور خود کافی کا مگ اٹھا کر چسکی لے کر نہایت تسلی بخش لہجے میں بولا۔

''گڈ کافی......! نمرا تم ٹرائی تو کرو۔'' وہ مگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے نہایت اپنائیت سے اسے دیکھنے لگا۔

''پاگل کہیں کا!'' اس نے جوس کا گلاس اٹھا کر اسے مضحکہ خیز نظروں سے گھورا تو وہ نادم ہونے کے بجائے خود اعتمادی سے بولا۔

''کم آن...... کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہ سب دقیانوسی اور پرانے زمانے کی باتیں ہیں۔ ہم آج کے ماڈرن دور کے ترقی یافتہ اور ویل ایجوکیٹڈ نمائندے ہیں۔ تعلیم ہمیں طرزِ نو کے تمام بند رستوں سے روشناس کراتی ہے۔ اگر خواتین نے ہمارے شانہ بشانہ چلنے کا عہد کرہی لیا ہے تو پھر ان تمام سوچوں سے باہر نکلنا ہوگا۔''

''سر تعلیم ہمیں اپنے دینِ اسلام کے قانون سے روشناس کراتی ہے، نامحرم کے ساتھ پڑھنے اور کام کرنے کی تمام مقرر کردہ حدوں کا درس دیتی ہے۔ ماڈرن اور ایڈوانس تعلیم کا مقصد ذہن و قلب کو فراخ و وسیع کرنا، غور و خوص کرنا اور اس ذات کو پہچاننا ہے جس نے ہمیں شعور جیسی نعمت سے نوازا ہے۔'' وہ احتراماً لہجے کو دھیمے انداز میں رکھتے

ہوئے بولی۔ ''میری زندگی خوشیوں کا گہوارا ضرور ہوگی سر کیونکہ مجھے آج کے اصولوں سے نہیں پرانی قدروں سے لگاؤ ہے۔ آپ میری فکر مت کریں، ہر انسان اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی تگ و دو میں شب و روز مصروف ہے۔ بحیثیت مسلمان ہمیں اپنی زندگی کو اسلامی اصولوں کو مدِنظر رکھ کر اپنی پسند سے گزارنے کے پورے اختیارات سونپے گئے ہیں۔ جن کے بارے میں کم از کم میں تو بخوبی واقف ہوں۔ گھر میں بیٹھی ہوئی اِک عام عورت تو اس کلچر کے اتار چڑھاؤ کے مطابق خود کو مرد کی پراپرٹی تصور کرنے لگتی ہے اور اس کے ہر طرح کے ظلم و ستم کو سہنے کے لیے خود کو تیار کر لیتی ہے۔ یہ زیادتی ہے سر، میں اس بے انصافی کے خلاف ضرور آواز اٹھاؤں گی۔ ہماری عورت کو اتنی شُدبُد ہونی چاہیے۔'' وہ تیزی سے بولتی چلی گئی۔

''ویری نائس...... تمہارے خیالات سن کر خوشی ہوئی۔'' وہ بہ مشکل بولا اور اپنی ممی کی بے بسی اور بزدلی پر نالاں سا ہوتا ہوا کافی پینے لگا۔ نمرا نے بھی جوس کا گلاس اٹھایا اور اٹھ کر کاؤنٹر پر صرف جوس کی پے منٹ کر کے وہاں سے باہر نکل گئی۔ عادل اس توہین آمیز رویے پر تلملا کر رہ گیا۔ اور ایک سوال اس کے ذہن میں انتشار پھیلاتا رہا... ''ممی کا ڈیڈی سے سلوک اور رویہ بہتر ہے کہ اس لڑکی کا...... جس کی نظر میں مرد اسی جیسا ہیومن بینگ ہے۔ دیوتا یا بھگوان نہیں کہ بیوی اسی کے چرنوں میں سر جھکائے بیٹھی رہے۔ آئی تھنک اس کے خیالات بہت جائز...... قابلِ قبول اور قابلِ تحسین ہیں۔'' وہ گہری سوچ میں چلا گیا۔ ''مگر یہ لڑکی ہے بہت مغرور اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتی ہے، کیا ہر لڑکی افلاطونی ہوتی ہے، اس کو تو میں راہِ راست پر لا کر ہی چھوڑوں گا۔ اور حاضر جواب ایسی کہ میری کہی ہوئی بات میرے ہی منہ میں واپس ڈال کر کیسے فرار ہوئی ہے یہاں سے، کچھ بھی ہے مگر ہے لاجواب...... کہاں وردہ اور کہاں یہ no companson''



''آپ خوش ہو جائیں، دنیا بھر میں شیرینی تقسیم کیجیے۔'' عالیہ نے...... ٹی وی دیکھتے شوہر کو طنزیہ لہجے میں کہا۔ تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

''کس خوشی میں شیرینی تقسیم کروں بھئی؟''

''سعود مع اپنے سامان اور دوست کے یہاں سے جا چکا ہے۔'' وہ غصیلی نظروں سے انہیں دیکھ کر بولی۔

''خس کم جہاں پاک...... سچ مچ مٹھائی تقسیم کرنے کا مقام ہے۔'' وہ اسی بے پروائی سے بولے۔

''جوان بچے کے ساتھ جو آپ نے کیا ہے ناں سراسر بے جا اور ناجائز تھا۔ کیا اسے گرفت میں لانے کا یہی صحیح طریقہ تھا یا صرف جذبات اور اپنے بڑے پن کا تعلق تھا؟'' وہ تلملا کر بولی۔

''میں نے جو بھی کیا، تمہیں اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہونا بہت ضروری تھا۔ مجھے آسمان اور زمین کے درمیان معلق رہ کر سانس لینی نہیں آتی۔ تم بھی اسے بھولنے کی کوشش کرو...... ایسی اولاد جو باعث ندامت ہو اس کا مر جانا یا روپوش ہو جانا ہی بہتر ہے۔ ورنہ ایسی اولاد نہ جانے کتنے گھروں کی تباہی و بربادی کا باعث ہوتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کی بدکاریوں کا ہلکا سا شائبہ بھی نمرا کی آنے والی زندگی پر پڑے۔ بہت اچھا ہوا وہ خود ہی یہاں سے چلا گیا۔ دعا کرو کہ اب وہ ہمیں اپنی شکل دکھانے کی جرأت ہی نہیں کرے۔'' وہ نہایت سنگین لہجے میں بول رہے تھے۔ عالیہ زار و قطار روئے جا رہی تھی۔ اعصاب بری طرح اذیت میں کراہنے لگے تھے۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے اگلی سانس لینی دوبھر ہو جائے گی۔ اسی اثنا نمرا لاؤنج میں داخل ہوئی۔ وہ یونیورسٹی سے واپس آئی تھی۔ ان کے قریب آ کر دونوں کو حیرت سے دیکھنے لگی۔

''ضرور کوئی لڑائی جھگڑا ہوا ہوگا۔'' وہ بڑبڑائی تو عالیہ بہ مشکل کھڑی ہوئی۔ اس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ جیسے کمر

میں شدید درد ہو رہا ہو یا ریڑھ کی ہڈی کو سعود کے دکھ نے خم دار کر ڈالا ہے۔
''امی جی......! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں......؟'' نمرا نے بیگ ٹیبل پر رکھ دیا اور ماں کو سہارا دے کر بولی۔
''ابو جی کچھ آپ ہی بتا دیں۔ مسئلہ کیا ہے؟''
''اس نامراد نے تمہاری ماں کی کمر توڑ دی ہے۔ وہ واپس جہنم رسید ہو گیا ہے۔ اسے یہاں کی جنت میں رہنے کی عادت نہیں رہی۔'' ان کے لہجے میں پژمردگی اور شکست خوردگی تھی اور آنکھوں میں عالیہ کی حالت دیکھ کر نمی آ گئی تھی۔
''سعود چلا گیا، بغیر بتائے؟'' وہ وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔
''اس کے ساتھ ان کا سلوک و رویہ جو ایسا تھا۔ بیچارہ ایک دن میں ہی ایسا دل برداشتہ ہوا کہ واپس جانے میں ہی مصلحت جانی اس نے۔'' عالیہ بھی بیٹھ گئی۔ اس کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ لہجے میں مایوسی اور کرب تھا۔
''امی! ابو جی کا رویہ بالکل درست تھا۔ ان کی جگہ میں بھی ہوتی تو میرا ری ایکشن ان سے بھی برا ہوتا۔ وہ تو زندہ سلامت یہاں سے کوچ کر گیا۔ پریشانی کی بات نہیں۔'' نمرا نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔
''تم دونوں باپ، بیٹی ہر بات میں صرف اپنی کیوں چلانا چاہتے ہو؟ زبردستی نہ تو کسی سے عزت کرائی جاتی ہے، نہ ہی پیار وصول کیا جاتا ہے اور نہ ہی اپنی بات منوائی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے دل کو بڑا کرنا پڑتا ہے، صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے، جب اولاد جوان ہو جاتی ہے تو اس پر والدین کا اختیار نہیں رہتا۔ اسے ڈگر پر لانے کا جو طریقہ انہوں نے اختیار کیا تھا اس کا انجام یہی ہونا تھا۔'' وہ آنسو صاف کرتی رہی اور بولتی رہی۔
''بیگم! جب اسے عیاشی کے لیے یہاں سے پیسہ نہیں جائے گا تو وہ واپس ہی پلٹے گا۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تسلی دیتے ہوئے بولے۔ ''اپنوں کو چھوڑنا اتنا آسان نہیں جتنا اس نے سمجھ رکھا ہے۔ تم صبر کرو۔ بس اس کے لیے دعا کرو کہ وہ جلد از جلد راہِ راست پر آ جائے۔''
''صبر کرو...... کہنا آسان ہے، ماں سے ایسی توقع رکھنا نادانی نہیں تو اور کیا ہے۔'' وہ تلخی سے بولی۔ ''آپ کیا جانیں کہ ممتا کسے کہتے ہیں؟ پتھر ہیں آپ، بے حس اور سنگین، یاد رکھیں اگر میرا بیٹا واپس نہیں آیا تو میں آپ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گی۔ جوانی میں ایسی غلطیاں سرزد ہونا عام سا فعل ہے، آپ اپنا بیتا ہوا وقت بھول گئے۔''
''میرا بیتا ہوا وقت نہ تو ایسا تھا، نہ ہی شرابی اور نہ بے دین تھا۔ اور نہ ہی میں نے والدین کی نافرمانی کی تھی۔ ہر رشتے میں پیار کی بھی کچھ حدیں مقرر کی جاتی ہیں، تم نے تو بے غرض ممتا اور اولاد کی بے فیض اور بے حس محبت کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میری ایک نہیں سنی، اسے بگاڑ کر رکھ دیا۔ اب رونے دھونے کی ضرورت نہیں۔ سوائے صبر کے ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اس کی واپسی کا میں بھی منتظر ہوں، آخر وہ میرا خون ہے، تم کیا سمجھتی ہو کہ میرے سینے میں دل نہیں...... تم کیا جانو کہ باپ وہ واحد ہستی ہے جو اپنے بیٹے کو خود سے بڑا خود سے کامیاب دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی بڑائی پر فخر کرنے والا اس کی کامیابی پر خوشیاں منانے والا باپ ہی تو ہوتا ہے۔'' ان کے لہجے میں دکھ بھر گیا تھا۔ نمرا نے اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کی مگر وہ والدین کے کرب کو برداشت نہیں کر سکی۔ اور باپ کے سینے پر سر رکھ کر سسکیاں لینے لگی۔
''کاش میں نے بیٹے کی جگہ بیٹی کو ہی جنم دیا ہوتا تو آج ہماری زندگی ہی مختلف ہوتی۔'' عالیہ نے بیٹی کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم کتنے ناسمجھ ہیں کہ بیٹے کی پیدائش پر خوشیاں مناتے ہیں، مٹھائیاں تقسیم کرتے تھکتے نہیں اور بیٹی کی پیدائش کا سن کر ہمارے چہروں پر ندامت اور شرمندگی چھا جاتی ہے۔'' عالیہ نے لمبی آہ بھر کر کہا۔
''ہم نے نمرا کی پیدائش پر سعود سے بڑھ کر خوشی منائی تھی، تم مجھے اس بات پر الزام نہیں دے سکتیں۔'' رحمان

نے برجستہ کہا۔ ''مجھے نمرا سعود سے بڑھ کر عزیز ہے۔''

''اس میں شک نہیں...... کیونکہ ہمیں اولاد شادی کے دس بارہ سالوں بعد عطا ہوئی تھی۔ میں ان والدین کی مثال دے رہی ہوں جنہیں شادی کے نو مہینے بعد اس نعمت و رحمت سے نوازا جاتا ہے۔ وہ لڑکے کو تو زور شور سے قبول کرتے ہیں اور لڑکی کی پیدائش پر سوگ مناتے ہیں۔''

''اب ایک دوسرے کو بلیم کرنے کا وقت نہیں...... جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا...... گزرا ہوا وقت تو واپس آنے سے رہا کہ غلطیوں کی تلافی ہو سکے۔ اس وقت ہمیں یکجا ہونے اور ایک دوسرے کے جذبات کو سہارا دینے کی ضرورت ہے۔'' نمرا نے سمجھداری سے کہا۔ والدین کے دکھ میں کمی تو نہ آئی مگر دل میں ہلکی سی تسکین کی لہر دوڑ گئی۔

''ہم نے اپنی ان آنکھوں سے نیکوکاروں کی اولاد بدکار اور گناہ گاروں کی اولاد کو اعلیٰ مقام پر دیکھا ہے، سب اوپر والے کے اختیار میں ہے۔'' عالیہ نے قدرے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔

''بے شک اس کی مرضی کے خلاف ایک پتا بھی جنبش نہیں کر سکتا۔ مگر اس نے عقل تو عطا کی ہے جو خیر و شر میں تمیز کرواتی ہے۔ آزمائش کی گھڑیوں میں ہی تو ایمان کی پختگی کو میرا رب آزماتا ہے۔ اپنے ایمان کو متزلزل کرنے سے ہم اپنے لیے جنت کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیتے ہیں۔ دلی بے سکونی اور ذہنی ردوکد ہی تو دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔ جو ہمیں جیتے جی جھلسائے رکھتی ہے۔'' رحمان کے لہجے میں نرمی تھی، عالیہ نے اثبات میں سر ہلایا اور خاموشی سے اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔

''ابو جی...... آپ مجھ سے ایک وعدہ کریں۔'' نمرا نے ماں کو جاتے دیکھ کر سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

''امی کا بہت دھیان رکھیں... ان سے بلاوجہ نوک جھوک کرنا چھوڑ دیں، میری امی بہت دکھی ہو گئی ہیں، ان کا دکھ کوہِ ہمالیہ سے بھی بڑا ہے، اسے ہم بانٹ نہیں سکتے۔ کم از کم اس ٹریجڈی کا انہیں موردِ الزام ٹھہرانا تو چھوڑ سکتے ہیں۔'' نمرا نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو، میرا تم سے وعدہ ہے، آئندہ خیال رکھوں گا، تمہاری ماں جیسی عورت شاذ و نادر ہوتی ہے۔'' رحمان نے بھی آہستہ سے کہا۔ تھوڑی دیر بعد عالیہ باپ، بیٹی کے لیے چائے بنا کر لے آئی تھی۔

''اتنی پریشانی میں بھی آپ ہمیں نہ بھولیں، آئی لو یو امی......!'' نمرا نے رحم و ترس سے ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''آج بیگم کو میں چائے پلاتا ہوں اپنے ہاتھ کی۔'' وہ نہایت ملائمت سے محبت آمیز لہجے میں بولے اور صوفے سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ عالیہ حق دق انہیں دیکھتی رہ گئی۔ وہ کچن کی جانب جا رہے تھے مگر اس میں یہ پوچھنے کی ہمت ہی نہیں تھی کہ یہ تبدیلی کیسے آ گئی۔

☆☆☆

''کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟ بندے کو ڈھیٹ ہونا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ وردہ کا طوقِ غلامی میرے گلے میں ڈال دیا جائے۔ نمرا کو میری پسند کا یقین آ جانا چاہیے۔ وہ مجھے کیوں پسند ہے۔ کیا خاصیت ہے اس میں کہ میں اس کی بے توجہی کے باوجود اس کی طرف کھنچتا چلا جا رہا ہوں۔'' وہ حیرت و اشتیاق میں ڈوبا آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔ ماں کی نصیحتیں سخت ناگوار گزر رہی تھیں۔ باپ کی سنگ دلی پر سر پیٹ لینے کو جی چاہ رہا تھا۔ اتنا لمبا چوڑا مطالعہ اور اعلیٰ تعلیم کے باوجود وہ ایک کنویں کے مینڈک ہی نکلے...... جنہیں دین اور دنیا کو ایک ساتھ لے کر چلنا ہی نہ آیا۔

''کاش میرے دو چار بہن بھائی ہوتے کتنا ہی اچھا ہوتا۔ کم از کم مجھ پر ہونے والے مظالم کا بٹوارا ہو جاتا۔ اب لے دے کے واحد میں ہی ان کی نظروں کا محور ہوں۔ ممی ایک پل کے لیے مجھے خود سے جدا نہیں کرنا چاہتیں۔ بدقسمتی

سے ڈیڈی سے حقوق دلوانے میں بھی ناکام ہی رہیں۔ ڈیڈی سمجھتے ہیں کہ مانوسیت ان کے رعب اور دبدبے کو غارت کردے گی۔ اور میں اپنی ہر بات منوانے پر اڑ جاؤں گا۔ کیسی عجیب اور خودغرض سوچ ہے میرے پڑھا کو اور کتابی کیڑے باپ کی۔'' سوچتے ہوئے اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ اس نے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور ایک ہی سانس میں پی کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور وال کلاک پر وقت دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ غیر ارادی طور پر اس کے قدم لائبریری کی طرف اٹھ رہے تھے۔ امید وبیم کے جذبے میں وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

''نمرا اس وقت لائبریری میں ہی ہوگی۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ ایسا ہی ہوا۔ نمرا لائبریری کے ایک تنہا گوشے میں بیٹھی اپنا اسائنمنٹ تیار کر رہی تھی۔ وہ دور کھڑا..... گہری اور قابلِ آفرین نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ وائٹ رنگ کے ڈریس میں کسی حور سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے براؤن بال اس کے شانوں سے ہوتے ہوئے بازوؤں تک بکھرے ہوئے تھے۔ اور وہ اپنی ہی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی کہ اس کے آنے کی خبر ہی نہیں ہوئی۔ اس کی نگاہوں کی تپش نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ وہ اسے سرتا پا کھڑا گھورتا رہا اور کچھ سوچتے ہوئے نپے تلے قدم اٹھاتا اس کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ تب وہ ایک دم سے چونکی اور لاشعوری طور پر کھڑی ہوگئی۔

''آپ اپنا کام جاری رکھیں۔ میں اِدھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا کہ اپنے محنتی اسٹوڈنٹ کو ہیلو کرتا جاؤں۔'' وہ اپنی شرمندگی مٹانے کے لیے کھسیانی سی مسکراہٹ سے خود پر قابو پاتے ہوئے بولا تو وہ مسکرادی۔

''مجھے بھی لیکچر کے لیے جانا تو تھا ہی۔ میں اسائنمنٹ میں ایسی بزی ہوئی کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔'' وہ اپنے بیگ میں اپنے پیپرز ڈالتے ہوئے بولی۔ بیزاری کی چھاپ اس کے چہرے پر چسپاں ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ اندر ہی اندر کھول کر رہ گیا۔

''خود کو سمجھتی کیا ہے۔ ذرا انتظار کرو اس یونیورسٹی سے دس سال بعد بھی ڈگری حاصل نہیں کر سکو گی۔ مجھے اگنور کرنے کی سزا تو تمہیں مل کر ہی رہے گی۔ آخر ہوں تو تمہارا استاد۔'' وہ وہیں کھڑا تھا کہ نمرا سرعت سے باہر نکل گئی۔ اور وہ وہیں کھڑے کھڑے اپنا اور اس کا تجزیہ کرنے لگا۔

☆☆☆

''ممی کیا بات ہے؟ دو دن سے یونیورسٹی بھی نہیں گئیں۔ رات بھر کروٹیں بدلتی رہتی ہیں۔ طبیعت خراب ہے یا کوئی پریشانی ہے۔ مجھے فوراً بتائیں۔'' عادل یونیورسٹی سے واپس آیا تو ماں کو جس حالت میں چھوڑ کر گیا تھا اسی حالت میں دیکھ کر چونک گیا اور قریب بیٹھ کر اپنائیت اور فکرمندی سے بولا تو سائرہ آہ کو دباتے ہوئے بولی۔

''بیٹا! اسے مژدۂ راحتِ جاں سمجھ کر تمہیں انفارم کردوں یا اِک عام خبر سمجھ کر انکشاف کروں کہ تمہارے ڈیڈی نے میری ہر التجا اور تمہارے انکار کی پروا کیے بغیر تمہاری شادی کی ڈیٹ فکس کردی ہے۔''

''ممی! یہ حق انہیں کس نے سونپا ہے؟'' وہ چونک کر بولا۔

''بیٹے تمہارے والد محترم ہیں۔ اپنا حق نہیں جتائیں گے تو والد کیسے ٹھہرائے جائیں گے۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

''ممی مجھے وردہ پر بے پناہ ترس آنے لگا ہے۔ وہ بیچاری خواہ مخواہ ہی ہماری گھریلو پولیٹکس میں ذلیل وخوار ہو کر رہ جائے گی۔'' وہ دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

''تو بیٹا اسے قبول کرنے میں حرج بھی تو نہیں ہے۔ جب تمہارے ساتھ رہنا شروع کردے گی تو آئی ایم شیور تم بھی اس کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکو گے۔'' سائرہ رک رک کر بات کر رہی تھی۔

''ممی! یہ کیسی بے انصافی اور زیادتی ہے کہ جنہوں نے مجھے کبھی پیار سے بلایا نہ ہی مجھ میں کسی قسم کی دلچسپی لی انہیں

یک دم اتنا بڑا فیصلہ کرنے کی کیوں سوجھی؟ بہت حیران ہوں میں۔'' وہ حیرت اور تاسف سے بولا۔

''بیٹا! صبر کرلو اگر وردہ میں کوئی خرابی ہوتی تو کیا میں ایسا سہانا خواب دیکھتی؟ چلو یوں سمجھو کہ تم نے ماں کا خواب پورا کردیا۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر نرماہٹ سے بولی۔

''ممی! ایموشنل بلیک میلنگ نہیں چلے گی۔ میں کتنی بار بتاؤں کہ میں نے اپنے لیے پہلی دفعہ جولڑکی پسند کی ہے۔ وہی میری آخری پسند ہے۔'' وہ مستحکم انداز میں بولا۔

''بیٹا تم پہلے تو ایسے نہیں تھے۔ میری ہر بات کو قرآن کا حرف سمجھ کر آداب بجالاتے تھے۔'' وہ حیران کُن لہجے میں بولی۔

''ممی بس میں اب ایسا ہی ہوگیا ہوں۔'' وہ خفگی سے بولا۔ ''ممی لیو می الون...... میں اس موضوع پر کچھ بھی سننا نہیں چاہتا۔ آپ کیسی ماں ہیں؟ میرے لیے اسٹینڈ لینے کی آپ میں سکت ہی نہیں۔ اس قدر بزدلی آپ کی اور اس قدر ہٹ دھرمی ڈیڈی کی آپ دونوں ہی unreasonable ہیں تو ممی میں نارمل کیسے ہوسکتا ہوں؟ اس لیے مجھے ابنارمل، پاگل اور دیوانہ سمجھ کر معاف کردیجیے۔'' وہ تلخی سے بولا۔

''بیٹا! مجھ پر اور خود پر رحم کرو...... تم ڈیڈی کے غصے کو جانتے ہوئے بھی انجان بن کر خود کو بے وقوف کیوں بنارہے ہو۔ وہی کرو، جو ڈیڈی چاہتے ہیں۔'' وہ تڑپ کر بولی۔

''آپ مشرقی بیوی کا روپ تو نہایت فخر سے اپنا سکتی ہیں مگر آئی ایم سوری میں مشرقی اولاد ہوں نہ ہی سراسر مغرب سے میرا تعلق ہے۔ میں گوشت پوست کا جیتا جاگتا انسان ہوں۔ میرا تعلق اپنی ذات، اپنی پسند اور اپنے فیصلے سے ہے اور سب سے قابلِ فخر بات یہ ہے کہ زندگی کے نشیب و فراز کی شد بد آپ نے مجھے بخشی ہے۔ آپ نے کتنی بار اس خواہش کا اظہار حسرت بھرے لہجے میں کیا ہے کہ مجھ میں فیصلہ کرنے کی قوت اور اس پر ثابت قدم رہنے کی ہمت کی بہت کمی ہے۔ اب میں آپ کی دیرینہ آرزو پوری کرنے نکلا ہوں تو آپ ہی رکاوٹ بننے لگی ہیں۔'' وہ سنجیدگی سے سمجھاتے ہوئے تقریباً تڑپنے لگا تھا۔

''بیٹے بعض فیصلے حالات کے پیشِ نظر بدلنے پڑتے ہیں، ارادوں کی پختگی میں بھی لچک کی گنجائش رکھنی بہت ضروری ہوتی ہے۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''ممی! آپ چاہے دنیا کو اِدھر سے اُدھر کردیں۔ زمین، آسمان یکجا کردیں۔ ڈیڈی آپ کے ان واحد چائلڈ کو جنم دینے کی غلطی کو معاف نہیں کریں گے۔ اس لیے میرے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے سے آپ کے marit al status میں رتی بھر فرق آنے والا نہیں...... اس سے بڑھ کر وہ آپ پر اور کیا ظلم کرسکتے ہیں۔ دربدر کردیں گے تو ہم ماں بیٹا اسے قبول کرلیں گے۔ ہم ان کے محتاج نہیں ہیں۔'' وہ قہر آلود لہجے میں بولے جارہا تھا۔

''ہم ان کے محتاج اور رحم و کرم کے غلام کبھی نہیں تھے۔ بیٹا دنیا والوں کو تماشا دکھا کر ہم کچھ حاصل نہیں کرسکیں گے۔ بیٹا اسی معاشرے میں ایسی عورتیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں، جن کی حیثیت نوکرانی سے کم نہیں۔ ان کے شوہر۔ ہر قسم کی، عیاشی ان کے سامنے انہی کے گھروں میں بے باکانہ طریقے سے کرتے ہیں اور وہ بظاہر آنکھیں بند کیے برداشت کیے جاتی ہیں۔ میرے ساتھ ایسے مسائل نہیں ہیں بیٹے، میں تو اس راجدھانی کی ملکہ ہوں۔'' وہ بھرائی آواز میں بولی۔

''ایسے تو نہیں کہتا کہ آپ نے زندگی میں ہمیشہ ہی تھوڑے کو قارون کا خزانہ سمجھ کر صبر کرلیا۔ لیکن مجھ سے ایسی توقع مت رکھیے گا۔ ورنہ مجھے خود وردہ سے ریکوئسٹ کرنی پڑے گی کہ میری جان چھوڑ دے کسی اور طرف نظر گھمائے، اسے ہزاروں چاہنے والے مل جائیں گے۔'' وہ کڑواہٹ سے بولا۔

''بیٹا......! وردہ کے بارے میں ایسی نازیبا باتیں مت کرو۔ تم جانتے ہو کہ وہ مجھے بہت پیاری ہے تمہاری

طرح...... رشتہ ہونا یا نہ ہونا تو مقدر کے کھیل ہیں۔'' وہ افسردگی سے بولی۔
''اگر آپ میری بات سنیں اور ڈیڈی کے فیصلے کو غلط قرار دے کر ریجیکٹ کر دیں تو ایسی باتیں کرنے کی نوبت نہیں آئے گی۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولا۔
''بولو...... تفصیلاً بتاؤ کہ کس نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔'' وہ چڑ کر بولی۔
''ممی مجھے یونیورسٹی میں ایک لڑکی پسند آ گئی ہے۔ بہت سلجھی ہوئی، دھیمے مزاج کی اور حسن میں بھی.... بے مثال...... خدا کا شکر ہے آپ کی طرح، ہائی آئی کیو لیول سے اس کا دور پار کا بھی واسطہ نہیں.......... نہ تو میں ڈیڈی جیسا ہوں نہ ہی وہ آپ جیسی ہے۔ ہم نارمل، گھنٹوں رٹا لگانے والے کبھی چیٹنگ سے کامیابی حاصل کرنے والے اور بعض اوقات اپنے ایگزام میں فلنک ہونے والے اسٹوڈنٹ ہیں...... ایسے ہی لوگوں کی زندگیوں میں خوشیاں بے بہا اور دکھ کم ہوتے ہیں۔'' وہ ماں کے سامنے مؤدبانہ انداز میں بیٹھا ہوا نہایت احترام سے بات کر رہا تھا۔ سائرہ خاموش تھی۔ جیسے سکتے میں چلی گئی ہو۔ چند لمحے خاموشی طاری رہی۔
''تم ہائی آئی کیو لیول کے بچے نہ ہوتے تو سب کے رُل گئے ہوتے۔ میرا سر قلم کر چکے ہوتے...... تم خود کو کیا جانو؟'' وہ دل میں ہی سوچ کر رہ گئی۔
''ممی......! خوشیوں کی تلاش بچپن سے ہی میری شخصیت کا اہم حصہ رہی۔ اب میں نے نمرا میں ان تمام خوشیوں کو پایا ہے۔ ڈیڈی کو چھیننے کی اجازت نہیں دوں گا۔ ممی آپ دیکھ کر اس سے مل کر خوشی سے پھولی نہیں سمائیں گی۔ آئی لو ہر۔'' لہجہ مستحکم تھا۔ ''آپ کو میری پسند اور میرے فیصلے پر فخر ہوگا۔''
''کیا وہ بھی تم سے پیار کرتی ہے؟'' وہ اچنبھے سے بولی۔
''آئی ڈونٹ نو...... میرا خیال ہے کہ وہ اس اسٹیج سے ابھی بہت دور ہے۔ کیونکہ میں اس کا استاد ہوں۔ وہ مجھ سے قدرے خوفزدہ بھی رہتی ہے۔ احترام بھی بے تحاشا کرتی ہے۔ اس لیے ہمیشہ مجھ سے کتراتی ہے۔ مجھے اظہار کرنے کا موقع ہی نہیں دیتی۔''
''یہ بات تو ہے...... لیکن بیٹا جی میرا اپنا خیال ہے بلکہ اپنے تلخ تجربات کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہ یکطرفہ محبت کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ میں تمہارے ڈیڈی کی محبت میں گرفتار نہیں ہوئی تھی نہ ہی مجھے ان کی محبت کی حدت کا احساس ہوا تھا۔ اسٹوڈنٹ اور ٹیچر کا رشتہ بہت مقدس ہوتا ہے۔ تم نے اس کی شخصیت اور عادات سے پیار کیا ہے جو اصل محبت ہے، حقیقی چاہت و راحت ہے۔ اس لیے اس کی رضامندی ضرور لے لو۔ بہت ضروری ہے، تم اسے اپنی عینک سے ویسا ہی دیکھ رہے ہو، جیسا تم تصور کرتے ہو۔ ہوسکتا ہے فطرتاً اور مزاجاً وہ ویسی نہ ہو۔ تمہارے ڈیڈی کی مثال تمہارے سامنے ہے، میں اور وہ سمندر کے دو کنارے نکلے...... جس کے نتائج تمہارے سامنے ہیں۔ میری ہر کوشش کے باوجود ہم دونوں کے درمیان بیکراں فاصلہ ہے اور تم بیچ منجدھار میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے جب ایک کنارے پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہو تو تھکن سے نڈھال ہو کر امید و بیم سے دوسرے کنارے کی جانب چل پڑتے ہو پھر رسائی نہ پا کر مضطربانہ حرکتوں سے خود کو مطمئن کرنے کی ناکام کاوش میں گم ہو جاتے ہو۔ افسوس کہ میں اور تم اس فاصلے کو مٹا نہیں سکے۔ ہم دونوں اپنی، اپنی جگہ براجمان ہیں کیونکہ انہی کناروں سے سمندر کی حیات وابستہ ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تاریخ دہرائی جائے۔'' وہ فکرمندی سے اسے سمجھنے لگی۔
''ممی ہم سمندر کے کنارے نہیں ہیں، وہ سورج ہے تو میں چاند ہوں، جو اس سے روشنی لے کر چمکتا ہے اور بعض سچویشنز میں، میں سورج ہوں، وہ چاند ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوں گے۔'' عادل نے سرشار ہوتے ہوئے کہا۔

''بیٹا......! مجھے تمہاری باتوں سے اتفاق ہے۔ سب سے پہلے اس کے دل میں جھانکنے کی کوشش تو کرو۔ پھر اگلا قدم اٹھائیں گے۔ تم دونوں کی انڈر اسٹینڈنگ کے بغیر کچھ بھی ہونے والا نہیں۔ اگر بالفرض ڈیڈی رضامند ہو بھی گئے...... تو میں مخالفت کروں گی کیونکہ شادی یکطرفہ پسندیدگی و محبت سے نہیں ہونی چاہیے۔ ویسے سوچو کہ وردہ میں کس چیز کی کمی ہے، خدمت گزار ایسی کہ مشکل وقتوں میں عصمت آپا نے میرا ساتھ نہ دیا ہوتا تو آج میں کسی پاگل خانے میں زنجیروں میں جکڑی ہوتی...... نہ تم ہوتے نہ ہی تمہارے ڈیڈی کا نام و نشان ہوتا۔'' وہ ممنونیت سے بولی۔ ''تم جانتے بھی ہو کہ تمہاری ماں تمہارے لیے جو بھی فیصلہ کرے گی بہترین ہوگا۔ اب بے یقینی کیوں ہے؟''

''ممی! یہ چیلنج ہے، آپ ہر حال میں میرا ساتھ دیں گی۔ ورنہ خونخوار جنگلی درندہ بن جاؤں گا۔ اور سب سے پہلے ان تمام ڈگریوں پر حملہ آور ہو کر اس کا ثبوت پیش کروں گا اور اس کے بعد...... اس کے بعد جنگلوں میں نکل جاؤں گا۔ وہاں جو انسان نظر آیا اسے لقمۂ اجل بنا دوں گا۔'' وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

''صبر، صبر، خود پر اور اپنے الفاظ پر قابو رکھو...... جانتے ہو ان بے تکی باتوں کا مطلب؟ آئی تھنک تمہیں اندازہ نہیں کہ تم نے کیا کہا ہے؟'' وہ خفگی سے بولی۔

''جانتا ہوں ممی! اب میں خود پر زیادتی نہیں ہونے دوں گا۔ انتقام کی آگ کو ٹھنڈا رکھنا میرے بس میں نہیں رہا۔ میرا انتقام ڈیڈی کے ہر فیصلے سے انکار پر منحصر ہے، میں نے آپ کی ہر خواہش کا احترام کیا۔ دن کو رات کہا۔ ڈیڈی کی نظروں میں اپنی ذات کو منوانے کے لیے آپ کے اور اپنے دن، رات کا سکون غارت کیے رکھا اور پھر ایک دن فخر و غرور سے ایک اَن وانٹڈ چائلڈ کے لیبل کو مٹانے کے لیے آپ مجھے ڈیڈی کے لیول پر لے کر آئیں مگر پھر بھی میری پیشانی سے وہ لیبل نہیں اتر سکا۔ اب میں اس لیبل کو اتار دوں گا۔ اپنی تابعداری اور فرمانبرداری سے نہیں، درشتگی اور سختی سے۔ ممی آپ کو میرے رستے سے ہٹنا ہوگا۔'' وہ زہر آلود لہجے میں بولا۔

''بیٹا اتنی تلخی اور کڑواہٹ شخصیت کو داغدار کر دیتی ہے۔ اسے اپنے اندر ہی دفن رہنے دو۔ ہوا دی تو ہم دونوں میں بھی لامتناہی فاصلے حائل ہو جائیں گے۔ ہمارے رب العزت کو اور نبی پاکؐ کو بھی عاجزی و انکساری پسند ہے۔ ہمارے ہاں درندگی اور بے رحمی کا کوئی تصور نہیں۔ میں نے تمہیں سنگل پیرنٹ بن کر پروان نہیں چڑھایا۔ میں آج بھی تمہاری ماں اور باپ کے کردار میں تمہارے ساتھ کھڑی ہوں۔ بس تم حوصلہ پکڑو اور صبر کرو...... اگر تمہارے ڈیڈی کو سمجھانے میں، میں کامیاب ہوتی تو آج ہماری زندگی ہی مختلف ہوتی۔ مگر بیٹا بہت افسوس ہوا ہے تمہارے خیالات سن کر...... میں سمجھتی رہی کہ میرے پیار اور توجہ نے تمہارے انگ، انگ میں چاشنی بھر دی ہوگی اور تم ایک مکمل اور بھرپور شخصیت بن کر اپنی زندگی لیڈ کرو گے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ میری تمام محنت ہی اکارت گئی۔'' وہ پژمردگی سے بولی۔ ''بولو کہ تمہیں آج تک کسی کمی کا احساس ہونے دیا ہے میں نے؟ جو تمہارے وجود میں پرلے درجے کی شقاوت، نفرت اور سنگدلی کا ایک بیج نہیں بے حساب بیج موجود ہیں جو وقت کے ساتھ کونپلیں نکال رہے ہیں۔ انہیں یہیں دبا دو بیٹا...... ورنہ زندگی حسرتوں اور پچھتاوؤں کی آماجگاہ سے نکل نہیں پائے گی۔''

''ممی! آپ نے میری شخصیت کا ظاہرانہ فساد تو بہت پُرکشش اور دلنشین بنا دیا۔ مگر میرے باطن میں پوشیدہ ان حسرتوں، تمناؤں اور خواہشوں تک آپ کی رسائی نہ ہو سکی۔ اس لیے مجھے آپ آسمانی مخلوق سمجھ کر اپنی توقعات مجھ سے وابستہ نہ رکھیں۔ میں انہی خامیوں کچھ خوبیوں کی آمیزش سے بنایا ہوا ایک گناہ گار اور ادھورا سا انسان ہوں اگر مجھ میں انتقام، بدلہ، غصہ اور احتجاج کرنے کی حس موجود ہے تو اٹ از اے نارمل تھنگ...... آپ کو یہ قبول کرنا پڑے گا۔'' وہ دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں نے ہر وقت خود کو بہترین پیش کرنے کی کوشش میں خود پر جبر کیا...... ممی اب مجھ سے ایسی بے ہودہ ایکٹنگ کی امید مت رکھیں۔ غور سے سن لیں کہ اب میں نہ تو آپ کی بات مانوں گا، نہ ہی

آپ کے شوہر کی طرف سے آنے والے احکامات پر راضی برضا ہو کر اپنی تابعداری کا اظہار کروں گا۔ وہ کروں گا جو میرا دل چاہے گا۔‘‘

’’یہاں رہتے ہوئے تو تم ایسا نہیں کر سکو گے۔‘‘ سارہ رو پڑی۔

’’آپ میں بھی خود غرضی ہے مام...... اپنی خوشی کی خاطر مجھ پر محنت کی تھی، اب میری خوشی کی خاطر جوائن می می...... پلیز ممی...... ڈیڈی کو سمجھائیں، اگر انہیں ہمیشہ کی طرح ہماری بات سمجھ نہیں آتی تو ہم انہیں چھوڑ کر اپنی نئی دنیا بسالیں گے۔ انہیں تنہائی کی مار دیں گے۔ پھر انہیں ہماری قدر آئے گی۔‘‘ وہ پل بھر میں خوشامدانہ انداز میں بولنے لگا تو اس نے تاسف بھری نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔

’’انہونی باتیں مت کرو۔ جسے میں نے تمام زیادتیوں کے باوجود نہیں چھوڑا۔ تم کس خوش فہمی میں ہو کہ عمر کے اس حصے میں ان سے کنارہ کشی اختیار کرلوں گی۔ بیٹا ان ڈگریوں سے میں نے صبر و شکر ہی تو سیکھا ہے۔ مجھے اپنے گرد و پیش بسنے والوں کی زہر آلود باتوں، طنز اور تمسخرانہ حرکتوں کی پروا تھی جو کسی سے اپنا دکھ درد بیان نہ کیا۔ تمہیں سوشل سرکل میں رہ کر پروان چڑھایا۔ اور تمہیں اِک بہترین انسان بنانے کی تگ و دو میں لگی رہی تاکہ تم ہر قسم کی ذہنی، جسمانی اور روحانی بیماریوں سے دور رہو۔ اور اپنی زندگی کے ترازو میں توازن رکھ سکو۔ تمہیں ہر سرگرمی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے پر آمادہ کرنے کا اِک مقصد تھا۔ کیا میری تمام کارکردگی میں خود غرضی تھی؟‘‘ وہ استفہامیہ لہجے میں کہنے لگی۔

’’ممی آپ کا لیکچر یونیورسٹی تک محدود رہے تو بہتر ہے۔ میں نے اپنی آنکھ کھولی تو کانوں میں آپ کے لیکچر کی تلخیاں ہی انڈیلی ہیں۔ یہی تلخی اور کڑواہٹ میری نس، نس میں سرایئت کرگئی ہے۔۔ تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔‘‘ وہ نہایت درشتگی سے کہہ رہا تھا۔

’’خدا کا شکر ہے کہ آج کی گفتگو سے تمہاری پرسنالٹی کے بہت سے پہلو مجھ پر عیاں ہوگئے۔ تمہارے نظریات کی روشنی میں پہلے کی نسبت اب کئی تاریک راہیں صاف اور واضح نظر آنے لگیں۔ آج مجھے یقین ہو چلا ہے کہ اولاد پالنے کے لیے ماں اور باپ دونوں کی ہم آہنگی کتنی اہم ہے۔ نہ تو باپ، ماں کی جگہ لے سکتا ہے اور نہ ہی ماں، باپ کے کردار میں خود کو فٹ کرسکتی ہے۔ آئی ایم سوری...... میں ہی غلطی پر تھی۔ تمہیں ڈگریاں تو دلوا دیں مگر تمہاری روح کی بہتر افزائش نہ کرسکی۔ تمہاری بیمار روح کی نگہداشت نہ کرسکی۔ میں اسی خام خیالی میں رہی کہ تم اپنی متوازن زندگی کے شکر گزار رستے کے پُرسکون اور پُرتسکین مسافر ہو۔‘‘ سائرہ کے لہجے میں حد درجے کی مایوسی و اداسی تھی۔

’’میں نے زندگی میں صبر و شکر کرنا ہی تو سیکھا ہے، ممی یہ دونوں جان لیوا بیماریاں ہیں کسی کینسر کی طرح...... جنہوں نے مجھے اندر سے کھوکھلا کر ڈالا ہے۔ نہ سوچ میری اپنی ہے نہ ہی کسی ارادے پر اختیار ہے، نہ ہی کوئی فیصلہ کرنے کی سمجھ ہے مجھ میں...... میں کیا ہوں؟ ممی اِک روبوٹ، ممی خدا کے لیے مجھے اس عذاب سے نکلنے کا موقع تو دیں۔ میری زندگی کا پہلا فیصلہ اور اہم فیصلہ میں خود کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ وہ ناگواری سے ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ’’میں بے انصافی یا زیادتی قطعاً نہیں کر رہا۔ اپنے حقوق مانگ رہا ہوں۔‘‘

’’یعنی تم بھی مجھ سے برگشتہ ہوگئے۔ تمہیں میرے تمام اعمال کے پیچھے خود غرضی نظر آئی۔ تم میری تربیت سے فیضیاب ہونے کے بجائے جاہل، اناڑی اور نادان ہی رہ گئے۔ بیٹا! اب میں تم پر کسی قسم کا کوئی حق نہیں رکھتی۔ کوئی دعویٰ نہیں کروں گی۔ کسی قسم کا مان نہیں جتاؤں گی۔ کیونکہ میں اس محاذ پر بری طرح ناکام ہوگئی ہوں، تمہیں دنیاوی تعلیم میں تو بے مثال بنا ڈالا مگر دینی تعلیم، اخلاقیات وحقائق میں تمہیں تاریکیوں سے نکالنے میں زیادہ محنت نہ کرسکی۔ تم دنیا کے اسٹیج پر خود مختار ہو، جیسا ڈراما کرنا چاہتے ہو، جیسا کردار نبھانا چاہتے ہو، تمہیں اس پر عبور

حاصل ہے، بیٹا آج سے ہم دونوں کے رستے ہی جدا ہو گئے۔ ایک چھت کے نیچے رہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہمارے رستے ہماری منزل ایک ہے، جدا راہیں، جدا منزلیں اور جدا حساب کتاب...... جدا جزا اور سزا لگتا ہے یہی ہے میرا نصیب۔'' وہ آنسو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

''ممی...... آپ ایموشنل بلیک میلنگ کرنا بند کر دیں۔ اب میں کنڈر گارٹن کا معصوم اور نادان بچہ نہیں رہا۔ جسے آپ اب بھی انگلی پکڑ کر چلنا سکھائیں گی۔ میں دنیا کے ہر خطے کے لوگوں میں پڑھ کر یہاں تک پہنچا ہوں' اپنا اچھا اور برا جانتا ہوں۔'' وہ نہایت رکھائی سے بولا۔

وہ بغیر جانے کہ عادل کہاں ہے، بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ لائٹیں اس نے آف کر دی تھیں۔ جب تیزی سے گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور کار کے ٹائر رات کی خاموشی میں دردناک آواز کے ہمراہ چرچرائے اور سرعت سے گاڑی گیٹ سے باہر نکلی تو حسنات اسٹڈی کی کھڑکی کی طرف تیزی سے بڑھے اور بیٹے کی اس وحشیانہ ڈرائیونگ پر حیران ہو کر کھڑے سوچنے لگے۔

☆☆☆

صبح کے دس بج رہے تھے۔ سائرہ رات بھر بے چین رہنے کی وجہ سے ابھی تک بستر سے اٹھ نہ پائی تھی شاید صبح ہوتے ہی نیند آئی تھی اسے۔ ملازم نے ہمیشہ کی طرح حسنات کا ناشتا اسٹڈی میں ہی پہنچا دیا تھا اور لاؤنج کی ٹوسیٹر ڈائننگ ٹیبل پر عادل اور سائرہ کا ناشتا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ ملازم نے سائرہ کے کمرے کا دروازہ ناک کیا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ وال کلاک کی طرف آنکھیں ملتے ہوئے دیکھ کر چونک گئی۔

''عادل کہاں چلا گیا؟ وہ رات کبھی باہر نہیں گزارتا تھا، بہت غصے میں تھا شاید کسی دوست کے پاس چلا گیا ہو۔'' وہ سوچنے لگی۔

''اُف دس بجے کا لیکچر تو مس ہو گیا۔'' وہ سرعت سے بستر سے باہر نکلی اور واش روم کی طرف چل دی۔ اسے تیار ہونے میں دس سے پندرہ منٹ ہی لگے ہوں گے۔ وہ ناشتا کیے بغیر باہر نکل گئی۔ اسی لمحے عادل کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا بکھرے ہوئے بال، کھلا گریبان، آگ بگولا ہوتی ہوئی آنکھیں اور چہرے پر کسلمندی کے آثار دیکھ کر وہ وہیں رک گئی۔ عادل گاڑی سے باہر نکلا۔ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ کو محسوس کر کے وہ لرز گئی۔ ''یہ میرا عادل نہیں ہو سکتا۔'' وہ غیر یقینی کے عالم میں اس کے قریب چلی گئی۔ اِک بدبودار بھبکا اس کے نتھنوں میں گھستا چلا گیا۔

''تم نے ڈرنک کی ہے اور رات کہاں گزاری ہے؟'' وہ کسی سوکھے پتے کی طرح لرز رہی تھی۔ لہجہ کانپ رہا تھا۔

''ممی...... گو اَوے...... دس از مائی لائف......'' اس نے نفرت آمیز لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔ سائرہ نے گاڑی کو لاک کیا اور اس کے پیچھے چل دی اور وہ اپنے کمرے میں پہنچ کر جوتوں سمیت بیڈ پر آڑھا ترچھا لیٹ گیا اور چند لمحوں میں ہی کمرے میں اس کے خراٹے گونجنے لگے۔

سائرہ نے آگے بڑھ کر بیٹے کے بوٹ اور جرابیں اتاریں اور آنسو صاف کرتے ہوئے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

''میرے بچے! تم نے اپنی زندگی کے ہر حسرت زدہ لمحے کے سامنے اِک بند باندھ کر مجھے مطمئن کیے رکھا، مجھے میری کامیابی پر فخریہ انداز میں جینے کا حوصلہ بخشا، بجز اس کے کہ تم خود اپنے باطن میں ٹوٹتے چلے گئے...... مجھے ہلکا سا شائبہ تک نہیں ہونے دیا۔ آج وہ تمام بند ٹوٹ گئے۔ آج میرا ہر مشورہ تمہیں بچگانہ لگا۔ ہر بات احمقانہ معلوم ہوئی۔ مجھے تمہارے تمام اعتراضات سن کر پچھتاوا نہیں ہوا۔ کسی قسم کی پشیمانی نہیں ہوئی۔ کیونکہ میں نے اپنے فرائض خوش

اسلوبی سے نبھائے ہیں، تمہارے خیالات سن کر حیرت ضرور ہوئی کہ انسان خود کو بہت طاقتور... چیز سمجھ کر وہ اختیارات اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتا ہے، جن پر صرف اور صرف اوپر والے کا قبضہ ہے۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی۔ اس کے مُتّے ہوئے چہرے پر دکھوں کی پرچھائیاں اور گہری ہوگئیں۔ اس کا دکھ سننے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کے تو دکھوں کا مداوا کرنے والا، اس کی تنہائیوں کا ساتھی اور پہاڑ جیسی قوت، حوصلہ اور ہمت رکھنے والا اس کے سامنے دنیا و مافیہا سے بے خبر بے سدھ پڑا تھا۔ وہ خود کو تنہا محسوس کرنے لگی تھی۔ یہ کیسا کربناک احساس تھا کہ وہ ہر لمحہ اس کی المنا کی میں دھنستی جارہی تھی۔ اسے آج اس محاورے کی سمجھ آئی تھی کہ واقعی آسمان سر پر ٹوٹ پڑنا کسے کہتے ہیں۔

اسے یونیورسٹی جانا تو در کنار سانس لینی ہی محال ہوگئی۔ ذہن و قلب میں گرہیں پڑنے لگی تھیں۔ ''قیامت کیسی ہوگی؟'' اس نے خود سے سوال کیا...... ''جزا اور سزا کا دن کیسا ہوگا؟ گناہ اور ثواب کا بوجھ کتنا بھاری ہوگا؟ کیا آج کے اس آزمائشی دن سے مقابلہ کرسکتی ہوں؟ پیروں کے نیچے زمین ہے نہ ہی سر پر آسمان......شاید درمیان میں معلق ہوں۔ ابھی مری نہیں...... زندہ ہوں۔ اتنے بڑے سانحے کے باوجود میں سانس لے رہی ہوں۔ یہ دکھ، کرب اور اذیت تو حسنات کے ظلم وستم سے کہیں زیادہ ہے۔'' وہ تاسف آمیز انداز میں خود کلامی کرتی رہی۔ آنسو خشک تھے، حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ بے قراری و بے سکونی کا احساس بہت حقیر اور معمولی لگنے لگا تھا۔ دکھ، درد اور پچھتاوا بہت وزنی تھا۔

☆☆☆

''ممی! مجھے بہلانا پھسلانا چھوڑ دیں۔ میں انسان ہوں اور انسان اشرف المخلوقات ہے، مجھے اسی مرتبے میں رہنے دیں۔ مجھے فرشتوں کا رتبہ نہیں چاہیے۔ آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔'' عادل نے چڑ کر کہا۔ وہ گلے، شکوے اور لعن طعن کی بیاض کب سے سن رہی تھی۔ پھر بھی تحمل سے بولی۔

''اشرف المخلوقات کو ایسی نازیبا حرکتیں زیب نہیں دیتیں۔ جن کی طرف تم چل نکلے ہو۔ بس میری یہی التجا ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہوں گی۔ تم سے کچھ نہیں مانگوں گی۔'' وہ دھیمے انداز میں بولی۔

''ممی! آج سے میرا کمرا الگ کردیں۔ اب میں آپ کے ساتھ نہیں رہوں گا۔ جوان، مرد کا روپ اختیار کیے سالہا سال بیت گئے ہیں اب مجھے آزادی چاہیے، میں نے اپنے بارے میں ہر فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی شاید آپ کی مکمل فرمانبرداری تھی۔'' وہ نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا اور سائرہ اس کی یہ باتیں سن کر تڑپنے لگی تھی۔

''سچ ہے کہ تم اب منہ لگانے کے قابل نہیں رہے۔ آج کے بعد تم سے کسی موضوع پر بات نہیں ہوگی۔ سمجھوں گی کہ میں نے تمہیں جنم ہی نہیں دیا۔ کیونکہ جس عادل کو میں نے پیدا کیا تھا وہ تو نہ جانے دنیا کی اس بھیڑ میں کہاں کھو گیا؟ وہ بھگدڑ میں شاید پامال ہوگیا ہے۔ مجھے سوگ منانا چاہیے، ماتم کرنا چاہیے۔ اور اپنے مالک سے اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگنی چاہیے۔ عفو و درگزر اس کی اعلیٰ ترین صفات میں سے ایک افضل ترین صفت ہے۔ جس دن اس نے مجھے معاف کردیا۔ اس دن تم میرے پاس خود لوٹ آؤ گے۔ اپنی ان تمام خوبیوں اور تمام خصلتوں کے ہمراہ جنہیں میں نے تمہارے رگ و ریشہ میں جذب کیا تھا، میں انتظار کرتی ہوں، انشاء اللہ۔'' وہ مستحکم لہجے میں بولی اور کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی۔ ریموٹ کنٹرول اٹھا کر اس نے ٹی وی آن کیا...... ملازم نے ڈنر ٹرالی پر رکھا اور ٹرالی اس کے سامنے لاکر مؤدبانہ انداز میں بولا۔

''چھوٹے صاحب کو بھی یہاں بلالاؤں؟ انہوں نے تین دن سے کھانا گھر پر نہیں کھایا۔ شاید میرے ہاتھ کے پکائے کھانے میں لذت نہیں رہی جو کھانا باہر کھانا شروع کردیا ہے۔'' وہ یہ بات سن کر دل ہی دل میں خوب تڑپی

پھر بڑی ہمت کر کے گویا ہوئی۔
''چاچا یہ کھانا اس کے کمرے میں پہنچا دو۔ مجھے تو بھوک نہیں ہے اور ہاں کل سامنے والا کمرا عادل صاحب کے لیے میڈ سے تیار کروالینا۔ اب وہ ماشاء اللہ بڑا ہو گیا ہے شادی کے قابل ہے، اسے مجھ سے الگ رہنے کی عادت ہونی چاہیے۔''

☆☆☆

''سائرہ! تم فکر کیوں کرتی ہو جب شادی طے ہو گئی تو پھر خدشہ کس بات کا۔ وردہ بہت دانشمند اور دور اندیش بچی ہے، پڑھی لکھی ہے، عادل کو ہینڈل کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ حسنات کہتا ہے کہ چار لوگوں کے ہمراہ رخصتی ہو گی، مجھے یہ بھی منظور ہے۔ اگر دھوم دھڑکے سے شادیاں کامیاب ہوتیں تو آج کسی بڑے گھرانے کی بچی طلاق یافتہ نہیں ہوتی۔ وہ ٹھیک ہی کہتا ہے کہ اس کے پاس ان فضول رسومات کے لیے وقت ہی نہیں ہے۔''
عصمت آپا نے سائرہ کو رام کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اگرچہ وہ سائرہ اور حسنات کی ازدواجی زندگی کے ہر پہلو سے واقف تھیں۔ پھر بھی بد قسمتی سے وہ بیٹی کے رشتے کے معاملے میں اندھی اور بہری بن گئی تھیں۔ کیونکہ عادل کی پرسنالٹی، اس کی تعلیم اور ظاہر ہے خاندانی وقار نے انہیں دل کے ہاتھوں مجبور کر دیا تھا۔ وہ کسی قیمت پر عادل کو کھونا نہیں چاہتی تھیں جبکہ سائرہ سے بھی انہیں کوئی گلہ نہیں تھا تو پھر وہ کیوں اپنے ہاتھوں سے یہ رشتہ گنواتیں۔ اور بیٹی کی بھی رضامندی سے بھی کسی حد تک واقف تھیں۔ جونہی ماں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا تو اس نے بھی فوراً رضامندی دے ڈالی تھی اور عصمت آپا، بھائی کے گرد ہو کر اپنی بات منوا کر مطمئن ہو گئی تھیں۔ انہیں اس بات کا اندازہ ہی نہیں تھا کہ ایک دبو اور خود اعتمادی کی کمی کا شکار بچہ انکار کر کے اپنی کسی اور پسند پر مُصر رہے گا۔ سائرہ نے انہیں سمجھانے کی بھی کوشش کی مگر عصمت آپا نے ایک نہ سنی اور بھائی سے بیٹے کے نکاح اور رخصتی کی ڈیٹ فکس کر کے منوں مٹھائی خریدی اور اپنے خاندان کے ہر فرد کو انفارم کرنے چل نکلیں۔
عادل اس تمام کارروائی سے بے خبر تھا۔ سائرہ کو فون پر ہر ایک مبارک باد دینے کے لیے بے تاب تھا مگر اس نے فون پر آنسرنگ مشین لگا دی۔ وہ کسی کی طرف سے مبارک باد وصول کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اب اس نے یہ معاملہ حسنات اور عادل پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ وردہ کی پاکیزہ اور صاف شفاف زندگی کو تیاگ کرنے کا گناہِ کبیرہ نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ عادل کے انقلابی رویے میں کہیں بھی لچک نہ تھی۔ وہ کسی غیر مرئی طاقت کے شکنجے میں جکڑ چکا تھا۔ اب بہتر اور مناسب حالات کا قیاس کرنا بھی نادانی ہی معلوم ہو رہی تھی۔ اس لیے بیٹے سے ڈسکس کرنا اور اسے پہلے والے عمدہ طریق سے اپنی بات منوالینا خام خیالی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس حقیقت کو اس نے پالیا تھا۔ حسنات سے آج تک اس پیچیدہ مسئلے پر دو تین بار مختصر گفتگو ہوئی تھی، وہ تو اچھوتی دھرتی کا اِک عجیب و غریب باشندہ تھا۔ جس سے نرم لہجے میں احتجاج کرنا بھی گناہِ کبیرہ تھا۔ انہیں بیوی کی فرسٹریشن کا اندازہ تھا نہ ہی بیٹے کی کم مائیگی کے احساسات سے واسطہ تھا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی ان کا رویہ سرد، دل شکن اور غیر متعلق ہی تھا۔ ان اذیت ناک لمحوں میں وہ اِک نئے دکھ و کرب اور بے حساب اندیشوں اور وسوسوں میں ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ عادل سے علیحدگی اور دوری اسے کسی پل چین نہیں لینے دیتی تھی۔ اسے اب یہ دکھ ہر دکھ پر بھاری لگا، جس کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ بیٹے کے پیار میں اپنی مثالی زندگی کو حسرتوں کی آماجگاہ میں سوچنے کی سوچ نے بے دم اور بے جان کر دیا تھا۔ کوئی اپنا راز داں نہ تھا جسے اپنے دل کے پھپھولے دکھاتی۔ مشورہ لیتی اور اس معمے کو حل کرنے کی راہ نکالتی۔ آخر ایک لمحے ہمت کو یکجا کر کے حوصلے سے اٹھتی مگر اگلے پل بے بس و بے خود ہو کر ڈھے جاتی۔ یونیورسٹی سے اس نے چھٹیاں لے لیں اور کمرے میں بند رہ کر آنے والے وقت کے فیصلے کا رخ بدلنے کا انتظار کرنے لگی۔

☆☆☆

یونیورسٹی میں پڑھنے والے اسّی فیصد لڑکوں اورلڑکیوں کے جوڑے تھے جو نہایت بے باکی سے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے لان میں محوِ گردش نظر آیا کرتے تھے۔ کئی جوڑے ایسے بھی تھے جنہیں پودوں، جھاڑیوں اور درختوں کے فربہ گوشوں کی تلاش رہتی تھی۔ نمرا ان میں سے نہیں تھی۔ وہ عموماً لائبریری میں پائی جاتی یا کیفے ٹیریا میں اپنی سہیلیوں کے ہمراہ...... عادل کی کڑی نظر اس پر رہتی۔ کئی بار اسے لائبریری میں ہی تعلقات بڑھانے کے ضمن میں طولانی گفتگو کرنا چاہی...... کسی نہ کسی بہانے اسے اپنے آفس طلب کیا۔ لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ مگر وہ ہمت ہارنے والا کہاں تھا۔ نہ جانے اتنی جرأت، ہمت و توانائی اس میں کیسے بھر گئی تھی۔

آخر ان اشاروں و کنایوں سے تنگ آ کر عادل نے اسے آفس بلا کر حالِ دل بیان کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس بے باکی اور بے شرمی پر وہ خود بھی چونکا تھا۔ اتنی جرأت تو اس میں کبھی نہیں تھی۔ کیا یہ ماں سے لاتعلقی اور بائیکاٹ کا نتیجہ تھا یا غلط راہ پر قدم رکھنے کا نتیجہ...... آج اظہارِ محبت کا سوچ کر اسے کوئی جھجک نہ ہوئی تھی۔ وہ انہی سوچوں میں غرق تھا کہ نمرا آفس میں داخل ہوئی۔ گرے رنگ کے کپڑوں میں وہ بادل کا بھٹکا ہوا ٹکڑا لگ رہی تھی۔ جیسے اس پر بصد شوق برسنے کو تیار ہو۔ وہ اسے دیکھ کر مسرت و انبساط سے جھوم اٹھا۔

''تشریف رکھیے جناب......'' اس نے آفس ٹیبل کے پار رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کرتے...... ہوئے کہا۔ نمرا ہراساں و پریشان نظریں جھکائے کرسی کے کنارے پر ٹک گئی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ فوراً اس کی بے باک نظروں سے دور ہو جائے۔ اس کی رفاقت کا فسوں تھا کہ وہ اس کے حسین و دلکش چہرے کے تیکھے خد و خال میں الجھتا چلا گیا۔ نمرا نے اچنبھے سے سرسری طور پر اسے دیکھا اور اضطراری کیفیت میں کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آج کافی یا چائے کی پیش کش نہیں ہوگی، آج بندہ حکم کا غلام ہے، آپ کیا پینا پسند فرمائیں گی؟'' وہ اسے کھڑا دیکھ کر عاجزانہ لہجے میں بولا۔

''مجھے یہاں بلاتے کا مقصد بتائیں؟'' خوفزدہ آواز میں ہلکے سے بولی۔

''بھئی بیٹھو گی تو کچھ اِدھر اُدھر کی گفتگو ہوگی تو پھر ہی اصلی مقصد کی طرف آسکوں گا ناں...... ایک دم سے نہ تو زبان میں اتنی سکت ہے نہ ہی تمہارے ذہن میں اتنی جگہ کہ مقصد سما سکے۔ بلا جھجک بیٹھو...... اور پھر میری سرگزشت سن کر بلانے کا مدعا سمجھ جاؤ گی۔'' وہ نہایت خود اعتمادی سے بولنے کی کوشش کررہا تھا۔

''فرمائیں......'' وہ خجل سی ہو کر بولی۔ ''میں ناتواں، ناچیز آپ کے لیے کیا کرسکتی ہوں؟ میں کچھ سمجھی نہیں سر۔'' وہ دوبارہ کرسی پر ٹک گئی۔

''نمرا تمہیں میری زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ پر یقین کرنا ہوگا کیونکہ یہ الفاظ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلنے کے لیے کب سے بے چین ہیں، انہیں ابدی سکون چاہیے۔'' وہ یہ کہتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے اتنے قریب آگیا کہ نمرا نے اس کی پھولی ہوئی بے ترتیب سانسوں کی حدت اپنی پیشانی پر محسوس کی۔ کرسی سے اٹھ کر وہ چند قدم پیچھے ہٹ کر اس جنونی کو تکنے لگی۔ عورت کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی حس سے نوازا ہے کہ وہ مخالف جنس کی آنکھوں کی جنبش کے بھی مقصد کو ایک پل میں پہچان لیتی ہے۔ نمرا کو اس کے چاشنی بھرے لہجے کا لب لباب سمجھ آچکا تھا۔ پھر بھی انجان سی بن کر وہیں ساکت و جامد کھڑی اسے تکتی رہی۔ وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔

''نمرا، ہر ذی روح کو اپنی زندگی اپنی پسند کے مطابق گزارنے کا حق ہے۔ یہ فارمولا صرف مرد کے لیے نہیں...... عورت بھی برابر کی حقدار ہے۔'' وہ نہایت سنجیدگی سے بولا۔

''جی سر!'' اس نے مختصراً جواب دے کر اسے بولنے کا موقع دیا۔
''میں نے بھی اپنا دل و جان دین و دنیا، عقل و شعور اور اپنی تمام متاعِ حیات ایک شریف النفس لڑکی کے نام لکھ دی ہے۔ میرے اس وجود میں گردش کرنے والا ہر قطرۂ خون اور حیات بخشنے والی ہر سانس اس کا نام لے رہی ہے۔ میرے دل کا سکون و قرار اور میری روح کی تشنگی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ میں اب بے بس اور بے دم سا ہو کر رہ گیا ہوں۔ ورنہ تمہیں یہاں بلانے کی گستاخی ہرگز نہیں کرتا۔'' وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر اپنے دھڑکتے دل پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔
''ڈائیلاگ کا خوب رٹا لگایا ہے۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر کچھ توقف کے بعد گویا ہوئی۔
''اس معاملے میں، میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں۔ مجھے اس لڑکی کا بائیو ڈیٹا بتائیں۔ شاید اس تک میری رسائی ہو سکے۔'' نمرا نے سکون سے آ ایک طویل اور بھرپور سانس لی کہ ضرور وہ اس کی کسی دوست کا نام لے گا۔
''سر یہ میری عزت افزائی ہوگی۔۔ اگر میں آپ کے کسی کام آ سکوں۔ آپ میرے قابلِ احترام استاد ہیں، آپ فرمائیں۔ مجھے اس خوش نصیب کا نام بتائیں۔ اگلے ہی لمحے آپ کی خدمت میں پیش کر دی جائے گی۔''
''خوش نصیب تو میں ہوں نمرا......'' اچانک وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ''آئی لو یو نمرا......''
''سر آپ کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔'' وہ اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی۔ ''آپ کی یاد دہانی کے لیے عرض ہے کہ نمرا آپ کی پسند کے.... کسی بھی روپ میں فٹ نہیں بیٹھتی۔ آپ ایک معزز استاد ہیں سر...... ایسی باتیں آپ کو زیب نہیں دیتیں۔''
''نمرا! استاد تعلیم دیتے، دیتے بے حس نہیں ہو جاتے۔ کیا پسندیدگی اور پیار کرنا ہمارے لیے ممنوع ہے؟'' وہ لرزش زدہ آواز میں بولا۔
''آپ کا مقام بہت اعلیٰ ہے سر...... آفس میں اپنی اسٹوڈنٹ کو بلا کر ایسی باتیں کرنا مجھے کیا، کسی کو بھی معیوب لگے گا۔ پیار کے اظہار کے اور بھی طریقے ہیں..... پسندیدگی، زبان سے نہیں آنکھوں سے جھلکتی ہے اور دوسرے کے دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ یہ سراسر جذباتی پن ہے...... اور جذبات، احساسات و محسوسات کبھی پائیدار نہیں ہوتے۔ حالات کے ساتھ ان پر دبیز دھند چھا جاتی ہے۔'' وہ نہایت اعتماد سے بول رہی تھی۔ ''آج کے بعد مجھے آفس میں طلب کرنے کی غلطی کی تو میں یہ یونیورسٹی ہی چھوڑ دوں گی۔ پلیز سر میری زندگی کو مشکلات میں مت ڈالیں۔ میں ایک مڈل کلاس گھرانے کی لڑکی ہوں جسے اپنی روایات سے بے پناہ محبت اور لگاؤ ہے۔ میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ جیسا آپ نے تصور کیا ہے، سر مجھے خود سے گھن آنے لگی ہے، میری ہی شخصیت و کردار میں شاید کچھ ایسا ضرور تھا کہ جس نے آپ کو شہ دی۔ مجھے اپنا محاسبہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔'' وہ روہانسی ہو گئی تھی۔
''فار گاڈ سیک...... ایسا کچھ نہیں۔'' وہ حیرت و تاسف سے بولا۔
''ایسا ہی ہے سر...... ورنہ اس پوری یونیورسٹی میں آپ نے مجھے ہی کیوں چوز کیا...... جو محبت کا اظہار کرنے میں آپ نے میرے نسوانی وقار و احترام کا بھی خیال نہ رکھا۔'' وہ ندامت سے بھرپور لہجے میں بولی۔
''نمرا تم نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ میں گلیوں میں پھرنے والا آوارہ اور اوباش غنڈا نہیں ہوں۔ تم مجھے پسند ہو، مجھے تم سے سچا پیار ہو گیا ہے۔ میں تمہیں عمر بھر کے لیے اپنا بنانا چاہتا ہوں مگر تم اتنی احمق ہو کہ نہیں سمجھو گی۔ بھئی میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ قدرے مسکرا دیا۔
''سر شادی۔ پر مجھ سے کیوں؟'' وہ حیرت و تجسس سے بولی۔ ''یہ کیسے ممکن ہے سر؟''
''کیونکہ میں نے تمہیں اپنے قابل سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''اگر میں کہوں کہ آپ مجھے اپنے قابل نہیں لگے......تو پھر......؟'' وہ کچھ چڑ سی گئی۔

''تمہیں بھی اپنی پسند پر پورا حق ہے، کہہ سکتی ہو۔'' وہ چونک کر بولا۔اور چہرے کو کتنے ہی زاویے دے ڈالے۔

''سر! محبت اور ہوس کے درمیان باریک ریشم کا پردہ ہوتا ہے، جسے چاک ہوتے دیر نہیں لگتی اور پھر وہی محبت وبالِ جان بن جاتی ہے۔ مجھے ایسی محبت پر بھروسا نہیں۔ کیونکہ حاصل، محبت کی موت ہے۔ آپ اپنی محبت کی پائیداری اور ہمیشگی چاہتے ہیں تو شادی کو بھول جائیں۔ وہاں شادی کا پروپوزل لے کر جائیں جہاں آپ وقتی اور عارضی جذبے کے ہاتھوں مجبور ہونے کے بجائے انڈر اسٹینڈنگ کا مضبوط پل تعمیر کرنے کی کوشش کریں پھر اس فولادی اور مضبوط پل پر ثابت قدمی سے آگے بڑھیں۔ یقین جانیں زندگی گزارنا آسان ہو جائے گی۔'' وہ نہایت خود اعتمادی سے بولی۔

''میں اس معاملے میں تمہارا ہم خیال نہیں ہوں، محبت کی بے چین گرمی میٹھی میٹھی چبھن، سردیوں میں دہکتے ہوئے انگاروں کی پُرسکون تپش کے مانند......اور دھوپ کی سحر انگیز تمازت وحدت ہی تو زندگی ہے۔ انڈر اسٹینڈنگ کا درجہ تو سانس لینے کے بعد شروع ہوتا ہے۔'' عادل کے لہجے میں نہایت سادہ پن تھا۔ اس وقت اس کا دل ہوس و حرص سے خالی لگ رہا تھا۔ اس کے باوجود نمرا نے اسے خشم آلود نگاہوں سے گھورا اور بالوں کو جھٹکا دے کر باہر نکل گئی۔ وہ وہیں ہکا بکا اسے دیکھتا رہ گیا۔

''خاصی بدتمیز، نامعقول اور نک چڑھی لڑکی ہے، دل آیا بھی تو کس ظالم حسینہ پر......'' وہ بڑبڑاتا ہوا بیٹھ گیا۔

''عادل یار......! انگلیوں کو خم دے کر کسی سے مکھن نکالتے تو سنا ہے، سیدھی انگلیوں کا استعمال کرو گے تو تمہاری محبت کا انجام یہی ہوگا۔''

☆☆☆

''چھوٹے صاحب! آپ کو بڑے صاحب یاد فرما رہے ہیں۔'' ملازم نے عادل کو کمرے میں آکر اطلاع دی تو وہ اچنبھے سے اسے دیکھنے لگا۔ زندگی میں دوسری مرتبہ حاضری وسلامی کے لیے حکم دیا گیا تھا۔ پہلی بار جب وہ اسکالرشپ حاصل کرنے کے بعد بیچلر کرنے یو کے جا رہا تھا۔ نصیحتوں اور فضیحتوں کا نسخہ اس کے ہاتھ میں پکڑا کر تحکمانہ لہجے میں وہ بولے تھے۔

''اس پالیسی کو بائے ہارٹ یاد کرلینا۔ یہ میری زندگی کے تجربات و مشاہدات کا نچوڑ ہے۔'' لغزش زدہ ہاتھوں سے وہ خاکی لفافہ پکڑ کر غصے اور افسوس کے ملے جلے جذبات لیے واپس اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ اسے ان کی تمام نصیحتیں پڑھ کر بہت حیرت ہوئی تھی کہ انہوں نے اس کی زندگی کے اٹھارہ قیمتی سالوں کو اپنے چند لمحوں اور چند جملوں میں مقید کر کے اتنے سالوں کے فرائض سے کس خوب صورتی سے سرخروئی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت وہ چھوٹا تھا۔ زیادہ دیر اس کیفیت میں مبتلا نہیں رہ سکا۔ لیکن ان کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے اس نسخۂ کیمیا کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ ہر طرح کے حرام سے محفوظ رہا تھا۔

آج جبکہ وہ تمام بری علتوں کا شکار ہو چکا تھا اسے دوسری مرتبہ یاد فرمایا گیا تھا۔ ''شاید مجھے وہی نسخۂ کیمیا تھما کر یاد دہانی کرانا مقصود ہو۔'' اس نے سوچتے ہوئے اپنے بالوں میں برش کیا...... کالر کو درست کیا، قمیص کے لپٹے ہوئے بازوؤں کو نیچے کر کے بٹن بند کیے اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ لاؤنج میں ممی کو دیکھ کر اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔ رسمی علیک سلیک بھی نہ ہوئی۔۔ نہ ہی اپنے تجسس واشتیاق کا ذکر کیا۔ چہرے پر مکمل سکون اور خود اعتمادی سجائے وہ ماں کے قریب سے گزر گیا۔ سائرہ نے پیچھے سے آواز دینا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ وہ اس کے تیوروں سے اندرونی کیفیت کو بخوبی جانتی تھی۔ اس وقت اس سے دوری اور لاتعلقی میں ہی اس نے عافیت سمجھی تھی۔

جاری ہے

آخری روزن

نگہت اعظمی



صالحہ بھائی کے سوئم کے بعد گھر آئی تو اس کا دل غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ ہر شے پر اداسی کی دبیز تہ چھائی ہوئی تھی۔ اسے ہر طرف دھند ہی دھند نظر آ رہی تھی، بھائی کے ساتھ گزرے ہوئے بے شمار لمحے آنکھ مچولیاں کھیلتے ہوئے نظروں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ گھر اپنی پرانی ترتیب کے ساتھ سجا سنورا ہوا تھا۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد دونوں بچے شاہدہ اور عابد خاموشی سے اپنے کمروں میں چلے

گئے تھے۔ اس کا شوہر حامد تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھ کر بھائی کی باتیں یاد کر کے اس کی دلجوئی کرتا رہا پھر وہ بھی اٹھ کر چلا گیا۔ وہ اکیلی رہ گئی۔

تین دن پہلے ہی اس کی بھائی سے بات ہوئی تھی۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک، ہشاش بشاش تھا۔ فون پر اس کی خیریت پوچھی، بچوں اور حامد کے بارے میں پوچھا، تھوڑا سا ہنسی مذاق کیا پھر فون بند کر دیا۔ وہ فون رکھ کر حسب معمول خوش ہو کر کچن میں رات کے کھانے کی تیاری میں مشغول ہو گئی۔ ہمیشہ ہی بھائی سے بات کر کے اس کے اندر خوشی اور توانائی کا احساس جاگ اٹھتا تھا، وہ گنگناتے ہوئے آٹا گوندھ رہی تھی۔ حامد کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے اروی گوشت کا سالن پکایا تھا۔ سالن ڈونگے میں نکال کر اس پر ہرا دھنیا اور پسا گرم مسالا چھڑکا اور توے کو چولھے پر رکھ کر وہ روٹیاں ڈالنے لگی اسے پتا تھا جیسے ہی وہ پہلی روٹی توے پر ڈالے گی دروازے پر بیل بجے گی۔ حامد نے سامنے والے فلیٹ میں ٹیوشن سینٹر کھولا ہوا تھا۔ رات کے دس بجے وہ سینٹر بند کر کے اپنے گھر کے دروازے کی بیل بجاتا۔ وہ ہر روز مسکراتے ہوئے دروازہ کھولتی، حامد گھر میں داخل ہوتا اور جتنی دیر میں وہ روٹیاں پکا کر فارغ ہوتی وہ منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاتا پھر وہ، حامد اور ان کے دونوں بچے رات کا کھانا کھاتے۔ زندگی میں ہر طرف سکون اور ٹھہراؤ تھا لیکن اس سکون اور ٹھہراؤ کے اندر کیسے، کیسے طوفان اور کیسی کیسی خود سر لہریں سر اٹھاتی تھیں...... یہ صرف اور صرف وہی جانتی تھی۔

وہ بہت اطاعت گزار اور شوہر پرست بیوی تھی۔ شوہر پرستی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اسے اپنے شوہر سے بے پناہ محبت تھی اور اسی محبت کی وجہ سے ان دونوں کی شادی ہوئی تھی۔ ورنہ اس کے گھر والے نہ حامد کو پسند کرتے تھے اور نہ ہی حامد کے گھر والوں کو لیکن چونکہ اسے حامد سے محبت تھی اس لیے گھر والوں کی مخالفت کے باوجود اس کی شادی حامد سے ہو گئی۔ یہ تو اسے شادی کے بعد معلوم ہوا کہ اس کے گھر والے حامد کو کیوں پسند نہیں کرتے تھے۔

وہ خود بہت معصوم تھی بلکہ کسی حد تک بے وقوف بھی اور اسے ایسا ہونا ہی تھا کہ اس نے اپنے گھر کے سوا کچھ اور دیکھا ہی نہیں تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے بابا بہت سخت گیر اور انتہا درجے کے مذہبی تھے۔ ان کے خود ساختہ مذہب میں لڑکیوں کا گھر سے باہر نکلنا اور علم حاصل کرنے کے لیے اسکول، کالج جانا شرع کے خلاف تھا۔ وہ لڑکیوں کی تعلیم کے خلاف نہیں تھے لیکن وہ اسکول جانے کے خلاف تھے۔ اسی لیے انہوں نے گھر پر ہی اس کی تعلیم کا بندوبست کر دیا تھا، گھر پر اسے پڑھانے کے لیے استانی آتی تھیں جو اسے اردو، اسلامیات، حساب اور انگریزی پڑھاتی تھیں اور وہ پڑھنے کی اتنی شوقین تھی کہ اس نے گھر میں ہی پڑھ کر جب میٹرک کا امتحان پرائیویٹ دیا تو اس کا اے گریڈ آیا اور چونکہ وہ لکھنے پڑھنے کی بہت شوقین تھی اس لیے چھپ، چھپ کر اردو کے میگزین، ناول اور ڈائجسٹ پڑھا کرتی جو اس کا بھائی اسے محلے کی لائبریری سے لا کر دیتا تھا۔ پڑھنے کے شوق کے ساتھ اسے لکھنے کا بھی شوق تھا۔ وہ اخباروں میں مضامین بھی لکھنے لگی۔ حامد اس کے محلے میں رہتا تھا اور اس کے بھائی کا دوست بھی تھا، وہ ایک سیاسی جماعت سے وابستہ تھا اور اس جماعت کا سرگرم رکن تھا۔ صالحہ کو بھی سیاست سے بہت دلچسپی تھی اور اس قسم کے نوجوان اسے بہت پسند تھے جو ملک و قوم کی خدمت کے لیے آگے، آگے رہتے ہوں اس لیے اسے حامد بھی اچھا لگنے لگا۔ حامد کے آٹھ بہن بھائی تھے اور وہ بہت پرانے بنے ہوئے چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے۔

حامد کے ابا بھی اس کے بابا کے دوست تھے اس لیے اس کی اماں اور اسے ان کے گھر جانے کی

اجازت تھی...... وہ بھی کبھی کبھی اماں کے ساتھ ان کے گھر چلی جاتی جب تک اسے حامد سے محبت نہیں ہوئی تھی اسے اس کے گھر سے وحشت ہوتی تھی۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اُن کے گھر آتی تو اسے گھبراہٹ ہونے لگتی...... ہر طرف گندگی، بے ترتیبی ---- بھائی بہنوں کے لڑائی جھگڑے، ماں کی چیخ پکار، باپ کا غصہ...... اس کا دم گھٹنے لگتا۔ اسے لگتا جیسے یہ گھر نہیں، کوئی عقوبت خانہ ہے جہاں انسان نہیں جانور رہتے ہیں۔ وہ لوگ کسی صورت انسانیت کے معیار پر پورا۔ اترنے کے لائق نہیں تھے حالانکہ وہ بھی کسی عالی شان گھر میں نہیں رہتی تھی ان کا بھی دو کمروں کا چھوٹا سا گھر تھا لیکن وہ اور اس کی ماں اس گھر کو بھی آئینے کی طرح چمکا کر رکھتی تھیں۔ اس کے بابا... بہت سخت مزاج تھے لیکن اس کی ماں بہت نرم گفتار اور صابر سی خاتون تھیں۔ اس کا ایک ہی بھائی تھا اور دونوں بہن بھائی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ اس کے بابا کی پرچون کی دکان تھی جس کی آمدنی سے ضروریات زندگی ہی مشکل سے پوری ہوتی تھیں لیکن پیسے کی کمی نے ان کو انسانیت کے شرف سے گرنے نہیں دیا تھا۔ باپ کی سختیوں کے باوجود وہ باپ سے بے پناہ محبت کرتی تھی، ان کا خیال رکھتی تھی۔ ان کے سامنے اونچی آواز میں بات کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ یہی حال اس کے بھائی کا تھا۔ باپ کی سختی اور سرزنش پر بھی اس کے بھائی نے باپ کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا کہ والدین کی تعظیم اور احترام ہی انسان کی پہچان ہے۔ یہ انسان کی صفت ہے کہ وہ مرتے دم تک اپنے والدین کے ساتھ رہتا ہے نہ صرف ساتھ رہتا ہے بلکہ ان کے احسانات کی قدر بھی کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو انسان اور جانوروں میں فرق کیا رہ جائے گا۔ جانور کا بچہ جب اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاتا ہے تو اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے تن کر کھڑا ہو جاتا ہے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غراتا ہے۔ اگر جانوروں کی یہ فطرت انسان میں پیدا ہو جائے تو پھر وہ انسان کتنی ہی ترقی کر لے، کتنے ہی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو جائے، کتنا ہی مہذب بن جائے انسان کہلانے کا حق دار نہیں...... وہ بھی نہیں جو اپنے آپ کو دنیا کی مہذب ترین قوم سمجھتے ہیں...... اور جن کے والدین بڑھاپے میں اولڈ ہاؤسز میں زندگی گزارتے ہیں جو بڑھاپے میں اپنے بچوں کی صورتیں دیکھنے کو ترستے ہیں جو تن و تنہا اکیلے فلیٹوں میں زندگیاں گزارتے ہیں اور ایک دن تنہا کسی فلیٹ میں دم توڑ دیتے ہیں۔ ان کے مرنے کا علم بھی پڑوسیوں کے ذریعے بچوں کو ہوتا ہے۔ انسان مادی طور پر کتنی ترقی کر لے لیکن اگر وہ انسانی اقدار کی حفاظت نہیں کر سکتا، اپنے انسانی شرف کو برقرار نہیں رکھ سکتا تو وہ کبھی آسودہ اور مطمئن نہیں ہو سکتا۔

صالحہ کی ماں بہت سمجھدار اور نیک خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے بچوں کے دلوں میں کبھی باپ کے خلاف میل نہیں آنے دیا۔ وہ شوہر کی ہر سختی کے جواب میں بچوں کو یہی سمجھاتی تھیں۔

"بیٹے وہ تمہارے باپ ہیں، وہ کبھی تمہارا برا نہیں چاہیں گے...... اور یاد رکھو باپ تو وہ مالی ہوتا ہے جو اپنے لگائے ہوئے پودوں کی صحیح نشوونما کے لیے ان کی کانٹ چھانٹ کرتا ہے تاکہ پودے صحیح سمت میں پروان چڑھیں......" اسی لیے باپ کی زیادتیوں کے باوجود اسے اپنے باپ سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ اپنے باپ سے زیادہ دنیا میں کسی اور سے محبت نہیں کر سکتی لیکن جب اسے حامد سے محبت ہوئی تو وہ اس کی محبت میں ایسا گرفتار ہوئی کہ ساری محبتیں بھلا بیٹھی۔ حامد کی محبت امربیل کی طرح اس کے پورے وجود پر چھا گئی، جس نے پچھلی ساری محبتوں کا رس کشید کر کے انہیں بے جان اور مُردہ کر دیا۔ امربیل کا تو کام ہی یہی ہوتا ہے۔ وہ

جس پیڑ پر قبضہ کرلے۔ اس کو بے جان کر دیتی ہے اور خود پھیلتی ہے، اس کے اندر بھی حامد کی محبت اسی طرح پھیل رہی تھی کہ اب اسے حامد کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اسے اس کا چھوٹا سا ٹوٹا پھوٹا گندگی سے اٹا ہوا گھر بھی اچھا لگنے لگا۔ پہلے جب وہ کبھی اس کے گھر آتی تو چند لمحوں میں ہی اس کا دل اکتا جاتا لیکن اب وہ اس کے گھر آنے کے بہانے ڈھونڈتی رہتی۔

حامد کی ماں، حامد کا رشتہ لے کر آئیں تو اس کے گھر والے ششدر رہ گئے۔ بابا غصے سے کانپنے لگے۔

''کمال ہے ان لوگوں کی یہ مجال کہ وہ اپنے نکمے، ناکارہ بیٹے کے لیے میری بیٹی کا رشتہ لے کر آئیں۔ ان کی یہ جرأت کیسے ہوئی ؟'' غصے کے مارے ان کی زبان سے الفاظ ادا نہیں ہو رہے تھے۔

''اس میں جرأت کی کیا بات جہاں بیری ہوتی ہے وہاں پتھر آتے ہی ہیں۔'' اس کی ماں نے ہمیشہ کی طرح بہت سہولت سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

''مگر پتھر پھینکنے والوں کو یہ ضرور دیکھنا چاہیے کہ وہ کس گھر میں پتھر پھینک رہے ہیں۔ انہیں یہاں آنے سے پہلے اپنے صاحبزادے کے عادات و اطوار دیکھ لینے چاہیے تھے۔'' بابا مزید بھڑک اٹھے۔

''اس میں اتنا غصہ کرنے کی کیا بات...... آپ کو رشتہ پسند نہیں تو آپ انکار کر دیجیے۔'' اماں نے سر جھکا کر دھیرے سے کہا۔

''ظاہر ہے منع تو کروں گا ہی...... اپنی بیٹی کو اس جہنم میں تو نہیں دھکیل سکتا۔'' بابا نے اس سے پوچھے بغیر ہی اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اور دوسرے دن ہی اس رشتے سے انکار کا پیغام بھجوا دیا۔ جس پر حامد کے گھر والوں نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ حامد کی اماں اور خالہ ان کے گھر آگئیں۔ انہوں نے خوب لڑائی جھگڑا کیا...... اس کی ماں کو بے شمار صلواتیں سنائیں...... گھنی، میسنی اور نہ جانے کیا، کیا کہہ دیا۔ وہ ہراساں ہوگئی۔ کیا محبت کی زمین پر قدم جمانے کے لیے نفرتوں اور ذلتوں کے جھکڑ بھی سہنے پڑتے ہیں......؟ گھر میں شدید تناؤ پیدا ہوگیا تھا۔ بابا کو پتا چل گیا تھا اس رشتے میں صالحہ کی مرضی بھی شامل ہے۔ وہ شدید غصے میں تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ساری دنیا کو تہس نہس کر دیں...... یہ بات ان کی سوچ سے بھی ماوراتھی۔ جس بیٹی کو انہوں نے ساری دنیا سے چھپا کر رکھا...... زمانے کی ہوا سے بچانے کی کوشش کی...... انہوں نے تو اس پر ہر دروازہ بند کر دیا تھا پھر بھی نہ جانے کون سا روزن کھلا رہ گیا تھا۔ کون سے چور دروازے سے حامد نے ان کے گھر میں نقب لگائی تھی۔ وہ بظاہر خاموش تھی لیکن اس کے اندر محبت کا لاوا ابل رہا تھا۔ اس عمر کی محبت ایسی ہی جذباتی، جوشیلی اور جلا کر خاکستر کر دینے والی ہوتی ہے۔ حامد کے گھر والے اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے تھے ان کی طرف سے دھمکیاں ملنے لگی تھیں کہ اگر رشتہ منظور نہ کیا گیا تو وہ اس کے بھائی کو غائب کروا دیں گے اور پھر اس کا نام و نشان بھی نہیں ملے گا یہ دھمکی سن کر تو اس کی ماں لرز کر رہ گئیں۔ وہ جانتی تھیں حامد ایسا کر سکتا ہے جیسی اس کی صحبت تھی، اس کے لیے ایسا کرنا مشکل نہیں تھا۔ ان کی راتوں کی نیندیں اڑ گئیں انہوں نے زندگی میں پہلی بار اسے مارا، اسے مرنے کی بددعائیں دیں۔ وہ بھی حیران تھی۔ اسے حامد سے یہ امید نہیں تھی۔ وہ تو اسے بہت ہمدرد، شریف اور وطن سے محبت کرنے والا...... جوشیلا نوجوان سمجھتی تھی۔ اس کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایسی باتیں بھی کر سکتا ہے۔ اس کے دل میں حامد کے خلاف غبار چھا گیا۔ بابا اس سے بے حد محبت کرتے تھے۔ اسی لیے اس کی دھمکی کے جواب میں بھی بابا کی نہ ہاں میں نہیں بدلی لیکن چند دن بعد ہی محلے میں شور مچ گیا۔ ''حامد نے خودکشی کر لی......'' اس نے نیند کی گولیاں کھالی تھیں۔ سارا محلہ حامد کے گھر میں جمع تھا۔ اس کی ماں، بہنیں چیخ، چیخ کر بین کر رہی

تھیں۔ اسے اور اس کے گھر والوں کو کوسنے دے رہی تھیں جن کی وجہ سے اُن کا جوان بیٹا موت کے منہ میں پہنچ گیا تھا۔

وہ سب گھر میں محصور ہو گئے۔ اس کا دل پھر حامد کے لیے بے چین ہو گیا۔ وہ اپنی استانی کی منتیں کر کے رات کی تاریکی میں ان کے ہمراہ اسے دیکھنے اسپتال گئی تو اس کی حالت دیکھ کر جیسے اپنے حواس ہی کھو بیٹھی۔

"ان کی حالت تسلی بخش نہیں ہے آپ دعا کریں۔" ڈاکٹر کے جملے نے اس کا دل ہلا دیا...... اگر وہ زندہ نہ رہا...... یہ سوچ کر ہی وہ وہیں کھڑے، کھڑے جیسے مُردہ ہو گئی۔

"بیٹا جلدی چلو اگر تمہارے باپ کو پتا چل گیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" استانی جی جو اس کی منت سماجت کے بعد اس کے گھر والوں سے چھپ کر اسے اسپتال لے کر آئی تھیں اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئیں۔

"میں نہیں جاؤں گی...... اگر میں چلی گئی تو...... کہیں......" اس کا لہجہ کچھ ایسا ہی سنگین تھا کہ استانی جی حواس باختہ ہو گئیں۔

"ایسا نہ کہو بیٹا...... حامد کو کچھ نہیں ہوا، وہ بالکل ٹھیک ہے تم ابھی گھر چلو۔ ہم صبح دوبارہ آ جائیں گے......" انہوں نے سمجھایا۔

"مگر ڈاکٹر...... تو کہہ رہا ہے......" اس کا لہجہ زندگی سے عاری تھا۔

"ڈاکٹر کا کیا ہے وہ تو جو منہ میں آئے کہہ دیتے ہیں تم ابھی چلو...... ورنہ......" استانی جی بڑی مشکل سے بہلا پھسلا کر اسے گھر لے آئیں لیکن جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو بابا کو اس کے آنے سے پہلے ہی اس کے جانے کی خبر مل چکی تھی۔

"تم کیا چاہتی ہو؟" انہوں نے خلافِ توقع اسے اپنے پاس بٹھا کر انتہائی نرمی سے پوچھا۔

"مجھے نہیں پتا...... مجھے کچھ نہیں معلوم......!"

وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو دی۔

"اگر تمہیں مرنے کی اتنی شدید خواہش ہے تو میں تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کروں گا۔ ٹھیک ہے میں یہ رشتہ منظور کرتا ہوں...... تم......" انہوں نے بیوی کی طرف رخ کیا...... "تم حامد کے گھر والوں سے کہہ دو کہ وہ اگلے جمعے کو بارات لے کر آ جائیں۔"

"بابا...... با...... با......" وہ ششدر کھڑی انہیں دیکھتی رہ گئی۔

"واقعی اولاد سب سے بڑی آزمائش ہے، میں نے اپنی بیٹی کو سات پردوں میں چھپا کر پالا تھا تا کہ کسی کی میلی نظر اس پر نہ پڑے مگر مجھ سے غلطی ہو گئی، میں نے تمہیں دنیا کی نظروں سے تو چھپا لیا لیکن تمہیں نیک اور بد کی پہچان کرانا بھول گیا۔" بابا کا چہرہ اتنا زرد ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس پر ہلدی مل دی ہو۔

حامد کی حالت سدھرنے لگی۔

وہ زندگی کی طرف لوٹ آیا اور پھر اس کے اسپتال سے آنے کے دو دن بعد ہی ان دونوں کی شادی ہو گئی۔

☆☆☆

شادی کے بعد چند دن بھی خوشگوار نہ گزرے، اسے ولیمے کے بعد ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نے اپنے لیے بڑے گھاٹے کا سودا کر لیا تھا۔ وہ واقعی جنت سے نکل کر جہنم میں آ گئی تھی۔ محبت کا دریا جتنی تیزی سے چڑھا تھا اتنی ہی تیزی سے اترنے لگا تھا اور اس اترتے ہوئے دریا میں کیا کچھ بہہ رہا تھا۔ یہ صرف وہی جانتی تھی۔

حامد اپنی ماں کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور ماں اس کی محبت میں شراکت برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔

ولیمے کے تیسرے دن جب حامد گیارہ بجے تک اپنے کمرے سے نہ نکلا تو انہوں نے اس کے کمرے کا دروازہ پیٹ ڈالا۔

"بے حیائی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے گھر میں تیری ماں بہنیں موجود ہیں۔" حامد شرمندہ ہو کر کمرے سے نکلا تو اس کے سارے بہن بھائی کمرے میں آ گھسے اور چند لمحوں میں کمرے کی کوئی چیز بھی اپنے ٹھکانے پر موجود نہیں تھی۔ وہ خاموش بیٹھی بچوں کی تخریب کاری دیکھتی رہی اور باہر اماں، حامد کو نہ جانے کیا کچھ سناتی رہیں جو اس کے اور اس کے گھر والوں کے خلاف تھا۔ وہ ڈرتے، ڈرتے جب اپنے کمرے سے باہر آئی تو سارے گھر میں ولیمے کے بچے ہوئے قورمے اور بریانی کی بُو بسی ہوئی تھی۔ اسے ابکائی آنے لگی۔ وہ ناشتے کا انتظار کر رہی تھی تو اس کی نند نے ولیمے کا بچا ہوا قورمہ اور پراٹھے اس کے سامنے رکھ دیے۔

"ولیمے کا قورمہ تو ایسا لذیذ تھا کہ ابھی تک لوگ مجھ سے باورچی کا پتا پوچھنے آ رہے ہیں۔" حامد کے ابا سامنے چارپائی پر بنیان اور پاجامہ پہنے لیٹے تھے۔ اٹھنے کی زحمت گوارا کیے بغیر ہی قورمے کی تعریف میں رطب اللسان ہوئے۔

"ہاں جی، ہمیں تو یہی فکر تھی کہ کچھ ہو نہ ہو کھانا بہت عمدہ ہو...... بارات کے کھانے پر لوگوں نے جو، جو باتیں بنائی تھیں ان کے منہ بھی تو بند کرنا تھے۔" حامد کی اماں نے کچن میں بیٹھے، بیٹھے ہانک لگائی۔

"لوگوں کو تو باتیں بنانے کی عادت ہوتی ہے ورنہ بارات کا کھانا تو بہت مزیدار تھا۔" حامد نے گھبرا کر اسے دیکھا اور بات بنائی۔

"خاک اچھا تھا...... سالن میں گوشت تو نام کو نہیں تھا سارے چھیچھڑے بھر دیے تھے۔" اماں کے اندر لحاظ اور مروت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

"خاموش ہو جا...... بک بک نہ کر، تیری شادی کا کھانا کیسا تھا؟ بھول گئی اس میں تو چھیچھڑے بھی نہیں تھے۔" حامد کے ابا بھی لنگوٹ کس کر میدان میں آ گئے۔

"مجھے پتا تھا کہ تو نے یہی کہنا ہے، میری بارات کا کھانا تو یاد ہے، ولیمے کا کھانا بھول گیا۔ بساندھ بھرا سالن اور لسٹری ہوئی بریانی آدھے سے زیادہ مہمانوں کے پیٹ خراب ہو گئے تھے۔" اماں اس کی ماں کی طرح صبر اور برداشت والی تھوڑی تھیں، اُن کی زبان تو بچھو کے ڈنک سے زیادہ تیز اور زہریلی تھی۔ نہ وہ خاموش ہو سکتی تھیں اور نہ حامد کے ابا...... دونوں میں اتنی تو تکار ہوئی کہ حامد کے باپ نے زمین سے جوتا اٹھا کر اُنہیں کھینچ مارا۔ جس پر اس کی ماں نے حامد کے باپ کی سات پشتوں کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ وہ یہ سب دیکھ کر سوکھے ہوئے پتے کی طرح لرزنے لگی۔ بابا نے صحیح کہا تھا۔ "اس نے اس جہنم کو اپنے لیے خود چنا تھا۔" شادی کے تیسرے دن ہی اسے یہ احساس ہو گیا تھا۔

☆☆☆

ان کے گھر کا یہی معمول تھا۔ اماں سارا دن محلے میں پھرتی رہتیں چھوٹی بہنیں ٹی وی دیکھتیں یا رسالے پڑھتیں۔ گھر کے کاموں سے عورتوں کو کوئی مطلب نہیں تھا۔ آئے دن کھانا بازار سے آتا۔ کبھی سالن پک جاتا تب بھی روٹی بازار سے آتی۔ گھر میں صفائی کے نام پر صرف جھاڑو دی جاتی۔ ہفتوں بستروں پر ایک ہی چادر بچھی رہتی، ہفتہ پندرہ دن میں کبھی کبھار ڈسٹنگ ہو جاتی۔ جب کپڑوں کا انبار جمع ہو جاتا تو کچھ کپڑے نکال کر دھو لیے جاتے۔ باورچی خانے کا حال کچھ زیادہ ہی ابتر تھا۔ جھوٹے برتن سنک میں بھنکتے رہتے۔ جب کھانے کا وقت ہوتا تو ضرورت کے برتن دھو لیے جاتے۔ چولھوں پر میل کی تہوں پر تہیں جمع تھیں اور مسالے، دالیں وقت کے وقت بازار سے آتیں۔ پورے کچن میں چوہوں اور کاکروچوں کی حکومت تھی۔

شروع میں اس نے کوشش کی کہ گھر کی حالت کو بہتر بنائے لیکن اپنی تمام تر کوششوں کے بعد بھی وہ انہیں

سدھار نہ سکی۔ وہ اسی افراتفری اور ابتری کا حصہ بن چکے تھے بلکہ اب تو وہ اس کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ صفائی، سلیقے اور ڈسپلن سے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ وہ گھر کو صاف ستھرا رکھنے کی کوشش کرتی تو سب الجھنے لگتے۔ اسے طعنے دیے جاتے۔ اس کے سلیقے کا مذاق اڑایا جاتا۔ وہ نماز پڑھتی تو اسے مُلّانی کا خطاب ملتا۔ وہ صاف ستھری رہتی تو اسے چھمک چھلو کہا جاتا۔ وہ کھانا اچھا پکاتی تو اس کا تعلق باورچیوں کے خاندان سے جوڑا جاتا۔ لگتا تھا کہ سب کی آنکھوں پر برائی کے پردے پڑ گئے تھے جہاں سے اس کی ہر اچھائی، برائی بن کر نظر آتی پھر ایک دن قدرت کو اس پر رحم آ گیا۔

حامد کی اپنے گھر والوں سے شدید جھڑپ ہو گئی۔ اس نے اپنی بہن کو چادر کے بغیر گھر سے باہر جانے پر منع کیا تو اس کی اماں نے فوراً صالحہ کو باتیں سنانی شروع کر دیں پھر پورا گھر حامد اور اس کے خلاف بولنے لگا جیسا کہ ہمیشہ ہی ہوتا تھا۔ ہر بات کی تان ان دونوں کی محبت پر آ کر ٹوٹتی تھی۔ جو لڑکیاں ماں، باپ کی مرضی کے خلاف محبت کی شادیاں کرتی ہیں وہ ساری زندگی اپنے اس ناکردہ گناہ کی سزا سسرال والوں کے طعنوں، تشنوں کی صورت میں سہتی ہیں اور کبھی کبھی تو خود شوہر بھی بیوی کے اس جرم کو معاف نہیں کرتا۔ اس کے ساتھ خدا کا کرم یہ تھا کہ اب تک حامد اس کے خلاف نہیں ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ گھر والوں کے سامنے اس کی حمایت کرتا اور یہی بات اس کے گھر والوں کو اچھی نہیں لگتی تھی۔ حامد نے ہمیشہ کی طرح اس کی طرف داری کی تو بات بڑھتی چلی گئی۔ جس کی لپیٹ میں اس کے نیک، پرہیزگار ماں، باپ بھی آ گئے پھر بات اس حد تک پہنچ گئی کہ حامد کے باپ نے انہیں اسی وقت گھر سے نکل جانے کا حکم صادر فرما دیا۔ حامد نے غصے سے اس کا ہاتھ تھاما اور گھر سے باہر آ گیا۔

ایک ہفتہ وہ حامد کی پھوپی کے گھر میں رہی جو اپنی بھاوج کی دشمنی میں اس سے بہت پیار اور محبت سے ملتی تھیں لیکن ان کے چھوٹے سے غربت زدہ گھر میں اتنی گنجائش کہاں تھی کہ وہ ایک کمرا ان دونوں کے لیے مختص کر دیتیں۔ دو دن بعد ہی ان کا رویّہ بدلنے لگا۔ زبان کی شیرینی میں کڑواہٹ گھلنے لگی۔ حامد گلاس بنانے والی فیکٹری میں سپروائزر تھا۔ اس نے مالکان سے کچھ رقم ادھار لے کر ایک کمرے کا چھوٹا سا گھر کرائے پر لے لیا۔ گھر بہت چھوٹا تھا اور فرنیچر بھی سسرال میں تھا۔ اس نے اپنا زیور بیچ کر ضرورت کا فرنیچر اور گھر کا سامان خریدا اور وہ اس چھوٹے سے گھر کو اپنی محنت اور محبت سے سنوارنے میں جُت گئی۔

گھر کا ہر کونہ اس کی محنت اور سلیقے سے جگمگانے لگا لیکن حامد کچھ زیادہ خوش نہیں تھا۔ اسے اپنے گھر والے بہت یاد آتے تھے اور جب اسے گھر والے زیادہ یاد آتے تو وہ اپنا غصہ اس پر اتارا کرتا اور بھول جاتا کہ یہی وہ لڑکی تھی جس کے لیے اس نے جان دینے کی کوشش کی تھی۔ وہ اکثر کہتا...... ''سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تمہاری نحوست نے مجھے میرے گھر والوں سے دور کر دیا۔'' وہ اٹھتے بیٹھتے اسے طعنے دیتا اور وہ اپنی ماں کی طرح خاموشی اور صبر سے ہر بات برداشت کرتی رہتی کسی سے کیا کہتی اپنے ہاتھوں سے گڑھا اس نے خود ہی کھودا تھا۔

حامد صبح کا نکلا ہوا شام کو گھر آتا پھر دوسرے چکروں میں گھر سے نکل جاتا۔ وہ سارا دن اکیلی گھر کی دیواریں تکتی رہتی۔ ماں، باپ کے گھر کا دروازہ تو پہلے ہی بند ہو چکا تھا۔ صرف ایک استانی جی کا گھر تھا جہاں وہ جا سکتی تھی اور وہ اس سے ملنے آ سکتی تھیں۔

☆☆☆

''تم نے اپنی تعلیم کا سلسلہ کیوں ختم کر دیا......؟''

.... استانی جی اس کے گھر آئی ہوئی تھیں تو اس نے انہیں دوپہر کے کھانے پر روک لیا تھا اور ان کے لیے خاص طور پر توری گوشت کا سالن اور دال چاول بنائے تھے۔ وہ کھانا کھاتی جا رہی تھیں اور ہر نوالے

پر اس کی تعریفیں کر رہی تھیں۔ کھانے کے دوران انہوں نے ایک دم ہی اس سے یہ سوال کر لیا۔

''آپ کو تو پتا ہے حامد کے گھر میں پڑھنے لکھنے کا کوئی رواج نہیں وہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔'' اس نے چاول پر دال ڈالتے ہوئے افسردہ لہجے میں کہا۔

''اب تو تم ان لوگوں سے الگ ہوگئی ہو۔ اب حامد کو سمجھا بجھا کر دوبارہ سے اس سلسلے کو شروع کرو۔'' استانی جی نے غور سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''پتا نہیں حامد بھی راضی ہوں یا نہیں......'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ حامد نے تو خود بڑی مشکل سے رو رو کر میٹرک کیا تھا اور اسے یقین نہیں تھا کہ وہ اسے مزید پڑھنے کی اجازت دے گا۔

''تم اسے پیار سے سمجھاؤ' وہ ضرور راضی ہو جائے گا۔''

''مجھے نہیں لگتا......'' وہ برتن سمیٹتے ہوئے بولی۔

''حامد فطرتاً برا نہیں ہے اور کوئی بھی فطرتاً برا نہیں ہوتا۔ میں نے اسے بچپن میں پڑھایا تھا۔ وہ بہت ذہین بچہ تھا اسے تو اس کے گھر والوں نے برباد کر دیا ہے۔ شکر کرو تم ان لوگوں سے الگ ہوگئیں اب تم آہستہ آہستہ اسے اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتی ہو۔'' استانی جی نے کھانے کے بعد اپنے بٹوے سے سونف نکالی اور پھانکتے ہوئے اسے مزید سمجھایا۔ ان کی باتیں اس کے دل کو لگ رہی تھیں۔

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں۔ حامد اپنے گھر والوں سے بالکل الگ طبیعت کے ہیں۔ بس جب غصے میں آجائیں تو بالکل اپنی ماں کی طرح لگتے ہیں۔'' اسے دراصل حامد سے بہت محبت تھی اور استانی جی کی زبان سے شوہر کی تعریفیں اسے اچھی لگ رہی تھیں۔

''تمہاری ساس کے بارے میں کیا کہوں...... کچھ بھی کہوں گی تو غیبت میں شمار ہوگا اور میں اپنی زبان کو کسی کی غیبت سے ناپاک کرنا نہیں چاہتی۔ خدا اس عورت کو ہدایت دے۔'' استانی جی باتوں، باتوں میں اسے سبق پڑھا رہی تھیں۔ استانی جی بالکل اکیلی تھیں۔ چند سال پہلے ان کے شوہر کا انتقال ہوگیا تھا۔ بال بچہ کوئی تھا نہیں بہن، بھائی اپنے، اپنے گھروں میں مگن تھے۔ وہ خود بی اے، بی ایڈ تھیں پہلے گورنمنٹ اسکول میں پڑھاتی تھیں پھر ریٹائرمنٹ کے بعد شوہر کی زندگی میں ہی گھر پر بچوں کو تعلیم دینی شروع کر دی تھی جس کی وجہ سے محلے والے ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ وہ بھی ہر موقع پر سب کے کام آتی تھیں۔ انہیں جب پتا چلا کہ صالحہ کو تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق ہے لیکن اس کے بابا اسے کسی کے گھر بھیجنے کے لیے راضی نہیں تو انہوں نے خود اس کے گھر جا کر اسے پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ بابا بھی ان کی بہت عزت کرتے تھے لیکن جب وہ صالحہ کو لے کر حامد سے ملانے اسپتال گئی تھیں تب سے وہ ان کے شدید مخالف ہوگئے تھے، وہ سمجھتے تھے ان کی بیٹی کو بگاڑنے میں استانی جی کا ہاتھ ہے۔

''میری بات کو اچھی طرح اپنے پلو سے باندھ لو۔ وقت کو ضائع نہیں کرو...... یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ اس وقت کو علم حاصل کرنے میں صرف کرو...... ورنہ وقت تو گزر ہی جائے گا اور تم خالی ہاتھ رہ جاؤ گی۔'' استانی جی جاتے، جاتے اسے مزید نصیحتیں کر کے چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد اس نے برتن دھو کر رکھے کچن کو پھر سے صاف ستھرا کیا۔ گھڑی دیکھی ابھی تو صرف تین ہی بجے تھے۔ وہ ظہر کی نماز پڑھ چکی تھی۔ عصر کی نماز میں وقت تھا اس نے کتابوں کے ریک سے اپنی پرانی کتابیں اٹھائیں۔ کتابوں کے ورق پلٹتے ہوئے وہ کسی اور دنیا میں چلی گئی۔ ذہن کی سطح پر جمی ہوئی کائی اترنے لگی اور سوچیں صاف شفاف پانی میں غوطے کھانے لگیں۔ روح پر چھائی ہوئی بے کیفی کی تہیں اتریں تو وہ اپنے آپ کو

بہت تازہ دم اور خوش محسوس کرنے لگی۔
شام کو حامد گھر آیا تو اسے بھی اس میں بڑی تبدیلی محسوس ہوئی۔ ''بہت خوش نظر آرہی ہو، کوئی خاص بات ہے کیا......؟''
''آج استانی جی آئی تھیں۔'' اس نے چائے کی پیالی اسے تھماتے ہوئے اطلاع دی۔
''اوہو......'' وہ اس کی خوشی کی وجہ سمجھ گیا۔ وہ بھی استانی جی کو بہت پسند کرتا تھا۔
''خالہ کہہ رہی تھیں مجھے اپنی تعلیم دوبارہ شروع کردینی چاہیے۔''
''استانی جی اس کے سوا اور کیا کہہ سکتی ہیں......'' وہ چائے پیتے ہوئے مسکرا کر بولا۔
''وہ تو یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ آپ بھی دوبارہ سے پڑھنا شروع کردیجیے۔'' اس نے موقع غنیمت جان کر اسے بھی آمادہ کرنا چاہا۔
''میں......؟'' حیرت سے اسے اچھو ہوگیا۔
''کیوں......؟ جب میں پڑھ سکتی ہوں تو آپ کیوں نہیں پڑھ سکتے۔''
''تمہاری بات اور ہے پر میرا ذہن ایسا نہیں ہے۔ میں نے تو پتا نہیں کس طرح میٹرک پاس کیا تھا......'' حامد نے صاف، صاف انکار کردیا۔
''آپ کوشش تو کریں ہم دونوں ساتھ پڑھیں گے......اگر کوئی مشکل ہوگی تو میں مدد کردیا کروں گی۔''
''نہیں ہرگز نہیں...... اس عمر میں پڑھتا ہوا اچھا لگوں گا......؟''
''علم کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی...... اور آپ کون سا بوڑھے ہوگئے ہیں۔'' اس نے استانی جی کے جملے دہرائے۔
''ہم جیسے بچے تو بچپن سے ہی بوڑھے ہوجاتے ہیں، ہماری زندگیوں میں نہ بچپن آتا ہے نہ جوانی آتی ہے۔'' اس کا موڈ ایک دم ڈپریسڈ ہوگیا۔

''میں اپنا بی اے کا فارم بھجوا رہی ہوں۔ آپ کا ایف اے کا فارم بھی بھجوا دوں گی۔''

تم اپنا فارم ضرور بھجوا دو مگر میرا نہیں...... میں اب کچھ نہیں کر سکتا۔ میں گلاس فیکٹری میں سپروائزر ہوں اور ساری زندگی یہی کام کرتا رہوں گا۔ یہ ڈگریاں مجھے افسر نہیں بنا سکتیں۔'' وہ دونوں ہاتھ سر کے نیچے کر کے پلنگ پر لیٹ گیا۔

''کیا ہوا...... کیا فیکٹری میں کسی سے جھگڑا ہو گیا......؟'' وہ محبت سے بولی۔

''کسی کی جرأت ہے مجھ سے جھگڑا کرے، اس کا سر نہ توڑ دوں۔'' وہ خونخوار لہجے میں بولا تو وہ سہم گئی۔

دروازے پر دستک ہو رہی تھی...... وہ سمجھ گئی۔ وہی لوگ اسے لینے آئے ہوں گے۔ شادی سے پہلے وہ اس کی ان سرگرمیوں سے جتنی مرعوب ہوتی تھی اب اتنا ہی چڑنے لگی تھی۔ کیونکہ ان لوگوں نے نوجوانوں کے ہاتھوں میں اسلحہ تھما کر ان کے مستقبل کو مزید تاریک کر دیا تھا۔

''میں بہانہ بنا دوں کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''ہرگز نہیں، آج بہت اہم میٹنگ ہے۔ میرا جانا بہت ضروری ہے۔'' وہ چابی سے چلنے والے کھلونے کی طرح فوراً اٹھ بیٹھا۔

''میں جا رہا ہوں۔ شاید دیر سے آؤں تم دروازہ اچھی طرح بند کر لینا۔''

☆☆☆

''میں نے حامد سے بات کر لی ہے، انہیں کوئی اعتراض نہیں، اب آپ جلدی سے مجھے فارم منگوا دیجیے۔'' وہ دوسرے دن حامد کے فیکٹری جانے کے بعد استانی جی کے گھر پہنچ گئی۔

''صرف تمہارے لیے یا حامد کے لیے بھی؟'' استانی جی بہت جہاں دیدہ خاتون تھیں۔

''ابھی صرف میرے لیے...... حامد تو مزید پڑھنے کے لیے بالکل راضی نہیں ہو رہے۔'' اس نے اپنی اور حامد کے درمیان ہونے والی گفتگو ان کے گوش گزار کر دی۔

''کوشش کرو کہ وہ بھی راضی ہو جائے۔ ورنہ ایسا نہ ہو کہ تمہارے آگے بڑھنے کی لگن اس کے اندر احساسِ کمتری پیدا کر دے۔''

''حامد ایسے نہیں ہیں، وہ میری ہر بات میں حوصلہ افزائی کرتے ہیں شادی سے پہلے بھی جب میں مضامین لکھتی تھی تو سب سے زیادہ تعریف کرتے تھے۔''

''پہلے کی بات اور تھی۔ مرد جب شوہر بن جاتا ہے تو اس کے خیالات اور احساسات یکسر بدل جاتے ہیں۔ عورت کا فرض ہے کہ بیوی بننے کے بعد وہ شوہر کے احساسات کو سمجھنے کی کوشش کرے۔'' استانی جی نے اسے بڑے پیار سے سمجھایا۔

''میں انہیں بھی راضی کر لوں گی آپ پہلے میرا فارم تو بھجوا دیں۔ کہیں دیر نہ ہو جائے۔'' وہ بہت بے قرار ہو رہی تھی۔

''اچھا، اچھا...... میں آج ہی فارم منگوا لوں گی اور کل ہی بھجوا دوں گی۔ ابھی وقت ہے۔'' وہ اس کی جلد بازی پر مسکرا دی۔ انہیں اپنی اس معصوم سی جنون کی حد تک پڑھنے کی شوقین شاگرد سے بے حد محبت تھی۔

☆☆☆

اس کا فارم چلا گیا اور وہ ہر طرف سے بے نیاز ہو کر پڑھنے میں مگن ہو گئی تھی۔ ابھی امتحانوں میں ایک مہینہ باقی تھا کہ اسے اپنے اندر .... کچھ تبدیلی کا احساس ہوا۔

''اب کیا ہوگا...... میں امتحان کیسے دوں گی......؟'' وہ بری طرح گھبرا گئی۔ میکے جانے پر تو پابندی تھی۔ وہ استانی جی کے گھر آ گئی۔ وہیں اس کی ماں بھی اس سے ملنے آ گئیں۔ جنہیں اب شوہر کی طرف سے اتنی اجازت مل گئی تھی کہ وہ کسی اور جگہ بیٹی سے مل سکتی تھیں۔

''گھبرانے کی کوئی بات نہیں...... شروع کے مہینے ہیں تم آرام سے امتحان دے سکتی ہو۔'' اماں اور استانی جی نے اسے تسلی دی۔

حامد یہ خبر سن کر زیادہ خوش نہیں ہوا۔ اس نے اتنے بچے دیکھے تھے کہ اسے بچوں سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔

''تمہارے امتحانوں کا کیا ہوگا......؟'' اسے بچے سے زیادہ اس کے امتحانوں کی فکر تھی۔

''آپ فکر نہ کیجیے، میں امتحان دے لوں گی......'' اس نے حامد کو مطمئن کر دیا اور خود بھی مطمئن ہوگئی لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ ماں بننا آسان نہیں ہوتا۔ چند دن بعد سے اسے ایسی الٹیاں اور چکر شروع ہوئے کہ اس کا کتاب ہاتھ میں لینا محال ہوگیا۔ اس کی طبیعت کی خرابی کے پیشِ نظر حامد نے اس کی ماں کو گھر آنے کی اجازت دے دی اور اس کے باپ نے بھی اس کی ماں پر سے یہ پابندی ہٹا دی کہ وہ بیٹی کے گھر نہ جائے۔ اس کی ماں دن میں ایک بار اس کے پاس آتیں لیکن استانی جی صبح کو نماز کے بعد ہی اس کے پاس آجاتیں۔ اس کے لیے دونوں وقت کا کھانا تیار کرتیں اور وہ ان کو دیکھ کر یہ سوچتی۔

''دنیا انہی جیسے لوگوں کی وجہ سے قائم ہے۔'' بے غرض، نیک، پُرخلوص، محبتوں سے بھری ہوئی استانی جی اس کے ہر درد کا درماں تھیں وہ اور اس کی ماں اسے لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گئیں جن کی دوا سے وہ اس قابل ہوگئی کہ امتحان میں بیٹھ سکے۔

☆☆☆

امتحانوں کے سات ماہ بعد اس کی بڑی بیٹی شاہدہ پیدا ہوئی۔ سسرال والے اتنے کٹھور ہوگئے تھے کہ پوتی کی خبر سن کر بھی اسے دیکھنے نہ آئے۔ حامد کو شدید غصہ تھا اور اب وہ اس غصے کا اظہار جا بے جا ہر بات پر کرنے لگا۔ جتنی تکلیف اسے اپنے گھر والوں کے رویّے سے پہنچتی اتنی ہی تکلیف وہ اسے پہنچاتا۔

شاہدہ کی پیدائش کے چار سال بعد عابد پیدا ہوا جب تک اس نے امتیازی نمبروں سے اردو لٹریچر میں ماسٹرز کر لیا اور اس دوران حامد کی منت سماجت کر کے اسے بھی بی اے کروا دیا۔ پھر وہ ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھانے لگی۔ حامد جس فیکٹری میں کام کرتا تھا وہ اچانک بند ہوگئی یوں وہ بے روزگار ہوگیا۔ ادھر سیاسی گروپ سے بھی ان بن ہوگئی۔ انہوں نے اس پر بہت تشدد کیا۔ وہ ملک اور ملک کی سیاست سے سخت متنفر ہوگیا لیکن اب انہیں چھوڑنا بہت مشکل تھا۔ اس کی زندگی خطرے میں تھی۔ وہ اسے اور بچوں کو لے کر ایک بہت غیر آباد کچی بستی میں رہنے لگا جو خالصتاً گھروں میں کام کرنے والی ماسیوں کی آبادی تھی، یہ سارا وقت اس نے بہت ہمت اور حوصلے سے گزارا اور پھر قسمت اس پر اس طرح مہربان ہوئی کہ اسے ایک بہت بڑے انگلش میڈیم اسکول میں اردو کی ٹیچر کی حیثیت سے نوکری مل گئی اور وہ بھی اس طرح کہ وہ ایک دن اس اسکول کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ اسکول کے پاس روز کے معمول کے خلاف رش دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے چوکیدار سے پوچھا۔

''یہاں ٹیچروں کے انٹرویو ہو رہے ہیں۔''

''کیا میں پرنسپل سے مل سکتی ہوں؟''

''آپ اندر جا کر پوچھو۔''

چوکیدار اسے بہت خوب صورت سے آفس میں لے گیا جہاں دو لیڈی کلرک بیٹھی تھیں۔ انہوں نے اسے غور سے دیکھا ان میں ایک اس کے پرانے اسکول کی ساتھی تھی وہ اس کے کام آگئی۔ اس نے صالحہ سے فوراً درخواست لکھوائی اور انٹرویو کی فائل میں لگا دی۔

''اتفاق سے آج اردو کی ٹیچرز کے لیے ہی انٹرویو ہو رہے ہیں...... اچھا ہوا تم آگئیں۔ میں موقع ملتے ہی میڈم سے بات کرتی ہوں۔'' اس نے سب سے نظریں بچا کر دھیرے سے اسے سمجھایا۔

وہ انتظار میں ویٹنگ روم میں جا کر بیٹھ گئی۔ بیٹھے بیٹھے شام ہوگئی سب چلے گئے۔ اس کی ساتھی اسے لے کر میڈم کے آفس میں آگئی۔ میڈم اور ان کے ساتھ بیٹھی ہوئی دو خواتین کسی بات پر قہقہے لگا رہی تھیں۔ اس کا تعارف کرایا گیا۔ انہوں نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ اردو کی ٹیچر نے اس کا نام پوچھا پھر نام سن کر وہ چونک گئیں۔

''آپ مضامین لکھتی ہیں؟''

''جی......'' وہ اعتماد سے بولی۔

''آپ بہت اچھا لکھتی ہیں، میں بہت شوق سے آپ کے مضامین پڑھتی ہوں۔'' انہوں نے کھل کر تعریف کی۔

''شکریہ......''

''ہمیں آپ جیسی ہی ٹیچر کی ضرورت ہے۔ جس کا ادبی بیک گراؤنڈ ہو۔ آپ ہمیں اس بورڈ پر چند لائنیں لکھ کر دکھا سکتی ہیں۔'' میڈم نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھ کر کہا۔ اس نے چاک اٹھائی اور سامنے دیوار پر لگے ہوئے گرین بورڈ پر غالب کا ایک مشہور شعر لکھ دیا۔ اس کی رائٹنگ اتنی خوب صورت تھی جیسے کسی نے لفظ لفظ میں موتی پرو دیے ہوں۔ اسے اسی وقت اپائنٹمنٹ لیٹر دے دیا گیا۔ وہ لیٹر لے کر گویا ہواؤں میں اڑتی ہوئی گھر آگئی۔

زندگی کا چلن ایک دم بدل گیا۔ اس کی تنخواہ بہت اچھی تھی پھر دونوں بچوں کے داخلے کی بھی آسانی تھی۔ اس نے چند ماہ میں اپنا گھر بھی بدل لیا اور حلیہ بھی......اسکول کے مالکان بہت مضبوط اور طاقتور لوگ تھے۔ انہوں نے حامد کو سیاسی وابستگی سے آزاد کرالیا۔ وہ لوگ ماسیوں کی کچی آبادی سے نکل کر مڈل کلاس آبادی میں ایک صاف ستھرے گھر میں آگئے تھے۔ کچھ عرصے بعد جب اس کی نوکری پکی ہوگئی تو اس نے حامد کو بھی ٹیوشن دلوا دیے۔ حامد کو بھی گریجویشن کے بعد پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہوگیا تھا پھر اسے گلاس فیکٹری میں کام کرنے سے زیادہ بچوں کو تعلیم دینے کا کام زیادہ اچھا لگا۔ اس نے پوری دیانت داری اور تندہی سے پڑھانا شروع کیا......اس کے پاس بھی طالب علموں کی تعداد بڑھنے لگی۔ انہوں نے گھر بدل کر آمنے سامنے دو فلیٹ لے لیے، ایک میں حامد نے ٹیوشن سینٹر کھول لیا اور دوسرے میں رہائش اختیار کرلی۔ سب کچھ اچھا تھا۔ حامد کا رویہ اس کے ساتھ بہت اچھا تھا وہ اسے اور بچوں کو بہت چاہتا تھا لیکن وہ اسے اور بچوں کو نہ اپنے گھر والوں اور نہ خاندان والوں سے ملنے دیتا اور نہ اسے اس کے گھر اور خاندان میں جانے کی اجازت دیتا۔ جبکہ بابا نے تو شاہدہ کی پیدائش کے بعد اسے معاف بھی کردیا تھا اور اسے گھر آنے کی اجازت بھی دے دی تھی لیکن اب اس کے شوہر نے اس پر پابندیاں عائد کردی تھیں حد یہ ہوگئی تھی کہ جب اس کے اکلوتے بھائی کی شادی ہوئی تب بھی بڑی منت سماجت کے بعد وہ اسے صرف ہال میں ہی لے گیا اور وہاں سے مہمانوں کی طرح وہ گھر آگئی۔

اسی طرح جب اس کے بابا کا انتقال ہوا تو بھی وہ غیروں کی طرح باپ کے جنازے میں شریک ہوئی۔ حامد، سسر کی تدفین کے بعد اسے اور بچوں کو لے کر گھر آگیا۔ عورتوں نے حیرت سے انگلیاں دانتوں میں دبالیں۔ کوئی بیٹی اتنی بھی سنگ دل ہوسکتی ہے۔ ایک دن بھی ماں کی دلجوئی کے لیے ماں کے گھر نہ رہ سکی۔ پھر باپ کے مرنے کے چند سال بعد ماں کا انتقال بھی ہوگیا۔ اس میں بھی وہ مہمانوں کی طرح شریک ہوئی۔ ماں، باپ کے مرنے کے بعد صرف بھائی بچا تھا۔ اب حامد کے رویے میں اتنی لچک پیدا ہوگئی تھی کہ وہ اسے بھائی سے ملنے سے نہیں روکتا تھا۔ بھائی اس کے گھر آسکتا تھا اور وہ بھائی کے گھر جاسکتی تھی۔ بھائی سے فون پر بات کرسکتی تھی۔ اس کے لیے

یہی بہت تھا لیکن اب بھائی بھی نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

شام کا ملگجا اندھیرا رات کی تاریکی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس نے لائٹ بھی نہیں جلائی وہ اندھیرے میں بیٹھی تھی اور اندھیرے میں ہی بیٹھنا چاہ رہی تھی۔ اسے روشنی سے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

''کیا بات ہے تم نے لائٹ کیوں نہیں آن کی؟'' حامد نے آ کر ٹی وی لاؤنج کی لائٹ آن کر دی تو اسے شدید غصہ آ گیا۔

''یہ لائٹ بند کر دیں۔ مجھے سخت وحشت ہو رہی ہے۔''

''کیا ہوا......؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے......'' حامد اس کے قریب آ گیا۔

''مجھے کیا ہونا ہے؟ میں بہت سخت جان ہوں، میرا سب کچھ ختم ہو گیا۔ میں پھر بھی زندہ ہوں......'' زندگی بھر کا غبار تھا جو نکلنے لگا تھا۔

''حوصلہ کرو...... صبر کرو...... جو دنیا میں آیا ہے اسے جانا ہی ہوتا ہے۔'' حامد نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''پلیز یہ سب نہ کہیں...... مجھے کچھ نہیں سننا......'' وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بے آواز رونے لگی۔

''میں تمہارے دکھ کو سمجھتا ہوں......'' حامد نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''میرے دکھ کو آپ سمجھتے ہیں؟'' اس نے حامد کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی کیفیت تھی کہ حامد کو بے اختیار نظریں چرانی پڑیں۔

''آپ نے کبھی میرے دکھ کو نہیں سمجھا...... اور آپ...... میرے دکھ کو...... سمجھ ہی نہیں سکتے......'' اس کا لہجہ کرب سے بوجھل تھا۔

''میں سمجھ سکتا ہوں۔'' حامد کی آنکھیں بھی خون چھلکانے لگیں۔ ''تم سمجھتی ہو صرف تم نے اپنے والدین اور بھائی کی جدائی کا دکھ سہا ہے......'' حامد ضبط کی انتہائی منزلوں سے گزر رہا تھا۔

''میں جانتی ہوں...... آپ کے گھر والوں نے آپ سے تعلق ختم کر دیا تو آپ نے میرا تعلق میرے میکے سے ختم کروا دیا۔'' اس نے انتہائی سفاکی سے حقیقت بیان کی۔

''تم غلط سمجھتی ہو یہ وجہ نہیں تھی......'' حامد کا لہجہ بھی سخت ہو گیا تھا۔

''پھر کیا وجہ تھی......؟''

اس کے سوال پر حامد کا چہرہ غم سے تاریک ہو گیا۔

''آپ نے میرے بچوں کو سارے خاندان سے الگ کر کے دنیا میں تنہا کر دیا۔ میرے بچے خاندان سے کٹ کر رہ گئے۔ آپ کو اندازہ ہے وہ کتنے اکیلے ہیں......'' وہ زور، زور سے چلانے لگی۔

''ہاں...... ہاں میں نے انہیں خاندان سے الگ کر دیا...... کیوں......؟ اس لیے کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ لوگوں کی آنکھوں میں اپنے باپ کے لیے حقارت دیکھیں...... تمسخر دیکھیں...... لوگوں سے سنیں کہ ان کا باپ وہ بزدل اور کمزور دشمن ہے جس نے محض ایک عورت کی خاطر زہر کھا لیا تھا۔''

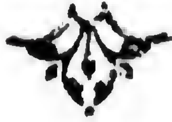
''کیا...... کیا......؟'' اس نے بے یقینی سے حامد کی طرف دیکھا۔

حامد کا چہرہ اس کے کہے ہوئے الفاظ کی تصدیق کر رہا تھا۔

زندگی کے بے شمار روز و شب مٹھی بھری ریت کی طرح اس کے ہاتھوں سے پھسلنے لگے...... تو آخر کار ساری عمر کی ریاضت کا یہ پھل ملنا تھا۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا...... سارا مان ٹوٹ گیا تھا...... طوفان آ کر گزر چکا تھا...... اب کچھ باقی نہیں بچا تھا...... ہر طرف گھٹن تھی...... اور یہ گھٹن بڑھتی جا رہی تھی۔ تازہ ہوا کا آخری در بھی بند ہو گیا تھا۔



مکمل ناول



ہمیں درکار ہے تو

سمیرا یونس ہارون

''بھئی! آج تو ملکۂ عالیہ کی خوشی دیدنی ہے۔ چہرہ یوں لائٹیں مار رہا ہے جیسے کسی کی چمکتی چندیا۔'' حسن بھائی نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتی اپنی زوجہ سارہ کو دیکھا اور بیزار سی صورت بنائے بیٹھی ماہین ابراہیم کو آنکھ مار کر ازراہِ شرارت کہا۔

آج کا سورج اس گھر کے مکینوں کے لیے جوش و خروش بھری مصروفیات لیے طلوع ہوا تھا۔ گھر بھر کا لاڈلا، راج دلارا خضر عباس، چار سال بعد لندن سے



ایم بی اے کی ڈگری لیے لوٹ رہا تھا۔ سومی اور مما صبح سے کچن کو رونق بخشے ہوئے تھیں۔

سارہ نے میکے میں قدم رکھتے ہی اپنے تین برس کے فرزندار جمند ''ارتضٰی'' کو اس کے والد کے سپرد کیا اور ملازمہ کے سر پر کھڑے ہو کر گھر کی تفصیلی صفائی کی ٹھانی۔ نانی امی بھی نواسے کی محبت میں دوڑی آئی تھیں اور اب کچن سے لاؤنج اور لاؤنج سے لان تک کا ہانپتا کانپتا سفر بیٹیوں اور ملازمین کو ہدایات دیتے ہوئے جاری وساری تھا۔

اس سارے منظر میں ایک ماہین ابراہیم تھی، جس کی بیزاری ولاتعلقی، ماضی میں خضر کے ساتھ گزارے ہوئے اُن لمحات کی مرہونِ منت تھی جو اتنے خوشگوار ہرگز نہیں تھے۔

خضر کے نام کے ساتھ ہی اسے وہ تھپڑ بڑی شدّ و مد سے یاد آجاتا تھا جو اس کی ماں نے زندگی میں پہلی بار اسے مارا تھا اور یہ 'پُرتشدد' واقعہ بھی خضر کی ''مہربانی'' کا ہی نتیجہ تھا۔ سو اس نے تھپڑ سہنے کے بعد خضر سے زندگی بھر بات نہ کرنے کا قصد کرتے ہوئے سوچا۔

''بابا، اس کے باپ ہونے کے باوجود تایا ہونے کی حیثیت سے میری زندگی میں ہمیشہ اہمیت رکھیں گے۔ اور مما، خالہ ہونے کی حیثیت سے میرے لیے ہمیشہ قابلِ احترام رہیں گی مگر اس سے مجھے کوئی رشتہ منظور نہیں۔ نہ تایازاد کا، نہ خالہ زاد کا۔'' جس روز اس نے یہ فیصلہ کیا اسی روز گھر کے بڑوں نے خضر کے ساتھ اس کا منگیتر کا رشتہ ''تخلیق'' کر کے ایک اور رشتے کا اضافہ کر دیا تھا اور یہ نیا رشتہ تو اس کے لیے بالکل قابلِ قبول نہیں تھا۔ کیونکہ چہرے پر پانچ انگلیوں کا ڈیزائن بھی تو اس رشتے سے انکار کی بدولت ہی پرنٹ ہوا تھا۔

''بھئی! تو ملکۂ عالیہ کی خوشی دیدنی کیوں نہ ہو؟ پورے چار برس بعد اپنے اکلوتے بھائی کی صورت دیکھوں گی۔''

گھر بھر مسرور تھا اور مصروف بھی...... سوائے ماہین ابراہیم کے۔ پیپرز کا بہانہ بھی خوب تھا۔ ہاتھ میں کتاب دھوکا دینے کا بہترین ذریعہ بنی ہوئی تھی جبکہ ذہن اس مصروفیت میں لگا ہوا تھا کہ صبح سے لے کر خضر کی آمد تک یہ مخصوص فقرہ...... ''چار برس بعد خضر لوٹ رہا ہے۔'' کتنی بار مختلف انداز میں مختلف زبانوں سے ادا ہوا تھا۔

''کیا بات ہے، ہماری گڑیا کچھ اداس ہے یا پھر بور ہو رہی ہے؟'' حسن بھائی نے اس کی بیزار صورت دیکھ کر استفسار کیا۔

''ہائے، کیا بتاؤں حسن بھائی! کہ اس دلِ نازک پر کیا، کیا بیت رہی ہے۔ اس نازک سی جان کو بڑا قوی دکھ لاحق ہے۔'' اس نے محض سوچا اور بس اتنا کہا۔

''پیپرز کی پریشانی نے سکھ برباد کیا ہوا ہے...... میرا ہائے، میں بیچاری۔'' اس نے آہِ سرد بھری۔

''جب سے ہوش وشعور کی دنیا میں قدم رکھا خود کو والد سے محروم پانے کے باوجود ممی کو ہمیشہ اپنی طرف شیر کی نگاہ سے دیکھتا پایا۔ البتہ اس خضر کے بچے کے واری صدقے ہو رہی ہوتی ہیں۔'' آج پھر ماضی کے واقعات نئے سرے سے یاد آرہے تھے۔

''پیپرز کو تو تم فضول ہی اعصاب پر سوار کرتی ہو۔ میں جب اسٹوڈنٹ تھا ایگزام کے دوران بھی.... بے فکری سے جیتا تھا اور پیپر سے محض ایک روز قبل کتاب کھول کے دیکھتا تھا۔'' حسن بھائی نے ارتضٰی کو صوفے پر لٹایا اور خود سینٹرل ٹیبل پر پاؤں پھیلا کر کسی قدر.... بے پروائی سے اپنا ماضی کا کارنامہ سنانے لگے۔

''صرف ایک روز پہلے......؟'' حیرت سے اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ ''پھر کلیئر ہو جاتے تھے؟''

''ہاں، شاندار طریقے سے۔'' عجب بے نیازی سی بے نیازی تھی۔

''وہ کیسے؟''

''اب اگر سارے راز بتا دوں تو تم تو میری پکی سہیلی بن جاؤ گی۔'' حسن بھائی نے ایک دم بے مروتی دکھائی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر وہ راز چھپا کر بھی

عیاں کر گئے تھے۔

''یقیناً ''بوٹیاں'' تیار کرتے ہوں گے۔ اتنی ہمت خود میں پاتی تو میں بھی یقیناً یہی کرتی۔'' پڑھائی سے بیزار دل کو پاس ہونے کا ''عام پاکستانی طریقہ'' بڑا بھایا۔

''دیکھوں تو سہی ہماری زوجہ محترمہ کہاں رہ گئی ہیں۔ بڑی دیر سے صورت نہیں دکھائی۔ خواہ مخواہ ہی خود کو کنوارا محسوس کر کے خوش ہو رہا ہوں۔''

''تو جب تک وہ اپنے درشن نہیں کراتیں، اس وقت تک خوش ہولیں۔ خوشی صحت کے لیے نقصان دہ تو نہیں۔'' حسن بھائی کی بات سے وہ بدمزہ ہوئی۔

''درست...... خوشی بالکل نقصان دہ نہیں مگر حقیقت پسندی میں بھی کافی فوائد پوشیدہ ہیں جو میں تمہیں کبھی فرصت میں بتاؤں گا۔ اب تم رٹے لگاؤ، میں چلا۔''

''رٹے کیسے لگاؤں۔ کسی کام میں دل ہی نہیں لگ رہا۔ خوشی کے چار برس کتنی جلدی بیت گئے۔'' اس نے اِک ٹھنڈی آہ بھر کے سوچا۔

''پہلے ہی موصوف خود کو بڑی توپ چیز سمجھتے تھے۔ اب تو شاید مزاج ہی نہ ملیں۔'' دل بہلنے کو کسی طور آمادہ ہی نہیں تھا۔

''خیر مجھے اس سے کیا غرض، چاہے مزاج ملیں نہ ملیں مگر ایک بات طے ہے، میں جو اس سے منگنی توڑنے اور زندگی بھر بات نہ کرنے کا قصد کیے بیٹھی ہوں، اسے نبھانا ہے۔'' خود سے یہ عہد ان چار برسوں میں وہ کتنی بار کر چکی تھی کوئی حساب تھا نہ شمار۔ بہرحال مگر وہ یہ عہد کرنے کے بعد مطمئن ضرور ہو جاتی تھی لیکن آج دل عجیب بے اطمینانی کا شکار تھا۔

''ماہین!'' اسی پل نانو اسے آواز دیتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔

''جی نانی امی۔'' اس نے گردن موڑ کے دیکھا۔

''نانی امی کی جان، صبح سے کتاب میں آنکھیں لگائے بیٹھی ہو۔ تھوڑا ریسٹ کر لو۔'' نانی امی نے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بادام کے حلوے کی پلیٹ اسے تھمائی اور چائے سینٹرل ٹیبل پر رکھی۔

''تمہاری ماں کا تو بس نہیں چلتا کہ وہ پوری کتاب کو تعویذ کی طرح پانی میں گھول کر تمہیں پلا دے۔ بس گریڈ شاندار بننا چاہیے، چاہے اس کے حصول کے لیے بچہ نیم جان ہو جائے۔'' اسے بڑی پاورفل ''پارٹی'' کی سپورٹ حاصل ہو گئی تھی سو اس نے کتاب کے ساتھ حلوے کی پلیٹ بھی سینٹرل ٹیبل پر رکھ دی۔

''سارے امپورٹنٹ سوال یاد کر لیے ہیں نانی امی، اب سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔'' کہنے کے ساتھ وہ نانی امی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

اسے بگاڑنے میں سارا ہاتھ نانی امی کے لاڈ کا تھا جس کا اظہار ممی برملا کرتی تھیں مگر نانی امی کی غیر موجودگی میں۔

''بس کافی ہے۔ پڑھائی کو زیادہ حواسوں پر سوار کرنے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری ماں سے میں خود نمٹ لوں گی۔'' ''محفوظ مستقبل'' کی گارنٹی ملتے ہی اس نے موبائل ہاتھ میں لیا اور اپنے من پسند کام میں لگ گئی۔

''سکھیو! ''پرنس چارلس'' کے آنے میں فقط چند گھنٹے رہتے ہیں۔ گھر میں چراغاں کر دیا گیا ہے۔ راہوں میں گلِ گلاب بچھا دیے گئے ہیں اور میرا دل اس وی آئی پی پروٹوکول پر اگر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا ہے تو میرے خیال کے مطابق یہ اتنا حق تو رکھتا ہی ہے۔'' میسج ٹائپ کر کے اس نے اپنی دوستوں کے گروپ کو سینڈ کر دیا جسے اس کی دوست زنیرا، سحاب اور دعا نے بیک وقت ریسیو کیا۔

''ہاں، ناشکرے لوگ اتنا حق تو رکھتے ہی ہیں۔'' ماہین کا ٹیکسٹ تینوں کے پاس پہنچا تھا مگر ان کے قائم کردہ اصولوں کے تحت جواب صرف زنیرا کی طرف سے آیا تھا اور اب زنیرا کا ریپلائی بھی تینوں کے نمبرز پر پہنچا تھا۔

ان چاروں نے ''ڈسٹری بیوشن لسٹ'' میں اپنا

ایک گروپ بنا رکھا تھا۔ جس کے سبب میسج بیک وقت سب دوستوں کے پاس پہنچتا تھا۔ اس طرح وہ سارا دن ایک دوسرے سے گپیں لگاتی رہتی تھیں۔ یعنی چھٹی کے بعد بھی وہ ساتھ، ساتھ ہوتی تھیں۔

''اب اس میں ناشکری کی کیا بات ہے؟'' خفا، خفا سے انداز میں اس نے میسج سینڈ کر دیا۔ اصول کے مطابق اگلے ٹیکسٹ کے ریپلائی کی ذمے داری سحاب پر تھی۔ سو چند لمحوں بعد ہی میسج ریسیو ہو گیا۔

''ڈیئر! پرنس چارلس تمہارے گھر تشریف لا رہے ہیں اور تمہارا دل پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ اسے ناشکری کے علاوہ اگر کچھ اور کہیں تو کیا؟ تم بتا دو۔''

''میرے ماضی کے متعلق سب کچھ جانتے ہوئے بھی، تم لوگوں کی مجھ سے بھنگڑے ڈالنے کی توقع نے مجھے بالکل متحیر نہیں کیا... کیونکہ تم لوگوں کی طوطا چشمی تو میں نے اسی روز دیکھ لی تھی جس روز تم لوگ اس پرنس کی تصویر دیکھ کر میری پروا چھوڑ کر اس کے گن گانے لگی تھیں۔'' اس نے غصے سے میسج سینڈ کیا اور موبائل آف کر کے ایک طرف ڈال دیا۔

''سارے کے سارے غدار میرے ہی نصیب میں ہیں۔'' یہ ایک جملہ تو گویا اب اس کا تکیہ کلام بنتا جا رہا تھا۔ اس نے نانی امی کی گود میں سر گھسیڑ کر آنکھیں موند لیں۔

''فقط چند گھنٹے ہیں سکون کے۔ جونہی بیتیں گے، اطمینان بھی تمام ہو گا۔'' ذہنی رو ایک بار پھر بہک گئی۔

''مگر جس طرح اس نے ماضی میں میرے ساتھ دھوکے اور ڈرامے کیے۔ اب اسے ایسے کسی بھی مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔'' ماضی کی سوچوں سے چھٹکارا پانا محال ہوا تو تھک ہار کر اس نے دھیان بٹانے کی بیکار مشقت ترک کر کے دل کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

☆☆☆

''سارہ! اگر single entry میں payment میں expenses ہو اور ڈیٹا میں accrude ہو تو بیلنس شیٹ میں ڈیٹا والی رقم لیں گے یا دونوں کو جمع کر کے ریکارڈ کریں گے؟'' خضر نے عین اس لمحے کن انکھیوں سے ماہین کو دیکھتے ہوئے موضوع بدلا، جب ماہین کو اپنا پسندیدہ موضوع چھیڑے محض چند پل ہی گزرے تھے۔

چند ماہ بعد سارہ کے گریجویشن کمپلیٹ کرتے ہی اس کی شادی متوقع تھی اور آج کل ''سارہ کی شادی'' ایک ایسا موضوع تھا جسے چھیڑنے کے بعد اگر اسے منٹوں میں ختم کرنا پڑتا تو وہ بدمزہ ہو جاتی اور اس وقت خضر کی یہ مداخلت اس لیے بھی ناگوار گزری تھی کہ یہ حرکت دانستہ اس کو چڑانے کے لیے کی گئی تھی۔

''بس اتر آیا اپنی وہی تھرڈ کلاس، گھٹیا حرکتوں پر...... کہنے کو آئی کام مگر حرکتیں وہی جاہلوں جیسی۔ خدا جانے کیا عداوت ہے اسے مجھ سے۔ جہاں میرا پسندیدہ موضوع شروع ہوا، وہیں اپنی ٹانگ اڑا کر میرا ناپسندیدہ موضوع چھیڑ دیتا ہے۔'' وہ بڑبڑا رہی تھی۔ خضر نے اسے چڑانے کے لیے موضوع بدل دیا ہے۔ یہ ماہین کا خیال تھا تو کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔

خضر اس کو چڑانے میں کامیاب ہو جانے کے بعد اب اپنی مخصوص دل جلانے والی مسکراہٹ لبوں پر سجائے کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ منہ پھلائے اپنے بائیں طرف لگے درختوں کی قطار پر نگاہیں جمائے ہوئے تھی۔ جہاں کوؤں کی بارات اتری ہوئی تھی۔ وہ تینوں اس وقت واک کے ارادے سے نکلے تھے۔

''تم کیا کوؤں کی گنتی کر رہی ہو؟'' ایک بار پھر وہ اس کا دل جلانے کے لیے پوزیشن سنبھال چکا تھا۔

''جی...... تمہیں کوئی اعتراض؟'' دل کی کھولن کو چھپاتے ہوئے اس نے بظاہر سکون سے کہا۔

''نہیں بھئی، مجھے کیوں اعتراض ہونے لگا۔'' اس نے سکون سے کہا۔ ''بلکہ اچھا ہے اس طرح تمہیں گنتی تو آ جائے گی۔'' وہ اسے تپانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔

پڑھائی سے خاص لگاؤ نہ ہونے کے باعث رزلٹ بھی گزارے لائق آتا تھا۔ ''نالائق اسٹوڈنٹ'' کے طعنے سے جب بھی موقع ملتا، ماہین کو ضرور نوازا جاتا۔

''میں تمہارے منہ نہیں لگنا چاہتی۔ بہتر ہے تم اپنی بکواس خود تک ہی محدود رکھو۔'' وہ زیادہ دیر تک خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش میں کامیاب نہ ہوسکی اور چیخ اٹھی۔

''اُف میرے خدا! یار تم تو ہتھے سے ہی اکھڑ جاتی ہو۔ اچھا سوری...... یہ لو چاکلیٹ کھاؤ۔'' اس نے جیب سے چاکلیٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔

''مجھے نہیں کھانی۔''

''لے بھی لو، اب کیا تمہاری منتیں کروں؟'' اس نے زبردستی اس کے ہاتھ میں چاکلیٹ تھمادی۔

وہ اکثر اسے زچ کرنے کے بعد اس کی فیورٹ چاکلیٹ سے ہی اس کا موڈ بحال کرتا تھا۔ سو اس وقت بھی اس نے چاکلیٹ اس کے ہاتھ سے لے کر کھول لی تھی مگر اگلے پل اس کا چہرہ خفت اور شرمندگی کے مارے سرخ پڑ گیا...... چاکلیٹ کے خالی ریپر میں مزید ریپر ڈال کر اسے نہایت خوب صورتی سے چاکلیٹ کی شکل دی گئی تھی۔ خفت اور غصے نے بیک وقت یلغار کی۔

''تم جیسے بے ہودہ شخص سے جتنی اوچھی حرکتوں کی توقع رکھی جائے کم ہے۔'' اس نے پوری قوت سے چاکلیٹ کے خالی ریپر اس کے منہ پر مارے اور تیز، تیز قدموں سے ان سے آگے نکل گئی۔

''تمہیں خدا جانے کیا پڑی رہتی ہے ہر وقت اسے تنگ کرنے کی۔'' سارہ نے بیزار سی صورت بنا کر اسے ٹوکا تو اس کے لبوں پر مچلتی محظوظ سی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی اور وہ سیٹی پر ٹائی ٹینک سونگ کی دھن بجاتا ماہین کے پیچھے چل دیا۔

☆☆☆

''سارہ! اگر فارغ ہو تو پلیز مجھے یہ سوال سمجھا دو۔'' وہ سارہ کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بولی مگر اگلے پل وہاں خضر کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی اس کا موڈ آف ہوگیا اور آج سہ پہر کا واقعہ دوبارہ اپنی پوری جزئیات کے ساتھ ذہن کی اسکرین پر چلنے لگا۔

کل اس کا میتھس کا ٹیسٹ ہونا تھا۔ معمول کے مطابق وہ دونوں اپنے، اپنے ٹیسٹ کی تیاری لاؤنج میں بیٹھ کر کررہے تھے۔ سارہ چونکہ اپنی دوست کی برتھ ڈے پارٹی میں گئی تھی لہٰذا آج کے دن اس کی ٹیوٹر ممی تھیں۔ گھر اور کچن کے باقی کام بھی نمٹانے کے سبب ممی ٹیوٹر کے فرائض زیادہ خوبی سے انجام نہیں دے پارہی تھیں، سو اسے ٹیسٹ کی تیاری کا کہہ کر خود کچن میں کسی کام سے چلی گئیں اور جس وقت اسے لگا کہ اب جمائیاں لے، لے کر اس کا جبڑا اتر جانے والا ہے تب اس نے خضر کو کہتے سنا۔

''آؤ ماہین! بیڈمنٹن کھیلیں۔'' اس نے اپنے ہاتھ میں موجود کتاب کو سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ اس نے شاید ٹیسٹ کی تیاری کرلی تھی۔

''میں کل کے ٹیسٹ کی تیاری کررہی ہوں۔'' اگرچہ ایسی پُرکشش آفر کو ٹھکرانے پر اس کے دل نے بڑے زبردست طریقے سے احتجاج کیا مگر اس نے بظاہر سکون سے جواب دیا۔

''ٹیسٹ تو کل ہوگا ناں، ابھی تو بہت ٹائم ہے، رات کو کرلینا۔''

''ممی آکر ابھی ٹیسٹ لیں گی۔'' اس کے لہجے میں کچھ، کچھ پسپائی تھی۔

''میں کہہ دوں گا کہ میں نے لے لیا ہے۔'' وہ مسلسل اسے اکسا رہا تھا۔

''وہ ثبوت مانگیں گی۔''

''نہیں مانگیں گی، میری بات ہی ثبوت ہے۔'' ماہین کو اس کا فخر سے کہنا ایک آنکھ نہیں بھایا۔ لیکن بات سچ تھی۔ وہ گھر کے ہر فرد کی نظر میں نہایت ذمے دار اور سمجھ دار بچہ تھا۔

''اب چلو بھی۔'' اس نے اسے سوچوں میں

گھرے دیکھ کر ہاتھ پکڑ کے اٹھایا۔ دل تو پہلے ہی بے ایمان ہو رہا تھا سو فوراً اٹھ گئی۔

"ماہین!" ابھی انہیں کھیلتے ہوئے بہ مشکل پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ امی نے لان میں آ کر اسے پکارا۔ وہ ہڑبڑا کے پلٹی۔ خضر کی سروس کروائی گئی شٹل کاک اس کے کندھے پر آ کر لگی۔

"جی ممی۔" اس نے کاندھا سہلاتے ہوئے ممی کو جواب دیا۔

"آپ شاید ٹیسٹ کی تیاری کر رہی تھیں۔" ممی نے تیز لہجے میں تفتیش کا آغاز کیا۔

"کر لی ممی۔" اس نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔ "اور میں نے خضر کو ٹیسٹ بھی دے دیا ہے۔"

"وہاٹ؟" خضر وہیں سے چیخا۔ "تم نے کب مجھے ٹیسٹ دیا ہے؟ ماہین! اتنا جھوٹ نہیں بولتے۔" اس نے طوطا چشمی کی حد کر دی۔

"خضر......!" صدمے سے اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

"ممی! جھوٹ بول رہا ہے یہ۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"جھوٹ بول رہا ہوں تو دکھا دو آنی کو وہ ٹیسٹ کاپی جس میں تم نے ٹیسٹ دیا ہے۔"

"دو منٹ میں اندر آؤ ماہین تم۔" ممی حکم صادر کر کے چلی گئیں۔ ماہین نے شکایتی نگاہوں سے اسے گھورا۔

"مجبوری تھی ڈیئر، اگر ایسا نہ کرتا تو یقیناً کل تم ٹیسٹ میں فیل ہو جاتیں اور پھر مجھ ایسے ذہین بندے کی کزن اگر فیل ہو جاتی تو بے عزتی تو میری ہی ہوتی ناں۔" اس کے لبوں پر وہی مسکراہٹ تھی جو اس کے دل کو جلا کے رکھ دیتی تھی۔

"اتنا ہی اپنی بے عزتی کا خیال تھا تو پھر کھیلنے کی آفر کیوں کی؟ کرنے دیتے مجھے ٹیسٹ کی تیاری۔" وہ اس کے جلنے کڑھنے سے محظوظ ہوتا ہے۔ یہ خیال اسے غصہ ضبط کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔

"یار! بوریت بھی تو دور کرنی تھی ناں۔" اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔ غصہ ضبط کرنا بہت مشکل ہو گیا۔ اس نے پوری قوت سے ریکٹ اس کی طرف اچھالا۔ اگر وہ بروقت اچھل کر سائڈ پر نہ ہو جاتا تو اس کے چہرے پر تجریدی آرٹ کا شاہکار نمودار ہو چکا ہوتا۔

"اللہ کرے تم خود ہی کل ٹیسٹ میں فیل ہو جاؤ۔" وہ تن فن کرتی اندر بڑھ گئی۔

اور اب اس وقت میتھس کا وہی سوال وہ سارہ سے سمجھنے آئی تھی جس سے اگر وہ شام میں نمٹ لیتی تو اس وقت سکون سے سو تو سکتی تھی۔

"ہاں، ہاں...... کیوں نہیں، آؤ میں سمجھا دیتا ہوں۔ آخر مشکل وقت میں اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں۔" اسے دیکھتے ہی وہ پھر فارم میں آ گیا۔

"فارمولے والے سوال ہیں۔ ٹیلی ہی نہیں ہو رہے۔" وہ مکمل طور پر اسے نظر انداز کرتے ہوئے سارہ کے پاس بیڈ پر جا بیٹھی۔

"ماہین! پھر تم نے آنی کو وہ ٹیسٹ کاپی تو ضرور دکھائی ہو گی جس میں تم نے مجھے آج ٹیسٹ دیا تھا۔" وہ صوفے سے اٹھ کر بیڈ پر اس کے سامنے آ بیٹھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی جبکہ ڈارک براؤن آنکھوں میں بلا کی شرارت ناچ رہی تھی۔

"خضر! کچھ دیر خاموش ہو جاؤ۔ مجھے سوال سمجھانے دو اسے۔" پیشتر اس کے کہ وہ کوئی جواب دیتی، سارہ نے مداخلت کر کے اسے خاموش کرا دیا اور وہ بھی بڑے آرام سے بیٹھ کر اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ جونہی وہ سوال سمجھ کر اٹھنے لگی وہ پھر بول اٹھا۔

"تم نے بتایا نہیں ماہین کہ آنی نے پھر تمہارے ساتھ کون سا میچ کھیلا؟ ریسلنگ یا پھر باکسنگ......؟" غصہ تو اسے اس قدر آ رہا تھا کہ وہ گلدان اٹھا کر اسے دے مارتی مگر اس نے بڑی مشکلوں سے غصہ ضبط کیا اور اس کی بات کو نظر انداز کرتی باہر آ گئی۔

''لگتا ہے اس بار ناراضی شدید نوعیت کی ہے۔'' ماہین کے مسلسل خاموش رہنے پر اس نے نتیجہ اخذ کیا۔''اب کیا، کیا جائے؟''

''تم کچھ نہیں کرو۔ وہ خود ہی کچھ کر لے گی۔'' سارہ نے میگزین کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔

''کل ویک اینڈ ہے۔ محترمہ خصوصی طور پر تمہیں ڈانٹ پڑوانے کے لیے نانی امی کی طرف جائیں گی۔ پیچھے، پیچھے تم بھی پہنچ جانا۔ نانی امی کی ڈانٹ سن کے، اس سے ایکسکیوز کر کے، تین چار روز ہنسی خوشی گزار لینا اور پھر اپنی ''اوقات'' پر آجانا۔ ویسے ایک بات بتاؤ......'' وہ میگزین ایک طرف ڈال کر مکمل اس کی طرف متوجہ ہوئی۔''تمہیں جب اس کی ناراضی کی اتنی پروا ہے تو اسے اتنا تنگ ہی کیوں کرتے ہو؟''

''پتا نہیں یار۔'' اس نے گود میں رکھا کشن اچھالا اور جمائی لیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

اگلے دن ان کی توقع کے عین مطابق وہ کھانے کی میز پر ممی سے نانی امی کی طرف جانے کی اجازت طلب کر رہی تھی۔ اسے ساری دنیا میں نانی امی ہی اپنی واحد ہمدرد و غمگسار نظر آتی تھیں جو اس کی بات سمجھتی تھیں۔ ورنہ ممی کی نظر میں تو وہ نہایت نکمی اور بے وقوف تھی۔ اپنے اندازے کے صحیح ہونے پر وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیے۔

☆☆☆

اس نے نانی امی کی عدالت میں رو دھو کے اور نہایت مظلوم بن کے خضر کے مظالم کا مقدمہ درج کرایا۔ نانی امی نے اسی وقت فون کھڑکا کے خضر کو پیشی کے لیے بلوا لیا تھا لیکن خضر چونکہ اس روز کچھ مصروف تھا لہٰذا اس نے اگلے روز لنچ کے بعد آنے کا وعدہ کر لیا تھا۔

وعدے کے مطابق وہ سارہ کے ساتھ لنچ کے بعد پہنچ گیا تھا اور اب سر جھکا کر پچھلے آٹھ منٹ سے نانی امی سے ڈانٹ کی ''کلاس'' لے رہا تھا۔ بغیر اپنی صفائی میں ایک لفظ کہے۔

''چلو اب ایکسکیوز کرو ماہین سے۔'' بالآخر جج صاحب نے فیصلہ سنا دیا۔

''کیا......؟'' وہ یوں چیخا جیسے اسے کسی معمولی جرم میں پھانسی کی سزا سنا دی گئی ہو۔

''غضب خدا کا، پچھلے دس منٹ سے اس کی وجہ سے ڈانٹ میں سنے جا رہا ہوں اور اب معافی بھی میں ہی مانگوں۔ یہ نہیں ہو سکتا، یہ انصاف نہیں ہے نانی امی۔'' اس نے احتجاج کیا۔

''تو اب تم مجھے سکھاؤ گے کہ کیا انصاف ہے اور کیا نہیں۔ چلو سوری کرو فوراً۔''

''نانی امی! میں......'' اس نے پہلو بدلا۔

''خضر!'' نانی امی نے آنکھیں دکھائیں۔

''اوکے نانی امی! صرف آپ کے کہنے پر معذرت کر رہا ہوں۔'' جھوٹ موٹ کی اکڑ دکھانا بھی ضروری تھا۔

''جی تو ملکۂ عالیہ......!'' وہ اس کی سمت متوجہ ہوا۔''خادم سے آپ کی شان میں گستاخی کرنے کی خطا سرزد ہو گئی ہے۔ ازراہِ کرم اس خاکسار کی خطا سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اسے اپنے سایۂ عاطفت میں لے کر اس کی عزت افزائی فرما دیجیے۔'' اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر ماہین کے سامنے جھکتے ہوئے کہا۔

''دیکھا نانی امی آپ نے! کس قدر طنزیہ معذرت ہے......سیدھی طرح یک حرفی سوری نہیں کہہ سکتا تھا۔ اتنا لمبا چوڑا بیان دینے کی کیا ضرورت تھی؟'' وہ اب بھی ناخوش تھی۔

''اچھا بابا، سوری، سوری!'' اس نے باقاعدہ کان پکڑ لیے۔

''بس چندا اب ختم کرو۔'' نانی امی نے چمکارتے ہوئے کہا۔''اب میں جا رہی ہوں اپنے کمرے میں تم لوگوں کی لڑائی میں میرے آرام کا وقت نکل گیا۔'' لنچ کے بعد ان کا کچھ دیر آرام کرنا لازمی امر تھا۔

''سولہ سال کی ہو گئی ہو ماہین! لیکن ابھی تک

بچپنا نہیں گیا۔ اب کیا تمہیں جب بھی کوئی مسئلہ ہوگا تو اسی طرح دادو کے پاس آؤ گی؟'' یہ تمسخر اڑاتا انداز ان کے اکلوتے ماموں کی اکلوتی بیٹی زرناز کا تھا۔ جس کی موجودگی کو وہ یکسر بھول گئے تھے لیکن اس نے پورا ''میچ'' لائیو دیکھا تھا اور اب تبصرہ کر رہی تھی۔ فیضان ماموں نے لومیرج کی تھی۔ بعد میں ''لو'' تو ختم ہو گیا البتہ ''میرج'' رہ گئی۔

فائزہ، فیضان کی کلاس فیلو تھیں اور ملک کے بڑے صنعت کار کی بیٹی تھیں۔ کسی کو خاطر میں نہ لانا فائزہ کا مشغلہ، غرور ان کی فل ٹائم جاب اور دوسروں کو حقیر جاننا ان کا مقصدِ حیات تھا۔ سوشل ورکر تھیں، گھر پر کم ہی ٹکتی تھیں۔ ان کی کوکھ سے جنم لینے والے دونوں بچے ماں کی ''پاؤڈر کاپی'' تھے۔ نہ صرف شکل صورت میں بلکہ مزاج میں بھی۔

بڑا بیٹا داؤد فیضان لمبے بال، ہاتھوں میں بینڈ اور کان میں بالی کی وجہ سے ان تینوں کی متفقہ رائے سے ''چھچھوری حسینہ'' قرار پایا تھا۔ ایم بی اے کے فائنل سمسٹر میں تھا اور گھر پر شاذ و نادر ہی پایا جاتا۔ اس کے سارے دوست اسی کی ''قسم'' سے تعلق رکھتے ہیں۔ لڑکیوں کو ٹشو پیپر کی طرح بدلنا اس کی ہابی تھی۔ مختصر طور پر اگر ایک حرفی تعریف کی جائے تو ذہن میں لفظ ''اوباش'' جلوہ افروز ہوتا۔

دوسرے نمبر پر بیٹی، جس کا نام تو زرناز تھا لیکن ان تینوں کے لیے یہ ''نک چڑھی'' تھی۔ مزاج میں اپنے بھائی کے برابر تلتی تھی۔ جینز اور سلیولیس ٹاپ کے علاوہ کسی دوسرے لباس میں لوگ اسے کم ہی دیکھتے تھے۔

وہ جب بھی نانی امی کے گھر آتے تو سوائے نانی امی کے باقیوں سے ملاقات شاذ و نادر ہی ہو پاتی اور اگر ملاقات ہو بھی جاتی تو بات ہیلو، ہائے سے آگے بڑھ کر طنز، تمسخر پر آرکتی۔

اس وقت بھی تینوں کو زرناز کا اپنے معاملے میں مداخلت کرنا ناگوار گزرا تھا مگر پیشتر اس کے کہ ماہین اس کی بات کا جواب دیتی، خضر بول اٹھا تھا۔

''ایکسکیوزمی! آپ کون؟'' اس نے دو منٹ میں بے عزتی کر دی۔

''میں، جس گھر میں تم بیٹھے ہو، اس کی مالک ہوں۔'' اس نے بھی فوراً جتایا۔

''اچھا...... کمال ہے۔'' خضر نے مصنوعی حیرت کا مظاہرہ کیا۔ ''میں نے تو سنا ہے یہ گھر زہرہ خاتون کا ہے۔'' اس نے نانی امی کا حوالہ دیا۔

''سنی سنائی پر کان نہیں دھرتے مسٹر۔'' اس نے ایک دم اٹھتے ہوئے کہا۔

''یہ گھر فیضان علی کا ہے۔ اس حساب سے زرناز فیضان کا بھی ہوا۔ اور زرناز اپنے گھر سے ناپسندیدہ ہستی کو دھکے دے کر بھی نکلوا سکتی ہے۔'' فلمی ہیروئن کی طرح ڈائیلاگ جھاڑتے، وہ دھڑ، دھڑ کرتی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

''یہ نک چڑھی، کچھ زیادہ ہی نک چڑھی نہیں ہو گئی۔ پچھلی بار بھی اس نے اچھے بھلے موڈ کا ستیاناس کر دیا تھا۔ کیا خیال ہے اس بار اسے کچھ سبق نہ سکھا دیا جائے؟''

''ایسے لوگ کسی بھی بات سے سبق حاصل نہیں کرتے۔ لہٰذا تمہاری کوشش رائگاں جائے گی۔'' سارہ نے اسے فضول مشقت سے بچانا چاہا۔

''سبق نہ سہی، سزا تو بنتی ہی ہے اس بدتمیزی پر... اسے بھی پتا چلنا چاہیے کہ آخر اس نے پنگا کس سے لیا ہے۔''

''اچھا تو کیا کر لو گے تم؟''

''میں تو اپنا کام بحسن و خوبی نمٹا لوں گا مگر تم لوگوں کو جو کرنا ہے وہ سن لو۔'' اس نے دونوں کے قریب کھسکتے ہوئے کہا۔

''سارہ! تمہیں یاد ہے جب تم سیکنڈ ایئر میں تھیں تب تم نے فرسٹ ایئر فول بنانے کے لیے مرچوں والے لڈو بنائے تھے؟''

''ہاں یاد ہے..... مگر اس بات کا یہاں کیا

ذکر؟"

"تم بس وہ لڈو مجھے بنا دو۔ اس وقت تمام ملازمین بھی سرونٹ کوارٹرز میں ہیں۔ تم جلدی، جلدی وہ لڈو بنا دو۔ زیادہ نہیں، بس تین چار کافی ہیں۔ تب تک میں ایک اچھا سا مٹھائی کا پیکٹ لے آتا ہوں۔ باقی کام لڈو بننے کے بعد کا ہے۔" وہ جلدی، جلدی ہدایات دیتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"بس جلدی یہ کام نمٹاؤ۔ میں ابھی دو منٹ میں واپس آیا۔"

وہ دونوں اس کی ہدایت پر اٹھ کر حکم کی تعمیل میں لگ گئیں۔ وہ مٹھائی کا خالی پیکٹ لیے پانچ منٹ میں آ گیا تھا اور پسی ہوئی مرچوں والے لڈو بیس منٹ میں بن گئے تھے۔ خضر نے ان لڈوؤں کو نہایت خوب صورتی سے پیک کر دیا۔

"اب اِس نک چڑھی کی کسی فرینڈ کا نام پتا چل جائے تو ہم اس کے نام سے یہ لڈو اِس تک پہنچا دیں مگر پتا نہیں اس نک چڑھی کی کوئی دوست ہے بھی یا نہیں۔" خضر نے استفہامیہ نگاہوں سے دونوں کی طرف دیکھا۔ جواباً دونوں نے لاعلمی کے اظہار کے طور پر کندھے اچکائے۔

"ایک کام کرو سارہ! تم سرونٹ کوارٹر کی طرف جاؤ اور عبدل کو بلا لاؤ۔ دھیان رہے صرف عبدل...... باقی کوئی یہاں نہ آنے پائے۔ پھر میں باہر سے کال کر کے نک چڑھی کو بلواؤں گا۔ جب وہ فون سننے نیچے آئے گی تو تم دونوں اس کے کمرے میں جا کر اس کی ڈائری یا اس کے موبائل سے اس کی کسی ایک دوست کا نام معلوم کر کے آ جانا۔ بس اتنا کام کرنا پھر مجھے میرے موبائل پر مس بیل دے دینا۔ میں سمجھ جاؤں گا کہ کام ہو گیا۔" اس نے اپنے اگلے اقدام سے آگاہ کرتے ہوئے ہدایات دیں۔

سارہ، عبدل کو چائے بنانے کے بہانے بلا لائی تھی۔ عبدل کے آنے کے دو منٹ بعد ہی لاؤنج میں رکھا فون بج اٹھا تھا۔ عبدل نے فون اٹینڈ کیا اور پھر

غزل

روح ہے گریہ کناں اور آنکھ اشکبار ہوئی
زندگی درد سے بوجھل و بے قرار ہوئی
کاٹ لی صعوبتیں تو مجھے یاد آیا
میں تو سچ بولنے کی ہی خطاوار ہوئی
کوئی بھی تو میرا ہمدرد و ہمنوا نہ ہوا
مجھ سے تو اپنی ہستی بھی بیزار ہوئی
ہے تماشا در و بام سے دیکھا کیجیے
میرے لٹنے کی رسوائی تو سر بازار ہوئی
ہے بھلا کون میری راہ کے کانٹے جو چنے
زندگی میری تو ازل سے ہی خاردار ہوئی
میرے شکوے تو فقط اپنی تسلی کے لیے ہیں
ورنہ کچھ کہنے کی نہ جراتِ اظہار ہوئی
ہے تباہی کا سفر اور منتظر ہے زمر
کب پلٹ آئے وہ منظر جب ساعتِ بہار ہوئی

شاعرہ: زمر نعیم، لاہور

ہولڈ کروا کر وہ زرناز کے روم کی سمت بڑھ گیا۔ اس کے روم میں جاتے ہی دونوں نے برق رفتاری سے زرناز کے برابر والے روم میں پناہ لے لی۔ تاکہ زرناز کے نکلتے ہی وہ اس کے روم میں بغیر کسی کی نظروں میں آئے داخل ہو سکیں۔

قسمت ان کا ساتھ دے رہی تھی کیونکہ زرناز کے نکلتے ہی جیسے ہی وہ اس کے روم میں آئیں سامنے ہی انہیں موبائل نظر آ گیا جس سے اس کی ایک نہیں کئی فرینڈز کے نام معلوم ہو گئے۔ کام مکمل ہوتے ہی انہوں نے کمرا چھوڑنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگایا اور چپکے سے لان میں آ کر خضر کے فون پر بیل دے دی۔

پانچ منٹ بعد ہی خضر صاحب خراماں، خراماں گیٹ سے انٹر ہوتے نظر آئے۔ خضر کے قریب پہنچتے ہی سارہ نے زرناز کے دوستوں کے نام کی لسٹ اسے

پکڑا دی۔

''یار! نک چڑھی سے میں نے فون پر فلم ڈائریکٹر بن کے بات کی تو وہ تو لٹو ہی ہو گئی۔ اب میں اسے اپنی فلم ''چھچھوری حسینہ'' میں بطور ہیروئن لے رہا ہوں۔'' اس نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا تو وہ دونوں ہی ہنس دیں۔

''چلو آؤ اب اندر۔ اب ہمارا کام ختم۔'' اس نے لسٹ میں سے ایک نام چوز کیا اور لسٹ پھینک دی۔

''عبدل!'' اس نے ٹی وی ٹرالی کی سائڈ میں چھپا کے رکھے مٹھائی کے ڈبے کو نکالتے ہوئے عبدل کو پکارا۔ عبدل بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو گیا۔

''یہ لو مٹھائی کا ڈبا اور اپنی اس نک چڑھی مالکن کو دے آؤ اور کہنا کہ کوئی زین نامی شخص دے گیا ہے۔ اپنی منگنی کی خوشی میں...... اور یہ تم رکھ لو۔'' اس نے جیب سے دو سو روپے نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھے۔ عبدل کی باچھیں کھل گئیں۔

''اور ہاں سنو۔'' اس نے جاتے ہوئے عبدل کو آواز دی۔

''اگر اس سارے قصے میں ہمارا نام آیا تو یاد رکھنا ان پیسوں کے بدلے ہزار لوں گا۔'' اس نے دھمکانا ضروری سمجھا۔

''آپ بے فکر رہو صاحب! آپ کا نام نہیں آئے گا۔'' عبدل بھی شاید اپنی مالکن سے عاجز آیا ہوا تھا۔ تبھی اس ایڈونچر کے لیے بہ خوشی تیار ہو گیا۔

اب وہ تینوں لاؤنج میں ٹی وی لگائے آنے والے طوفان کے انتظار میں بیٹھ گئے مگر اس طوفان کے آنے کی توقع بہت کم تھی۔ زرناز کے دوستوں میں سے کوئی بھی اپنی منگنی کی خوشی میں صرف پانچ لڈو نہیں بھیج سکتا تھا اور نہ ہی اپنی منگنی کی خبر یوں اچانک دے گا لیکن اگر قسمت ساتھ دے تو سب کچھ ممکن ہے۔ عبدل اپنا فرض نبھا کر واپس آ گیا تھا۔

''عبدل...... عبدل۔'' دو، تین منٹ بہ مشکل گزرے ہوں گے کہ وہ اپنے کمرے سے چیختے ہوئے نکلی اور غضب ناک چہرے کے ساتھ عبدل کے سر پر پہنچ گئی۔ وہ دونوں تو لاتعلق بن کے ٹی وی کی جانب متوجہ ہو گئیں جبکہ خضر وفورِ شوق سے اس ''ڈرامے'' کو دیکھنے لگا۔

''کیا بے ہودگی ہے یہ......؟'' اس نے مٹھائی کا ڈبا پوری قوت سے عبدل کو دے مارا۔ عبدل نے نہایت پھرتی سے سائڈ پر ہو کر اس ''ڈرون حملے'' سے خود کو بچایا۔

''بے ہودگی......؟ مجھے تو لڈو لگ رہے ہیں۔'' عبدل نے بغیر رعب میں آئے، لڈو کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں کچھ زیادہ ہی بکواس کرنی آ گئی ہے۔ آج دیکھو ذرا، میں تمہاری کیسے چھٹی کرواتی ہوں۔'' اس نے خضر کو خونخوار نگاہوں سے گھورتے ہوئے عبدل کو دھمکایا۔

''عبدل! جب تمہاری یہاں سے چھٹی ہو جائے تو ہماری طرف آ جانا۔ ہم ہزار، پانچ سو تمہیں زیادہ ہی دیں گے۔'' خضر نے اطمینان سے جلتی پر تیل چھڑکا۔

''اگر تمہارے منہ لگنا میں اپنی انسلٹ نہ سمجھتی تو ضرور اس کا جواب دیتی۔''

''دیکھیں محترمہ! اطلاعاً عرض ہے کہ مجھے منہ لگائے بغیر بھی آپ اپنی اچھی خاصی انسلٹ کروا چکی ہیں۔ جاہلوں کی طرح چیخ چلا کر۔ اب مزید کی تو گنجائش ہی نہیں ہے۔ بہتر ہے آپ اپنے کمرے میں جا کر سر پر برف رکھیں تاکہ لڈوؤں کی تاثیر کم ہو۔'' وہ مسلسل ان کے غصے میں اضافے کا باعث بن رہا تھا۔

''دیکھا! آخر عیاں ہو ہی گئے ناں تم، مجھے پہلے ہی پتا تھا۔ ایسی اوچھی حرکت تمہارے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔'' اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ خضر کو اٹھا کر باہر پھینک دیتی۔

''بس جی، ذرہ نوازی ہے آپ کی...... ورنہ بندہ کس کام کا۔'' اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر کو ہلکا سا

ختم کیا۔ ''ویسے میں اپنا قیمتی وقت فضول لوگوں کے پیچھے برباد نہیں کیا کرتا...... تمہیں بڑی خوش فہمی ہے کہ یہ حرکت میری ہے۔''

''آخر تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو؟'' اسے پتنگے لگ گئے۔ ''بڑی توپ چیز ہو تم......؟ نمٹ لوں گی میں تم سے بھی...... بہت مہنگا پڑے گا تمہیں مجھ سے پنگا لینا۔'' وہ غصے سے کھولتے ہوئے سیڑھیوں کی سمت بڑھ گئی۔

''مہنگائی سے نہ ڈراؤ ڈیئر مجھے۔ میں ملک کے بہت بڑے بزنس مین کا بیٹا ہوں۔ مہنگائی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔'' اس نے پیچھے سے ہانک لگائی۔

زرناز نے اوپر جا کر دروازہ اس زور سے بند کیا کہ چاروں نے بہ خوبی سنا۔

''واہ...... سواد آ گیا بادشاہو۔'' خضر نے چٹخارا لیتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

''میں خوب جانتی ہوں زویا! محض سولہ برس کی عمر میں ہی اگر ماہین کے کئی رشتے آ چکے ہیں تو اس کی وجہ محض میری بیٹی کی خوب صورتی نہیں بلکہ اس کی وہ جائداد ہے جو اس کا باپ مرتے وقت اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے ترکے میں چھوڑ گیا ہے اور یہی بات مجھے بہت زیادہ فکر مند رکھتی تھی کہ کہیں نادانستگی میں میری بیٹی ناقدروں اور لالچیوں کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔''

آج شام سارہ کی مایوں تھی۔ گھر بھر میں افراتفری کا عالم تھا۔ ملازمین سے لے کر مالکان تک کسی نہ کسی کام میں مصروف تھے۔ سو گھر بھر کے کپڑوں کی استری کا کام اس کے سپرد تھا۔

اپنے کام کو بخوبی انجام دینے کے بعد جب وہ سب کے کپڑے ہینگ کر کے وارڈ روب میں لٹکا رہی تھی، تب اسے ممی کے دوپٹے کی غیر موجودگی کا علم ہوا۔ اسی دوپٹے کا پوچھنے وہ ممی کے پاس آئی تھی لیکن کچن سے آتی ممی کی فکر میں ڈوبی آواز نے اس کے قدم روک دیے۔

''چلو آج کی تقریب میں جب میں ماہین کو خضر کے نام کی انگوٹھی پہناؤں گی تو تمہاری یہ فکر بھی دور ہو جائے گی۔'' مما کی آواز پر وہ ایک دم چونکی۔

''اوہ، میرا خدا!'' خبر اچانک ملی تھی، سو وہ بے طرح چونکی۔

''اتنا بڑا فیصلہ مجھ سے پوچھے بنا کر لیا گیا۔'' اسے پل بھر کو افسوس ہوا۔ مگر پیشتر اس کے کہ افسوس گہرا ہوتا وہ کچھ سوچ کے مسکرا دی۔ ''اچھا لڑکا ہے...... ہینڈسم، گڈلکنگ اور بقول خضر کے کالج کی نصف فیصد لڑکیاں اس کی وجاہت کے آگے دل ہار بیٹھی ہیں تو اس لحاظ سے تو میں خوش نصیب ہی ٹھہری۔'' وہ دل و جاں سے راضی ہو گئی۔

''لیکن اگر اس ہینڈسم کو علم ہو گیا کہ میں دل و جاں سے راضی ہوں تو وہ اپنے آپے میں نہیں رہے گا۔ سو بہتر یہی ہے کہ موصوف پر اپنی پسندیدگی ظاہر ہی نہ کی جائے بلکہ ناپسندیدگی ہی ظاہر کی جائے۔ تاکہ موصوف زیادہ پھیلیں نہیں۔'' ماما کی زبان سے ادا ہونے والے ایک جملے پر وہ کئی پلان بنا بیٹھی اور یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ خبر خضر پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے وہ الٹے پیر لوٹی۔ پائیں باغ، لان اور لاؤنج میں خضر کی تلاش کی ناکام کوشش اس کے کمرے میں کامیاب ٹھہری۔ گھر بھر کا لاڈلا، راج دلارا، اپنے باپ کی آدھی سے زائد ذمے داریاں اپنے کاندھوں پر سہارنے والا خضر عباس اسے اپنے کمرے میں سیل فون پر کسی ضروری کال میں مصروف ملا۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر نہایت بے قراری سے اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

''تم جانتے ہو خضر! گھر میں کیا ہو رہا ہے؟'' خضر کے کال ڈسکنکٹ کرتے ہی اس نے بے چینی سے استفسار کیا۔

''میں کیا، سارا جہاں جانتا ہے کہ آج سارہ کا مایوں ہے۔'' خضر اس کے انداز سے ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ کس معاملے کی تفتیش کر رہی ہے لیکن وہ جان کے انجان بنا۔

''اُف۔'' وہ جھنجلائی۔ ''کیا تم جانتے ہو کہ آج کی تقریب میں میرے ساتھ ایک حادثہ رونما ہونے والا ہے، تم سے منگنی کی صورت میں...... گھر کے بڑے تمہارے ساتھ میری منگنی طے کر چکے ہیں۔'' اس نے اپنے تئیں دھماکا کیا۔ خضر نے چونکنے کی کامیاب اداکاری کی جیسے یہ اس کے لیے واقعی نئی خبر ہو۔

''یارب! یہ میرے گناہ گار کان کیا سن رہے ہیں؟'' وہ سر اونچا کر کے بلند آواز میں اللہ سے ''راز و نیاز'' کرنے لگا۔

''اب میں ایسا بھی گناہ گار نہیں...... میرے لیے کیا صرف یہی بچ گئی تھی۔''

ماہین روہانسی ہو گئی۔ وہ تو یہ سوچ کر تن فن کرتی ہوئی آئی تھی کہ اس کا انکار خضر کو کافی صدمہ پہنچائے گا اور وہ اس سے منگنی پر رضامند ہو جانے کے لیے اصرار کرے گا۔ اس کی خوش گمانی کی کوئی حد تھی نہ کم عقلی کی۔

''ایسی حسین صورت بیٹھے بٹھائے مل رہی ہے۔ اسی لیے مزاج ٹھکانے نہیں۔ ناشکرا کہیں کا۔ میں بھی کیوں ظاہر ہونے دوں کہ میں بڑوں کے فیصلے پر دل و جان سے راضی ہوں۔''

خضر کے لیے اس کا چہرہ کھلی کتاب تھا، جو وہ بہ آسانی پڑھ لیتا تھا۔ اس نے چند پل اس کی صورت کا مطالعہ کیا اور جان گیا کہ محترمہ درحقیقت چاہتی کیا ہیں۔ اس نے نچلا لب دانتوں تلے دبا کر مسکراہٹ چھپائی اور اس کے برابر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''تم اگر معترض ہو اس رشتے پر تو پھر تم انکار کیوں نہیں کر دیتیں؟''

''میں......؟'' اس نے اچنبھے سے استفسار کیا۔ اس کے ذہن میں انکار کے بعد ممی کی غیظ و غضب میں ڈوبی صورت نمودار ہوئی۔

''صرف میں کیوں......؟ تمہاری بھی تو مرضی کے خلاف یہ رشتہ طے ہو رہا ہے۔ تمہیں تو مجھ سے منگنی ہی گناہوں کی سزا لگتی ہے۔'' اصل قلق تو یہی تھا۔

''تو میں تمہارے ساتھ ہوں ناں! تم پروا کیوں کرتی ہو؟ میں تمہیں مشکل وقت میں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ تم بس ایک بار انکار کر دو، باقی کام میرا۔'' وہ گویا اس کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ خضر کی ڈارک براؤن آنکھوں میں رقصاں شرارت کا وہ سراغ ہی نہ پا سکی۔

''خدا نے وجاہت کیا دے دی، موصوف کے مزاج ہی نہیں مل رہے۔ اب تو انکار کرنا لازم ہو گیا ہے۔ جیسے میں تو ترس رہی ہوں اس سے منگنی کو۔'' دل کی کھولن اس کے چہرے سے واضح تھی۔

''مجھے کوئی فکر نہیں، آخر میری رائے بھی اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن میں محض اتنا چاہتی ہوں کہ جب تم بھی اس رشتے سے انکاری ہو تو میں اکیلی ہی کیوں ذلت اٹھاؤں؟ آخر گھر والوں کو بھی تو پتا چلے کہ ان کا فرمانبردار سپوت، اتنا بھی فرمانبردار نہیں۔'' اس نے جل کر کہا۔

''چلو آؤ، پھر دونوں مل کر ذلت اِٹھاتے ہیں۔'' وہ اٹھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا ''لیکن اتنا بتا دوں، پہل ہر صورت تمہیں کرنا ہو گی......'' دروازے کی سمت بڑھتے ہوئے وہ اپنے پیچھے آتی ماہین کو خبردار کرنا نہ بھولا۔

''کیوں......؟ میں کیوں کروں پہل......؟'' وہ ٹھٹک کر رکی۔ غدار تو وہ اوّل درجے کا تھا۔ عین وقت پر آنکھیں پھیرنا اس کے لیے کوئی مشکل امر نہیں تھا۔

''کیونکہ مجھے تم پر اعتبار نہیں۔ بہادر تو تم اتنی ہو کہ آنی کے آنکھیں دکھانے سے ہی تمہارا ہارٹ فیل ہونے لگتا ہے۔ مجھ سے الٹا سیدھا بلوا کر خود معصوم بن کے کھڑی ہو جاؤ گی۔'' وہ کن کن طریقوں سے چڑتی ہے خضر خوب جانتا تھا۔

''ہاں، جیسے تم تو بڑی قابلِ اعتبار ہستی ہو۔ غداری کے ایک ہزار ایک طریقے تو یقیناً تمہیں ازبر ہوں گے لیکن فکر مت کرو مجھے تمہاری جن حرکتوں سے نفرت ہے وہ میں نہیں اپناؤں گی۔'' توقع کے عین

مطابق وہ بھڑک اٹھی۔

''یہ ہوئی ناں مردوں والی بات!'' اس نے باچھیں چیریں۔ ''میری صحبت میں رہو گی تو بہادری بھی آہی جائے گی۔'' اس کی خودستائی پر ماہین دانت کچکچاتے ہوئے اس کے پیچھے ہولی۔ مگر یوں جیسے جان ہتھیلی پر لیے کوئی معرکہ سر کرنے جارہی ہو۔ دل میں جل تو جلال کا وِرد بدستور جاری تھا۔

کچن کے دروازے پر رک کر خضر نے گردن اندر کر کے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور اسے اشارے سے اندر جانے کو کہا۔ ماہین نے نہایت اعتماد سے قدم آگے بڑھائے اور کچن میں داخل ہو گئی۔ کچن میں اس وقت صرف ممی ہی تھیں۔ مما (یعنی خضر کی امی اور ماہین کی خالہ) اسے کہیں نظر نہ آئیں۔

''بولو ناں۔'' خضر نے پیچھے سے اسے ٹہوکا مارا۔ اور وہ کیسے بولتی زبان تالو سے چپک گئی تھی۔ اس کے ''پاس'' جتنا اعتماد تھا وہ سارے کا سارا کچن میں قدم رکھتے ہی صرف ہو گیا تھا۔

''کیا بات ہے ماہین! کوئی کام ہے؟'' اسی وقت ممی فریج سے کوئی چیز لینے کے لیے مڑی تھیں۔

''جی ممی! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔'' اس نے پیچھے مڑ کر ایک نظر خضر کی موجودگی کا یقین کیا (جو دروازے کی اوٹ میں کھڑا تھا) اور جھجکتے ہوئے کہا۔

''ہاں، بولو، میں سن رہی ہوں۔'' ممی ٹماٹر کی تکہ بوٹی کرتے ہوئے مصروف سے انداز میں گویا ہوئیں۔

مدعا بیان کرنے سے پہلے وہ حفظِ ماتقدم کے طور پر ممی سے چند قدم دور ہوئی اور آنکھیں بند کر کے، تھوک نگل کر بہ مشکل گویا ہوئی۔

''ممی! خضر سے منگنی پر میرا دل رضامند نہیں۔''

جملے کی درست ادائیگی تھی یا کوئی معرکہ سر کر لیا تھا۔ وہ سکون کا سانس نہیں لے پائی تھی کہ اس نے جانا۔ آنکھیں بند کر دینے سے خطرہ ٹلتا نہیں، نہ ہی چند قدم کی دوری اتنا فاصلہ ہے کہ ممی کو اس تک پہنچنے میں گھنٹے لگیں اور وہ اپنے بچاؤ کی کوئی ترکیب کر سکے۔

شادی والا گھر، ڈھیر سارے کام کی ٹینشن نے ذہن کو کچھ زیادہ ہی تھکا دیا تھا۔ ہمیشہ اس کی نادانیوں سے نالاں رہنے والی ممی کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ ورنہ بات اتنی بڑی نہیں تھی کہ ہاتھ کی کرامات دکھائی جاتیں۔

ممی کا ہاتھ پوری قوت سے گھوما تھا اور اس کے سادہ گورے گال کو لمحوں میں پر غذ بنا گیا۔ چونکہ اس کی آنکھیں بند تھیں اور زندگی میں اس سے پہلے اس نے کبھی تھپڑ کا ذائقہ نہیں چکھا تھا اس لیے جان نہ پائی کہ یہ تھپڑ ہی تھا یا ممی نے کوئی آہنی چیز اٹھا کر اس کے چہرے پر دے ماری تھی۔ اسے دن میں تارے کیا پورا اجرام فلکی دکھائی دینے لگا۔

''یہ فقرہ آئندہ میں تمہاری زبان سے نہ سنوں۔ تمہارا دل راضی نہیں تو اسے راضی کر لو۔ مجھے بڑوں کے سامنے، منہ پھاڑ کے اپنے رشتے کی بابت رائے دیتی لڑکیاں سخت بری لگتی ہیں۔'' ممی کے غصے کا سورج سوا نیزے پر تھا۔

وہ گال پر ہاتھ رکھے ابھی تک چاند، سورج، ستاروں کا ہی نظارہ کر رہی تھی، سو چند لمحوں تک تو اسے لگا جیسے ممی چائنیز بول رہی ہوں۔ کچھ پلے ہی نہیں پڑ رہا تھا۔

''اپنے اطوار درست کر لو، بچی نہیں رہیں تم۔ لیکن عقل کے معاملے میں بچوں کو مات دے دو۔ آفرین ہے خضر پر جو تم جیسی لڑکی سے منگنی پر رضامند ہے۔ محض اس لیے کہ یہ بڑوں کا فیصلہ ہے۔'' ممی کے نزدیک وہ ہمیشہ سے ہی ''تم جیسی لڑکی'' تھی جبکہ حسبِ دستور خضر بڑوں کے آگے اپنے نمبر بڑھا گیا تھا۔

ماہین نے اس کے میدان میں نہ اترنے پر پیچھے مڑ کے دیکھا۔ وہ کب چمپت ہوا، اسے خبر ہی نہ ہو سکی۔ اس نے من ہی من میں خضر کو چند نازیبا القابات سے نوازا، جس نے ہمیشہ کی طرح اسے بڑی آسانی سے دھوکا دے دیا تھا اور تواتر سے بہتے اشکوں کو صاف کیا۔

''ہاں، میں ہوں ہی احمق، جو ہر بار اس غدار پر

بھروسا کرلیتی ہوں۔'' غصے کی انتہا تھی ورنہ اپنے آپ کو کم عقل تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں کہا تھا۔ ''پتا نہیں کیا سحر پھونکا ہے اس بقراط نے میری ماں پر جو اپنی سگی بیٹی سے سنڈریلا جیسا سلوک کرتی ہیں۔ ہائے، میرا گال۔'' اسے ازسرِنو گال پر جلن محسوس ہونے لگی۔

''گھر میں اس بات کی کسی کو بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے۔ اس لیے رونے کا باقی شوق اپنے کمرے میں جا کر پورا کرلو۔'' اس کی بہتی آنکھوں کا کوئی اثر لیے بغیر ممی نے حکم صادر کردیا۔ وہ اسی حکم کی منتظر تھی۔ تیزی سے کچن سے نکل کر وہ سیڑھیاں چڑھ گئی۔

''یارب! یہ میری سگی ماں ہی ہے یا نہیں؟ انہیں تو میرا رونا بھی، میرا شوق لگ رہا ہے۔'' اس نے ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے، اللہ سے استفسار کیا۔ ''نانی امی کو یقیناً خبر ہوگی۔ موقع ملا تو ضرور پوچھوں گی۔'' وہ بدگمان ہوئی۔

''ایک وہ ہیں موصوف! گھر بھر کا دل مٹھی میں کیا ہوا ہے میرے لیے اللہ جانے اپنے دل میں کن جنموں کی عداوت پالے بیٹھا ہے۔'' غم کسی طور کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ ''اچھا ہے لندن چلا جائے۔ میری زندگی کے چند سال تو خوشگوار گزریں گے پھر تو تمام عمر اسی کے ساتھ رہنا ہے۔'' چند لمحوں میں ہی سوچیں کہاں سے کہاں پہنچ گئیں۔

''تمام عمر......؟'' نئی سوچ حملہ آور ہوئی۔

''نہیں...... میں اس کے ساتھ تمام عمر گزاروں گی تو یہ تو مجھے یونہی ڈرا ڈرا کر اور دھوکے دے دے کر مار دے گا۔'' آنسو دوبارہ اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گئے۔ ''میں کیا کروں یارب؟ میری تو ماں بھی میرے ساتھ نہیں۔'' اس نے بے بسی سے لب کچلے۔ ''مگر یہ طے ہے میں شادی اس سے ہرگز نہیں کروں گی۔ منگنی کا بھلا کیا ہے وہ تو ختم بھی ہوسکتی ہے۔'' ایک تھپڑ پڑتے ہی خیالات نے مخالف سمت اختیار کرلی تھی۔ ''اور بات تو میں اس سے زندگی بھر نہ کروں۔'' غصہ کم ہونے میں ہی نہیں آرہا تھا۔ سو ''رنگ، رنگ'' کے اشتعال انگیز خیالات ذہن میں وارد ہو رہے تھے۔

شام تک خضر کے خلاف کئی عہد و پیمان خود سے باندھ کر بہ مشکل غم غلط کرنے میں کامیاب ہو پائی تھی کہ ممی کی کزن کی بیٹی زینب اپنی بہن کے ہمراہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

''ہیلو ماہی! کیا حال چال ہیں؟ ٹھیک ہو؟'' وہ عادتاً آتے کے ساتھ شروع ہوگئی۔

''مجھے آنٹی نے بھیجا ہے کہ تمہیں اچھا سا تیار کر دوں۔ سارہ کی مایوں کی رسم کے فوراً بعد تمہاری منگنی کی رسم شروع ہو جائے گی۔ لہٰذا یہ سوٹ لو اور جلدی سے فریش ہو کر یہ زیب تن کر کے آجاؤ۔ پھر تمہیں خوب صورت بنانے کی ''مشق'' شروع کریں گے۔'' زینب نے اس کی طرف منگنی کا خوب صورت جوڑا بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ہائے! سارہ کی مایوں کی رسم۔'' اس نے حسرت سے ٹھنڈی آہ بھری۔ ''کتنا شوق تھا مجھے سارہ کی شادی کا...... مگر اٹینڈ کرنا قسمت میں نہیں۔'' ابھی چند لمحوں پیشتر ممی آکر اس کے کمرے سے باہر آنے پر پابندی لگا گئی تھیں۔ سو مایوں کی تقریب اٹینڈ کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آخر اس کی منگنی تھی، کوئی معمولی بات نہیں۔

''کیا ہو گیا ماہین؟ ایسی خوفناک صورت بنائے کیوں بیٹھی ہو؟ جلدی کرو، وقت بالکل نہیں۔ ابھی سارہ کے سسرالی آجائیں گے۔'' زینب کی ساری بات میں اسے لفظ ''خوفناک'' کافی قابلِ اعتراض لگا تھا سو اس نے ایک ناراض سی نگاہ زینب پر ڈالی۔ جواباً وہ سمجھتے ہوئے قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

''مذاق کر رہی تھی یار! ورنہ ایسی پیاری صورت کو تو کوئی دشمن بھی خوفناک نہ کہے۔'' زینب نے اس کی ٹھوڑی کو پیار سے چھوتے ہوئے کہا۔

''بس رہنے دو۔'' اس نے زینب کی معذرت قبول نہیں کی اور واش روم کی سمت بڑھ گئی۔

خوب صورت تو تھی ہی ہلکے سے میک اپ نے

خوب صورت ترین بنا دیا۔

''اتنی حسین لگ رہی ہو کہ نظر لگ جانے کا اندیشہ ہے۔'' زینب نے آئینے میں نظر آتے اس کے عکس پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

''میں سوچ رہی ہوں کہ اگر خدا جنت کی حوریں دنیا والوں کو دکھانا چاہتا تو وہ مثال کے طور پر تمہیں پیش کرتا۔'' زینب اور آمنہ کی معیت میں جو وہ نگاہیں نیچی کیے اسٹیج کی سمت بڑھ رہی تھی تب اس کے بائیں جانب موجود آمنہ نے کہا۔ آمنہ ہمیشہ سے کم گو تھی لیکن جب بھی بولتی اس کی گفتگو اور لب و لہجہ ماہین کو بہت متاثر کرتا۔ سو اس وقت بھی آمنہ کی رائے اس کے لبوں پر تبسم بکھرا گئی۔

''اُف ظالم لڑکی! یوں سرِعام مسکرا کر قتلِ عام تو نہ کرو۔ وہ جو تمہارے منگیتر صاحب سامنے بیٹھے ہیں ناں ابھی پٹ سے گر پڑیں گے۔ پھر تمہاری منگنی کا قصہ تو کھٹائی میں پڑ جائے گا ناں۔'' زینب نے اسٹیج کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ماہین نے نگاہ اٹھا کر سامنے دیکھا۔ براؤن شلوار سوٹ میں وہ بلا کا جاذبِ نظر لگ رہا تھا۔

''یونانی دیوتا تو یونہی فضول میں مشہور ہیں۔ اُف کتنی خوش نصیب ہوں میں۔'' خیالات ایک بار پھر بدل کر پرانے خیالات میں تبدیل ہونے لگے مگر اگلے لمحے ہی اسے یاد آیا کہ وہ تو اس سے منگنی مجبوری کے تحت کر رہی ہے اور شادی نہ کرنے کا عہد کیے بیٹھی ہے۔

''ایک تو کم بخت لگتا اتنا شاندار ہے کہ اپنے ہی فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے کا من کرتا ہے۔''

''اُف نگاہیں تو نیچی کرو۔'' زینب نے اسے ٹہوکا دیا تو اس نے قدرے جھینپ کر نظریں جھکا لیں۔

''ماشاء اللہ کہہ دو خضر! ورنہ اگر جو نظر لگ گئی تو نقصان تمہارا ہی ہوگا۔'' زینب نے اسے خضر کے برابر میں بٹھاتے ہوئے ازراہِ شرارت کہا۔ وہ شاید اسے پُرشوق نگاہوں سے تک رہا تھا۔

''ماشاء اللہ! کیا صورت ہے۔ کالے لباس میں کسی سچے ہیرے کی طرح جگمگاتی ہوئی۔'' خضر نے اتنی دھیمی آواز میں کہا کہ صرف ماہین ہی سن پائی۔
''ایں! کالے لباس میں؟'' اس نے نیچی نگاہوں سے اپنے پنک اور شاکنگ پنک کمبی نیشن والے سوٹ کو آنکھیں پھاڑ کے دیکھا۔ اسے پورے لباس میں کہیں بلیک کلر کی جھلک بھی دکھائی نہ دی۔
''پریاں شاید ایسی ہی ہوں گی۔'' اب کی بار اس نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا تو ماہین نے بے اختیار چونک کر اس کی سمت دیکھا۔
''وہ کس پری کے متعلق بات کر رہا ہے؟'' ماہین نے اس کی نگاہوں کی تعاقب میں دیکھا تو بھونچکا رہ گئی۔ بلیک کیپری اور بلیک سلیولیس لانگ شرٹ میں دمکتی ''پری'' بلاشبہ زرناز تھی۔ وہ خضر کے اس ستائشی فقرے پر ہرگز متحیر نہ ہوتی اگر جو وہ اس بات سے واقف نہ ہوتی کہ خضر، زرناز کے متعلق کیا رائے رکھتا ہے۔
وہ بلاشبہ بے انتہا حسین تھی مگر خوب صورتی ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ خضر، زرناز کی عادتوں کی بنا پر اس سے کسی حد تک بیزار رہتا تھا۔ زرناز کی شخصیت کی خامیاں اس کی خوب صورتی پر حاوی ہو جاتی تھیں۔ سو خضر کا یہ ستائشی جملہ اسے حیرت زدہ کر گیا۔
''یہ صورت بھلا کب سے اس کے لیے پریوں جیسی ہونے لگی۔'' ماہین نے ایک بار پھر بڑی توجہ سے زرناز کی سمت دیکھا۔ عریاں بازو، پنڈلیوں تک عریاں ٹانگیں اور گہرا گلا۔
''اُف! بے حیا، بے شرم۔'' اسے پسینے آگئے۔
''نہ جانے نانی امی، فیضان ماموں کی فیملی کے آگے اتنی بے بس کیوں ہیں؟''
''تم کیا دیدے پھاڑ، پھاڑ کے اردگرد دیکھ رہی ہو؟ منگنی کی دلہن ہو، نگاہیں نیچی کرو۔'' صوفے کے پیچھے کھڑی زینب نے اس کے کان کے قریب دھیمی آواز مگر تیز لہجے میں سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ اس اچانک افتاد پر اس نے پیچھے مڑ کر ایک ناراض سی نگاہ زینب پر ڈالی۔ وہ اس کے قریب ہی تو کھڑی تھی، سو اس نے بھی دھیمی آواز میں کہہ دیا۔
''ہاں، میں نگاہیں جھکائے بے خبر بیٹھی رہوں تاکہ میرے منگیتر صاحب تمام حسین لڑکیوں کو تاڑتے پھریں۔'' جواباً زینب کا قہقہہ بڑا جاندار تھا۔ اس نے گڑبڑا کر خضر کی سمت دیکھا۔ اس کے لبوں پر مچلتی محظوظ سی مسکراہٹ پتا دے رہی تھی کہ وہ سب سن چکا ہے۔
''اُف! ہر بات کا جواب دینا بھی مجھ پر فرض ہو چکا ہے۔'' کچھ بس نہ چلا تو وہ اپنے آپ کو ہی لتاڑنے لگی۔ ''اب موصوف خواہ مخواہ ہی خوش فہم ہونے لگیں گے کہ میں رقابت محسوس کر رہی ہوں۔'' اسے افسوس ہوا۔
''ویسے زینب! مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ چاہے شوق سے ہر لڑکی میں دلچسپی لیتے پھریں۔'' اب کی بار خاص خضر کو سنانے کے لیے یہ فقرہ کہا گیا تھا اور اس بار بھی خضر اپنے لبوں پر آتی مسکراہٹ کو روکنے میں ناکام ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا زینب بھی مسکرا رہی تھی۔
''شاید پھر کچھ غلط کہہ دیا ہے۔'' وہ جھنجلائی۔
''اب تو مناسب یہی ہے کہ واقعی نگاہیں جھکائے روایتی دلہنوں کی طرح بیٹھ کر رسم ہو جانے کا انتظار کروں۔'' اس نے خود کو ہدایات دیں اور نظریں جھکا کر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

سارہ کے ولیمے کے پانچویں روز خضر کی لندن روانگی تھی۔
سارہ ایک روز پہلے ہی میکے آگئی تھی اور بھائی کو سی آف کرنے کے لیے ائرپورٹ جانے کا ارادہ بھی رکھتی تھی۔ ایسا ارادہ نانی امی بھی رکھتی تھیں سو وہ بھی ایک روز قبل ہی رکنے کی غرض سے آگئی تھیں اور وہ جو خضر کی وجہ سے تھپڑ سہنے کے بعد اس سے زندگی بھر بات

نہ کرنے کا قصد کیے بیٹھی تھی اور چاہتی تھی کہ اس سے سامنا ذرا کم ہی ہو، نانی امی کے اس عمل پر پیچ و تاب کھا کے رہ گئی۔

''اُف، نانی امی نے میرے سارے منصوبے کو مٹی میں ملا دیا۔ کم از کم آج کے دن نہیں آتیں تو میں بھی ان کے ساتھ اُن کے ہی گھر ہوتی۔ اب لازماً خضر کی روانگی کے وقت مجھے بھی اس سے ملنا پڑے گا۔ ورنہ ممی کے ہاتھوں ضرور اپنے انجام کو پہنچ جاؤں گی۔'' اس نے کچھ بیزاری سے سوچا۔

شہنشاہِ عالم کی سواری، بادِ بہاری نکلنے کے لیے تیار کھڑی تھی اور اس کی توقع کے عین مطابق اس کا بلاوا آ گیا تھا۔ وہ منہ بناتے ہوئے نیچے اتری۔ لاؤنج میں اس وقت رخصتی سے پہلے کا جذباتی سین چل رہا تھا۔ اس سین سے کافی ملتا جلتا جو سارہ کی رخصتی پر کری ایٹ ہوا تھا۔

روئی روئی سی سرخ آنکھوں کو انگلیوں کی پوروں سے پونچھتی ممی، لب بھینچ کر آنسو روکنے کی ناکام کوشش میں ہلکان مما، لبوں پر اداس مسکان سجائے کھڑے بابا، (ماہین کے تایا)، آبدیدہ سی نانی امی اور مچلتی ہوئی سارہ۔

اسے بلوایا تو گیا تھا مگر اب کسی کی بھی توجہ اس پر نہیں تھی۔ وہ بھی فارمیلٹی نبھانے کے لیے آ گئی۔ نہ آتی تو شامت پکی تھی۔ اس کی موجودگی تو نگاہوں میں نہ آ سکی تھی مگر عدم موجودگی ضرور نوٹس میں آ جاتی۔

''چار سال کوئی زیادہ عرصہ تو نہیں، پتا بھی نہیں چلے گا اور گزر جائے گا۔'' ممی کو ساتھ لگائے اور مما کے ہاتھ تھامے اپنی اداسی و افسردگی کو چھپائے وہ تسلی آمیز انداز میں گویا تھا۔

''چلو خضر بیٹا! دیر ہو رہی ہے۔'' بابا کے احساس دلانے پر وہ ممی سے الگ ہوا تو اس کی نگاہ ماہین پر پڑی جو سیڑھیوں کے پاس ہی بھاگنے کے لیے پر تولے کھڑی تھی۔ وہ اس کے پاس آیا۔ مما اور ممی، بابا کے پیچھے لاؤنج کے دروازے کی سمت بڑھ گئی تھیں۔

''اچھا ماہین! چلتا ہوں۔ اپنا بہت سارا خیال رکھنا......اور......'' اس نے دانستہ فقرہ ادھورا چھوڑا اور لاؤنج کے دروازے سے ایک، ایک کر کے باہر جاتے افرادِ خانہ کو دیکھا۔

''اور......؟'' ماہین کا دل دھڑک اٹھا۔ جواب سننے کے لیے وہ ہمہ تن گوش ہوئی۔

''اور دعا کرنا وہاں میرا دل کسی پری وش پر نہ آ جائے، ورنہ مسئلہ ہو جائے گا۔'' اس کی ڈارک براؤن آنکھوں میں شرارت مچلنے لگی۔ اس کے سارے ارمانوں پر اوس کیا اولے پڑ گئے۔ وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کے رہ گئی۔

''میں دعا کروں گی کہ خدا کرے تمہارا دل کسی پر آ ہی جائے تاکہ میری جان تو چھوٹے۔'' اس نے کہنے کو کہہ دیا مگر پھر پچھتائی بھی۔ خضر ہنس دیا۔

''الٰہی! میں ہر بار کیوں بھول جاتی ہوں کہ اب کبھی اس کے منہ نہیں لگنا۔ اس کی وجہ سے میں نے جو اپنے نازک سے گال پر فولادی تھپڑ سہا تھا وہ بھلائے جانے والی بات تو نہیں۔'' زخم پھر سے تازہ ہو گئے۔

''اچھا، سوری!'' خضر نے کلائی موڑ کے وقت دیکھا اور سنجیدگی اختیار کی۔

''معذرت اللہ جانے کس بات کی کر رہا ہے؟ سیکڑوں بار تو دل جلا چکا ہو گا میرا۔'' اس نے خود سے کیے گئے عہد کے سبب خاموشی اپنائی۔

''مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا یار کہ آنی اتنا غصے میں آ جائیں گی کہ تھپڑ ہی جڑ دیں گی۔''

''مکار، جھوٹا، فریبی۔ اتنے دھوکے کھانے کے بعد بھی اگر آج ماہین! تم نے اس پر اعتبار کر لیا ناں تو آئندہ جب بھی بے وقوفی کا ذکر چھڑے گا تو لوگ گدھے کو چھوڑ کر تمہاری مثال دیں گے۔'' اس نے خود کو تنبیہ کے ساتھ تلقین کی۔

''اگین سوری۔'' اس کی خاموشی پر خضر نے دوبارہ کہا۔

مگر وہ ریلنگ سے ٹیک لگائے، قدرے رخ

موڑے کھڑی رہی۔ خضر نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی اور گویا ہوا۔

''کچھ تو کہو یار! تم شاید میری جدائی کے خیال سے افسردہ ہو۔'' اسے پھر سے شرارت سوجھی۔ اور اس بات پر وہ یقیناً اس کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے بول اٹھتی، اگر جو باہر سے خضر کے نام کی پکار نہ اٹھتی۔

''او کے، میں چلتا ہوں اب۔ تم سے تفصیلی بات فون پر ہوگی۔ ٹھیک......؟'' عجلت میں کہتا وہ دروازے کی سمت بڑھ گیا۔

''ہاں، جیسے میں تو کر ہی لوں گی فون پر اپنے دشمن سے بات۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ گئی اور پھر واقعی وہ اپنے ارادے پر عمل کرنے میں کامیاب رہی۔

پندرہ دنوں میں وہ تین بار اس سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کر چکا تھا مگر بات نہ کرنے کے لیے اس کے مختلف بہانوں نے کام دکھایا تھا سو خضر کی طرف سے ایسی کسی خواہش کا پھر اسے ذکر سنائی نہیں دیا اور پھر اگلے دو برس بیت جانے کے بعد وہ خضر سے بالکل لاتعلق ہو کر اپنے آپ کو یہ باور کروا چکی تھی کہ وہ اسے یکسر بھول چکی ہے۔

☆☆☆

''کہاں ہو؟'' پیپر سے فارغ ہو کر اس نے پُرسکون سانس فضا کے سپرد کی اور میسج ٹائپ کر کے ''ڈسٹری بیوشن لسٹ'' میں سیو اپنی دوستوں کے گروپ کو سینڈ کر دیا۔

''ہم لوگ اس وقت کالج کے ٹینس کورٹ کے دائیں طرف موجود بینچوں پر بیٹھے تمہارا ویٹ کر رہے ہیں۔'' زنیرا کا رپلائی بھی تینوں نمبرز پر پہنچا تھا۔

پیپر توقع سے زیادہ اچھا ہوا تھا سو وہ مسرور سی ٹینس کورٹ کی سمت چل دی۔ مگر بینچ پر اپنی دوستوں کے درمیان عائشہ کو بیٹھا دیکھ کر وہ کسی قدر بدمزہ ہوئی۔ عائشہ درانی کو ان کا گروپ کچھ خاص پسند نہیں کرتا تھا۔ ''کسی زمانے'' میں عائشہ درانی بھی ان کے گروپ کا حصہ تھی مگر اپنی چند ناپسندیدہ عادتوں کی بنا پر وہ ان کے گروپ کے ساتھ، ساتھ ان کے دلوں میں بھی جگہ نہ بنا پائی۔ دوسروں کا مذاق اڑانا، معاشی طور پر کمزور لوگوں کو حقیر جاننا، نودولتیوں کی طرح اپنی قیمتی اشیا پر اترانا، خود کو ہر لحاظ سے برتر نہ صرف سمجھنا بلکہ لوگوں کو باور کروانا، اس کے مشاغل میں شامل تھا۔ سو وہ خاص پسند نہیں کی جاتی تھی۔

''یہ میرے فیانسی ہیں میکال! انگلینڈ میں ہی ہوتے ہیں۔'' قریب پہنچی تو اس نے سنا اور دیکھا کہ عائشہ درانی تصویروں کا البم لیے اترا، اترا کر اپنے منگیتر صاحب کی ''تشہیر'' کر رہی ہے، ناچار اسے بھی ان کی محفل میں شریک ہونا پڑا۔

''یقین جانو یار! کسی پاکستانی لڑکی سے منگنی کی ان کی کوئی تمنا تھی نہ ارادہ مگر مجھے دیکھتے ہی موصوف دل ہار بیٹھے اور اپنے سارے ارادے بھول گئے۔'' اپنے شولڈر کٹ بالوں کو ایک ادا سے پیچھے کرتے ہوئے اس نے اترا کر کہا۔

''بلاشبہ تم بہت حسین ہو......اور تمہارا منگیتر بے پناہ ہینڈسم۔'' سحاب تصویروں کو دیکھتے ہوئے گویا ہوئی تو تینوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''یہ سحاب اس کی تعریف کیوں کر رہی ہے؟ پہلے ہی موصوفہ کا دماغ عرش پر رہتا ہے۔ اب یہ ستائش اس کے دماغ کو نہ جانے کن بلندیوں پر پہنچا دے۔'' اس نے کلس کر سوچا۔

''مگر ایک مسئلہ ہے یار! تمہارا قد تمہارے منگیتر کے برابر میں کافی چھوٹا لگ رہا ہے۔ ہے ناں دعا......؟'' سحاب نے البم دعا کے سامنے کر کے تائید چاہی۔

''ہاں، کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔'' دعا نے بغور تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور پتا ہے یہ کمی اتنی چھوٹی نہیں کہ اسے نظر انداز کیا جا سکے۔'' زنیرا نے بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کچھ اس قدر تشویش سے کہا جیسے معاملہ انتہائی

سنگین ہو۔ عائشہ تعریف و ستائش سمیٹنے آئی تھی سو گفتگو کو مخالف سمت میں مڑتا دیکھ کر اچھی خاصی بدمزہ ہوئی۔

''نہیں یار! یہ کوئی اتنی ٹینشن والی بات بھی نہیں۔ بس اسے ڈھیر سارے اونچی ایڑی والے جوتے لینے پڑیں گے اور مسئلہ حل۔'' ماہین نے عائشہ سے نگاہ بچا کر دعا کو آنکھ ماری اور شرارت سے کہا۔

''تم نہیں جانتیں ماہین! یہ معاملہ انتہائی سنگین ہے جس روز میکال کے دل میں اس بات کا احساس جاگا وہ اس سے تعلق توڑنے میں ایک لمحہ نہیں لگائے گا۔ مغربی دنیا میں بسنے والے لوگوں کے نزدیک شادی اتنی اہمیت تھوڑی رکھتی ہے۔'' زنیرا اچھی طرح عائشہ کو باور کروانا چاہ رہی تھی کہ جس رشتے پر وہ پھولے نہیں سما رہی اس میں کتنی خامیاں ہیں۔

''میرے خیال میں تم لوگوں کی منگنیاں نہیں ہوئی ناں اس لیے تم لوگ اچھی خاصی جیلس ہوگئی ہو۔ آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ باقی آئندہ، او کے بائے۔'' عائشہ نے دعا کے ہاتھ سے البم لی اور دل جلانے والی مسکراہٹ لبوں پر سجا کے یہ جا وہ جا۔ اور وہ چاروں جو اپنے تئیں اس کے خودسر دماغ کا علاج کر رہی تھیں، پیچ و تاب کھا کے رہ گئیں۔

''ہائے۔'' زنیرا نے حسرت سے بھرپور ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے ان تینوں کو ٹھہرا دیا۔ ''یارب! حسن تو ہم چاروں کو بھی تو نے بڑی فیاضی سے عطا کیا ہے مگر کیا ہی اچھا ہوتا جو ہم میں سے کسی کو ایک عدد منگیتر بھی عطا کر دیتا تو شاید آج ہم یوں بے عزت نہ ہوتے۔'' حسرت سے پرشکوہ بھری دعا سب کو افسردہ کر گئی۔

''دل پر نہ لے جگر۔'' دعا نے زنیرا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ڈھارس بندھائی۔ ''خدا کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ سو عمرِ عزیز کی اٹھارہ بہاریں اگر بے کیف گزری ہیں یا ہمارا حسنِ جہاں سوز کوئی جادو نہیں چلا سکا تو یقیناً اس میں کوئی اللہ کی مصلحت ہی ہوگی۔'' دعا کے تسلی دینے پر زنیرا نے اسے گھور کے دیکھا۔

''محترمہ! اگر ہمارے حسنِ جہاں سوز نے آج تک کسی شہزادے پر جادو نہیں چلایا تو کل تک ضرور چلا لے گا۔ بات کسی گلفام کے لٹو ہونے کی نہیں بلکہ اس بے عزتی کی ہے جو ابھی چند لمحوں پیشتر آنسہ عائشہ درانی صاحبہ ہماری کر کے گئی ہیں۔'' حساس دل زنیرا نے عائشہ کی بات کا گہرا اثر لیا تھا۔

''یارب! ہم چاروں میں سے کسی ایک کی راتوں رات کسی ہینڈسم بندے کے ساتھ انگیجمنٹ کرا دے تاکہ ہم بھی تصویروں کا ڈھیر لا کے عائشہ کی بچی کو جلا سکیں۔'' زنیرا کے ننھے سے دل کے لیے عائشہ کا مذاق اڑاتا لہجہ فراموش کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ سو پھر...... ماہین کو لگا کہ معاملہ انتہائی ''سنگین'' صورت اختیار کر لے گا، اگر جو اس نے اپنی منگنی کی خبر مزید ان لوگوں سے مخفی رکھی اور تب ہی ماہین پر آشکار ہوا۔

''دوستوں کو افسردہ دیکھ کر ان کی دلجوئی نہ کرنا، ہر کسی کے لیے آسان نہیں ہوتا اور اس صورت میں تو قطعی نہیں جب آپ کے پاس دوست کی افسردگی کا علاج بھی ہو۔'' سو ماہین کو لگا کہ وہ اب مزید زنیرا کو اداس نہیں دیکھ سکتی۔

''چاروں میں سے کیوں......؟ میں تو پہلے ہی منگنی شدہ ہوں۔'' اسے معلوم تھا کہ یہ خبر ان تینوں کے لیے کسی ''ڈرون حملے'' سے کم ثابت نہیں ہوگی اس لیے ماہین نے عام سا لہجہ اختیار کیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

''دیکھو زنیرا! اللہ نے کتنی جلدی تمہاری سن لی۔ تم نے ''راتوں رات'' کہا تھا، اللہ نے بیٹھے بٹھائے اسے منگنی شدہ کر دیا۔'' سحاب کو اس کی بات پر اعتبار نہیں تھا۔

''یہ ''حادثہ'' بیٹھے بٹھائے رونما نہیں ہوا۔'' ماہین کے لیے اپنی منگنی حادثہ ہی تو تھی۔

''دو برس بیت چکے ہیں اس واقعے کو۔'' ماہین نے کن انکھیوں سے تینوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

ماہین کی بات پر چند لمحوں تک تو تینوں یقین اور بے یقینی کی کیفیات کے درمیان گھڑیال کے پنڈولم کی

طرح ڈولتی رہی تھیں۔
''کون سا حادثہ؟ اور کس واقعے کی بات کر رہی ہو؟'' دعا اب بھی بے یقین تھی۔
''بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ہماری جگری دوست اتنی بڑی بات ہم سے چھپائے اور وہ بھی مسلسل دو سال تک۔''
''اپنی منگنی کی بات کر رہی ہوں۔'' وہ بلاوجہ ہی کوئسچن پیپر نکال کے پڑھنے لگی۔
''ماہین! سچ ہے یا گپ......؟ سچ بتانا بالکل۔'' سحاب کے تیور خطرناک تھے۔
''اُف! کیا مصیبت ہے۔ ایسی کون سی انوکھی بات کر دی میں نے کہ تم لوگوں کو اعتبار ہی نہیں آ رہا۔'' وہ جھنجلا اٹھی۔
''اعتبار کی بچی، تم نے اتنی بڑی بات ہم سے چھپا کیسے لی؟''
''یعنی واقعی تم نے منگنی رچا لی اور اپنی دوستوں کو ہوا تک نہ لگنے دی۔ ہائے ربّا! یہ دن دیکھنے سے پہلے میں مر کیوں نہ گئی۔''
''اعتبار آ بھی کیسے سکتا ہے؟ کبھی کسی دوست نے اپنی دوستوں کے ساتھ ایسا نہ کیا ہوگا، جیسا تم نے کیا۔'' ماہین کی بات کے جواب میں تینوں کی زبان سے بیک وقت تین مختلف جملے ادا ہوئے جس کی وجہ سے عجب شور سا پیدا ہو گیا اور ساتھ ہی تینوں کے فولڈر بیک وقت ''ٹیک آف'' کر کے ماہین کے سر، کمر اور بازو پر ''لینڈ'' کر گئے۔
''اُف اللہ! کیسی جنگلی دوستوں سے پالا پڑا ہے میرا۔ کم از کم سبب تو جان لیتیں کہ میں نے یہ خبر کیوں تم لوگوں سے مخفی رکھی۔'' اس نے بازو سہلاتے ہوئے کہا۔
''تو تم کیا سمجھتی ہو، وجہ جانے بغیر ہم تمہیں بخش دیں گے۔ جلدی سے اُگل دو اس خبر کے اتنے عرصے تک پوشیدہ رکھنے کی وجہ۔''
''وجہ کوئی خاص نہیں۔ بس میں چاہتی ہوں کہ یہ انگیجمنٹ ختم ہو جائے۔ اسی سبب میں اس خبر کو سارے جہان میں نشر کرنے سے احتراز برتتی ہوں۔''
''کیا......؟ ختم کر دینا چاہتی ہو؟ وہ کیوں بھلا؟'' تینوں ہی متحیر تھیں۔
''وہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔
''مگر لڑکوں کی شکل صورت کب اتنی اہمیت رکھتی ہے کہ اس کو بنیاد بنا کر منگنی ہی توڑ دی جائے۔'' سحاب نے کہا۔
''یہ میں نے کب کہا کہ اس کی شکل صورت میرے لیے قابلِ قبول نہیں۔ اس میں بہت بری عادتیں پائی جاتی ہیں۔'' اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تو وہ تینوں ہی ٹھٹکیں۔
''اوہ نو، کہیں نشہ وغیرہ تو نہیں کرتا؟'' دعا متفکر ہوئی۔
''ہمیشہ انوکھا ہی سوچنا۔'' ماہین نے فولڈر اٹھا کے اس کے سر پر دے مارا۔
دعا کا حشر دیکھ کر زنیرا نے لب بھینچ کر کچھ کہنے کا ارادہ فی الفور ملتوی کیا۔
''پھر بھی پتا تو چلے۔ ایسی کون سی بری عادتیں ہیں موصوف میں جو تم انتہائی حد تک جانے کا سوچتی ہو؟'' سحاب ایسے چھوٹے موٹے ''حملوں'' سے نہیں ڈرتی تھی سو بلا جھجک کہہ گئی۔
''کوئی ایک ہو تو بتاؤں۔'' اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''وہ مجھے دنیا کی احمق ترین لڑکی سمجھتا ہے اور کبھی کسی بھی معاملے میں اہمیت نہیں دیتا۔''
''واؤ! بندہ تو کافی سمجھ دار لگتا ہے۔'' سحاب نے بے ساختہ سراہا۔ مگر پیشتر اس کے کہ ماہین اس کے فقرے پر دھیان دیتی زنیرا بول اٹھی۔
''محض یہی سبب ہے تمہارے منگنی توڑنے کا تو پھر جو تمہیں احمق سمجھتے ہیں وہ بالکل حق پر ہیں۔''
''صرف یہی سبب نہیں ہے۔'' وہ تڑپ ہی تو اٹھی زنیرا کے تبصرے پر۔ ''وہ مجھے ذلیل و رسوا کرنے کا

کوئی موقع ضائع نہیں جانے دیتا۔ نت نئے طریقوں سے مجھے ممی کے ہاتھوں بے عزت کروا کے لطف لیتا ہے۔'' اس نے اپنے تئیں خضر کی ایک اور بری عادت اپنی دوستوں کے گوش گزار کی۔ جسے سن کر ان تینوں نے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کو بڑی مشکلوں سے لبوں تک آنے سے روکا۔

''اوہ نو، یہ بات تم اپنی ممی کو بتامت دینا۔ ورنہ وہ خود ہی اس منگنی کو توڑ دینے میں ایک لمحہ نہیں لگائیں گی۔'' سحاب ایک بار پھر دل کی بات دل میں ہی رکھنے میں ناکام ہوئی۔

''سحاب! تم خاموش ہو جاؤ۔ ورنہ میں تمہارا سر پھاڑ دوں گی۔'' ماہین کو غصہ آ گیا۔

''او کے، او کے۔ اب نہیں بولوں گی۔'' سحاب نے باقاعدہ لبوں پر انگلی رکھ لی۔

''اور سب سے بڑی وجہ وہ مجھے ناپسند کرتا ہے۔'' اب کی بار جو ''بری عادت'' منظرِ عام پر لائی گئی اس میں کافی وزن تھا سو وہ تینوں متوجہ ہوئیں۔

''اس بات کا بھلا تم نے کیسے اندازہ لگایا؟'' دعا مکمل تفتیش کے موڈ میں تھی۔

''اس نے خود مجھ سے کہا تھا کہ مجھ سے منگنی اس کے لیے گناہوں کی سزا ثابت ہوگی اور تو اور اس نے مجھے اکسایا کہ میں اس رشتے سے انکار کر دوں۔''

''تو وہ خود کیوں انکار نہیں کر دیتا؟'' زنیرا نے اچنبھے سے پوچھا۔

''وہ خود کبھی انکار نہیں کرے گا۔ وہ اگر ایسا کرے گا تو گھر والوں کی نظروں میں اپنی اہمیت کھو دے گا۔ اس لیے چاہے وہ اس رشتے سے کتنا ہی ناخوش کیوں نہ ہو، انکار نہیں کرے گا۔ لوگوں کے سامنے نمبر بڑھانے کے سارے طریقے ازبر ہیں اسے۔''

''پھر......؟'' دعا کو اسٹوری دلچسپ لگی۔

''پھر کیا؟ اس کے کہنے میں آ کر میں نے انکار کر دیا اور ممی کے جلال کو آواز دے لی۔ ممی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، گھما کے تھپڑ میرے پھول سے گال پر رسید کر دیا اور تب ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ اس منگنی کو میں قائم نہیں رکھوں گی۔ جب بھی شادی کا ذکر چھڑا، میں اعلانِ بغاوت کر دوں گی۔'' وہ اچھی خاصی جذباتی ہو گئی۔

''تو شادی کا ذکر ابھی تک کیوں نہیں چھڑا؟ دو برس تو ہو گئے تمہاری منگنی کو؟'' اب سحاب کو معلوم نہیں شادی سے دلچسپی تھی یا اعلانِ بغاوت سے۔

''موصوف ایم بی اے کے لیے لندن گئے ہوئے ہیں۔ دو برس بعد لوٹیں گے۔ شاید تب ہی ہو گی۔''

''اچھا، لندن گئے ہیں۔'' زنیرا اچھل اٹھی۔ ''پھر تو سمجھو ہماری ''جگری دوست'' کا آدھا مسئلہ حل ہو گیا۔'' زنیرا نے اس کے کندھے کے گرد بازو پھیلا کر گویا اس کی ڈھارس بندھائی۔

''وہ کیسے؟'' ماہین کے ساتھ، ساتھ وہ دونوں بھی متوجہ ہو گئیں۔

''وہ اس طرح کہ اکثر مشرقی لڑکے مغربی ممالک جا کے وہاں کی گوریوں کی سنہری زلفوں کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ وجہ چاہے کچھ بھی ہو مگر ایسا بہر حال اکثر دیکھا گیا ہے اور اگر تمہارے منگیتر صاحب بھی کسی گوری پر دل ہار بیٹھے تو تمہارا مسئلہ تو حل ہو گیا ناں!'' اپنی دوست کی ڈھارس بندھاتی زنیرا اگلے روز اس وقت اپنی گزشتہ روز کی ''تقریر'' پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور ہو گئی، جب خضر کی تصاویر اس کی نظروں سے گزریں۔

''ہائے، کتنا ہینڈسم بندہ ہے ماہین! دعا کرو کہ وہ کہیں کسی ''گوری'' کی زلفوں کا اسیر نہ ہو جائے۔''

''واؤ کیا زبردست پرسنالٹی ہے۔ میں تو کہتی ہوں ماہین! اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کر لو۔ اتنے شاندار بندے کا تو غصہ بھی پیارا لگے گا۔'' دعا پر کچھ زیادہ ہی تصویر اثر انداز ہو گئی تھی۔

''تم لوگ کیا اسے الٹی سیدھی پٹیاں پڑھا رہی ہو؟'' سحاب نے دونوں کو گھور کے دیکھا اور روئے سخن

ماہین کی جانب موڑ دیا۔
''تم ان کی باتوں میں نہ آنا ماہین! جلدی سے اس بندے کو ''سائڈ'' پر کرو تا کہ میں اپنی راہ ہموار کرسکوں۔''
''کیسی دوستیں ہو تم میری؟ تم لوگوں کو میری کوئی فکر نہیں اور ذرا سا ہینڈسم بندہ دیکھ کر فوراً فریفتہ ہو گئیں۔'' ماہین کی آنکھوں میں ناراضی کے جذبات دیکھ کر وہ تینوں ہی بوکھلا کر اس کے اردگرد بیٹھ گئیں اور پھر منتوں، التجاؤں کا دور شروع ہوگیا۔

☆☆☆

''نانی امی! آپ کے ہاتھ کا بنا ہوا گاجر کا حلوا کھانے کا من کر رہا ہے۔'' ماہین دونوں ٹانگیں سامنے سینٹرل ٹیبل پر پھیلائے، صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے انتہائی آرام دہ حالت میں نانی امی کے برابر بیٹھی تھی۔
''چندا! گاجر کو مارکیٹ میں آتو لینے دو.. پھر کراچی میں سب سے پہلے ہمارے گھر میں ہی حلوا بنے گا۔'' نانی امی ہمیشہ کسی کم سن بچے کی طرح اس کے لاڈ اٹھاتی تھیں۔
''نانو!'' کچھ پل ٹھہر کر اس نے دوبارہ نانی امی کے من پسند کام میں خلل ڈالا۔
''جی، نانو کی جان۔'' نانی امی کتاب رکھ کر ایک بار پھر ہمہ تن گوش ہوئیں۔
''غالب امکان ہے کہ والدہ محترمہ مجھے لینے کے لیے کسی کو بھیجیں گی۔'' وہ پچھلے تین روز سے ان کے پاس ٹھہری ہوئی تھی۔ ''یا پھر آپ کو کال کر کے مجھے ماموں کے ساتھ بھیج دینے کا کہیں گی۔'' وہ سیل فون سے کھیلتے ہوئے سرسری لہجے میں بولی۔
''اچھا تو پھر......؟'' نانی امی جان کر انجان بنیں۔
''تو پھر یہ کہ آپ کا دل بھی تو میرے بنا نہیں لگتا ناں۔'' اس نے گردن ترچھی کر کے معنی خیزی سے کہا۔
''ویسے نانی امی! آپس کی بات ہے... میرا یہ خیال ہے وہ ہٹلر کو آئیڈیلائز کرتی ہیں اس وقت غلط ہو جاتا ہے جب ان کی دال آپ کے آگے نہیں گلتی۔''
''ماہین!'' انہوں نے تنبیہی نگاہوں سے اسے چشمے کے پیچھے سے گھورا۔
''پہلے تولو پھر بولو کا محاورہ یقیناً تم نے سن رکھا ہو گا۔'' نانی امی نے نرمی سے سرزنش کی۔
''سوری، نانی امی۔'' غلطی کا احساس جاگتے ہی اس نے فوراً اپنے کان پکڑ لیے۔ اسی پل فون کی بیل بج اٹھی۔
''دیکھا آ گئی ناں میری ماں کو میری یاد۔'' اس کے اندازے کے مطابق فون ممی کا تھا مگر حقیقت میں خضر کا تھا۔ وہ نمبر دیکھ کر ہی پُرجوش ہوگئیں۔
''ہیلو! خضر بیٹا کیسے ہو؟'' ان کا خوشگوار موڈ مزید خوشگوار ہوا۔
''اوہ خضر۔'' ماہین کا منہ بن گیا۔
''مجھے بھی تمہاری یاد بڑا ستاتی ہے۔ ویسے خیریت رہی؟ اس بار کافی دنوں بعد کال کی؟''
دوسری طرف کی آواز ظاہر ہے نہیں آرہی تھی لیکن نانی امی کی باتوں سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ موصوف نانی امی کی یاد میں گھل رہے ہیں۔
''بیٹا! فضول باتوں کی طرف سے دھیان ہٹاؤ، جس مقصد کے لیے گئے ہو، اس پر اپنی توجہ صرف کرو۔ اپنوں کی یاد تو جتنا دور جاؤ، اتنی زیادہ آتی ہے۔ اس بار چھٹیوں میں تمہارا کوئی کورس وغیرہ کرنے کا ارادہ نہ ہو تو ایک چکر لگا جاؤ۔'' انہوں نے نصیحت سے تسلی اور تسلی سے مشورے تک کا سفر ایک سانس میں طے کیا۔
ماہین نے غیر محسوس طریقے سے نانی امی کے مزید قریب ہو کر اگلی طرف کی بات سننے کی سعی کی...... مگر بے سود۔
''ہاں، یہ تو ہے بیٹا! چلو جہاں دو برس بیتے، مزید دو بھی بیت ہی جائیں گے۔ اللہ مالک ہے۔'' انہوں نے سرد آہ بھری اور مقابل کی سننے لگیں تو ایک بار پھر چند پل کے لیے لاؤنج میں

خاموشی طاری ہوئی۔

''ہاں، یہاں سب خیریت سے ہیں۔ تم نے اپنی ماں کو فون کیا؟ وہاں سب سے بات ہوئی تمہاری؟''

جواب میں اللہ جانے نانی امی نے کیا سنا تھا مگر ان کے اگلے فقرے نے ماہین کو بوکھلا دیا۔

''ماہین سے تو بات نہیں ہوئی ہوگی تمہاری...... یہ پچھلے تین روز سے یہیں ہے۔ لو بات کرلو اس سے۔''

گزرے دو برس میں جب بھی خضر کا فون اس کی موجودگی میں آتا، وہ چپکے سے اپنے کمرے میں آکر سوتی بن جاتی۔ اب چاہے کال دن کے بارہ بجے ہی کیوں نہ آئی ہو مگر آج اسے بالکل بھی توقع نہیں تھی کہ نانی امی یوں ''شب خون'' ماریں گی، سو وہ بری پھنسی۔

انہوں نے فون اسے پکڑا کر وال کلاک کی سمت نگاہ دوڑائی تو ہڑبڑا اٹھیں۔

''اوہ میری نماز کا وقت نکلا جارہا ہے۔'' نانی امی کے جاتے ہی ایک پل کو اس کا دل چاہا کہ لائن ڈسکنکٹ کردے لیکن......

''ہیلو! السلام علیکم۔'' اس نے زندگی میں پہلی بار خضر کو نہایت سنجیدگی، شرافت اور تمیز سے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' جواب بھی انتہائی سنجیدگی سے آیا تھا۔

''پڑھائی کیسی جارہی ہے ماہین؟'' ایک روایت سی ہے کہ سلام کے بعد بندے کا حال چال پوچھا جاتا ہے، سو اسے بھی یہی توقع تھی مگر توقع کے برخلاف فقرہ سن کر اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''لو جی! میری کوئی فکر ہے نہ خیال۔ کوسوں دور بیٹھے ہوئے بھی پڑھائی کی فکریں پالی ہوئی ہیں، بقراط نے۔'' اس پر بیزاری طاری ہوئی۔

''ٹھیک ہورہی ہے۔'' ذہن میں اس سے زیادہ مختصر جملہ وارد نہیں ہوا۔

''نانی امی بتا رہی تھیں کہ پچھلے دنوں وہاں حالات اتنے خراب ہوگئے تھے کہ تعلیمی ادارے کئی روز تک بند رہے۔ پڑھائی کا جو حرج ہوا اس کا اندازہ لگانا ہی محال ہے۔ تمہارے پیپرز کیسے ہوئے؟'' ماہین کو اس کے لہجے میں دو سال قبل والی کوئی بات نہ ملی۔ اس کے مخصوص شرارتی لہجے کی جگہ سنجیدگی اور متانت نے بڑی خوبی سے لے لی تھی۔

''اچھے ہوگئے۔''

''جو باتیں مجھ سے کرنی چاہیے تھیں، وہ نانی امی سے کرکے فارغ ہوا۔ اب میرے لیے ''پڑھائی'' اور ''کراچی کے حالات'' جیسے موضوع ہی رہ گئے ہیں۔ ابھی شاید گفتگو کچھ طول پکڑے گی تو یہ مہنگائی اور لوڈشیڈنگ پر گفتگو کرنے لگ جائے گا۔'' وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔

''اب رزلٹ آنے تک کا جو وقت ہے اسے ضائع نہیں کرنا۔ کوئی کورس یا انٹرن شپ کرلینا۔''

''مجھ سے بہتر تو نانی امی ہیں جنہوں نے ''آپ کی بہت یاد آرہی ہے، آپ کے بنا دل نہیں لگ رہا'' جیسے پیار بھرے فقرے تو سنے۔ میں بیچاری تو اس سے بھی گئی۔'' وہ کوفت کا شکار ہوئی۔

''اور کچھ؟'' اس نے اکتا کر کہا تو وہ ہنس دیا۔

''سنا ہے پڑھائی میں اب بھی آپ کا دل نہیں لگتا۔''

''شکر ہے رومینٹک جملہ نہ سہی، رومینٹک ورڈ تو آیا۔'' دل چاہے پڑھائی کے حوالے سے ہی سہی مگر دل کو ڈھارس تو بندھی۔

''پرسنٹیج سکسٹی نائین (69) سے سیونٹی تھری (73) کے درمیان ہی سفر کرتی رہتی ہے۔'' اب پھر وہ اپنے وہی پرانے اوچھے پن پر اتر آیا تھا۔

''سنا تو میں نے بھی آپ کے متعلق بہت کچھ ہے کہ لندن کی حسینائیں پڑھائی میں بڑا خلل ڈالتی ہیں۔'' حالانکہ سنا تو اس نے ایسا کچھ نہیں تھا مگر دل میں پلتے شک کی بنیاد پر اس نے اندھیرے میں تیر چلایا کہ اگر یہ سچ ہوا تو وہ ضرور تردید یا تائید میں کچھ ایسا اگل دے گا جس سے اندازہ لگانا دشوار نہیں رہے گا۔

''اچھا!'' خضر نے اپنے بے ساختہ قہقہے کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

''یہاں میرا ایک پاکستانی دوست ہے، اس کی منگیتر کو بھی لندن کی حسیناؤں میں اپنے لیے بہت بڑا خطرہ محسوس ہوتی ہیں۔'' وہ محظوظ ہوا تھا اس کے جملے سے۔

''ہوتی ہوں گی لیکن مجھے تو ایسا کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔'' خود کو بے پروا ظاہر کرنے کی اس نے بھرپور کوشش کی۔

''اتنا بھروسا ہے مجھ پر۔'' خضر نے اس کی بات کو اپنی مرضی کے معنی پہنائے اور شرارت سے گویا ہوا۔

''ہاں، بڑی قابلِ اعتبار ہستی ہو ناں تم۔'' اس نے جل کر کہا۔ ''میری تو دلی مراد بر آئے گی، اگر تم وہیں کسی سے شادی کر لو۔ خواہ مخواہ ہی میرے سر پر مسلط کر دیے گئے ہو۔'' کہنے کے ساتھ اس نے غصے سے لائن ڈسکنکٹ کر کے سیل فون کو سامنے ٹیبل پر پٹخا۔

''اس سے بات کرنا اپنا دل جلانے کے مترادف ہے۔ دل کو پُرسکون رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کم بخت سے بات ہی نہ کی جائے۔'' وہ غصے سے بڑبڑائی۔ محض چند پل ہی دل کو پُرسکون کرنے میں لگے تھے، پھر وہ سائڈ ٹیبل سے اپنا موبائل اٹھا کر میسج کرنے لگی۔

''دوستو....! بڑا ہی دل دُکھا دینے والا واقعہ رونما ہوا ہے آج۔ پورے دو برس بعد اتفاقاً ہی اپنے منگیتر صاحب سے بات ہوئی تو دل جل کر خاک ہو گیا۔ اب بھلا بتاؤ... اس روئے زمین پر کوئی ہو گا جو سمندر پار سے اپنی منگیتر کو کال کر کے حالاتِ حاضرہ اور اسٹڈی پر گفتگو کرے۔ گفتگو کے دوران خواہ مخواہ ہی ہیلری کلنٹن نیا دآئے جا رہی تھی۔'' میسج ٹائپ کر کے اس نے تینوں کو بیک وقت سینڈ کر دیا۔ پلک جھپکتے ہی ریلائی موصول ہونے لگے اور سب نے تو جواب دیے ہی مگر سحاب کا جواب ٹھک کر کے اسے لگا تھا۔

''ہیلری اور بل کو چھوڑو، تم اپنی بات کرو۔ جہاں تک میرا خیال ہے تم سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ خضر تمہیں نظر انداز کرے یا اس نئے رشتے کو غیر اہم سمجھے جو تم دونوں کے بیچ بڑوں نے طے کیا ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ تم خضر کو پسند کرتی ہو، ورنہ تمہیں اس کی ایسی گفتگو اتنا دکھی نہ کرتی۔'' سحاب نے اس کے پہلے ٹیکسٹ سے ہی جو اندازہ لگایا وہ ٹائپ کر کے سینڈ کر دیا۔

''جی نہیں، میں کوئی کسی کو پسند وسند نہیں کرتی اور نہ ہی کسی کی گفتگو نے مجھے دکھی کیا ہے، وہ تو سیاست سے چڑ ہونے کے سبب ایسی گفتگو سے بھی نفرت ہے جو کسی بھی سیاست دان کی یاد دلا دے۔'' اس نے سحاب کے بیان کی پُرزور تردید کی۔ کچھ اسی طرح کے پیغامات باقی سب کے بھی تھے۔

''کیا بکواس ہے یہ...... ایک ذرا سی بات کیا کہہ دی، تم لوگوں نے تو اس کا فسانہ ہی بنا ڈالا۔ میرے دل نے مجھ سے کوئی غداری نہیں کی۔ میں اس سے منگنی کا رشتہ ختم کرنے کا جو ارادہ کیے بیٹھی ہوں، اس کو عملی جامہ بھی بہت جلد ہی پہناؤں گی۔ تم لوگ دیکھنا...... میں نے تو اس سے زندگی بھر بات نہ کرنے کے ارادے کو بھی بڑی کامیابی سے دو سال تک نبھایا۔ مگر آج اتفاق سے ہی بات ہو گئی مگر کاش نہ ہی ہوئی ہوتی۔'' اس نے اپنی دوستوں کو باور کرایا کہ وہ خضر کے لیے کوئی خاص جذبات نہیں رکھتی۔

''شبہ تو ہمیں تمہاری بے وقوفی پر پہلے بھی کبھی نہیں رہا مگر اس قدر ہینڈسم بندے کو اگر تم نے ٹھکرا دیا تو ہم تینوں بے وقوفی کے اس شاندار مظاہرے پر تمہیں اعزازی طور پر پھولوں کے ہار پہنائیں گے۔'' زنیرا کا ریلائی اسے مشتعل کر گیا۔

''دفع ہو جاؤ تم سب کی سب۔ غدار، دھوکے باز، دوست میری ہو مگر ہمہ وقت اس بقراط کے لیے رطب اللسان۔ میں تو تم لوگوں سے ذکر کر کے پچھتائی۔ میری توبہ جو میں آئندہ تم لوگوں سے کوئی بات کروں۔'' غصے سے میسج سینڈ کر کے اس نے سیل ہی آف کر دیا۔

''سارے کے سارے غدار میرے ہی نصیب سے جُڑے ہیں۔'' فون آف کر کے بھی وہ کافی دیر تک بڑبڑاتی رہی تھی۔

☆☆☆

''ماہین! بے وقت کیوں سو رہی ہو، اٹھ کر باہر آؤ۔'' ممی کی غصیلی آواز پر وہ ہڑبڑا کے اٹھی۔ ماضی کی بھول بھلیوں میں سفر کرتے ہوئے وہ کب نیند کی وادیوں میں جا اتری، کچھ خبر ہی نہ ہوسکی۔

''آنی! صبح سے بھوکا ہوں پلین میں بھی کچھ نہیں کھایا۔ اب تو یوں لگ رہا ہے جیسے پیٹ میں چوہوں کا عالمی مقابلہ شروع ہو گیا ہے۔'' خضر کی بلند آواز نے لاؤنج سے ڈرائنگ روم تک کا سفر بغیر رکاوٹ کے طے کیا۔

''تو گویا موصوف بالآخر پہنچ گئے۔'' لاؤنج کی چہل پہل کا اندازہ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر بھی بخوبی لگا سکتی تھی۔

''اُف نہ جانے کتنی دیر تک سوتی رہی ہوں میں، وہ بھی بے وقت۔'' اچانک احساس ہوتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''خدا کی پناہ! صبح سے بھوکے ہو...... مگر کیوں؟ اس مشقت کی وجہ جاننے سے قاصر ہوں میں۔'' ممی کی فکرمندسی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

''ہائے ری قسمت، کبھی میرے لیے تو ایسی مٹھاس نہ ٹپکی، میری ماں کے لہجے سے، ساری شیرینی اسی کم بخت کے لیے ہے۔'' اس نے ہاتھوں سے بکھرے بال سنوارے اور موبائل اٹھا کر باہر کی سمت چل دی۔

''وجہ بھلا کیا ہوگی آنی، سوائے اس کے کہ مدت ہوئی آپ کے ہاتھ کا پکا ہوا نہیں کھایا۔ سو آج ڈٹ کر کھانے کا ارادہ ہے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ پیٹ کو خالی رکھا جائے۔''

''اچھا...... پھر میں کھانا لگا دیتی ہوں۔'' ممی مسکرا کر کچن کی سمت چل دیں۔

''السلام علیکم۔'' اس نے لاؤنج میں داخل ہو کر بغیر کسی کو مخاطب کیے بلند آواز میں سلام جھاڑ دیا۔

خضر صوفے پر بیٹھا، اپنے برابر بیٹھے ننھے ارتضیٰ کی سمت جھک کر اسی کی بولی میں شاید کوئی بہت ہی اہم الجھن سلجھا رہا تھا۔ چہرے پر ثبت سنجیدگی سے تو یہی لگ رہا تھا۔ اس کے سلام کرنے پر خضر چونک کے سیدھا ہوا۔

''وعلیکم السلام! کیسی ہو ماہین؟'' باٹل گرین ٹی شرٹ اور بلیک جینز میں وہ بلا کا جاذب نظر لگ رہا تھا۔

ماہین کا وہاں ٹھہرنے کا کوئی ارادہ تھا نہ خواہش۔ وہ محض سلام کرنے کے لیے ہی بادلِ ناخواستہ چند ثانیے کو رکی تھی مگر سلام کے جواب کے ساتھ خضر نے جو مزاج پرسی کی رسم نبھائی تو اسے نہ صرف رکنا پڑا بلکہ اخلاق کے تقاضوں کو بھی نبھانا پڑا۔

''میں ٹھیک ہوں......آپ خیریت سے ہیں؟''

''الحمدللہ۔''

''آپ......؟'' خضر کا جواب سارہ کی ہلکی چیخ میں واضح نہ ہوسکا۔ اس وقت لاؤنج میں خضر اور ارتضیٰ کے علاوہ سارہ اور حسن بھائی بھی موجود تھے۔

''ہماری ماہین کے لیے خضر ''آپ'' کب سے ہو گیا؟'' سارہ کے لہجے میں شرارت نمایاں تھی۔

''کہیں مستقبل میں دشواری پیش نہ آئے، اپنے سرتاج کو ''آپ'' کہنے میں......شاید اسی لیے ابھی سے عادت ڈالی جا رہی ہے...... ہے ناں ماہین؟'' سارہ کی اس بے ہودگی پر وہ پیچ و تاب کھا کے رہ گئی غصے کا گراف اس وقت کچھ اور اونچا ہوا جب اس نے خضر اور حسن بھائی کے لبوں پر محظوظ سی مسکراہٹ کو مچلتے دیکھا۔

''خباثت میں تو بالکل اپنے بھائی پر گئی ہے۔'' اس نے دانت پیس کر سوچا مگر وہ جواب میں کچھ بھی الٹا سیدھا بول کر اس قصے کو مزید نہیں کھینچنا چاہتی تھی۔ سو اس نے ایک ناراض سی نگاہ سارہ پر ڈال کر کچن کا رخ کیا۔

''مستقبل کے سرتاج۔'' اس نے ہلکے سے سر جھٹکا۔ ''ذکر چھڑنے تو دو بیٹا شادی کا...... پھر دیکھنا...... انکار نہ کر دیا شادی سے تو کہنا۔'' اس کے ارادے بڑے خطرناک تھے۔

''وہ تو منگنی کے وقت بڑوں کی ''زبردستی'' کام آ گئی۔ اب تو نانی امی کے ذریعے انکار کہلاؤں گی۔'' اس میں کوئی شک ہی نہیں تھا کہ ممی کے سامنے تو وہ اب بھی کچھ بولنے کی خود میں ہمت نہیں پاتی تھی۔ کچن میں کھڑے، کھڑے اس نے مستقبل کی پلاننگ بھی کر ڈالی اور سارہ کی بات کا اثر زائل کرنے کی اِک کوشش بھی۔ اب وہ اس کوشش میں کامیاب ہوئی تھی یا نہیں مگر ممی کو اپنی طرف ''ظالم نظروں'' سے گھورتا پا کر وہ بوکھلا کر یہ سوچنے پر ضرور مجبور ہو گئی کہ وہ اپنی پلاننگ پر عمل بھی کر سکے گی یا نہیں۔

☆☆☆

خضر کے کامیاب لوٹنے کی خوشی میں گھر کے لان میں ہی ایک چھوٹی سی پارٹی کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس نے اپنی دوستوں کو بھی بلایا تھا۔ وہ چاروں ایک میز پر بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔

''یار! اپنے ہینڈسم سے تعارف تو کرواؤ ہمارا، انہیں پتا تو چلے کہ ماہین ابراہیم کی دوستیں کتنی خوب صورت ہیں۔'' سحاب نے دور کھڑے خضر کو دیکھ کر کہا جو زرناز سے گفتگو میں مشغول تھا۔

ماہین فرداً فرداً گھر کے تمام افراد سے ان تینوں کا تعارف کروا چکی تھی مگر خضر سے متعارف کروانے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

آج خضر کو آئے بارہ دن بیت چکے تھے مگر ان بارہ دنوں میں اس نے خضر سے جو پہلے روز بات کی تو پھر اس کے بعد ماہین نے اس سے بات کرنے اور سامنا کرنے سے گریز ہی کیا...... ان کی ملاقات کھانے کی میز پر ہوتی اور کبھی کسی سبب کے تحت وہ بھی نہیں ہو پاتی۔ البتہ ان بارہ دنوں میں زرناز کے کئی چکر لگ چکے تھے۔ آج کل اس کا مشغلہ خضر کو اپنی طرف مائل کرنا تھا۔

''فضول ہے یہ کوشش...... اس وقت اس کے پاس جو خوب صورت لڑکی کھڑی ہے اس کے آگے تم لوگوں کا حسن کچھ بھی نہیں۔ وہ تم لوگوں کو لفٹ ہی نہیں کرائے گا۔'' اسے آج کل زرناز پہ ہمیشہ سے کچھ زیادہ غصہ آ رہا تھا۔

''تو نہ کرائے لفٹ...... ایسے ہینڈسم کی بے رخی بھی ہم ہنس کے سہار لیں گے۔'' سحاب نے کسی فلمی ہیروئن کی طرح ڈائیلاگ جھاڑا۔

''یار ماہین! مجھے لگ رہا ہے یہ تمہاری کزن خضر پہ ڈورے ڈالنے کی کوشش میں ہے۔ اگر تمہارا یہی حال رہا تو وہ بہ آسانی اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گی۔'' دعا کو فکر لاحق ہوئی۔

''ہونے دو، مجھے کون سا فرق پڑتا ہے۔'' اس نے بے نیازی برتی۔

''تم جیسا کم عقل تو کوئی شاید ہی ہو اس دنیا میں۔ میں اگر تمہاری جگہ ہوتی تو اس وقت ہواؤں میں

نیا سال

پرانے زخم ہیں، نیا سال
کلیاں سوئی، پھیلا جال
چاند ستارے، ہوا اور بادل
سارے اداس ہیں، سارے نڈھال
کہاں مقدر پھول کا موسم
اجڑا جیون، زندگی محال
دل برباد اور آنسو دامن
بھیگا آنچل اب سنبھال
جدھر بھی نظر اٹھے گی
اندھیرا، اندھیرا تیرگی زوال
چلو یہ کہانی تمام ہوئی
اب کیا دکھ، کیا خیال

کاوش: فصیحہ آصف خان، ملتان

اڑ رہی ہوتی۔'' زنیرا کا دل اس کی کم عقلی پر ماتم کرنے لگا۔
''ہاہاہا...... تم ہواؤں میں اڑ رہی ہوتیں اور نیچے تمہارا رائٹ مین کسی اور حسینہ کی بانہوں میں... بانہیں ڈالے مسرور ہوتا...... بے وقوفی میں تو پھر تم بھی ماہین کے برابر ٹھہریں ناں۔'' دعا نے گویا زنیرا کا مذاق اڑایا۔
''اُف......بس فضول ہانکے جاؤ، میری بات تو کہیں بیچ منجدھار میں ہی رہ گئی۔ کنارے تو لگنے دو کم از کم اسے۔'' سحاب جھنجلائی۔
''تو بکو بھی کس نے روکا ہے۔'' دعا نے بولنے کی اجازت دے کر گویا احسان کیا۔
''یار ماہین! مجھے اپنے فیانسی سے ملواؤ، میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ یہ بائی نیچر کیسا بندہ ہے۔''
''سوری ڈیئر! میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔'' ماہین سینے پر ہاتھ باندھ کر کرسی سے ٹیک لگا کر مطمئن حالت میں بیٹھ گئی۔
''او کے......!'' سحاب اٹھ کھڑی ہوئی۔
''میں خود مل لیتی ہوں۔'' اس نے اپنا سیل فون اٹھایا اور خضر کی جانب چل دی۔ ماہین نے بوکھلا کر اس کی جانب دیکھا۔
''اوہ! یہ منہ پھٹ کچھ الٹا سیدھا نہ ہانک دے اس ''شہزادے'' کے سامنے'' اسے نئی فکر لاحق ہوئی۔
اس نے دیکھا سحاب بڑی خوش مزاجی سے خضر سے بات کر رہی تھی اور خضر اس سے بھی زیادہ خوش مزاجی میں گویا اس کا ریکارڈ توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جبکہ سائے کی طرح اس کے ساتھ کھڑی زرناز اپنی تیوری کو شکنوں سے پاک رکھنے میں بری طرح ناکام ہو رہی تھی۔ اب وہ ان تینوں کی طرف اشارہ کر کے خدا جانے کیا ارشاد فرما رہی تھی جو خضر مسکرائے جا رہا تھا۔ اسے خلجان ہونے لگا۔ چند لمحوں بعد اس نے اشارے سے دعا اور زنیرا کو بھی بلوالیا۔ اس نے بوکھلا کے اپنا سیل اٹھایا۔
''اس کے سامنے کچھ الٹا سیدھا نہ بھونک دینا۔''
ٹیکسٹ سینڈ ہوا اور تینوں کے سیل کی آگے پیچھے بجی میسج ٹون اس نے اپنی ٹیبل پر بیٹھے ہوئے سنی۔
تینوں کی توجہ پل بھر کو خضر سے ہٹ کر اپنے، اپنے موبائل کی جانب مبذول ہوئی مگر اگلے پل سحاب اور دعا کی توجہ دوبارہ خضر کی جانب منتقل ہوگئی جبکہ زنیرا ریلائی کی ذمے داری نبھانے لگی۔
''سیدھا، سیدھا بھونکنے کی اجازت ہے؟'' اب کی بار ماہین، دعا اور سحاب کے سیل کی میسج ٹون بجی تھی۔
ایک ہی وقت میں موبائل ٹون بجنے پر خضر کا چونکنا ماہین نے دور سے محسوس کیا۔
''دھوکے بازوں، غداروں، آستین کے سانپوں، بھاڑ میں جاؤ آئندہ مجھ سے بات کرنے کی کوشش مت کرنا۔'' میسج سینڈ ہوا تھا اور ایک بار پھر تینوں کے موبائل کی ایک دوسرے کے پیچھے ٹون بجی۔
''یہ کیا ماجرا ہے؟'' اس نے دور سے خضر کے ہلتے ہوئے لبوں سے اندازہ لگایا۔
سحاب نے میسج پڑھنے سے زیادہ ضروری یہ جانا کہ خضر کو یہ بتا دیا جائے کہ وہ کس طرح ایک دوسرے کے پل، پل سے واقف رہتی ہیں۔ جبکہ دعا اور زنیرا اس کا میسج پڑھتے ہی اس کی ناراضی کا اندازہ لگا چکی تھیں سو فوراً اسے پیشتر اپنی میز تک واپس آ گئی تھیں اور پھر اسے منانے کے جتن ہونے لگے۔

☆☆☆

''نانی امی میں خضر سے شادی نہیں کروں گی پلیز آپ ممی سے کہہ دیں۔'' کل اتفاق سے ہی ممی اور مما کے درمیان ہونے والی گفتگو سے وہ آگاہ ہو چکی تھی۔ وہ اس کی شادی اگلے چند ماہ میں کرنے کا ارادہ کیے بیٹھی تھیں اور اس ارادے پر عمل نانی امی سے مشورے کے بعد ہی ممکن تھا۔ بہت ممکن تھا کہ مشورے کے لیے فون آج ہی کھڑکا دیا جائے سو اس نے نانی امی تک اپنے دل کی بات پہنچانے میں دیر نہیں کی انہوں نے کسی قدر حیرانی سے اس کی سمت دیکھا۔
''وہ کیوں بھلا؟'' انہوں نے اخبار لپیٹ کر

بیڈ کی سائیڈ دراز پر رکھا اور مکمل اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ''انکار کی یقیناً کوئی ٹھوس وجہ ہوگی تمہارے ذہن میں؟''

''وجہ کوئی خاص نہیں...... مجھے لگتا ہے وہ خود بھی مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔'' اس نے خود کو بے نیاز ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

''یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا؟''

''اندازہ نہیں لگایا اس نے خود کہا ہے۔''

''خود کہا ہے؟'' نانی امی متحیر ہوئیں۔ ''اس نے ایسا کب کہا؟''

''جس روز منگنی ہوئی اسی روز کہا تھا کہ تم سے شادی گناہوں کی سزا ہے۔'' اس نے روٹھے، روٹھے لہجے میں کہا۔

''تو جانو یہ تو بہت پرانی بات ہے۔ ابھی تو اس نے ایسا کچھ نہیں کہا ناں؟'' نانی امی اسے بچوں کی طرح بہلانے لگیں۔

''زبان سے نہیں کہا تو کیا ہوا اس کی حرکتیں نہیں دیکھتیں آپ، جب سے آیا ہے اکثر اوقات زرناز کے سنگ ہی دیکھا گیا ہے۔'' جوش جذبات میں آواز کچھ بلند ہوگئی۔

''ان ملاقاتوں میں بھی زیادہ ہاتھ زرناز کا ہی ہے۔'' نانی کے نزدیک دوسرے اعتراض میں بھی اعتراض والی کوئی بات نہیں تھی۔

''آپ نہیں جانتیں اس ڈرامے باز کو، بہت بڑا فنکار ہے وہ۔ اس نے ہمیشہ مجھے ممی کی نظروں میں ڈی گریڈ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک بار اس کی وجہ سے ممی نے مجھے تھپڑ بھی مارا تھا۔'' اسے تھپڑ کا غم بھولتا نہیں تھا۔

''اور اس بات کے لیے سوری بھی اس نے کئی روز کے بعد کی تھی۔ ایکسکیوز کیا تھا بس صرف فارمیلٹی ہی نبھائی گئی تھی۔ میں نے تو اس کا ایکسکیوز ایکسیپٹ ہی نہیں کیا مگر اسے پروا بھی کب تھی اگر ہوتی تو میری ناراضی دور کرنے کی کوشش ضرور کرتا۔'' اس کی خضر سے شادی نہ کرنے کی وجوہات اتنی سنجیدہ نوعیت کی تھیں کہ نانی امی کو مسکراہٹ لبوں کے گوشوں میں دبانا دشوار ہورہا تھا مگر وہ دھیان دیتی تب ناں وہ تو بس اپنی ہی ہانکے جارہی تھی۔

''مگر شاید وہ تو بھول بھی گیا ہے کہ میں اس سے ناراض ہوں۔ زرناز صاحبہ کچھ یاد رکھنے بھی تو نہیں دیتی ہوں گی ناں اسے۔ جب دیکھو اس کا دُم چھلا بنی رہتی ہے۔'' دل کی جلن نادانستگی میں بھی لفظوں سے بھی عیاں ہوگئی۔

''چلو میں خضر کو سمجھادوں گی کہ وہ تم سے ایکسکیوز بھی کرے اور زرناز سے ملنا بھی کم کرے۔''.... نانی امی اپنے تئیں اس کے مسئلے کا حل ڈھونڈ لائی تھیں مگر وہ سٹپٹا گئی۔

''نہیں نانو، اس سے کچھ مت کہیے گا۔ خواہ مخواہ ہی سر چڑھ جائے گا یہ سوچ کر کہ میں اس کی محبت میں مبتلا ہوکر زرناز سے جیلسی فیل کررہی ہوں۔'' اول روز سے اسی ایک بات کی وجہ سے ہی تو اسے خواری ہوئی جارہی تھی۔

''تو تم کس بات سے انکاری ہو، محبت سے یا جیلسی سے؟'' نانی امی کو اس وقت سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بڑی دقت ہورہی تھی۔

''اُف نانی امی، آپ نہیں سمجھ سکتیں۔'' وہ جھنجلائی۔ ''مجھے کوئی اس سے محبت وحبت نہیں ہے۔ ماضی میں جس طرح ڈرامے کرکر کے اس نے ممی سے میری عزت کروائی ہے اس کے بعد مجھے اس سے محبت ہو بھی نہیں سکتی لیکن آپ لوگوں نے اگر میرا مستقبل اس کے ساتھ جوڑا اور اگر اس کا ڈرامے بازی کا شوق اور ممی سے میری عزت کروانے کا شوق قائم رہا تو میرا مستقبل تو ہوگیا ناں اندھیرا۔'' اس نے روٹھے لہجے میں کہا۔

''اچھا بھئی، جس بات سے ہماری ماہین خوش اس سے ہم بھی مسرور....'' نانی امی سے اس کے ناراضی کب برداشت ہوتی تھی سو انہوں نے اس کو

بہلانے کے لیے فوراً حامی بھرلی۔ وہ مسکرا کر ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ نانی امی نے ایک بار پھر اخبار اٹھالیا اور وہ میسجنگ میں مصروف ہوگئی۔

''ساتھیو! آج ہم نے خضر سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ نانی امی تک پہنچا دیا ہے۔ وہ مان گئی ہیں جلد ہی معاملہ نمٹ جائے گا۔''

''اوہ مائی گاڈ کیوں انکار کردیا...... وجہ؟'' ان کے قائم کردہ اصولوں کے تحت جواب زنیرا کی جانب سے آنا چاہیے تھا مگر رپلائی سحاب کے نئے نمبر سے آیا تھا جو چند روز قبل ہی اسے سحاب نے سینڈ کیا تھا مگر اس نے اس بات پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔

''تم لوگ سب جانتی ہو پھر کیوں کا کیا سوال؟'' وہ جھنجلائی۔

''ہاں بھئی ہم لوگ سب جانتے ہیں...... اب اگر دوبارہ بھی دُہرا دو گی تو قیامت نہیں آجائے گی۔'' اب کی بار زنیرا کے نمبر سے رپلائی آیا۔

''میرا دماغ خراب نہیں ہوگیا جو میں دوبارہ دُہرانے لگ جاؤں۔ تم لوگوں کو اگر اتنا ہی شوق ہے میری بربادیوں کے قصے سننے کا تو ریکارڈ کرلینی تھی میری داستان۔'' وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔

''بس غلطی ہوگئی ناں جگر ریکارڈ نہیں کرسکے تیری داستان۔ اب لکھ کر سینڈ کردو ہم سیو کرلیں گے۔'' دعا گویا اسے چڑا رہی تھی اور وہ واقعی چڑ گئی۔

''بھاڑ میں جاؤ تم سب کی سب۔ بڑی غلطی ہوگئی جو تم لوگوں سے اپنی دل کی بات کرڈالی۔ اب مجھے چھیڑنے کی کوشش مت کرنا ورنہ ہماری دوستی خطرے میں پڑجائے گی۔'' اس نے میسج سینڈ کرکے موبائل ایک سائڈ پر ڈال دیا اس کے بعد وقفے، وقفے سے میسج ٹون بجتی رہی مگر اس نے نہ میسج دیکھا نہ ہی رپلائی کیا۔ بس یونہی آنکھیں موندے نظرانداز کرتی رہی۔ ذرا کی ذرا آنکھ لگی تھی۔ آنکھ کھلنے پر احساس ہوا کہ وہ پینتیس منٹ تک سوتی رہی ہے۔ اس نے نگاہیں گھما کر اردگرد دیکھا۔ نانی امی کمرے میں موجود نہیں تھیں۔ اٹھ کر اس نے ہاتھ سے بکھرے بال سیٹ کیے اور باہر آگئی۔ چائے کی طلب جاگ اٹھی تھی سو وہ کچن کی سمت بڑھنے لگی۔

''لندن سے لوٹنے کے بعد خضر تم میں کافی چینج آگیا ہے۔'' زرناز کی کھنکتی ہوئی آواز لاؤنج سے آرہی تھی۔ وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ ''میرے کہنے کا مطلب ہے کافی میچورٹی آگئی ہے اور یہ میچورٹی تمہاری پرسنالٹی کو چار چاند لگا رہی ہے۔''

گھر کی تعمیر کچھ اس طرح سے تھی کہ نانی امی کی خواب گاہ اور لاؤنج کے درمیان سیڑھیاں حائل ہوجاتی تھیں۔ سو یہ ابھی تک ان دونوں کی نظروں سے اوجھل تھی جبکہ ماہین سیڑھیوں کے اوٹ سے انہیں دیکھ چکی تھی۔ زرناز سامنے ہی صوفے پر بیٹھی تھی جبکہ خضر کارنر میں سنگل صوفے پر بیٹھا تھا۔ ٹیبل پر موجود چائے کے خالی کپ اس بات کی طرف اشارہ کررہے تھے کہ موصوف کی آمد کو تقریباً پندرہ بیس منٹ تو گزر ہی چکے تھے۔

''ہاں بہن، تمہارے لیے ہی اس نے خود کو تبدیل کیا ہوگا جی بھر کے خوش ہولو۔'' وہ بڑبڑائی اور کچن کی سمت ہولی۔ کچن کا راستہ لاؤنج سے ہوکر نہیں گزرتا تھا مگر کچن کی سمت جاتے ہوئے اس کا نظروں میں نہ آنا ممکن نہیں تھا۔ سو دونوں کی ہی نگاہ اس پر پڑی تھی مگر وہ نظرانداز کرکے کچن میں آگئی۔

خواہ مخواہ ہی غصہ چڑھ رہا تھا جو کیتلی، پتی اور چینی کے جار پر اتر رہا تھا۔ چائے تیار کرکے اس نے وہیں کچن میں بیٹھ کر پی اور باہر آگئی۔ وہ ابھی تک وہیں جما بیٹھا تھا اور زرناز دھیمی آواز میں اللہ جانے اس سے کیا کہہ رہی تھی وہ چاہ کر بھی نہ سن پائی۔ اچانک ہی اس نے نانی امی کے کمرے میں جانے کا ارادہ ترک کیا اور ان دونوں کے سامنے ٹیبل پر پڑے خالی کپ اٹھانے کے بہانے قریب آگئی۔ زرناز نے فوراً خاموش ہوکر رخِ روشن اس کی جانب موڑا۔

''تم فضول ہی زحمت کررہی ہو ماہین! رہنے دو

ناں عبدل سمیت لے گا سب۔'' لہجے میں طنز کی آمیزش بڑی واضح تھی۔

''شوق کے تحت تو میں بھی نہیں کر رہی۔ نانی امی کا حکم تھا، سوٹالا تو نہیں گیا۔'' اس نے مسکرا کر اسے بتانا چاہا اور شاید وہ اپنے ارادے میں کامیاب بھی ہو جاتی اگر جو اسی وقت نانی امی لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل نہ ہوتیں وہ تینوں ہی متوجہ ہوئے تھے۔

''اے یار...... ایہ بے عزتی بھی ناں...... ہر جگہ ہی ہو جاتی ہے۔ ذرا لحاظ نہیں کرتی۔'' اس نے قسمت پر بھروسا کر کے رسک لیا تھا اور پھر خوب پچھتائی۔

''دادو لان میں اور تم کچن میں...... یقیناً یہ حکم تمہیں کال کے ذریعے ملا ہوگا یا میسج کے ذریعے۔'' وہ طنزیہ مسکراہٹ لبوں پر سجائے صاف اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔

''اوّل درجے کی کمینی ہے۔ لحاظ، مروت تو چھو کے نہیں گزرا۔'' اس سے قبل کہ وہ زرناز کو کچھ الٹا سیدھا بول دیتی، خضر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''ماہین! میں نانی امی سے چند ایک ضروری بات کر لوں پھر گھر چلتے ہیں۔'' وہ اسے حکم دے کر نانی امی کے پیچھے ان کے کمرے میں جانے لگا تھا کہ ماہین نے روک لیا۔

''سنیں......!'' خضر پلٹا تو ماہین نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر دبے دبے غصے کے تاثرات تھے۔

''شاید کوئی بات مزاج پر گراں گزری ہے۔ مگر کس کی؟ میری یا پھر زرناز کی؟'' وہ اندازہ نہ لگا پائی۔

''میرا تو آج گھر جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ آج تو میں نے اور داؤد بھائی نے آئس کریم پارلر جانے کا پروگرام بنایا ہے۔'' اس نے سیڑھیوں سے اترتے ہوئے داؤد کو دیکھ کر ایک بار پھر قسمت کو آزمالیا۔

''میرے مولا! میرے پاس کچھ نہیں۔ سوائے عزت کے سو اسے بچالینا۔'' وہ من ہی من میں اللہ کے حضور گڑگڑا رہی تھیں۔

''زہے نصیب! ہمیں عزت بخشنے کا خیال کیسے آگیا؟'' داؤد بھائی کی باچھیں کھل گئیں۔ اور وہ عزت محفوظ رہنے پر خدا کی مشکور......

''یہ احمق بھی ناں......'' وہ اچھی خاصی بدمزہ ہوئی، جب کہہ دیا کہ ہم دونوں کا پروگرام ہے تو پھر نہ جانے الٹا سیدھا ہانکنے کی ضرورت کیا تھی۔ اب اس بقراط کو تو پتا چلا گیا ناں کہ یہ پروگرام ابھی کے ابھی بنا ہے۔

''تو پھر چلیں داؤد بھائی؟'' اس نے بھی اس موقع پر باچھیں چیرنے کی ضرورت محسوس کی۔

''ضرور......!'' داؤد بھائی نے قدم بڑھائے اور اس نے ان کے قدم سے قدم ملائے۔

''آپ کو پتا ہے ناں کہ بلوچ کی کرنچ میری فیورٹ ہے۔'' اس نے داؤد بھائی سے بے تکلفی برتتے ہوئے دانستہ خضر کی جانب ایک نگاہ کی اور کسی قدر مایوسی ہوئی۔ دل خضر کے چہرے پر جیلسی کے تاثرات دیکھنے کا آرزومند تھا مگر تمام آرزوئیں پوری کب ہوتی ہیں۔ خضر کے لبوں کے گوشوں میں دبی مسکراہٹ ہونٹوں پر مچلنے کو بے تاب تھی۔ آرزو کے برعکس نگاہوں نے کچھ اور دیکھا تو... مایوسی کچھ اور بڑھی۔

''یہ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو؟ ہیرو کہیں کا۔'' مایوسی حد سے بڑھ کر غصے میں بدل گئی۔

''اتنا غرور خدا جانے کس بات کا ہے۔'' گاڑی کا دروازہ زور سے بند کرنا، غصہ کم کرنے کی ایک کوشش تھی۔

داؤد نے گھڑی کی سیکنڈ سوئی کے ساتھ بدلتے مزاج پر کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔ ''پہلے پزا ہٹ چلیں ماہین؟'' وہ پھیلنے لگا۔

''نہیں داؤد بھائی! اب تو آئس کریم کا بھی موڈ نہیں...... ایک لمبا چکر لے کر گاڑی کو دوبارہ گھر کی طرف موڑ لیں۔'' بے نیازی سے حکم صادر کر کے وہ میسجنگ میں مشغول ہو گئی۔ سکھیوں کو ہر پل باخبر رکھنا بھی تو ضروری تھا ورنہ چین کیسے پڑتا۔ داؤد نے

قدرے غصے سے اسٹیرنگ پر ہاتھ مارا۔
''موبائل میں مشغول ہو جانے کے بعد وہ کہیں اور توجہ دے پاتی یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ سو داؤد نے باقی کا تمام سفر لب سیے اور ڈرائیونگ کے فرائض انجام دیتے ہوئے ہی بتایا۔
''سکھیو! محبت کے مرض میں اگر معشوق بلاوجہ ہی کسی سے فری ہونے لگے تو عاشق کو جیلسی فیل ہوگی یا لبوں پر مسکراہٹ کے پھول کھل اٹھیں گے؟''
''پتا نہیں...... میں نے محبت میں پی ایچ ڈی نہیں کی۔'' آج پھر جواب خلافِ اصول زنیرا کے بجائے سحاب کے نیو نمبر سے آیا تھا۔
''محبت میں نہیں کی مگر کمینگی میں یقیناً کی ہوگی۔ کسی بات کا ڈھنگ کا جواب نہ دے سکو تو کم از کم بھونکنے سے گریز ہی کیا کرو۔'' وہ بھڑک اٹھی۔
''کیا افتاد آن پڑی جو محبت پر ریسرچ کرنے چلی ہو؟'' زنیرا نے انٹری دی۔
''ایسے ہی معلومات کے لیے پوچھ رہی ہوں، کبھی یہ مرض لاحق ہو بھی ہو سکتا ہے، سو علامات کا علم ہونا چاہیے۔'' ماہین کا میسجنگ کا سلسلہ گھر واپسی تک جاری رہا تھا اور داؤد کا جھنجلاہٹ کا۔

☆☆☆

''ماہین!'' وہ عادتاً عصر کی نماز کے بعد لان میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ جب اس نے اپنے پیچھے داؤد کو پکارتے سنا۔
''اے یار!'' اس کا موڈ آف ہوا۔ ''بڑا، باہمت شخص ہے۔ میرا بیزار رویہ بھی اسے بدمزہ نہیں کرتا۔''
''جی داؤد بھائی!'' اس نے مڑتے ہوئے کسی قدر سنجیدگی سے کہا۔
''کچھ نہیں یار! میں نے پہلی بار تمہیں اپنے فیورٹ کلر میں ملبوس دیکھا تو دل چاہا کہ قریب سے صورت بھی دیکھوں......'' وہ پُرشوق نگاہیں اس پر جمائے کہے گیا۔ ماہین کو اس کے الفاظ اور لہجہ دونوں برا لگا۔
''پلیز داؤد بھائی! مجھے اس قسم کی گفتگو پسند نہیں۔ آپ خیال رکھا کریں۔'' داؤد نے اس کے چہرے پر پھیلتے ناگواری کے تاثرات کو بھی دلچسپی سے دیکھا اور ہنس دیا۔
''اوکے پریٹی ڈول! ناراض کیوں ہوتی ہو؟ آئندہ خیال رکھوں گا کہ کوئی بات تمہیں ناگوار نہ گزرے۔'' اس نے اتنی سعادت مندی سے تو کبھی اپنی ماں کو بھی جواب نہیں دیا ہوگا۔
''میں اپنے دوست کی طرف سے پی سی میں انوائٹڈ ہوں۔ بہت بڑا فنکشن ہے وہاں...... نامور سنگرز آئیں گے، چلوگی؟'' پچھلے دنوں وہ اس کے سنگ ایک بورترین سفر گزار چکا تھا اور اب پھر ایک بورترین سفر اس کے ہمراہ بتانے کے لیے تیار تھا۔ ماہین نے اس کی ہمت کو دل ہی دل میں ایک بار پھر سراہا۔
''نہیں، میرا موڈ نہیں۔'' ماہین کی بات آدھی ادا ہو چکنے کے بعد آدھی ابھی لبوں میں ہی تھی کہ جب اس نے خضر کی مرسڈیز کو زن سے اندر داخل ہوتے اور پھر پورچ میں رکتے دیکھا مگر گاڑی کے پورچ میں رکنے سے بھی کچھ پہلے زرناز کو اس نے اندر سے برآمد ہوتے دیکھا۔ جیسے وہ خضر کے انتظار میں ہی ہو۔
''یقیناً اپنی آمد کے متعلق بتایا ہوگا تبھی تو محترمہ دیدہ و دل فرشِ راہ کیے کھڑی ہیں۔'' اس نے جل کر سوچا۔
خضر برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر اب زرناز کے ساتھ کھڑا کچھ کہہ رہا تھا جبکہ اس کی نگاہیں ماہین اور داؤد کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔
''اوکے ٹھیک ہے، پھر میں چلوں۔'' داؤد کے لہجے میں کسی قدر مایوسی تھی۔ ''اگر چلتیں تو مجھے خوشی ہوتی۔'' وہ پلٹا تھا۔ اسی پل خضر کے لبوں پر زرناز سے گفتگو کرتے ہوئے مسکان سجی اور اس سے اگلے پل ہی ماہین نے اپنا ارادہ بدلا۔
''سنیں داؤد بھائی۔'' وہ دوبارہ پلٹ کر

متوجہ ہوا۔ ''میں نانی امی سے اجازت لے آؤں پھر چلتے ہیں۔''

''ہاں ضرور لے آؤ مگر تم جانتی تو ہو کہ دادو عصر سے مغرب تک کا وقت ذکر اللہ میں گزارتی ہیں، سو انہیں تنگ کرنا مناسب نہیں...... ویسے مجھے نہیں لگتا کہ وہ اجازت لینے پر تمہیں انکار کریں گی۔ سو بہتر یہی ہے کہ تم میسج کر کے انہیں بتا دینا۔ وہ جب بھی فارغ ہوئیں پڑھ لیں گی۔'' اس وقت تو حواسوں پر خضر کا زرناز سے مسکرا، مسکرا کر باتیں کرنا سوار تھا سو ذہن بھی داؤد کے دیے گئے مشورے پر زیادہ غور وفکر کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔

''چلیں ٹھیک ہے۔'' اس نے مسکرا کر ہامی بھری۔

''آج ایک احسان مجھ پر تم ضرور کرنا ماہین۔'' داؤد نے گاڑی کی جانب بڑھتے ہوئے اس سے گویا التجا کی۔

''کیسا احسان؟'' وہ کسی قدر حیران ہوئی۔

''اپنے موبائل فون کو اس وقت تک آرام دے لینا جب تک میرے ساتھ رہو۔ پلیز!'' اس نے درخواست پیش کی۔

''اوکے۔'' ماہین نے اس کے ملتجی لہجے پہ ہنس کر بطورِ خاص خضر کی سمت دیکھا۔ وہ یہیں متوجہ تھا مگر اس بقراط کی صورت دیکھ کر اس کے احساسات کا اندازہ لگانا ذرا دشوار تھا سو وہ ناکام ہی رہی۔ البتہ نگاہوں سے یہ بات مخفی نہ رہ سکی کہ وہ اس وقت تک خضر کی نگاہوں کے حصار میں رہی تھی جب تک گاڑی گیٹ سے نکل کر اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔

گاڑی کے گیٹ سے نکلتے ہی اس نے نانی کو بذریعہ میسج داؤد کے ساتھ جانے کا بتا دیا۔ غالب امکان یہی تھا کہ وہ تمام وظائف، تسبیحات اور مغرب کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد ہی میسج پڑھیں گی۔

''تمہارے بال بہت حسین ہیں، تم انہیں کھلا کیوں نہیں رکھتیں؟''

''بس شروع کر دی پھر وہی بکواس۔'' وہ پانچ منٹ میں ہی حد درجہ بور ہوئی۔ اس کی داؤد میں دلچسپی محض خضر کو دکھانے کی حد تک تھی۔

''تمہارے چہرے پر جب ناگواری کے تاثرات ابھرتے ہیں تو وہ تمہارے حسن کو مزید دلکش بنا دیتے ہیں۔'' داؤد سے اس کے چہرے پر ابھرتے ناگواری کے تاثرات پوشیدہ نہ رہ سکے تھے۔

''اس شخص کا سُدھرنا اتنا ہی دشوار ہے، جتنا مسئلہ کشمیر کا حل ہونا۔'' اس نے ٹھنڈی آہ بھر کے سوچا۔

''ہائے، ایسے نہ آہیں بھرا کیجیے۔'' چھچھورپن سے گنگناتے ہوئے اس نے آنکھ ماری۔ وہ بے طرح سلگ اٹھی۔

''میں کیوں آ گئی اس جوکر کے ساتھ۔'' وہ اپنی نادانی پہ حد درجہ پچھتائی۔

میسج ٹون بجی تھی، وہ فوراً متوجہ ہوئی، سحاب کا نیو نمبر اسکرین پر جگمگا رہا تھا۔

''کہاں ہو؟''

''ماہین! تم نے میری کمپنی میں موبائل یُوز نہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔'' اسے موبائل میں مصروف ہوتا دیکھ کر داؤد نے فوراً یاد دہانی کرائی۔

''نانی امی کا میسج ہے، جواب دینا بے حد ضروری ہے۔'' اس نے داؤد کو جھوٹ بول کر ٹالا اور جواب ٹائپ کرنے لگی۔

''اس وقت داؤد بھائی کے ساتھ ان کی پراڈو میں ہوں۔''

''کہاں لے جا رہے ہیں وہ تمہیں؟'' اگلا میسج بھی سحاب کے اسی نمبر سے آیا تھا۔

''پی سی میں ان کے کسی دوست نے فنکشن ارینج کیا ہے، وہیں جا رہے ہیں۔ خیریت؟'' میسج سینڈ کر کے وہ جواب کا انتظار کرنے لگی۔

''ماہین! تم اپنے وعدے سے مکر رہی ہو، مسلسل میسجز کر کے۔'' وہ بے حد جھنجلایا ہوا تھا۔

''داؤد بھائی! زندگی میں پہلی بار نانی امی سے اجازت لیے بنا گھر سے نکلی ہوں، اب وہ فکر مند ہیں تو

انہیں مطمئن کرنا میرا فرض بنتا ہے۔'' اس نے ناگواری سے کہا۔
''تو فون کر کے ان کی تسلی کرادو کہ تم اپنی مرضی سے آئی ہو، میں تمہیں اغوا کر کے نہیں لے جارہا۔'' بالآخر داؤد بھی صبر کھو بیٹھا۔
''مجھ سے نہیں ہوتی فون پر بات۔ میں میسج کے ذریعے ہی کروں گی۔'' ہٹ دھرمی سے کہہ کر وہ دوبارہ موبائل کی جانب متوجہ ہوئی۔ ریپلائی کسی بھی نمبر سے نہیں آیا تھا۔
''بتایا نہیں تم نے کہ مجھ سے یہ تفتیش کیوں کی جارہی تھی؟''
گاڑی کی اسپیڈ بڑھی تھی، اس نے موبائل سے نگاہ ہٹا کر داؤد کی سمت دیکھا۔ وہ لب بھینچے غصہ ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پہلی بار اس کا دل خوفزدہ ہوا، کسی خدشے کے تحت اس نے محتاط نگاہوں سے سڑکوں کا جائزہ لیا۔
''یہ واقعی مجھے اغوا کر کے کہیں اور نہ لے جائے۔'' جائزہ دو منٹ میں ہی تمام ہوا، گاڑی پی سی کی جانب ہی گامزن تھی۔ دل کو ڈھارس بندھی تو وہ دوبارہ موبائل کی سمت متوجہ ہوئی۔
''یار! آخر خاموش کیوں ہو تم سب کی سب؟ جواب کیوں نہیں دے رہیں؟'' جواب اب بھی کافی دیر انتظار کے باوجود نہیں آیا تھا۔ وہ حیران ہوئی۔ ایسا چار برسوں میں پہلی بار ہوا۔ اس نے ایک بار پھر موبائل کو دیکھا۔
گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تھی۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ منزل تک پہنچ گئے تھے۔ وہ دروازہ کھولے باہر آئے، عین اسی لمحے خضر کی گاڑی اس کے قریب ہی رکی اور وہ طیش کے عالم میں باہر آیا۔
''گھر چلو ماہین!'' سلگتے ہوئے لہجے میں اس نے حکم صادر کیا۔
''کیوں......؟''
''بس میں جو کہہ رہا ہوں۔'' اس کا غصہ مزید بڑھا۔
''میں کہیں نہیں جارہی، میں یہاں......'' ابھی جملہ لبوں میں ہی تھا کہ وہ اسے کلائی سے پکڑ کر گاڑی تک لے آیا اور اندر دھکیل دیا۔ اس کا دھان پان سا وجود ابھی پوری طرح سنبھلا بھی نہیں تھا... مگر وہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔
''آخر اس بدمعاشی کا مقصد کیا ہے؟''
''یہ میں تمہیں گھر چل کر اچھی طرح سمجھا دوں گا۔'' اس نے خونخوار نگاہوں سے گھورتے ہوئے اتنے غصے سے کہا کہ اس کا ننھا سا دل فوراً سہم گیا۔ آج سے قبل اس نے خضر کو اتنا مشتعل دیکھا بھی تو نہیں تھا۔
''شاید داؤد بھائی سے بے تکلفی کھلی ہے موصوف کو۔'' گاڑی خطرناک رفتار سے گھر کی سمت بڑھ رہی تھی۔
''خدا جانے یہ گھر پہنچ کر کیا کرے...... اگر ممی کو اپنے جھوٹے سچے قصے سنا کر مشتعل کر دیا تو وہ تو صفائی کا موقع دیے بنا سزا سنا دیں گی۔'' اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔
''اور یہ تو بچپن سے ہی میرا پکا دشمن بنا ہوا ہے، اس سے کسی اچھے کی امید رکھنا نادانی ہی ہے۔'' جس تیزی سے فاصلہ کم ہو رہا تھا اسی تیزی سے اس کے خوف میں اضافہ ہو رہا تھا۔
''یا اللہ! رحم ڈال دے، اس ظالم کے دل میں میرے لیے۔'' آخری سہارا دعا ہی کا تھا، سو وہ گھر پہنچنے تک دعا گو ہی رہی۔
خضر کے تیور خاصے خطرناک تھے سو گاڑی کے پورچ میں رکتے ہی وہ پھرتی سے خضر سے بھی پہلے گاڑی سے اتر کر اپنے کمرے میں آگئی۔ ورنہ خضر سے کچھ بعید نہیں تھی کہ وہ اسے اسی وقت ممی کے سامنے پیش کر دے۔ وہ اس سے اتنی ہی بدگمان تھی، اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ سکھ کا سانس بھی نہیں لے پائی تھی کہ وہ اس کے پیچھے آدھمکا۔
''تم سمجھتی کیا ہو اپنے آپ کو؟'' وہ اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے اس کے اوپر چڑھ دوڑا۔
''میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی، جس سے کوئی معترض ہو۔'' خضر کے لہجے کی سختی نے اسے بھی

برہم کر دیا۔

''بنا اجازت ایک ایسے شخص کے ساتھ گاڑی میں گھومنا، جس کے کردار کی تمام خرابیوں سے سب آگاہ بھی ہوں، تمہارے خیال میں اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات ہے ہی نہیں؟'' اس کی بے وقوفی پر وہ تلملایا۔

وہ خاموش رہی اور بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔

''جس قماش کا وہ شخص ہے۔ اس کے دوست بھی سارے اسی کے جیسے ہوں گے۔ اور جس قسم کے فنکشن اٹینڈ کرتے میں اسے دیکھ چکا ہوں، وہاں کا ماحول کسی بھی شریف بندے کے لیے موزوں نہیں۔'' اس کے لہجے میں اب بھی کچھ تیزی باقی تھی۔

''لو جی زرناز صاحبہ نے یہ بھی بتا دیا کہ میں اس کے بھائی کے ساتھ کہاں جا رہی ہوں۔'' اس سوچ نے موڈ مزید خراب کیا۔

''ہر طرح کا ماحول، ہر بندے کے لیے موزوں ہوتا ہے، بات صرف سمجھداری اور مضبوطی کی ہوتی ہے، جس کے سبب بندہ خراب ماحول میں بھی محفوظ رہ سکتا ہے۔'' بات اتنی بھی سمجھداری کی نہیں تھی مگر جتنی تھی اتنی کی بھی ماہین کے لبوں سے ادائیگی کی امید نہیں تھی سو وہ خوشگوار حیرت میں گھر گیا لیکن یہ وقت اس کو سراہنے کے لیے بالکل مناسب نہیں تھا۔

''ہاں بھئی! واقعی تم تو اتنی سمجھدار ہو کہ ہر طرح کے حالات سے بخوبی نمٹ سکو، بغیر اجازت ہر کسی کے پیچھے چل پڑنا بھی تو سمجھداری کی ایک واضح دلیل ہے۔'' اس سارے قصے میں ایک یہی غلطی تھی جس کے سرزد ہونے پر وہ اچھا خاصا پچھتا چکی تھی۔ مگر اس وقت خضر کی طنزیہ گفتگو نے اسے مشتعل کر دیا۔

''تم آخر ہوتے کون ہو مجھ پر اتنا رعب جمانے والے اور جرح کرنے والے؟''

''میں نہ صرف تمہارا کزن اور منگیتر ہوں بلکہ

ہونے والا شوہر بھی ہوں، اس لحاظ سے میں پورا، پورا حق رکھتا ہوں کہ اپنی ہونے والی بیوی کے ہر فعل سے آگاہ رہوں، اس کو کسی سے کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اسے بچانے کی کوشش کروں۔'' ماہین کے استفسار پر خضر کا لہجہ ایک دم ہی بدلا اور وہ مسکرا کر بولا تھا۔

''اس سوچ میں مت رہنا کہ میں تم سے شادی کروں گی نہ ہی اس رشتے کے حوالے سے آئندہ کبھی مجھ پر رعب جمانے کی کوشش کرنا۔'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔

''یار......! میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے خفا ہو مگر اتنا بڑا فیصلہ یوں لمحوں میں تو نہ کرو ناں۔'' وہ اس کے مقابل ہی بیڈ پر بیٹھ گیا۔ لہجے کو حتی المقدور اس نے سنجیدہ ہی رکھا۔

''تم سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ میں نے منگنی والے روز ہی کر لیا تھا۔ سو اسے لمحوں میں کیا جانے والا فیصلہ نہیں کہیں گے۔''

''بالکل درست...... میں اس بات سے بھی باخبر ہوں کہ تمہاری ناراضی کا سلسلہ کافی پرانا ہے مگر میں تمہارے وہ تمام گلے شکوے دور کرنے کو تیار ہوں، جس کے سبب تم یہ رشتہ ختم کرنے پر بضد ہو۔''

''مجھے تم سے کوئی گلے، شکوے نہیں۔'' اس نے روٹھے لہجے میں کہا۔

''اب تم چاہے مکر و اس بات سے مگر میں جانتا ہوں کہ تمہاری اس طویل ناراضی کی بنیاد اس گلے پر ہے کہ میں تم سے منگنی کی خبر سنتے ہی خوش کیوں نہیں ہوا تھا۔ ایسی حسین صورت بیٹھے بٹھائے بغیر کسی محنت کے مجھے مل رہی تھی وگرنہ ایسا گوہرِ نایاب تو میری ماں جوتیاں گھسا لیتی تب بھی نہ ملتا۔ سو کم از کم خوشی سے بھنگڑا تو ڈالنا چاہیے تھا مجھے اپنی منگنی پر...... کچھ ایسی ہی آرزوئیں محترمہ کے چہرے پر ڈیرا جمائے ہوئے تھیں اُن دنوں اور کچھ اس شان سے جمائے ہوئے تھیں کہ کسی کے لیے بھی پڑھنا دشوار نہیں تھا۔ اور میرا تو ان دنوں کام ہی اپنی منگیتر کا چہرہ پڑھنا تھا سو کیسے نہ بھانپتا۔'' وہ شرارتی مسکان لبوں پر سجائے کہتا چلا گیا۔

''ایسا تو کچھ بھی نہیں تھا۔ خود سے ہی نہ جانے کیا، کیا سوچ لیا۔'' اس نے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔

''سو فیصد ایسا ہی تھا اور تو اور محترمہ اظہار بھی چاہتی تھیں۔'' اس نے نچلا لب دانتوں تلے دبا کر شرارت سے اس کی صورت تکی۔

''مجھے تو ایسا کچھ یاد نہیں...... یقیناً کوئی خواب ہی دیکھا ہوگا۔'' وہ صاف مکر گئی۔ دل نے الگ دھڑک، دھڑک کر دماغ خراب کیا ہوا تھا۔ یوں دھڑک رہا تھا جیسے کوئی ڈھول، ڈھم ڈھما ڈھم۔

''چلو تمہیں یاد نہیں لیکن مجھے تو یاد ہے ناں۔ سو میں تمہاری خواہش ابھی پوری کر دیتا ہوں کہ تم پہ......''

''مجھے کوئی شوق نہیں بے ہودہ کوئی سننے کا...... تم پلیز خاموش رہو۔'' اس نے بوکھلا کر اس کی بات قطع کی۔ اس کے بوکھلانے پر وہ جی بھر کر محظوظ ہوا۔

''خاموش کیسے رہوں یار......! جبکہ مجھے تو ابھی تم سے اس بات پر بھی ایکسکیوز کرنا ہے کہ جس کی وجہ سے آنی نے تم پر ہاتھ اٹھایا تھا۔'' وہ اپنے اس فعل پر واقعی شرمندہ تھا۔ ''یار......! مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اتنی سی بات پر آنی اس قدر مشتعل ہو جائیں گی، ورنہ ازراہِ شرارت ہی سہی میں ایسی حرکت کبھی نہیں کرتا۔''

''بڑی جلدی احساس ہو گیا اپنی اس غلط حرکت کا۔'' اس نے ناراض نگاہوں سے خضر کی سمت دیکھا۔

''اب یہ مجھ پر الزام ہے۔ اس ایک بات کے لیے میں تم سے کئی بار معذرت کر چکا ہوں۔ متعدد بار لندن سے کال بھی اسی مقصد کے لیے کرتا رہا۔ مگر تمہیں تو مجھ سے بات کرنا بھی گوارا نہیں تھا۔ کبھی تم نے میری کال ہی ریسیو نہ کی۔ تب میں نے بھی سوچا کہ جا کر ہی مناؤں گا۔ پلیز یار! اب بھول بھی جاؤ اس بات کو چلو آؤ پھر سے دوستی کر لیں۔'' وہ دوستانہ مسکراہٹ لبوں پر سجائے بولا۔

''میں یہ سب بھول بھی جاؤں تو نیا رشتہ تو میں تم سے پھر بھی نہیں جوڑوں گی۔'' خضر کے پیچھے اتنا جو اُس

نے اپنا خون جلایا تھا اس کے بعد اتنا حق تو اس کا بنتا تھا کہ وہ بھی اسے تھوڑا ستائے۔

''میرے خدا......!'' اس نے بے بسی اور مدد طلب نگاہوں سے اوپر دیکھا۔''اب انکار کی وجہ یقیناً زرناز کی مجھ سے بے تکلفی ہی ہے، دیکھو مکرنا نہیں، نانی امی مجھے تمہاری ہر بات سے آگاہ کرتی رہی ہیں۔''

''اوہ گاڈ......!'' اس انکشاف پر وہ حیرت سے گنگ ہوئی۔''یعنی کہ نانی امی بھی......'' صدمے سے بے حال ہوتے ہوئے وہ ایک جھٹکے سے اٹھی۔''میں ابھی نانی......'' وہ جس تیزی سے اٹھی تھی پھر اسی تیزی سے بیٹھ بھی گئی۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ اس وقت نانی امی کے گھر نہیں بلکہ اپنے گھر میں ہے سو فوری''باز پرس'' کی خواہش فی الحال ممکن نہیں۔

اس کے کومِک ایکشن پہ خضر ایک دم قہقہہ لگا کر ہنس دیا اور وہ اپنی شرمندگی اور جھینپ مٹانے کے لیے ایک دم بول اٹھی۔

''ہاں ثابت تو تم بھی اپنی حرکتوں سے یہی کرنا چاہ رہے تھے کہ زرناز تمہارے نزدیک کوئی خاص ہی اہمیت رکھتی ہے۔'' جلتے دل کی تپش لفظوں میں بھی آ گئی۔ خضر مسکرایا۔

''میرے نزدیک، وہ خاص کیا، وہ عام حیثیت بھی نہیں رکھتی۔ البتہ وہ ضرور مجھ پر اپنا دل ہار بیٹھی ہے۔ اسی سلسلے میں مجھے اپنا گرویدہ بنانے کے لیے وہ بیچاری کافی کوشش بھی کیا کرتی ہے جو تمہارے ساتھ مجھے بھی بری لگتی ہیں مگر اب ہمارا بچپن تو رہا نہیں جو ہم پہلے کی طرح لگی لپٹی رکھے بِنا کھری، کھری سنا دیں۔ اب جبکہ ہم بڑے ہو گئے ہیں تو کچھ لحاظ، مروت کو بھی لفٹ کروانی پڑتی ہے، کچھ غصے کو بھی آنکھیں دکھانی پڑتی ہیں۔ کچھ ناگواری سے بھی منہ موڑنا پڑتا ہے......

اور یہ جو داؤد صاحب ہیں ناں......'' رسان سے اس کی بدگمانیاں دور کرتے ہوئے اچانک داؤد کے متعلق کچھ یاد آنے پر اس کا لہجہ تلخ ہوا۔

''اس جیسے خطرناک بندے سے تو تم جیسی سمجھدار لڑکیوں کو تو دور ہی رہنا چاہیے۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں سمجھدار پر زور دیتے ہوئے کہا تو اس نے کسی قدر ناراضی سے خضر کی سمت دیکھا۔

''یہ آج کل تم سے بہت زیادہ کلوز ہونے کی کوشش میں ہے تو یہ کیوں بھلا......؟'' اس نے استفہامیہ نگاہوں سے ماہین کی سمت دیکھا۔

''مجھے کیا معلوم......ایسی تفتیشی سرگرمیاں بھی خدا تم ہی کو مبارک کرے۔'' وہ ہنوز خفا تھی۔ خضر نے گہری سانس لی۔

''خدا خیر کرے......مجھے لگ رہا ہے مستقبل میں بھی مجھے میرا رب اسی کام میں مشغول رکھے گا کہ میں ہمہ وقت یہ دھیان رکھوں کہ میری نصفِ بہتر اپنی سمجھداری سے کوئی ایسا شاندار کارنامہ نہ انجام دے لے جو تاریخ میں سنہری حرفوں میں لکھنے کے لائق ہو۔'' اس نے مسکرا کر شرارت سے کہا۔

''بے فکر رہو، ایسا ظلم تمہارے ساتھ تب ہی ہوگا جب میں تم سے شادی پر رضامند ہو جاؤں گی اور مجھے اپنے آپ سے بھی دشمنی کا کوئی شوق ہے نہ ارادہ۔''

''پھر وہی بات......'' وہ زچ ہوا۔''اس طرح تو تم زرناز کی راہ ہموار کر رہی ہو......تمہیں علم نہیں ہوگا مگر میں سب خبر رکھتا ہوں۔ اپنے بھائی صاحب کو بھی اس نے اپنی راہ کا کانٹا ہٹانے کے لیے تمہارے پیچھے لگایا ہے۔''

''مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ میرا کون سا عمل زرناز کی راہ ہموار کر رہا ہے اور کون سا اس کے لیے دشواریاں پیدا کر رہا ہے۔ میں صرف اپنی بات کروں گی۔ مجھے تم سے شادی نہیں کرنی۔''

''اتنے برس تک میرا دل جلاتا رہا ہے، اب میں کم از کم تین، چار روز تو ضرور اس سے منتیں کرواؤں گی۔'' دل ہی دل میں عزم کرتی ہوئی وہ بڑی شاد اور مطمئن تھی۔

اس کی صورت کو بڑے دھیان سے دیکھتے خضر نے گہری سانس بھری اور گویا ہوا۔

''ٹھیک ہے ماہین! تمہاری مرضی میرے نزدیک میری اپنی خواہش سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔'' لہجے میں حد درجہ مایوسی سموئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''اور تم کسی قسم کی کوئی بھی فکر اپنے ذہن پر سوار مت کرنا۔ شادی سے انکار بھی میری طرف سے ہی سامنے آئے گا۔ تم فکر مند قطعی نہ ہونا اور یوں بھی محبت تو محبوب کی خوشی کا نام ہے۔ سو میں یہ ثابت بھی کر دوں گا۔'' مایوسی سے کہہ کر وہ دروازے کی سمت بڑھ گیا۔

''میرے خدایا! یہ کیا ہو گیا۔'' وہ بوکھلا گئی۔ ''یہ تو بازی ہی پلٹ گئی۔ اب کیا کروں؟'' ذہن کی کارکردگی تو پہلے ہی بہت خراب تھی سو بوکھلاہٹ میں مزید ہوئی۔

''میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا۔'' وہ تیزی سے اٹھ کر اس کی راہ میں حائل ہوئی۔ خضر کے دروازے کی سمت اٹھتے قدم رک گئے۔

''کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔'' اس نے معصومیت کی حد کر دی۔

''اوہ میرے خدا! کتنا مشکل وقت آن پڑا ہے۔ اب کیسے معاملہ سلجھاؤں؟'' وہ نروس ہونے لگی۔

''میں کہہ رہی ہوں کہ'' لمحہ بھر کو رک کر اس نے تھوک نگلا...... ''میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا۔'' اس نے وہی بات دُہرا دی۔

''اب کیسے باز رکھوں اسے اپنے ارادے سے؟ اچھے خاصے معاملے کو خود ہی الجھا دیا ہے میں نے۔'' وہ جھنجلائی۔

''وہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ کیا نہیں کہا تم نے؟'' اس نے ایک بار پھر انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''ویسے تو ہر وقت بقراط کو مات دینے کے چکر میں ہوتے ہو۔ اب یہ اتنی عام سی بات تمہارے لیے فیثا غورث کا مسئلہ بنی ہوئی ہے۔'' اس کی ناسمجھی پہ ماہین کو غصہ آنے لگا۔

''یار! ناراض کیوں ہو رہی ہو؟ نہیں سمجھ سکا تبھی پوچھ رہا ہوں ناں؟''

''خدا جانے کیا مسئلہ ہے۔ ٹینشن میں تو دماغ صاحب بھی کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔'' کوئی مناسب بات ذہن میں نہ آنے پر اسے اپنے ذہن سے بھی شکایت ہونے لگی۔

''اب شاید اس افلاطون کو صاف لفظوں میں ہی کہنا پڑے گا، شاید تب ہی سمجھے۔ مگر کیسے کہوں......؟'' تذبذب میں گھری وہ اپنے ذہن میں الفاظ ترتیب دینے لگی۔

''کھل کر کہنے میں کوئی پریشانی ہے کیا؟ تمہیں جو کہنا ہے صاف لفظوں میں کہو ناں۔'' وہ اس کی ہمت بندھا رہا تھا۔

''خضر......!'' دروازہ کھول کر سارہ نے گردن اندر کی۔ ''اگر روٹھا یار منا لیا ہو تو چلو بھائی! مجھے دیر ہو رہی ہے۔ دو بار ہمارے سرتاج کال کر چکے ہیں۔'' ماہین نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور سامنے سے ہٹ کر صوفے پر جا بیٹھی۔

''اے یار سارہ......! بڑے ہی غلط وقت پر انٹری دی ہے تم نے...... بالکل کسی ولن کی طرح۔'' اس نے مایوسی سے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''کیوں......؟ ہیروئن صاحبہ کوئی رومینٹک سا گانا گا کر اظہارِ محبت کرنے والی تھیں۔'' ماہین نے گھور کر سارہ کو دیکھا۔

''گانا گا کر تو نہیں...... البتہ نثر میں اظہارِ محبت ضرور کرنے والی تھیں۔'' خضر نے شرارتی نگاہوں سے ماہین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرے خدا! یہ کس آسانی سے مجھے بے وقوف بنا لیتا ہے۔ ڈرامے باز...... سب سمجھ جانے کے بعد بھی انجان بننے کی اداکاری کس خوبی سے کر لی۔'' آج اس کی ڈرامے بازی کا راز کھلنے پر وہ مشتعل ہونے کے بجائے پُرسکون ہو گئی۔

''چلو شکر ہے بندہ سمجھدار ہے۔ اب مجھے اپنے منہ سے تو کچھ نہیں کہنا پڑے گا۔'' اس نے بڑے مطمئن انداز میں کشن گود میں رکھ کر صوفے کی پشت

سے ٹیک لگالی اور موبائل ہاتھ میں لے کر ان باکس چیک کرنے لگی۔

سارہ عجلت میں تھی سو ابھی تک سابقہ انداز میں کھڑی تھی۔ یعنی سر اندر اور دھڑ باہر......

''موسم اچھا ہے خضر......! کچھ خبر نہیں کہ اگلے چند لمحوں میں کس رخ کی ہوائیں چلنے لگیں، سو میرا خیال ہے کہ اگر موبائل والا راز بھی ابھی منکشف کر دو تو حالات ساز گار رہیں گے۔'' سارہ کی کوڈ ورڈز میں کی گئی بات پر اس نے کن انکھیوں سے دونوں بھائی، بہن کو دیکھا۔

''اور اگر موڈ خراب ہو گیا تو......؟'' کسی خدشے کے تحت خضر نے پوچھا۔

''تو اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لینا۔'' سارہ نے بے پروائی سے کہا۔ ''میں نیچے تمہارا ویٹ کر رہی ہوں، جلدی آؤ۔'' سارہ کے جانے کے بعد وہ مکمل اس کی جانب متوجہ ہوا۔

''وہ ماہین! ابھی جو موبائل والے راز کا سارہ ذکر کر گئی ہے ناں...'' کنفیوز سا وہ سر کھجانے لگا۔ ''وہ راز دراصل یہ ہے کہ تمہاری فرینڈ ہے ناں سحاب اس نے جو تمہیں اپنا نیو نمبر دیا ہے، وہ دراصل سحاب کا نہیں میرا نمبر ہے۔ نیو نمبر...... جو صرف تمہارے پاس اور تمہاری دوستوں کے پاس ہی ہے۔ اس نمبر سے تمہیں حاصل ہونے والے تمام میسجز میں ہی کرتا تھا۔'' انکشاف تھا یا کوئی بم پھٹا تھا۔ ماہین پر سکتہ طاری ہو گیا۔

نیچے سے خضر کے نام کی پکار پڑنے لگی تھی۔

''اب اس تازہ گستاخی پر بھی دل و جان سے معذرت یار...... حالانکہ اس میں میرا دوش ایک فیصد بھی نہیں تھا یہ سراسر سحاب کی شرارت ہے۔'' وہ عجلت میں تھا سو اس کی صدمے سے بے حال صورت دیکھتے ہوئے دروازے کی سمت بڑھ گیا۔

''یا اللہ! یہ سارے کے سارے غدار...... کیا میرے ہی نصیب میں ہیں۔ دوستیں میری ہیں اور وفاداریاں کسی اور سے۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''ایسی غداروں سے دوستی قائم رکھنا، اپنے آپ سے دشمنی کرنے کے مترادف ہے۔''

میسج ٹون بجی تھی۔ زنیرا نے سوری کا پکچر میسج سینڈ کیا تھا۔ اس نے ریپلائی نہیں کیا۔

چند لمحوں بعد سحاب اور دعا کی طرف سے بھی سوری کا میسج آ گیا۔ مگر وہ بھی اس کے ارادے میں دراڑ کا باعث نہ بن سکے۔ اگلا میسج خضر کے نمبر سے آیا تھا۔ جسے آج تک وہ سحاب کا نیا نمبر سمجھتی رہی تھی۔

''تمہاری دوستوں نے جو کچھ بھی کیا، وہ ہم دونوں کے درمیان پیدا ہو جانے والے فاصلے کو مٹانے کے لیے ان کی ایک چھوٹی سی شرارت تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح تمہارے خیالات سے آگاہ ہو کر، تمہاری بدگمانیاں دور کرنا زیادہ مشکل نہیں رہے گا سو اگر تم اپنے اور میرے مابین تعلقات کی بہتری پر خوش ہو تو پلیز اپنی دوستوں کا قصور معاف کر دینا اور دوسری بات یہ کہ میرا نمبر ڈسٹری بیوشن لسٹ سے ہٹا دو۔''

''ہاں! جس کی مرضی میں آئے، مجھے بے وقوف بنا دے اور میں بڑے آرام سے سب کے قصور معاف کرتی پھروں۔'' اس نے جل کر سوچا اور موبائل کو سائڈ میں پٹخنے سے پہلے خضر کے نمبر یعنی سحاب کے نیو نمبر کو ڈسٹری بیوشن لسٹ سے ہٹا دیا۔

اور پھر...... موبائل پٹخنے بہ مشکل پانچ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ سکھیوں سے رابطے کے لیے دل ہمکنے لگا۔

''کیا کروں، ان کم بختوں میں خدا جانے کیسا جادو ہے جو دل قطع تعلق پر آمادہ ہی نہیں۔'' بڑبڑا کر اس نے سیل فون اٹھایا اور ٹیکسٹ ٹائپ کرنے لگی۔

''غدارو...! بقراط سے میری دوستی ہو گئی ہے۔ اگرچہ اس کے ذریعے تم لوگوں کی غداری مجھ پر عیاں ہو بھی چکی ہے مگر پھر تم لوگوں سے قطع تعلق کا حوصلہ خود میں نہیں پاتی۔ کیونکہ تم لوگ میرا جگر ہو یارو۔''



ہم دبئی کے ہو گئے

عظمیٰ آفاق سعید

دبئی یہ نام ہے ایک ایسی آزاد ریاست کا جہاں آپ کو ہر قومیت، ہر رنگ و نسل اور ہر مزاج و انداز کے لوگ نظر آئیں گے۔ لفظ دبئی زبان و ذہن میں آتے ہی مجھے پرانے دور کے ڈراموں کا وہ اکڑا ہوا ماموں یا چاچا خیال میں آتا ہے جو لال کوٹ پہنے اور کالا چشمہ لگائے جس کا ٹیگ بھی چشمے کے سائڈ کی ڈنڈی میں جھول رہا ہوتا ہے...... اپنے رشتے دار کے گھر دبئی سے آتا ہے۔ میں اپنے بچپن میں جب دبئی سے آنے والوں کا

ایسا نقشہ ڈراموں میں دیکھتی تھی تو مجھے لفظ دبئی اپنے اندر کافی کشش لیے ہوئے لگتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاید یہ ایسی جگہ ہے جہاں آدمی اپنے آپ میں نہیں رہتا، بدل جاتا ہے، کپڑے بدل جاتے ہیں، چال بدل جاتی ہے وغیرہ، وغیرہ۔

شادی کے بعد ویسے تو بہت دفعہ دبئی جا چکی ہوں مگر گزشتہ سفر بہت ہی یادگار رہا۔ وجہ یہ تھی کہ اس دفعہ ہمارے ساتھ ہمارے اماں اور ابا بھی تھے۔ پروگرام کچھ یوں تھا کہ پہلے ہمیں تین دن کے لیے دبئی جانا تھا اور اس کے بعد عمرے کی ادائیگی کے لیے سعودی عرب روانہ ہونا تھا مگر جب دبئی میں رہائش پزیر میری نند امبر اور اس کے شوہر مسرت کو پتا چلا کہ ہم لوگ دبئی آرہے ہیں تو وہ بضد ہوگئی کہ ہم اپنے دبئی کے دورانیے کو بڑھا دیں۔

''امبر بہت مشکل ہو جائے گا، آگے عمرے پر بھی جانا ہے، تھکن نہ ہو جائے۔'' میں نے فون پر امبر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ (امی اور ابو سیدھا سعودی عرب جانے کے خواہش مند تھے اور دبئی بالکل نہیں جانا چاہ رہے تھے بقول ان کے کئی بار دبئی جا چکے ہیں...... اب بار، بار جا کر کیا کریں گے مگر ہوتا وہی ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے)۔

''ارے اتنے سے دنوں میں تو آپ بہت ساری چیزیں مس کر جائیں گی۔'' امبر بھی ہار ماننے والی نہیں تھی۔ آخر ہماری نند ہیں...... کیسے بھاوج کو جیتنے دیتیں۔

''مامی فراری ورلڈ تو دیکھنے کی چیز ہے، پچھلی دفعہ جب آپ لوگ آئے تھے تو یہ نہیں تھا۔ امبر کی بچیاں علیحدہ منانے میں لگی تھیں...... ''اب دبئی میں اتنی تبدیلیاں جلدی، جلدی ہو رہی ہیں، نئی، نئی چیزیں بن رہی ہیں...... وہ آپ کو دیکھنی تو ضرور پڑیں گی۔'' اِدھر ہمارے بچوں کی وہاں کی باتیں سن، سن کر رال ٹپک رہی تھی۔ ''ہاں امی ڈولی ٹھیک کہہ رہی ہے، ہاں ماما...... مریم نے بالکل صحیح کہا اور امبر پھپو تو غلط کہہ ہی نہیں سکتیں۔'' یہ اجیہ کی رائے تھی۔'' امی اور پاپا رک جاتے ہیں ناں چار دن اور......'' یہ ایمان صاحب تھے۔ (میرے سب بچوں کو ہمیشہ دبئی جانا اور اپنی امبر پھپو سے ملنا اچھا لگتا ہے کہ وہاں سے آنے کے بعد بھی...... وہ اپنے آپ کو وہیں محسوس کرتے ہیں) ایک دو دن تو تھکن میں ہی نکال دیں گے آپ لوگ۔ پھر کیا ایک دن گھومیں گے؟ اگر تین دن کے لیے گئے۔'' تو یہ علی صاحب دور کی کوڑی لائے تھے...... یہ بیٹا فلاسفر ہے، کم سخن ہے اور اپنی رائے سب سے آخر میں دیتا ہے...... مگر بات وہی ہوتی ہے جو پہلے بچے کی ہوتی ہے...... ادھر امبر، مسرت اور ان کی چاروں بچیاں کرن، ریحاب، مریم اور مسکان وغیرہ کے فون پر فون چلے آرہے تھے کہ ہر سال تھوڑی آپ لوگوں کا دبئی کا پروگرام بنتا ہے اسی لیے دبئی کا ٹرپ بڑا کریں...... اتنے کم دنوں میں ہمیں بالکل مزہ نہیں آئے گا...... اور ہمیں معلوم ہے آنٹی، انکل ہمارے ہاں کبھی بور نہیں ہوئے وغیرہ وغیرہ...... خیر جناب ہوتا وہی ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے۔ تین دن کا ٹرپ تقریباً ایک ہفتے کے ٹرپ میں بدل گیا۔ ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ دبئی میں امبر کی فیملی اور اِدھر ہم لوگ خوشی سے جھوم اٹھے کہ سیر و تفریح میں ہمیشہ زیادہ لوگوں میں لطف آیا کرتا ہے۔ پتا نہیں لوگ کیسے تنہا سیر کرتے ہیں، بالآخر ہم آٹھ لوگ جن میں، میں، میرے شوہر آفاق، بچے اجیہ، ایمان، علی اور کسوئی اور ساتھ میں امی، ابو شامل تھے۔ بذریعہ ایمریٹ ائر لائنز دبئی کے لیے روانہ ہوئے چونکہ اس کے بعد ہمیں عمرے کے لیے جانا تھا۔ اسی لیے آفاق کے ایک دوست کی فیملی الیاس بھائی بھی ہمارے ساتھ ہی محوِ سفر تھی۔ یہ لوگ پہلی دفعہ انٹرنیشنل ٹرپ پر جا رہے تھے، اسی لیے ہمارے بچے ان لوگوں کے آگے کافی قابل بن رہے تھے۔ جیسے پیدا ہی جہاز میں ہوئے ہوں۔ (ایسی، ایسی باتیں ہو رہی تھیں کہ آج بھی یاد کرتی ہوں تو ہنسی آتی ہے کہ خود کو قابل پوز کرنا شاید دنیا کا آسان ترین کام ہوتا ہے) ''یہاں بیٹھ کر انتظار کریں گے پھر جہاز میں بیٹھیں گے۔'' بڑا بیٹا ایمان ان کے

بیٹے سے مخاطب تھا۔ جب لاؤنج میں سارے مسافر بیٹھے تھے۔
''بڑا خراب لاؤنج ہے، مجھے تو بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا۔'' ان کا بیٹا بھی ہمارے بچوں کی شو بازی کی دھت تیرے کی کر رہا تھا۔ اور اس کی باتیں سن کر اجیہ کو غصہ اور مجھے ہنسی آ رہی تھی کہ سیر کو سوا سیر جو ملا تھا۔
''بڑی خراب سروس ہے ایمریٹس کی، ہم نے تو سنا تھا کہ سب سے اچھی ائر لائن ہے۔'' ان کی بیٹی اجیہ سے کہہ رہی تھی۔ جب کچھ ویزا پرنٹنگ میں پرابلم آیا۔
''بیٹا ہم جا بھی رہے ہیں دبئی یا نہیں..... گھر والوں کو تو اچھی طرح خدا حافظ کہہ کر آئے ہیں۔'' امی پریشان ہو رہی تھیں کیونکہ ویزے کی فوٹو کاپی کلیئر، صاف نہیں تھی۔ جس کی وجہ سے ایمریٹ کا عملہ ہمارے ایجنٹ کو فون کر رہا تھا۔ فلائٹ چونکہ صبح کی تھی تو ایجنٹ صاحب سو رہے تھے۔
خیر اللہ، اللہ کر کے ایجنٹ نے فون اٹھایا اور ارجنٹ ویزا کاپی کمپیوٹر کے ذریعے بھیجی..... تب کہیں جا کر آگے جانے کی اجازت ملی..... اور امی کے چہرے پر طمانیت آئی..... اور ایمان نے پھر اپنے دوست سے مذاق کرنا شروع کر دیا۔ تب میں نے امی سے ہنس کر کہا۔
''اب آپ گھر جا کر کیا کہتیں کہ چولہا شاید بند نہیں تھا کہ وہ دیکھنے آئی ہوں، اگر ہمارے ایجنٹ صاحب فون ریسیو نہ کرتے تو گھر تو واپس آنا پڑتا یا یہ کہہ دیتیں کہ باتھ روم کا شاید نل کھلا رہ گیا تھا اسے بند کرنے آئی ہوں۔'' جب جہاز میں، میں امی کے برابر بیٹھی تو انہیں چھیڑتے ہوئے بولی۔
''اللہ کا شکر ہے عظمیٰ..... ساتھ خیریت کے سب ہو گیا۔ ورنہ مجھے تو عجیب ہی لگ رہا تھا۔'' امی نے شکر کرتے ہوئے کہا..... ایسا معاملہ ہمارے ساتھ پہلی مرتبہ ہوا ہے جبکہ انٹرنیشنل ٹریولنگ بارہا کرتے ہیں۔'' کیا لگ رہا تھا آپ کو کہ آپ کے داماد چھوڑ کر چلے جائیں گے ہمیں۔'' اب ابو، امی سے مخاطب تھے۔ آفاق بھی ساتھ بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ بچے اپنی اپنی سیٹوں پر براجمان تھے، اجیہ صاحبہ اپنی اور کسوئی کی دھڑا دھڑ تصویریں لے رہی تھیں کہ بچوں کے ذہنوں میں یہ واضح فرق ہوتا ہے کہ وہ ہر پریشانی کو لائٹ لیتے ہیں اور جلد بھول جاتے ہیں۔'' ارے ہماری بھی فوٹو لے لو، پتا چلے کہ ہم بھی گھومنے گئے تھے۔'' جب اجیہ اپنی ہی تصویریں لیے جا رہی تھیں تو میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا..... کہ گھومنے تو ہم بھی جا رہے ہیں تو پھر ہمیں کیوں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔
''اچھا، اچھا بھئی، آپ کی بھی لے رہی ہوں۔'' اجیہ صاحبہ اٹھلاتی ہوئی آئیں..... ''گھر میں تو بنواتی نہیں ہیں..... جہاز میں بچوں کے ساتھ بچوں کی طرح شوق ہو رہا ہے.....'' وہ ہنس کر بولی اور مجھے بھی ہنسی آ گئی۔
کراچی سے دبئی کا سفر مشکل سے دو گھنٹے کا ہے۔ دبئی اتنا ہی دور ہے جیسے ہم کراچی سے بائی ائر اسلام آباد چلے جائیں۔ ٹکٹ میں بھی کوئی اتنا بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ہم لوگ اکثر بچوں کو چھٹیوں پر دبئی لے آتے ہیں۔ ایک تو بچوں نے انٹرنیشنل سفر کر لیا۔ دوسرے ایک نیا ملک، نیا تجربہ حاصل کیا۔ نئے لوگ طور طریقے دیکھے اور ان سے کچھ سیکھا..... میں ہر سفر کے بعد اپنے بچوں سے کہتی ہوں کہ اس کے بارے میں اپنے، اپنے انداز میں لکھو وہاں کیا اچھا اور برا لگا۔ اس طرح بچوں کو لکھنے کی عادت بھی ہوتی ہے جو ان کے لیے ہمیشہ فائدہ مند ہوتی ہے۔ بفضلِ خدا میرے دونوں بڑے بچے اجیہ اور ایمان ہمیشہ اپنے، اپنے سفر کی روداد لکھتے ہیں۔ وہ انگریزی میں ہی لکھتے ہیں اور انشاء اللہ اردو میں بھی ضرور لکھیں گے۔ خیر جناب بات ہو رہی تھی فلائٹ کی۔ تھوڑی دیر بعد ہی فوڈ سرو ہونا شروع ہو گیا۔ عربی ذائقے کا ابلا ابلا کھانا ابو کو تو بہت اچھا لگا۔ ''یہ ہائی پروٹین اور لو کولیسٹرول کھانا ہے، ذائقے کو چھوڑو، صحت کے لیے بہت اچھا ہے۔'' ابو اجیہ اور ایمان کو منہ بناتا دیکھ کر سمجھا رہے تھے۔
''امی..... کے ایف سی کی فلائٹ ہو سکتی ہے کیا؟'' یہ علی تھے۔
''جس میں سادہ کھانا کے ایف سی کا ہو، برگر، چکن وغیرہ..... میں تو پھر اسی فلائٹ پہ جاؤں گا۔'' علی آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کھانا کھاتے ہوئے بولا۔

''میں بھی کے ایف سی کے جہاز میں جاؤں گی۔''
کسوئی بھی علی کی ہمنوا بن گئی تھی۔

فلائٹ میں بچوں کا کھانا علیٰحدہ سرو ہو رہا تھا۔ مگر ہمارے بچوں کو اس سے بھی پرابلم تھی...... ویسے بھی یہ دونوں کھانے پینے کے معاملے میں بے حد نخریلے بچے ہیں...... اب کسوئی اپنی ٹرے پیچھے کر کے بولی۔''امی! سامنے والی ٹیبل پر جو ٹرے سرو ہوئی ہے مجھے وہ لا دیں۔''

اور پھر جب برابر سیٹ پر آنے والی ٹرے میں صرف پھل آئے تو میں نے بھی بڑھ کر ائر ہوسٹس سے وہی لانے کو کہا۔'' اس کا آرڈر پہلے دیا جاتا ہے اور اس کھانے کی پے منٹ ٹکٹ کے ساتھ کی جاتی ہے۔'' ائر ہوسٹس اچھی طرح سمجھا کر گئی کہ بہن پہلے جیب ڈھیلی کر لیتیں تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔

اب پچھتاوے کیا ہوت
جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

ذائقے کی بات نکلی ہے تو ایک واقعہ ہمیشہ میرے ذہن میں تازہ رہتا ہے۔ جب کبھی ہنسنے کو دل چاہتا ہے تو یہ واقعہ یاد کر لیتی ہوں۔ قصہ کچھ یوں تھا کہ شادی کے شروع کے دن تھے اور آفاق کے افسر ہماری دعوت کے لیے بضد ہو گئے۔'' ارے چھوڑیں سر، اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟'' آفاق بھی جانا نہیں چاہ رہے تھے۔ لیکن خیر بھئی ایک دن تیار شیار ہو کر ان کے گھر بتائے ہوئے ٹائم پر پہنچ گئے۔ ان کی بیگم کافی تپاک سے ملیں مگر یہ کیا......؟ گھر میں دعوت والی کوئی ہلچل ہی نہیں...... ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے اور ٹی وی لاؤنج، کمروں، باورچی خانے تک کی لائٹ بند تھی، سوچا بجلی کا ضائع کرنا اچھی بات تھوڑی ہے اسی لیے انہوں نے سارے گھر کی بجلی بجھا رکھی ہے۔ پانی پلانے کے بعد کہا۔'' بھئی چلیں باہر چل کر ڈنر کیا جائے۔'' چلو بھئی یہاں تک بھی ٹھیک تھا۔ راستے میں اپنی گاڑی میں، میں نے آفاق سے پوچھا بھی کہ ہم کون سے ہوٹل جا رہے ہیں تاکہ کھانے کا دماغ بنا لوں، سوچوں میں بریانی، کباب، پراٹھے، چائنیز یا کے ایف سی وغیرہ آنے لگا لیکن جب گاڑی بڑا کی مشہور زمانہ دکان پر رکی تو میری سانس اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ مجھے بڑا بالکل نہیں پسند...... چونکہ امی، ابو بھی نہیں کھاتے تھے تو گھر میں ماحول، نہاری، پائے، حلیم اور کباب پراٹھے نان کلیجے والا تھا۔ چلو یہاں تک بھی راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

''آج دعوت بھابی کے اعزاز میں تو آج آرڈر بھابی دیں گی۔'' آفاق کے افسر عزت دینے کے لیے مینیو کا آرڈر میرے ہاتھ میں تھما کر بولے۔

''چلو بھئی گئی بھینس پانی میں......'' وہ جگہ جہاں پہلے کبھی آئے نہ ہوں، وہاں کی چیز کھائی نہیں ہو، اس کا آرڈر کہاں سے دیتے۔ کبھی کہتے ہیں کہ ماں، باپ کی دعائیں ضرور لینی چاہیے...... دماغ میں ایک ترکیب آئی۔

''ارے، ارے، نہیں نہیں، جو بھی آپ آرڈر کر لیں وہ ٹھیک ہے۔ مجھے خوشی ہو گی پلیز مجھے شرمندہ نہ کریں۔'' میں کمالِ مہارت بلکہ کمالِ اداکاری کے جھنڈے گاڑتے ہوئے بولی کہ اگر یہ اداکاری میں کسی فلم میں کر رہی ہوتی تو پاکستان میں تو آسکر میں سترہ سال پہلے ہی لے آئی ہوتی۔ شرمین عبید چنائے تو دو سال پہلے لائیں......اور وہ بھی ہدایت کاری کے طفیل......ہاہاہا......

''ارے بھابی تکلف کر رہی ہیں۔'' ان کی بیگم اب مجھ سے لپٹیں......'' آج تو ہم آپ کے آرڈر کے منتظر ہیں۔ پلیز بھابی تکلف کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ کیجیے ناں آرڈر......''

اور میں دل میں سوچ رہی تھی یہ تو کافی تکلیف کی بات ہے...... مگر پھر وہی ماں، باپ کی دعائیں کام آ گئیں ان کے میاں نے مینیو کارڈ میرے ہاتھ سے لے لیا، ایسا لگا کہ میرے ہاتھ سے کسی نے ایٹم بم لے لیا ہو۔ اگر وہ پھٹتا تو کسی اور کا تو پتا نہیں مگر میں تو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔

خیر جناب...... افسر صاحب نے ویٹر کو آرڈر دیا۔
''دو چکن تکہ، مجیٹا۔''
دوسرے نمبر کے آرڈر کا تو سمجھ میں نہیں آیا بس دل

میں یہ شکر کیا کہ چکن تکہ آئے گا بھئی، میں تو بس چکن تکہ کھالوں گی۔ کوئی بات نہیں اگر پراٹھا/ رائتہ یا چٹنی وغیرہ نہ بھی آئی تو چکن تکہ ہی کافی ہے۔

تھوڑی دیر بعد ان کی بیگم ایک پیالہ لے کر کسی جگہ گئیں میں سمجھی شاید باتھ روم وغیرہ گئی ہیں کہ انجانی جگہ پر اکثر لوگوں کا کنٹرول نہیں ہوتا۔ لیکن پیالہ لے کر کیوں گئیں ابھی اس گتھی کو سلجھانے میں مصروف ہی تھی کہ افسری (افسر کی بیگم) دوسری جگہ سے واپس آرہی تھیں لیکن اب اس پیالے میں سلاد وغیرہ تھا۔

میں دل ہی دل میں اپنے اوپر ملامت کررہی تھی کہ نہ جانے کیا، کیا سوچ رہی تھی۔

خیر تھوڑی دیر میں پزا سرو کیا گیا۔ پزا کیا تھا؟ دو بڑی، بڑی خمیری روٹیوں کے اوپر رات کا بچا ہوا سالن موٹی، موٹی پیاز کاٹ کو ٹماٹر کٹے ہوئے، ٹماٹر کے ساتھ گھر میں موجود سبزیاں جیسے شملہ مرچ، بند گوبھی وغیرہ ڈال کر ساتھ ہی اس کے اوپر کیچپ مل کر بیک کر دیا تھا اور سب اسے اتنے شوق سے کھا رہے تھے جیسے آج کے بعد دوبارہ نہیں ملے گا۔ مجھے کھانا تو تھا ہی نہیں...... اسی لیے برابر والی ٹیبل پر بیٹھی ایک عورت کو میں اتنی حیرت سے دیکھ رہی تھی جو دونوں ہاتھوں سے اس پزا کو کھا رہی تھی۔

”ارے بھابی دوسرا پیس لیں ناں...... آپ تو ایک ہی لے کر بیٹھ گئیں۔“ افسری نے میرا موجودہ پزا کا بھی ابا میری پلیٹ میں ڈال کر میری پیٹھ سہلائی جیسے مجھے کہہ رہی ہو یہ کھا کر دکھا بچو...... تو مانوں...... میں نے انہیں مسکراتے ہوئے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور بس دیکھتی رہی۔ پزا کو توڑا، موڑا، کھایا رکھا، وہ ٹائم کیسے گزرا بس...... قیامت کا منظر تھا۔ آفاق میری طرف دیکھ تک نہیں رہے تھے کہ یہ نہیں ہوا کہ چوری چھپے ایک ٹکڑا مجھ سے لے لیتے...... اس واقعہ کو وجہ بنا کر دل میں میاں کے خلاف خاصا میل الگ آیا کہ محبت کرنے والے تو ہر موقع پر خیال کیا کرتے ہیں۔

”چکن تکہ کیوں نہیں آیا...... عجیب ہوٹل تھا آرڈر کچھ کروا آتا کچھ ہے۔ آپ کے افسر بھی کچھ نہیں بولے کہ بھائی تکہ منگوایا تھا کہاں ہے؟ شاید پیسے بہت ہیں ان کے پاس......“ میں گاڑی میں بیٹھتے ہی آفاق سے بولنا شروع ہوگئی...... جب اس دعوت سے نمٹ کر ہم گھر جارہے تھے یا کسی جنگ میں شریک ہو کر...... فارغ ہوئے تھے۔

”آیا تو تھا چکن تکہ پزا......“ آفاق حیران پریشان مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے کی ہر مسکراہٹ خاصی حیرت کا مظاہرہ کررہی تھی اور میں کلس کررہ گئی۔

”میں پزا کی بات نہیں کررہی...... میں چکن تکہ کی بات کررہی ہوں......“ میں اپنی رو میں بولے جارہی تھی۔ میرا غصہ اترا کہاں تھا...... دعوت میں جا کر بھوکی آئی تھی۔

”اوہو آپ پزا کی دکان پر چکن تکہ اور پراٹھوں کا انتظار کررہی تھیں۔“ اب آفاق کے قہقہے آسمانوں پر تھے۔ (یہ شوہر مخلوق، بیوی کا مذاق اڑا کر کتنا خوش ہوا کرتی ہے۔ جبکہ ایسا موقع کبھی مخالف پارٹی کو نہیں دیتی)

”جی نہیں...... جی نہیں...... میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔ مجھے بھی حیرت ہورہی تھی کہ بھئی پزا کی دکان پر تکہ کیسے مل سکتا ہے، یہ تو وہی بات ہوئی کہ قسائی کی دکان پر آدمی انڈے مانگے۔“ میں نے اپنی جھینپ مٹانے کی کوشش کی مگر نا کام رہی۔

مگر...... مگر...... مگر...... اس بات کو سترہ سال ہوگئے ہیں۔ میرے بچے پزا بہت شوق سے کھاتے ہیں، اکثر ہمارے گھر میں پزا پارٹی ہورہی ہوتی ہے، بڑی بیٹی اجیہ بہت اچھا پزا بناتی ہے لیکن سچ بتاؤں تو مجھے آج بھی پزا اچھا نہیں لگتا۔

ایک مزے کی بات

اس وقت مجھے پزا سے جڑی ایک اور مزے کی بات یاد آرہی ہے۔ آج سے تقریباً سات یا آٹھ سال پہلے کی بات ہے...... ہم دبئی آئے ہوئے تھے۔ اس مرتبہ بھی امی اور ابو ہمارے ساتھ تھے۔ اور ہم ائر لائن کی جانب سے

ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے...... جہاں انڈین ٹی وی اداکاروں کی ایک کھیپ بھی رکی ہوئی تھی...... آپ کو شاید یاد ہو...... ان میں سے کسی فنکارہ کا میں نے انٹرویو بھی لیا تھا جو پاکیزہ میں شائع ہوا تھا ہاں تو جب ہمیں پتا چلا تھا کہ انڈین ٹی وی فنکار بھی اسی ہوٹل میں مقیم ہیں تو ان کو دیکھنے کو دل چاہا۔ مگر وہاں ناشتے میں مجال ہے کہ کوئی خوب صورت لڑکی نظر آتی ہو...... سب ہی کالی، کالی اور بے انتہا سوکھی، سوکھی سی لڑکیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے وہاں کے شیف سے پوچھا...... کیا انڈین فنکار یہاں ناشتا کرنے نہیں آتے...... تو اس نے ہنس کر بتایا۔ اس وقت آپ کی ٹیبل کے ساتھ جو لڑکیاں ناشتا کر رہی ہیں وہ سب انڈیا کی ٹی وی آرٹسٹ ہی تو ہیں...... میں نے بغور دیکھا۔ تو بڑی مشکلوں سے شباہت سی نظر آئی۔ ورنہ اتنی بیمار سی لڑکیوں کو تو میں نے نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا تھا یا شاید اسکرین بیوٹی کے لیے ایسے ہی مدقوق چہروں کی ضرورت ہوتی ہوگی۔ تب میرے منہ سے بے اختیار نکلا...... یہ ہیں فنکارائیں...... لاحول ولاقوۃ اصل بیوٹی تو ہمارے ملک میں ہے، کیسی کیسی، پیاری، پیاری موٹی، موٹی سی لڑکیاں بھی ہماری ٹی وی فنکارائیں ہیں جو ٹی وی پر بھی اچھی لگتی ہیں اور دیکھنے میں بھی...... وہاں تو زیادہ تر فاقے ماریاں ہیں۔

ہم قدم دبئی کے ہم

دو گھنٹے کی آرام دہ فلائٹ کے بعد ہم دبئی کے انٹرنیشنل ائرپورٹ پر اترے۔ دبئی کا ائرپورٹ بہت خوب صورت اور بڑا ہے۔ اترنے والا ٹرمینل الگ ہے جبکہ ملک سے باہر جانے والے مسافروں کے لاؤنجز بالکل الگ ہیں۔ کیونکہ ائرپورٹ بہت بڑا ہے اسی لیے مسافروں کی آسانی کے لیے اندر ہی ائرپورٹ کی گاڑیاں چل رہی ہوتی ہیں۔ عمر رسیدہ یا بیمار مسافر اس میں بیٹھ کر راستہ طے کر سکتے ہیں۔ ہم سب لوگ ماشاء اللہ صحت مند تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہم تو دوسروں کو بیمار کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ پیدل ہی اس بیلٹ کی طرف روانہ ہوئے جہاں ہمارا سامان لوٹیں لگا رہا تھا۔ درمیان میں آٹومیٹک پاتھ (یعنی خود کار مشینی چلنے والی زمین) جگہ، جگہ بنائی گئی تھی کہ پیدل چلنے والے مسافر بھی تھکان محسوس نہ کریں۔ آدھا کلومیٹر راستہ تو ضرور ہوگا جو سب کے ساتھ گپ شپ کرتے ہوئے پتا نہیں لگا...... ہاں بس کسوئی نے ضرور تنگ کیا۔ ”امی، امی مجھے واش روم جانا ہے“ کسوئی میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔

”بھئی کسوئی ابھی ہوٹل جا رہے ہیں بیٹا تھوڑا کنٹرول کرو۔“ میں نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔

”امی! مجھے جلدی لے جائیں ورنہ......؟“ اس نے اپنا آخری حربہ بھی استعمال کر لیا۔

”اچھا، اچھا میری جان، پہلے کہہ دیتیں۔ چلو ڈھونڈتے ہیں واش روم ابھی مل جائے گا......“ میں نے اپنی عزت بچاتے ہوئے سب کو چھوڑا اور واش روم کی تلاش میں سرگرداں و پریشان پھرنا شروع کر دیا۔

ایک نشان پھر دوسرا نشان پھر تیسرے نشان کو فالو کرتے کرتے میں واش روم تک پہنچ گئی۔

واش روم تھا کہ سجا ہوا کاریڈور...... ہر طرف خوشبوئیں، مدد کرنے کے لیے دو عورتیں الگ کھڑی تھیں۔ اس کاریڈور سے گزر کر واش روم میں جانا ہوتا تھا۔ وہاں کی اتنی صفائی کہ کسی...... پھوہڑ کے گھر بھی اتنے صاف نہ ہوں۔ میں بلاوجہ گھبرا رہی تھی کہ پبلک والی جگہ پر پتا نہیں واش روم کیسے ہوں“ میں نے اجیہ سے واپسی پر کہا۔

”امی اب ہم دبئی میں ہیں، ساری پریشانیاں بھول جائیں“ اجیہ بے فکری سے کہہ رہی تھی۔

خیر جلدی جلدی امی، ابو کے پاس تک پہنچے اتنی دیر میں سارا سامان جمع کیا جا چکا تھا اور باہر جانے کے راستے کے لیے روانہ ہونے والے تھے۔

”آپ نے سارا سامان پہچان لیا امی......؟“ میں نے امی سے کہا۔ جنہوں نے میرا سامان بھی پہچان کر ٹرالی میں رکھوا لیا تھا۔

”تو؟ اس میں کیا بڑی بات ہے، ہر اٹیچی پر اسی رنگ کا اور وہی کپڑا تو باندھا ہوا ہے جو ہماری والی میں ہے اور یہ میں نے تو دیا تھا“ انہوں نے یاد دلایا۔ پھر مجھے یاد آیا۔

امی نے کپڑوں کی دھجیاں بنا کر دی تھیں کہ اسے اٹیچیوں میں باندھ دینا، دور سے اٹیچی نظر آجاتی ہے۔ آدمی دوسری جگہ پہنچ کر ویسے ہی حواس باختہ ہو رہا ہوتا ہے! یہ تک یاد نہیں رہتا کہ ہمارے سامان کے کتنے عدد تھے؟ اور کس، کس رنگوں کے تھے (اور میں اپنی امی کی ذہانت پر اش اش کر اٹھی...... ہر موقع پر وہ کوئی نہ کوئی آسانی مہیا کر دیتی ہیں) جوں، جوں ہمارا آٹھ افراد کا قافلہ باہر جا رہا تھا، سامنے سے امبر کے شوہر مسرت اور ان کی بیٹی ریحاب (ڈولی) سامنے کھڑے نظر آرہے تھے۔ ڈولی پھولوں کا گلدستہ لیے کھڑی تھی۔ امی کو گلدستہ دینے کے بعد باقی سب لوگوں کو پھولوں کی کلیاں دے رہی تھی۔

”اتنے سارے پھولوں کی کیا ضرورت تھی ڈولی...... تم خود ہی آجاتیں یہ ہی بہت تھا۔“ امی اسے پیار کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ (ریحاب ویسے بھی امی کی بے حد لاڈلی ہے) اجیہ اپنی کزن سے مل کر کافی خوش ہو رہی تھی چونکہ ہم لوگ تقریباً دو سال بعد دبئی گئے تھے۔ اسی لیے دونوں کافی ایکسائٹڈ بھی تھیں۔ ”چلیں گھر چلتے ہیں پہلے فریش ہو جائیں پھر پروگرام بنائیں گے کہ کہاں، کہاں جانا ہے۔“ مسرت بھائی ایمان اور علی سے باتیں کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

”مگر ہماری بکنگ ہے ہوٹل کی، شام تک گھر آجاتے ہیں، ابھی تو دوپہر کے تین بج رہے ہیں پانچ بجے ملتے ہیں۔“ آفاق نے انہیں بتاتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں بھائی، آپ کی بہن ہمارے کان کھینچ لے گی، اس نے آپ لوگوں کو لانے بھیجا ہے تو مطلب لانے بھیجا ہے۔ ہم اپنی بیگم کے حکم کے آگے غلام ہیں۔“ مسرت فل مذاق کے موڈ میں تھے۔

”ارے نہیں بھائی، ناحق زحمت ہوگی، جب بکنگ ہے تو پریشانی کی کوئی بات ہی نہیں۔ ذرا ہوٹل والوں کو بھی تو تنگ کیا جائے۔“ ابو مسرت کو سمجھا رہے تھے۔

لیکن ان لوگوں کی محبت کے آگے ہم سب لوگوں کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ہم سب لوگ ایک بڑی سی کوسٹر میں بیٹھ کر امبر کے گھر روانہ ہوئے۔ آفاق کے دوست کی فیملی ائرپورٹ سے ہی اپنے عزیز کے گھر روانہ ہوگئی تھی۔

امبر عجمان میں رہتی ہے۔ بہت اچھا لگژری فلیٹ ہے۔ جس میں ہر فلور پر مصنوعی پارک بنایا گیا ہے۔ نیچے، گراؤنڈ کو یہ لوگ پوڈیم کہتے ہیں جہاں پر جم، بیوٹی پارلرز، ہیلتھ کلب جاگنگ ٹریک سب کچھ موجود ہے۔

اپنے فلیٹ کے برابر والے فلیٹ میں اس نے ہمارے لیے انتظام کر رکھا تھا جو کہ کافی اچھا تھا۔ اور بے حد کشادہ بھی...... دوپہر کا کھانا بہت ہی لذیذ تھا۔ کھانے میں بریانی، روسٹ، قورمہ، سبزی اور جانے کیا، کیا بنایا ہوا تھا۔ اپنے گھر میں تو پتا نہیں چلتا لیکن دوسرے کے گھر جا کر بھوک بہت لگتی ہے۔ سو یہی حال یہاں بھی تھا۔

”آپ لوگ تھوڑا آرام کرلیں تو شام میں دبئی مال چلا جائے۔“ مسرت پروگرام بنا رہے تھے۔

”بچے بھی گھر سے اپنا پروگرام لے کر آئے ہیں۔ کیونکہ ایک ہفتہ ہے اور جگہیں بہت ساری ہیں اس لیے جتنا مزہ کرنا ہے کرلو......“ آفاق مسرت کو ہنستے ہوئے بتا رہے تھے۔

”بالکل، بالکل......“ سب ان کی تائید میں سر ہلا رہے تھے۔

”لیں بھئی گرم گرم چائے......“ امبر باتوں کے دوران اٹھ کر ایک دم چائے کے بھاپ اڑاتے ہوئے مگ لے کر حاضر ہوگئی۔

”جزاک اللہ...... اسی چیز کی طلب ہو رہی تھی۔“ امی اسے دعا دیتے ہوئے بولیں۔

چائے پی کر ہم اپنے فلیٹ سدھارے...... صبح سے بھاگم بھاگی کر کے واقعی اب تھکن محسوس ہو رہی تھی اور فلیٹ میں جا کر سب اپنے، اپنے بیڈ پر جا کر گرنے کے انداز میں لیٹ گئے اور ایسے بے خبر سوئے کہ پتا ہی نہیں چلا...... اور جب زلزلہ محسوس کر کے پریشان سے اٹھے تو معلوم ہوا کہ امبر اور اس کی بچیاں دروازہ دھڑ دھڑاتے ہوئے ہمیں اٹھانے کی کوششیں کر رہی تھیں کہ موبائل سب کے بیگز میں تھے اور سارے بیگز لاؤنج میں تھے۔ اس لیے ان لوگوں نے دروازہ دھڑ دھڑا کر ہم

سب کو اٹھایا اور سب ہی یوں اٹھ کھڑے ہوئے جیسے کسی نے نیند ہی نہیں لی تھی۔

''پہلے ہائی ٹی...... پھر گھومنا ہوگا......'' امبر نے کہا۔

''سنو امبر...... کھاپی کر چلا نہیں جائے گا......'' میں نے کہا۔

''خوب چلیں گے ...... بلکہ بھاگیں گے۔'' وہ ہنسی...... زبردست ہائی ٹی...... امبر کی طرف سے ارینج تھی۔ سب نے ہی خوب مزے لے کر کھائی۔ اب بچے سب جانے کے لیے پر تول رہے تھے اور امی...... اپنی قضا نمازیں پڑھ رہی تھیں۔

اجیہ اپنا اٹیچی کیس کھولے...... سوچ رہی تھی کہ کیا پہنا جائے۔

''یہ اچھا لگ رہا ہے۔'' اس کی مشکل ڈولی نے حل کر دی...... اور اپنی پسند کا سوٹ اٹیچی کیس میں سے کھینچ لیا۔

''میں اسے ہی تو ڈھونڈ رہی تھی۔'' اجیہ ہنسی۔

دبئی مال اور ہم

خاصی گہری شام کو ہم سب تیار ہو کر دبئی مال کے لیے روانہ ہونے لگے۔'' بیٹا میں اور ابو کافی تھکن محسوس کر رہے ہیں۔ تم لوگ جاؤ ہم لوگ آرام کریں گے۔'' امی نے مجھ سے کہا جو واقعی کافی تھکی ہوئی لگ رہی تھیں۔

''اتنا خوب صورت مال آپ دیکھنے سے مس کر جائیں گی۔ کیا یہاں آرام کے لیے آئی ہیں......؟'' مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ امی، ابو کو چھوڑ کر جاؤں۔

''بیٹا ہم لوگ کل چلیں گے جہاں تم کہو گی۔'' یہ ابو صاحب بستر پر سے فرما رہے تھے۔

''یار نانا، نخرے، وخرے نہیں کریں چلیں یار......'' ایمان نانا کو منا رہا تھا ان کا لاڈلا جو ہے۔

خیر ہاں نہ کرتے، کرتے دونوں بہ مشکل تیار ہو گئے۔ ہم سب مسرت کی بڑی سی گاڑی میں سوار تھے چونکہ یہ مال دبئی میں تھا اور سب عجمان (دوسرا علاقہ) سے جا رہے تھے۔ اسی لیے زیادہ تر گاڑیوں میں نیوی گیٹر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی مشین ہے جس میں کمپیوٹر کی طرح یہ لکھ دیا جاتا ہے کہ ہمیں یہاں جانا ہے اور وہ سارے راستے بولتی ہوئی راستہ بتاتی رہتی ہے کہ ابھی ہم یہاں ہیں، یہاں سے سیدھا لیں یا الٹا پاکستان کی بھی اچھی گاڑیوں میں یہ سسٹم ہوتا ہے مگر ہماری میں نہیں ہے گاڑی ہماری بھی اچھی ہے۔

اس سسٹم پہ یاد آیا کہ ایک دفعہ کسی عزیز کی گاڑی میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہمیں کونے تک ڈراپ ہونا تھا سمجھیں (گلی کے پان والے کی دکان تک) اس کی گاڑی میں یہ نیوی گیٹر لگا ہوا تھا، ہمیں شو مارنے کے لیے اس سسٹم کی مدد لے رہا تھا چونکہ یہ سب ہم پہلے بھی یہاں دبئی کی گاڑیوں میں دیکھ چکے تھے اس لیے اس کی اتراہٹ پر ہنسی آ رہی تھی۔

''بیٹا صرف آنکھیں بند کر کے بھی گاڑی چلاؤ گے ناں تو جہاں ہمیں چھوڑنا ہے وہ جگہ آ جائے گی۔ اس مشین کو کیوں تھکا رہے ہو۔'' میں نے اس بچے سے کہا تھا۔

خیر بات ہو رہی تھی جانے کی، کافی دور کی مسافت طے کر کے دبئی مال تک پہنچے...... دبئی میں چونکہ کافی لمبی روڈ ہیں اور بیچ میں کوئی کٹ نہیں ہے۔ اگر گاڑی چلانے والے کا کوئی بھی کٹ چھوٹا تو پھر دوسرا کوئی نہیں آئے گا۔ علاقہ ختم ہو جائے گا مگر اب دوسرا کٹ ہوگا تب ہی آئے گا۔

دبئی کو منی یورپ بھی کہتے ہیں۔ نائن الیون کے بعد پوری دنیا خاص کر امریکا سے کافی مسلم باشندوں کی اکثریت دبئی میں آ کر سکونت پزیر ہوئی کیونکہ یہاں انہیں ہر چیز کی آزادی حاصل ہے جو چیز چاہے پہنو، جو چیز چاہے کھاؤ جو چیز چاہے پیو...... کوئی روک ٹوک نہیں...... قوانین اتنے سخت کہ کوئی انہیں توڑنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر اگر کسی نے غلط کار پارکنگ کر دی تو فوراً شرطہ (پولیس والا) چالان کر دے گا۔ جسے یہاں کے لوگ ٹکٹ کہتے ہیں۔

اچھے فلیٹوں میں پارکنگ کی جگہ بھی فلیٹ کے ساتھ خریدی جاتی ہے تاکہ بعد میں مشکل نہ ہو۔ کوئی کسی

کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی نہیں کر سکتا۔ پاکستان میں پارکنگ تو چھوڑ ہم آرام سے کسی کے گھر کے مین گیٹ کے آگے گاڑی پارک کر لیتے ہیں۔ اب یہ سارے مزے تو اپنے ملک میں ہی مل سکتے ہیں۔

دبئی مال دبئی کے وسیع و عریض بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ سب سے بڑے مال میں سے ایک ہے۔ دبئی کا ٹریفک دنیا کے بدترین ٹریفک میں سے ایک ہے۔ دبئی گورنمنٹ اپنے ملک کے بدترین ٹریفک جام کو کنٹرول کرنے کے آئے دن منصوبے بناتی رہتی ہے مگر ایک جگہ جس کے ہر شہری کے پاس دو سے تین گاڑیاں ہوں تو پھر اس جگہ کے روڈ کا جو حشر ہونا چاہیے وہی یہاں کا تھا۔ ٹریفک کے رش کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر دبئی میں کسی کا آفس صبح نو بجے شروع ہوتا ہے تو وہ عجمان سے صبح چھ بجے نکل جائے گا۔ جبکہ اگر رش نہ ہو تو یہ راستہ آدھا گھنٹے سے زیادہ نہیں۔

شکر ہے کہ جب ہم لوگ دبئی کے لیے روانہ ہوئے تو رش آورز نہیں تھے۔ گاڑی پارکنگ کے اندر کھڑی کر کے.... انڈر گراؤنڈ سسٹم سے ہم لفٹ کے ذریعے مین سینٹر پہنچے۔ سینٹر کے باہر ایک وسیع و عریض جھیل پر ٹورسٹ کشتی کی سیر بھی کر رہے تھے۔ ہم نے بھی جھیل کی سیر کی مگر کنارے سے، ابھی ہم اپنے بچوں اور امبر کے بچوں کو گننے میں ہی مصروف تھے کہ یکایک پوری جھیل کے اطراف اندھیرا چھا گیا۔ دل میں ایک کمینی سی خوشی ہوئی کہ چلو لائٹ یہاں پر بھی جاتی ہے، بلاوجہ ہی یہاں کے لوگ شو مارتے ہیں پتا چل گئی ناں یہاں کی بھی اوقات......

لیکن یہ کیا......؟

پوری جھیل پر روشنیوں کا رقص شروع ہو گیا۔ کسی عربی گانے کے اوپر روشنیوں اور پانی کے جھرنوں کا جو تال میل ملنا شروع ہوا کہ بھئی واہ...... مزہ آ گیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس جھیل میں کسی نے بجلیاں بھر دی ہوں۔

”امی کتنا اچھا لگ رہا ہے ناں......“ میں نے امی سے کہا جو اس منظر میں کھوئی ہوئی تھیں۔

”واقعی بہت خوب صورت نظارہ ہے۔“ انہوں نے جواب دیا لیکن جس لہجے میں دیا میں سمجھ گئی کہ وہ اپنی کسی ناول کی ہیروئن کو اپنے ہیرو کے ساتھ بیٹھا دیکھ رہی ہیں۔

”بیکار آپ منع کر رہی تھیں، نہ آتیں تو مجھے بہت افسوس ہوتا۔“ میں نے انہیں پانی دیتے ہوئے کہا۔

”امی جب گانے کا میوزک سلو ہوتا ہے تو پانی کا فوراہ بھی بالکل نیچے ہو جاتا ہے اور جب میوزک لاؤڈ ہوتا ہے تو وہ... کتنا اوپر ہو جاتا ہے۔“ اجیہ صاحبہ وہ بات بتا رہی تھیں جو سب محسوس کر رہے تھے۔

”مامی ہر زبان کے گانوں پر یہ واٹر ڈانس ہوتا ہے انڈین گانوں پر تو اور مزہ آتا ہے۔“ ڈولی ہمیں ہر طرح کی معلومات دے رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد گانا ختم ہو گیا اور اطراف کی ساری لائٹس بھی کھول دی گئیں۔ لیکن ہم تو ابھی اس سحر سے آزاد ہی نہیں ہوئے تھے۔

”امی ہم لوگ آئس اسکیٹنگ کرنے جا رہے ہیں۔“ (برفیلی زمین پر پہیوں والے جوتے پہن کر بھاگنا) ایمان مجھے اطلاع دے رہا تھا۔

”اچھا، اچھا پاپا کو بتا کر جاؤ۔“ میں نے ایمان کو کہا۔

”بھئی وہ تو ہمارے ساتھ ہی ہیں۔“ ایمان اور علی نے بتاتے ہی دوڑیں لگائیں۔

میں، امی، ابو، ڈولی، کسوئی سب آہستہ، آہستہ مال میں گھومتے رہے۔ کئی منزلہ تعمیر یہ مال اتنا بڑا ہے کہ ایک فلور پر، ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچنے میں ایک دو گھنٹے لگ سکتے ہیں۔ ایک فلور پر فوڈ کورٹ (کھانے پینے کے ہوٹلز) بنے ہوئے ہیں۔ کسی فلور پر صرف نوزائدہ بچوں کا سامان ملتا ہے۔ کسی فلور پر نوجوان لڑکیوں کے کپڑے موجود ہیں، کسی پر صرف لڑکوں اور مردوں کی اشیا دستیاب ہیں۔ ہر دکان برانڈڈ اور اسی طرح ان کے ریٹ بھی کمال کے۔ ہم ہر دکان میں گھس کر اشیا کے ریٹ تو ضرور پوچھ رہے تھے مگر صرف قیمتیں سن کر ہی اتنی کمزوری ہو رہی تھی کہ لگ رہا تھا جیسے یرقان

سے اٹھے ہوں۔

''اب بچوں کے پاس چلا جائے، پتا نہیں کیا، کیا تماشے کر رہے ہوں گے۔'' جب کافی دیر ہو گئی تو ابو کو بچوں کی فکر ستانے لگی۔

''ارے ابو، بچے اپنے ابا کے ساتھ ہیں، فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے ان کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''ارے یہی بات تو فکر کی ہے، تمہارے میاں صاحب بھلا کسی بچے سے کم ہیں۔'' ابو نے ہنس کر امی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ تو سو آنے درست بات کی آپ نے۔'' میں نے بھی اماں، ابا کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

اب جناب، اتنا بڑا مال، کہیں سے سیڑھیاں چڑھ رہیں تو کہیں لفٹ سسٹم ہے۔ اتنی بھول بھلیاں تھیں کہ واپسی پر گھر جاتے وقت باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل پا رہا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ہمارے ساتھ ڈولی (ریحاب) تھی۔ اسی بچی نے ہمیں بچھڑوں سے ملوا دیا۔ ورنہ شاید ہم دبئی مال سے ایک ہفتے سے پہلے نہیں نکل سکتے تھے۔ بچوں کے پاس پہنچے تو سب کے سب اس اسکیٹنگ ایریا میں موجود تھے، گر رہے تھے پڑ رہے تھے مگر کر رہے تھے۔ سینٹر کی ایک بہت بڑی دیوار پر پروجیکٹر سینما اسکرین پر فٹ بال ورلڈ کپ کے پول میچز ہو رہے تھے۔ چونکہ یہاں پر ہر قومیت کے لوگ بستے ہیں تو سب ذوق شوق سے میچز دیکھنے میں مصروف تھے۔ جب بھی گول ہو جاتا تھا تو ایک شور شرابا مچ جاتا تھا۔

''امی مجھے اپنے موبائل کے کورز لینے ہیں۔'' اجیہ اسکیٹنگ کرتے ہوئے ہی مجھے اپنے آئندہ کے پروگرامز بتا رہی تھیں۔

آفاق سامنے بیٹھے بچوں کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔

''کوئی بات نہیں، دوبارہ کھڑے ہو جاؤ، ارے گیم میں تو چوٹ لگتی ہے۔'' وغیرہ ٹائپ کے جملے الگ بول رہے تھے۔ آفاق کی ایک بات مجھے جو اچھی لگتی ہے وہ یہ کہ وہ بچوں کو ہر گیم ہر ایونٹ میں حصہ لینے کے لیے بضد رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تجربہ انسان کو بہت کچھ سکھاتا ہے۔ دور سے کھڑے دیکھنے میں اور اس چیز میں حصہ لینے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بچے اسکول کے ٹرپ پر چڑیا گھر، میوزیم، ہاکس بے، کلفٹن، کوکا کولا فیکٹری، قائداعظم کے مزار غرض جہاں جہاں اسکول بھاگا، بھاگا پھر رہا ہے اس کے ساتھ، ساتھ ہمارے بچے بھی دوڑ رہے ہیں۔

مجھے یاد ہے جب میں اسکول میں تھی تو مجھے امی کسی بھی ٹرپ پر جانے نہیں دیتی تھیں۔

''ارے پاگل سی ٹیچریں ہیں، کہیں چھوڑ دیا تو، میں تو اپنی بچی کو نہیں بھیج رہی۔'' امی کا یہ ایک خاص ڈائیلاگ تھا۔

خیر مجھے بھی جانے کا کوئی خاص شوق نہیں ہوتا تھا کیونکہ جو بچے نہیں جاتے تھے ان کی اس دن اسکول کی چھٹی ہوتی تھی اور ہم چھٹیوں کے رسیا۔ دیر تک سونے کے ماہر، جب اسکول کی چھٹی ہو تو صبح، دوپہر ایک بجے ہوتی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ امی نے کبھی مجھے ڈانٹا ہو، مار تو بہت دور کی بات ہے۔ ہم سارے بہن بھائی امی سے بہت نزدیک ہیں۔ میں تو میں، میری بیٹی بھی کوئی خاص بات پہلے اپنی نانی کو بتاتی ہے پھر مجھے، شاید ان کی اسی تربیت، ان کی اسی چاہت کی وجہ سے ہم ان سے محبت نہیں عقیدت رکھتے ہیں۔ اپنے بچپن کی یادوں میں گم ہوں تو ایک ذکر ضرور کروں گی کہ جب میں بہت چھوٹی تھی شاید ون یا ٹو کلاس میں، ہمارے گھر چکن بنی تھی میرے بھائیوں نے کہا کہ ''امی، لیگ پیس ہمیں دیں۔''

''ارے بہن کو دو، کیا پتا سسرال میں ملے یا نہ ملے۔'' امی کافی غمگین لہجے میں اس مرغی کی پتلی سی ٹانگ میری پلیٹ میں ڈال دیا کرتی تھیں۔

بہت عرصے تک تو میں یہی سوچتی تھی کہ سسرال میں ایسی مرغیاں پائی جاتی ہیں جن کی ٹانگیں نہیں ہوتیں اور اپنے تصور میں بے ٹانگ کی مرغیاں اِدھر اُدھر پھدکتی ہوئی دیکھا کرتی تھی۔ بات کہاں سے کہاں نکل گئی، بات ہو رہی تھی دبئی مال کی، خیر جلدی جلدی بچوں کا اسکیٹنگ

ٹائم ختم ہوا، ان کو لے کر ہم سب نے گھر کی راہ لی۔

کچھ دبئی کے بارے میں!

جس جگہ جانا ہو اس کے بارے میں معلومات رکھنا اچھا رہتا ہے، جانے سے پہلے بچے طرح طرح کے سوالات پوچھ رہے تھے کہ وہاں کیا ہوگا، کیسا ہوگا؟ چونکہ پہلے کے مقابلے میں یہاں روز بروز تبدیلی ہوتی جا رہی ہے اور تبدیلی بھی مثبت تبدیلی، بلند و بالا عمارتیں، چکاچوند کر دینے والی روشنیاں، بہترین آمدورفت کے ذرائع، سسٹم، قوانین اتنے سخت کہ کوئی انہیں توڑنے کا سوچ نہیں سکتا۔

مثلاً اگر سیٹ بیلٹ لگا کر گاڑی نہ چلائی تو چالان، گاڑی میں زیادہ لوگ بٹھا دیے تو چالان، گاڑی غلط پارک کر دی تو چالان، جس جگہ منع کیا گیا وہاں تیز گاڑی چلائی تو چالان۔ یعنی یہاں پر انسان اتنے قوانین میں جکڑا ہوا ہے کہ وہ ایک سے بچ بھی جائے تو دوسرے میں دھر لیا جائے گا۔ دبئی میں رہائش اختیار کرنا کافی مہنگا ہے۔ ایک آدمی یہاں پاکستان سے جاب کے سلسلے میں دبئی آیا۔ یہاں پاکستان میں تو ہر آدمی بادشاہ ہے جہاں سے جانا ہے جاؤ، جہاں روڈ سے آنا ہے آؤ، ایک وے پر الٹا جانا چاہو تو جاؤ، اس پر اگر کوئی تیزی سے سامنے آجائے تو اس غریب کو آنکھیں الگ دکھاؤ کہ نظر نہیں آرہا، اتنی بڑی گاڑی آرہی ہے۔ وہ صاحب بھی پاکستان کی گلیوں میں پل کر جوان ہوئے تھے۔ دبئی پہنچ کر بھی ان کی عادات نہ بدلیں، دے دھپا دھپ چالان پہ چالان ہونا شروع ہو گئے۔ ایک دن جب کافی تگڑے چالان کا سامنا کرنا پڑا تو موصوف فرمانے لگے کہ جتنے میرے چالان ہوئے ہیں، اگر نہ ہوئے ہوتے تو دبئی میں ایک گھر تو میرا ضرور ہوتا۔

دبئی کی کرنسی درہم کہلاتی ہے۔ ایک درہم ہمارے پاکستان کے اٹھائیس روپے کے قریب بنتے ہیں۔ یہاں کوئی چوری کرنے کا سوچ نہیں سکتا کیونکہ اگر کوئی چوری میں پکڑا جائے تو اس کے ہاتھ کاٹ دیے جاتے ہیں جو دوسروں کے لیے عبرت کے لیے کافی ہوتا ہے۔ پیسوں کا یہاں کی حکومت کے پاس کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ پیٹرول زمین میں بہہ رہا ہے۔ پوری دنیا ان کا دوست بننے کے لیے تیار ہے۔

دبئی کے ساتھ ملحقہ ریاستیں ہمارے پٹھان بھائیوں کی محنت کی بدولت زرخیز ہیں چونکہ یہ بالکل ریگستانی علاقہ ہے۔ یہاں کی حکومت نے جنگل میں منگل مصنوعی طریقے سے بنایا ہے۔ سرسبز و شاداب درخت، ہری بھری کیاریاں، وسیع و عریض باغات ہمارے پٹھان بھائیوں کی محنت ہے۔ یہاں سے انہیں بلایا گیا اور انہوں نے بنجر زمین میں مٹی ڈال کر کھود کھاد کرا سے زرخیز بنایا۔

امی کی دوست محسنہ اسرار جو دبئی میں رہائش پذیر ہیں ایک دفعہ ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ گھر کیا تھا زمین پر جنت تھا۔ اتنا مذہبی ماحول میں نے شاید ہی کسی کے گھر میں دیکھا ہو۔ یہ لوگ امریکن نیشنل تھے مگر نائن الیون کے حالات کے بعد دبئی مقیم ہوئے تھے۔ ان کے شوہر اسرار صاحب جو کہ پیشے کے اعتبار سے بزنس مین ہیں بتاتے تھے کہ یہاں سے ہمارے محنت کش بھائی پاکستان فون کر کے پوچھتے ہیں کہ ....

سوال: ”بیگم، چیک بھیجا تھا مل گیا؟“

جواب: ”خان صاحب مل گیا 25000 روپیہ۔“

سوال: ”میں سوچتا ہے کہ چھٹی میں واپس آجائے۔ پر کام کا حرج ہوگا۔“

جواب: ”ارے خان صاحب، کیا ضرورت ہے، کام مام کرو، بیکار یہاں پر کون انتظار کرتا ہے۔ اگلی دفعہ آجانا۔“

وہ یہاں خوش، بیوی بچے وہاں، دونوں طرف ترقی ہو رہی ہے۔

محسنہ آنٹی کے گھر کی ڈیکوریشن مجھے آج بھی یاد ہے۔ حالانکہ بات چھ سات سال پرانی ہے۔ (جب سات سال پہلے دبئی گئی تھی) کہ گھر کے ٹی وی لاؤنج سے سیڑھیاں ناچتی ہوئی اوپر کے بیڈ رومز میں جا رہی تھیں اور

سیڑھیوں کے نیچے انہوں نے پانی کا خوب صورت سا فوارہ چلا رکھا تھا۔ بے مثل کراکری کے گلاس ہاتھ میں لینے میں بھی خوف محسوس ہو رہا تھا کہ بچوا گر گر گیا تو......

دونوں میاں بیوی پُرخلوص مہمان نوازی کے ریکارڈ بنا رہے تھے۔ گھر میں اعلیٰ نسل کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک سائڈ ٹیبل پر ایک ڈیکوریشن پیس تھا جس میں پانی تھا اور اس کے اندر سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

''شاید پانی ابل گیا ہے، اب پتی ڈال دیں۔'' میں نے مذاق میں محسنہ آنٹی سے کہا۔

''یہ تو بہت ہی پیارا لگ رہا ہے۔'' میں نے ان کے صوفہ کلاتھ کی تعریف کی جو اُن کے صوفے کی کمر پر جھول رہا تھا۔

''یہ میں نے فیسٹیول سے لیا تھا انڈین اسٹال سے۔'' وہ بھی محبت سے بتا رہی تھیں۔

''اس کا مطلب ہے کہ فیسٹیول میں آنا چاہیے۔'' امی ان سے پوچھ رہی تھیں۔

''جی انجم، فیسٹیول شاپنگ کے حوالے سے کافی اچھا رہتا ہے۔ پوری دنیا کی چیزیں آپ کو ایک جگہ مل جاتی ہیں اور ریٹ بھی مناسب ہوتے ہیں۔'' وہ امی کو تفصیل سے بتا رہی تھیں اور میں دل میں سوچ رہی تھی کہ کوئی بھی نہیں، میں نے بھی دبئی فیسٹیول دو مرتبہ دیکھا ہے گلوبل ویلج والا، ایک بڑے سے پارک جو کہ ایکڑوں پر پھیلا ہوا ہے، ایک حصے میں بوٹنگ بھی ہو رہی ہے، کہیں پر گھوڑوں اور اونٹوں کی سواری کا انتظام کیا ہوا ہے وہیں پر ایک حصے میں فیسٹیول ارینج کیا ہوا ہے۔ جیسے چین کی چیزیں دیکھنی ہے تو شروع میں ایک دروازہ سا بنایا ہوا ہے چین کے جھنڈے کا رنگ ہر طرف نمایاں ہے اندر جائیں مختلف اسٹالز ہیں جہاں پر چینی ثقافتی چیزیں بک رہی ہیں۔ بیچنے والے چینی لباس میں موجود ہیں۔ چینی زبان کا کوئی مشہور گانا مثلاً چو چا چا بج رہا ہے۔ یعنی ایک ماحول بنا ہوا ہے۔ چینی کھانے بھی مل رہے ہیں مگر ریٹ...... آپ سمجھ گئے ناں کہ میں کیا کہنا چاہ رہی ہوں؟

ایسے ہی پاکستانی، انڈین، ایرانی، مصری، افغانستان غرض پورے ملک اس ایک جگہ آ بسے ہیں۔ میں پاکستانی اور انڈین اسٹالز پر بھی گئی۔ گئی تو اور ملکوں کے بھی مگر مزہ تو صرف انہی میں آیا۔ پاکستانی اسٹالز پر ہماری ثقافتی چیزیں مثلاً شیشوں کے کام کے گلے، اجرک، چوڑیاں، پراندے، چادریں، لکڑی کا سامان اور طرح طرح کی چیزیں بک رہی تھیں۔ گانا بھی جیوے پاکستان چل رہا تھا۔ یہاں کی چیزوں کے بھی ریٹ کافی ہائی تھے مگر اس سے خوشی ہوئی کہ اچھا ہوا اتنے ریٹ رکھے۔ بہت پیسہ ہے یہاں کے لوگوں کے پاس، اگر ہمیں دے دیں گے تو کوئی غریب نہیں ہو جائیں گے۔

بڑا بیٹا ایمان اس وقت ڈیڑھ سال کا تھا جب ہم سب سے پہلی دفعہ دبئی فیسٹیول دیکھنے آئے تھے۔ اجیہ بھی چھوٹی تھی اس کا منہ ہاتھ دھلانے اسے واش روم لے کر گئی اور آفاق سے کہہ گئی کہ ذرا ایمان کو دیکھیے گا۔ ابھی میں وہاں سے واپس بھی نہیں آئی تھی کہ امبر گھبرائی ہوئی آئی ''ایمان آپ کے پاس ہے کیا؟''

''ارے نہیں بھئی، اسے تو میں آفاق کو دے کر آئی ہوں۔'' میں نے گھبرا کر کہا۔

اس کی پریشان شکل مجھے بتا چکی تھی کہ ایمان کھو گیا ہے۔ اجیہ کو گھسیٹتی ہوئی میں واپسی کے راستے پر تھی اور دل کی عجیب کیفیت تھی کہ آج بھی یاد کرتی ہوں تو آنسو خود بخود آنکھوں میں آ جاتے ہیں۔ واپس پہنچی تو آفاق ادھر بھاگ رہے تھے۔ امبر کے شوہر مسرت دوسری طرف۔ جگہ اتنی بڑی کہ بچہ تو بچہ بڑا بھی کھو جائے تو اگر اس کے پاس کوئی نشانی نہ ہو تو ملنا مشکل۔ شاید پانچ منٹ کا دورانیہ یا شاید دس منٹ کا وقت ہو گا جب ایمان نہیں ملا تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں امبر کی جیٹھانی جو آفاق کی ماموں زاد بہن بھی ہیں اپنی گود میں ایمان کو لے کر آ رہی تھیں، وہ زار و قطار رو رہا تھا۔

''ذرا آگے چلا گیا تھا، سیکیورٹی والے نے اپنے پاس کر لیا تھا۔ یہاں سے کوئی کھو نہیں سکتا، آپ لوگ بلاوجہ

پریشان ہو رہے تھے۔" شی باجی (شبانہ) نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

میں نے جو ایمان کو دیکھا جو اَب تک میں بڑی نڈر اور حوصلے سے تلاش میں مصروف تھی خود بخود رونے لگی، میں نے تو سوچوں میں کیا، کیا سوچ لیا تھا۔ دماغ آگے کے سفر پر گامزن ہو گیا تھا کہ اب تو ایمان ملے گا نہیں، یہاں کا کوئی اونٹ والا اسے گود لے لے گا، بڑا ہو کر اونٹ چلائے گا، وغیرہ وغیرہ۔ آنسو تھے کہ رک نہیں رہے تھے۔

"چلیں، چلیں آئسکریم کھائی جائے۔ پھر اچھا سا ڈنر کریں گے۔ بھئی چلتے چلتے بھوک لگ گئی ہے۔" مسرت ماحول کو ہلکا کرنے کے لیے پتا نہیں کیا، کیا بول رہے تھے۔ مگر سفر کا ایک ایسا رنگ اس دن مجھ پر آشکارا ہوا کہ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے آج بھی میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔

☆☆☆

ارے ہاں بات کا سرا تو شروع...... محسنہ آنٹی سے ہوا تھا۔ میں ان کا تعارف کرا دوں بہت معروف مصنفہ ہیں۔ انگریزی میں بھی لکھتی ہیں اور اردو میں بھی۔ ان کا تعلق اسلام آباد کے حوالے سے بہت گہرا ہے۔ ہماری امی کی اسکول کے زمانے کی دوست رفعت...... جن کا ساتھ کالج تک رہا...... اور وہ امی کے محلے میں بھی رہتی تھیں اور ان کے والد اور ہمارے نانا...... ریڈیو ہیڈ کوارٹر اسلام آباد میں جاب کرتے تھے۔ یہ محسنہ آنٹی...... رفعت آنٹی کی نند ہیں۔ امی کو اسلام آباد سے ہی جانتی تھیں۔ اب امی کی پیاری دوست رفعت آنٹی امریکا میں ہوتی ہیں...... مگر بعض دوستیاں خون کے رشتوں پر حاوی آجاتی ہیں۔ جب امی کے پاس رفعت آنٹی کا فون آجائے...... امی اتنی خوش ہوتی ہیں کہ کوئی ان کی خوشی کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتا۔ اسی طرح محسنہ آنٹی بھی امی سے بے حد محبت کرتی ہیں۔ وہ جب بھی کراچی آتی تھیں، امی کے پاس ان کا فون ضرور آتا تھا۔ ان دنوں...... وہ اب دبئی میں نہیں ہیں اور امی کے پاس ان کا فون بھی نہیں آیا ہے۔ مگر مجھے وہ دن ہمیشہ یاد رہے گا جب ایک بھرپور دن ہم نے ان کے ساتھ گزارا تھا اور ان کی پیاری، پیاری بیٹیاں خوب مزے کی باتیں کر رہی تھیں۔ پیاری آنٹی...... آپ ہمیشہ خوش رہیں۔ آپ کو واقعی دوستی نبھانی آتی ہے۔

ڈیزرٹ سفاری، ہم کھلاڑی

دبئی کی سیر میں اگر کسی نے ڈیزرٹ سفاری کی سیر نہیں کی تو گویا وہ دبئی گھوما ہی نہیں، دبئی چونکہ ریگستانی صحرائی علاقہ ہے۔ یہاں کے شیخوں نے اسے ویسے تو پورا ڈیولپ کر دیا ہے مگر اب بھی کافی حصہ ریگستانی ہے جس کو بھی انہوں نے اپنی کمائی کا ذریعہ بنا لیا ہے۔

مٹی کے ٹیلوں پر فور ویل جیپ چلتی ہیں جس میں بیٹھے ٹورسٹ ان ٹیلوں پر چڑھنے اور اوپر سے اترنے کا مزہ لیتے ہیں، کتنی ہی انڈین فلموں کی شوٹنگ اس جگہ پر ہو چکی ہے۔

اس جگہ پر جانے کے لیے کئی لائسنس یافتہ کمپنیوں کی گاڑیاں چلتی ہیں جو مطلوبہ دن سے پہلے ہی بک کرانی پڑتی ہیں۔ ان گاڑیوں کا انتظام ہمارے آنے سے پہلے ہی امبر کر چکی تھی۔ دو جیپ کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایک گاڑی بچوں کے لیے تھی اور اس گاڑی کے ڈرائیور کو خاص ہدایت تھی کہ گاڑی ذرا تیز چلانا جبکہ دوسری گاڑی میں ابو، امی، آفاق کے دوست کی فیملی موجود تھی۔ دوست کی فیملی کے ساتھ ان کی ایک کزن بھی ان کے ساتھ تھیں۔ کیونکہ وہ بھی دبئی کے دورے پر تھیں اس طرح ان کی بھی سیر ہو رہی تھی۔

میں، بچوں والی گاڑی میں بیٹھی تھی، امی والی گاڑی ہماری گاڑی کے تقریباً ساتھ ساتھ ہی چل رہی تھی مگر کچھوے کی چال سے مگر اس پر بھی امی، ابو کی شکلیں اچھی خاصی پریشان کن تھیں۔ کبھی گاڑی اونچے سے ٹیلے پر چڑھ جاتی کہ سر نیچے اور پیر اوپر محسوس ہوتے۔ پھر ڈرائیور اونچے ٹیلے سے نیچے اترتے وقت گاڑی کو اس اینگل سے اتارتا... جیسے گاڑی اب پلٹی کہ تب پلٹی۔

امی کے اوپر نظر جب بھی پڑتی تھی تو ان کی آنکھیں کس کے بند ہوتی تھیں اور وہ زیرِلب کچھ پڑھ بھی رہی ہوتی تھیں۔ درود شریف یا کلمہ وغیرہ یقیناً۔

درجنوں گاڑیاں آگے پیچھے ڈول رہی تھیں، جب گاڑی کسی مٹی کے پہاڑ پر چڑھتی تھی تو بچوں کی چیخیں ان کے ایکسائٹڈ ہونے کا اعلان کرتی تھیں پھر ایک مقام پر تمام گاڑیاں روک دی گئیں کچھ گاڑیوں کو ٹھنڈا کرنے کا ٹائم دیا گیا اور کچھ ٹورسٹ کو گرم ہونے کا۔ کیونکہ گاڑیوں کے اندر تو اے سی ایسا چلتا ہے کہ جیسے آپ ڈیپ فریزر میں بیٹھے ہوں اور اب تمام ٹورسٹ گاڑیوں سے نیچے اتر کر مٹر گشتی کر رہے تھے۔ گرم گرم لوؤں کے تھپیڑے منہ پر پڑ رہے تھے، کچھ فارنرز ٹورسٹ اس گرم مٹی پر لیٹ، لیٹ کر تصویریں بنوا رہے تھے۔ کچھ کود رہے تھے کچھ بھاگ رہے تھے یعنی ہر طرح سے اس وقت کو انجوائے کر رہے تھے۔

جب تمام گاڑیاں ٹھنڈی اور ہم اچھے خاصے گرم ہو گئے پھر اس میں سوار ہوئے تو ایک جگہ جا کر گاڑیاں پھر روک دی گئیں۔ یہ اونٹوں کا فارم تھا۔ بتایا اور دکھایا جا رہا تھا کہ کس طرح اونٹوں کی نشوونما کی جاتی ہے۔ یہ اونٹ ڈیلی ٹورسٹ کو آتا جاتا دیکھنے کے عادی تھے۔ اس لیے ہمارے آنے پر عجیب، عجیب آوازیں نکال رہے تھے۔ سلام وغیرہ ہی کر رہے ہوں شاید۔

”دیکھو، ہم آئے ہیں ناں، اس لیے ہمیں سلام کر رہا ہے۔ یہ آوازیں سلام کے لیے نکالی جاتی ہیں۔“ علی قابل بن کر ایمان کو بتا رہے تھے۔

”ابے بول تو ایسے رہا ہے جیسے کراچی کے سارے اونٹوں کا مالک ہے، یہ اونٹ سلام نہیں گالی دے رہے ہیں کہ کیوں آئے گرمی میں ہماری نیند خراب کرنے کے لیے۔“ ایمان بھی اسے کہاں چھوڑنے والا تھا۔

”میری اور نانی کی تصویریں کھینچیں امی!“ اجیہ مجھے اپنا موبائل دیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”امی یہ اونٹ کا بچہ میں لے لوں۔“ کسوٹی اونٹ کے بچے کو دیکھ کر ہڑک رہی تھیں۔ ”ہاں امی میں اس کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔ میری فرینڈز...... اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گی۔ اسی پر اسکول بھی چلی جایا کروں گی۔“ کسوٹی پروگرام بنا رہی تھی اور بچے ہنس رہے تھے۔

”اور کیا امی، لے لیجیے، وین کی فیس بھی بچے گی، بس گھر سے اس کو بٹھانے کے بعد اونٹ کو پیچھے سے ایک ہنٹر مار دیجیے گا۔ بھاگتا ہوا اسکول پہنچ جائے گا۔ واپسی پر ٹیچریں مار دیں گے۔“ اجیہ ہنستے ہوئے لقمہ دے رہی تھی۔ (مزاح لکھنے والوں کا خاندان ہے...... گھریلو بات چیت غصے میں ہو یا ہنسی میں ہوتی پُرمزاح ہی ہے)

”ہاں، ہاں بیٹا۔ اب یہی تو کام رہ گیا ہے۔ میرا۔ اونٹوں کو ماروں، گدھوں کو ماروں، تم لوگوں کے نہ کان موڑ دوں۔“ میں نے دونوں کو چپت لگاتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر اونٹوں کے خاندان کے ساتھ تصویریں بنوا کر دوبارہ گاڑیوں میں بیٹھے اور پھر چند ہی لمحوں کے بعد اس ٹرپ کے فائنل اسپاٹ پر پہنچ گئے۔ شام قریب تھی اسی لیے آہستہ، آہستہ کمپنی والوں کی تمام گاڑیاں جو یہاں چل رہی تھیں کم و بیش پندرہ بیس تو ضرور ہوں گی پہنچنا شروع ہو گئی تھیں۔ ویک اینڈ پر ٹورسٹ کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

یہاں پر مٹی میں ہیوی بائیک چلانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ آدھا گھنٹے دورانیہ کے حساب سے اچھے خاصے پیسے وصول کیے جا رہے تھے اور ہر بچہ ایک، ایک بائیک پر چڑھ گیا تھا کہ میں چلاؤں گا...... چلانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا مگر سرگوشی ضرور کی۔ ”کیا واپسی پر ابا کی ٹوپی کے چنے بکواؤ گے؟“ میں نے بچوں کو آنکھیں دکھائیں بلکہ اتنی دکھائیں...... کہ وہ اچھی خاصی ٹیڑھی ہو گئیں...... مگر بچے اس سے پہلے ہی بائیک اسٹارٹ کر کے بھگا چکے تھے۔ ”ایمان بیٹا...... تم سب سے زیادہ سمجھ دار ہو...... اور سب کو سمجھا سکتے ہو۔ بس ایک ہی بائیک پر باری، باری سب چکر لگا لو۔“

”اف...... صرف ایک بائیک...... صبح ہو جائے گی

اور سب کا نمبر بھی نہیں آئے گا۔'' ایمان نے تمسخر سے کہا۔ ''اور پیاری ماما! ہم لوگ صرف دبئی کو ہاتھ لگانے تو نہیں آئے ہیں۔''

''ارے نہیں، نہیں...... ہم تو سارا دبئی خریدیں گے...... اور پھر یہیں پھینک کر چلے جائیں گے کہ اچھا نہیں لگا...... یا یہ کراچی میں تو چلے گا ہی نہیں......'' میں نے غصے سے کہا۔ مگر کوئی میرا غصہ دیکھنے والا نہیں تھا۔

اجیہ بائیک کے دو چار راؤنڈ لگانے کے بعد بضد ہوگئی۔ ''امی اب آپ بائیک چلائیں گی۔'' اور اپنی کیپ اس نے میرے سر پر جمادی۔ پہلے تو میں نے منع کیا لیکن جب آفاق نے کہا۔ ''چلا کر تو دیکھو...... کہ تم سے چل بھی سکتی ہے یا نہیں......'' بس یہ سننا تھا کہ مجھ میں بجلی بھر گئی اور یوں بھی میں ان کی کوئی بات نہیں ٹالتی...... کہ کراچی جا کر میرا مذاق اڑانے والوں میں یہ حضرت سب سے پہلے ہوں گے...... اور یوں بھی تین پہیوں کی بائیک چلانا کون سا مشکل تھا۔ بس ذرا موڑنے کا اور کہیں گڑھے میں پھنس نہ جانے کا خیال رکھنا تھا اتنا تو ڈرائیونگ کی وجہ سے آئیڈیا تھا۔ (جی ہاں میں بہت اچھی گاڑی چلاتی ہوں مگر شادی کے بعد نہیں چلائی) بس پہلا ڈر...... بائیک پر بیٹھتے وقت ہی لگا تھا اور پھر...... تو میں تھی اور بائیک...... راؤنڈ پر راؤنڈ...... واقعی بچے ٹھیک کہہ رہے تھے کتنا مزہ آرہا ہے...... جب خود انجوائے کیا تو میں نے بھی اپنے دل میں کہا۔ اب میں یاہُو کہہ کر بائیک چلا رہی تھی بلکہ کھڑے ہو کر چلا رہی تھی۔ ہمت جو بڑھ گئی تھی۔ پھر میں نے امی...... ابو...... الیاس بھائی کی بیگم، ان کی بیٹی اور ایک رشتے دار خاتون...... اور آفاق کو بھی...... اپنی بائیک کی کمر پر بٹھایا اور خوب مہارت سے راؤنڈ لگائے۔ اور سب میرے شکر گزار ہوئے۔ حالانکہ یہ بائیک تو خود چل رہی تھی یا اڑ رہی تھی اور میں اپنے آپ کو کسی سرکس والی ہیروئن سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ آفاق کے قریب سے گزرتے ہوئے کوئی نعرہ مارتے ہوئے گزرتی اور کسی بچے کی بائیک کو ٹریس کر کے آگے نکل جاتی تو پیچھے مڑ کر اسے ایسی نظروں سے دیکھتی...... جیسے اسے ہرا دیا ہو بچے بائیک چلا کر...... اب اترنے لگے تھے۔ مگر میرا جوش و جنون کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ آفاق کے قریب سے گزری تو وہ بولے۔ ''کیا اب ناشتا پانی...... بائیک چلاتے ہوئے کرو گی۔ جیسے کہ کرتب باز کیا کرتے ہیں۔'' اور مجھے ہنسی آگئی۔ بہر حال تھوڑی سی خوشامد کے بعد اتری مگر آج بھی امی کی اس بات پر ہنسی آتی ہے جب میں نے ان سے کہا تھا۔ ''ہم لوگ ڈیزرٹ سفاری آئے ہیں اور بائیک پر نہ بیٹھے تو یہ ناراض تو نہیں ہو جائے گی۔'' میں نے امی ابو کو کہا۔

''بیٹا دیکھ لو، کہیں ٹوٹ ووٹ تو نہیں گئی، چلتے وقت عجیب، عجیب ابکائیاں لے رہی تھی یہ اسکوٹر۔'' امی نے اترتے وقت کافی پریشانی میں کہا۔ (اور لفظ ابکائیاں سن کر سب ہی کی ہنسی رکی نہیں تھی کہ واقعی اس کی آوازیں کچھ اسی نوعیت کی تھیں)

''ارے نہیں امی...... اور اگر ٹوٹ بھی گئی تو ہم نے پیسے دیے ہیں بھئی۔'' میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ مگر سب ہی ہنس رہے تھے اور بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ بائیک چلانے والے از خود ہنستے ہیں۔ (تجربہ کر کے دیکھ لیں) بائیک ایریا کے ساتھ ہی ایک ٹینٹ تھا جہاں پر بیٹھنے کا انتظام تھا شام کی چائے کے ساتھ پکوڑے، سموسے وغیرہ سرو کیے جا رہے تھے۔ یہ سب چیزیں اس ٹرپ میں شامل تھیں، اسی ٹینٹ کے ایک کونے میں ایک لڑکی مہندی لگا رہی تھی۔ ایک جگہ عبایا اور مردوں کا عربی لباس رکھا ہوا تھا۔ جس کو پہن، پہن کر ٹورسٹ تصویریں بنوا رہے تھے، خوش ہو رہے تھے۔ یعنی یہاں ریگستان میں یہ عربی اپنا ثقافت دکھا کر لوگوں کو خوش کر رہے تھے۔ فارنرز عورتیں مہندی لگوا کر ایسے خوش ہو رہی تھیں کہ پتا نہیں انہوں نے کیا پا لیا ہو۔

تھوڑی دیر کے بعد جب سب لوگ اس جگہ جمع ہو گئے اور مغرب کی نماز سے فارغ ہو گئے تو پھر اس فرشی ٹائپ جگہ پر بیٹھ کر پیر سیدھے کیے، سامنے ایک اسکرین

لگی ہوئی تھی جس پر ہمارا سارے دن کا ٹرپ دکھایا جارہا تھا۔ پتا نہیں کب بنا اور کس نے بنایا؟

''امی دیکھیں، آپ بائیک چلا رہی ہیں۔'' علی نے اسکرین پر مجھے دیکھ کر کہا۔ مجھے حیرت کے ساتھ شرمندگی بھی ہوئی کہ سب سے زیادہ بائیک چلاتے ہوئے مجھے دکھایا گیا تھا بچوں سے ریس لگاتے ہوئے بار بار دکھایا جارہا تھا۔ جسے دیکھ کر بچے ہنس رہے تھے اور مجھے برا لگ رہا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ کسی گاڑی میں ہی کیمرے ہوتے ہیں جو ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور مووی بناتے رہتے ہیں ٹرپ کے آخر میں یہ مووی بکتی ہے۔

جب قیمت پتا کی تو جس خوشی سے بھاگتے ہوئے بچے گئے تھے، اسی اسپیڈ میں دوڑتے ہوئے واپس آگئے مگر وہ اوریجنل مووی آفاق نے خرید لی تھی جسے ہم نے پاکستان میں دیکھا تو انجوائے کیا۔

مائیک پر آنے والوں کا شکریہ ادا کیا جارہا تھا اور ڈنر کے لیے بلایا جارہا تھا۔ روسٹ، دال، چائنیز، سبزی کھانوں میں ہر طرح کی چیزیں شامل تھیں۔ کیونکہ یہاں ہر طرف سے لوگ آرہے ہیں کچھ نان ویج ہیں کچھ ویج ہیں۔ ہر طرح سے لوگوں کے بارے میں سوچا جارہا تھا۔ اتنی اچھل کود کے بعد تو واقعی اب بھوک بھی چمک رہی تھی۔ سب نے خوب پیسے برابر کیے۔ پانی اور کولڈ ڈرنک کے اسٹالز الگ بنا دیے گئے تھے کہ لوگ آرام سے لے سکیں۔

''پتا نہیں کتنی دیر ہوجائے میں نے تو بیگ میں بھی کولڈ ڈرنک بھر لیں۔'' ایمان میرے کان میں منمنایا۔ (مگر مجھے یہ دیکھ کر ہنسی آئی کہ میزبانوں نے سب سیاحوں کے سامنے کولڈ ڈرنکس کے کریٹ لاکر رکھ دیے کہ پی لو یا بھر لو۔ ارے ہٹ یہاں سے، کسی نے دیکھا تو سمجھیں گے کہ اماں بچوں کو کہہ رہی ہے کہ چیزیں بیگوں میں بھرو۔'' میں نے ایمان کو اپنا غصہ دکھایا۔

''ماما...... سب سیاح دور دراز سے آئے ہیں۔ ایک شخص کا ٹکٹ ڈھائی سو درہم سے زیادہ کا ہے ان کی یہ سب میزبانی...... تو ہمارے ٹکٹس کے آگے کچھ نہیں ہے ماما۔ فکر ہی ناں کریں، میں ہوں ناں۔'' وہ شاہ رخ بننے کے موڈ میں تھا۔ ''مجھے آپ کی واپسی کی پیاس کا بھی احساس ہے۔'' اب ایمان تقریر کے موڈ میں تھا۔ جو منہ میں آرہا تھا بولے جارہا تھا کہ اچانک اعلان ہوا کہ سب اپنی جگہوں پر بیٹھ جائیں۔

''شاید زیادہ کھانا کھالیا ہے ہم نے، تبھی تو کہہ رہے ہیں کہ اب سب چھوڑو اور خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔'' میں دل میں سوچ رہی تھی کہ اچانک دبئی کے روایتی تمبورا ڈانس ہونے کا اعلان ہوا۔ دو ڈانسرز بیچ اسٹیج پر نمودار ہوئے اور میوزک شروع ہوا۔ دونوں گول، گول گھوم رہے تھے اور ان کے کپڑوں میں لائٹیں جل رہی تھیں۔ کوئی عربی دُھن بج رہی تھی جس پر وہ دونوں چکر پر چکر کاٹ رہے تھے۔ کبھی ان کے کپڑوں کی لائٹیں ہری ہوتیں، کبھی پیلی مگر ان کا گول گھومنا نہیں ختم ہورہا تھا۔ ''اللہ ان کو کیسے چکر آرہے ہیں جو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے۔'' امی کو شاید وحشت سی ہورہی تھی۔

''امی، انہیں کرنٹ لگ گیا شاید۔'' ایمان میرے کان میں بولا۔

''ارے نہیں بھئی، یہ پکے ہوتے ہیں ایسے تھوڑی لگے گا کرنٹ۔'' میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''ارے ابھی لائٹیں نیلی ہوئی تھیں۔ جب برابر والے افضال صاحب کو پانی کی موٹر سے کرنٹ لگا تھا تو وہ بھی تو نیلے ہوگئے تھے۔'' ایمان اپنے ڈرنے کی وجہ بتا رہا تھا۔

''ارے اگر لائٹیں لال ہوئیں تو کیا آدمیوں میں آگ لگ جائے گی بے وقوف...... کچھ نہیں ہورہا بس دیکھو اور انجوائے کرو۔''

کم و بیش آدھا پون گھنٹا گھوم گھوم کر جب وہ دونوں بیچارے نڈھال اور ہم سب بیزار ہوگئے تب ان کا ڈانس ختم ہوا۔ لیکن یہ ایک ایسی چیز تھی کہ جس کے دیکھنے کا مزہ رات کے اندھیرے میں دوبالا ہوگیا تھا اور اس سے قبل میں نے ایسا ڈانس نہیں دیکھا تھا۔

''بہت مزہ آرہا ہے ڈانس دیکھ کر۔'' آفاق

بچوں کو چھیڑ رہے تھے۔

”فکر مت کیجیے ماموں، آپ کے لیے بھی ایک سرپرائز ہے پھر بتائیے گا کہ کیسا لگا؟“ ڈولی آفاق کو کہہ رہی تھی۔ ہم سمجھے...... ٹکٹوں کی لاٹری کے تحت شاید کوئی انعامات ہوں گے کہ ایسا بھی کچھ سنا ہوگا۔

تھوڑی دیر بعد ایک اور ڈانس کا اعلان ہو۔ پھر سب سیدھے ہو کر بیٹھ گئے کہ اچانک ایک خوبرو دوشیزہ اسٹیج پر بھاگتی ہوئی آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں کچھ چمکیلے کپڑے وغیرہ تھے۔ چہرے مہرے سے ازبک یا روسی لگ رہی تھی۔

اس حسینۂ عالم نے دو تین ڈانس کیے جو ہوشربا ڈانس تھے کہ اللہ کی پناہ، جو زیادہ تالیاں وغیرہ بجا کر اسے داد دے رہا تھا اس کی طرف منہ کر کے وہ اور ڈانس اسٹیپ دکھا رہی تھی جو مرد آگے بیٹھے تھے ان کو اٹھا کر اسٹیج پر بھی لے جا رہی تھی۔ فارنرز خوشی خوشی اس کے ساتھ اسٹیج شیئر کر رہے تھے۔ شاید یہ گوری چمڑی والی ان ہی کے لیے ناچ رہی تھی۔ آگے کے لوگ اس کے ایک ہاتھ کے اشارے پر بھاگ کر اس کے ساتھ ناچ رہے تھے۔

”ارے کہیں آفاق کو نہ اٹھالے۔“ جب میں نے آفاق کو آگے بیٹھے ہوئے دیکھا تو ایمان کو کہا۔ لوگ بُرے مردوں سے ڈرتے ہیں اور میں اس حسینہ سے ڈر رہی تھی۔

”اچھا ہے امی اٹھالے، ہم بھی تو پاپا کا ڈانس دیکھیں، ویسے تو کبھی دکھاتے نہیں ہیں۔“ ایمان ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر اس رقاصہ نے پاپا کو اٹھنے کو کہا...تو وہ اس کو کس غصے سے منع کریں گے یا حامی بھر لیں گے۔

”ارے نہیں، جہاں سے اس ڈانسر کو داد دی جا رہی ہے وہ وہاں سے مردوں کو اٹھا رہی ہے ہماری طرف سے تو کوئی تالیاں نہیں بجا رہا۔“ میں نے اطمینانی لہجے میں کہا۔

”اچھا یہ بات ہے۔“ اور اس کے ساتھ ہی ایمان، علی، ڈولی وغیرہ زور زور سے تالیاں بجانے لگے کہ وہ آفاق کی پشت پر بیٹھے تھے۔ ان کا مقصد مجھے چڑانا تھا یا ڈرانا۔ مگر میں پریشان ضرور ہو گئی۔ ڈانسر کبھی لکڑی کی چھڑی کمر پر رکھ کر رقص کے اسٹیپ دکھاتی تو کبھی چھڑی پیٹ پر رکھ کر دُہری ہوئی جاتی تھی۔ کوئی عربی بلغمی آواز کا گانا تھا جس پر موصوفہ تھرک رہی تھیں۔ گانے میں صرف یا اللہ یا اللہ سمجھ میں آ رہا تھا اور میں یہ سوچ رہی تھی کہ پیسہ کمانے کے لیے...... فن کے نام پر کہاں تک خواتین جا سکتی ہیں۔

جب کافی دیر بعد رقاصہ پسینوں سے اور ہم سب شرم سے پانی پانی ہو گئے تب کہیں جا کر رقص کا اختتام ہوا اور واقعی ایسا لگا جیسے کوئی بھیانک منظر اپنے اختتام کو پہنچا۔

مائیک پر اجازت چاہی جا رہی تھی۔ تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا جا رہا تھا۔ مگر ہمارے پیر تھے کہ دو، دو من وزنی ہو چکے تھے۔ کافی لوگ تو اب بھی حیران پریشان اور منہ کھولے بیٹھے تھے کہ یہ ہوا کیا؟

خیر بھئی دبئی کا ایک ہیجان انگیز دن اپنے اختتام کو پہنچا جہاں ہم سب ایک دوسرے سے نظریں تک نہیں ملا پا رہے تھے۔

میں نے سوچا۔ امی سے پوچھوں کہ آپ کو یہ ڈانس کیسا لگا؟ تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی...... امی تو تھیں ہی نہیں۔ سوچا ابو سے پوچھوں۔ گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ تو وہ بھی وہاں نہیں تھے۔ شاید دورانِ ڈانس ہی وہ دونوں اٹھ کر باہر چلے گئے تھے۔

اور اب مجھے پریشانی ہو رہی تھی کہ وہ کہاں گئے ہیں۔ تب آفاق نے مجھے بتایا”ابو اور امی...... باہر ٹھنڈی، ٹھنڈی ریت پر واک کر رہے ہیں۔“

تب سرعت سے باہر آئی تو دیکھا امی، ابو کی طرح اور بھی بہت سے جوڑے چاندنی رات کا لطف اٹھا رہے تھے اور کافی کا مگ ہاتھ میں تھامے واک کر رہے تھے اور انجوائے بھی...... تب میں نے اطمینان کی سانس لی۔

(باقی آئندہ ماہ، انشاءاللہ)

نئے سال کے نئے خواب ہیں
نئے موسموں کے گلاب ہیں

شائستہ زریں



قارئین کرام! السلام علیکم
دسمبر ۲۰۱۴ء کے شمارے میں ہم نے گزرتے ہوئے مہ وسال کے پیغام اور ۲۰۱۴ء میں سرزد ہونے والی غلطیوں اور کوتاہیوں کے حوالے سے ایک سروے رپورٹ ترتیب دی تھی۔ ہمیں خوشی ہے کہ سروے کے شرکا نے اگر بڑی سچائی سے ہمارے سوالوں کے جواب دیے تو قارئین کی جانب سے بھی پسندیدگی کی سند ملی۔ بلاشبہ ہر جانے والا سال آنے والے سال کی نوید دیتا ہے اور آنے والا سال ہمارے لیے کوئی نہ کوئی پیغام اپنے ہمراہ لے کر آتا ہے اور سال گزشتہ کا جائزہ لیتے ہوئے، اس کے تجربات کے تحت ہم اپنی زندگی میں کسی ایسی تبدیلی کے آرزومند بھی ہوتے ہیں جو ہمارے حال ہی نہیں مستقبل کے لیے بھی سودمند ہو۔ اسی خیال کے پیش نظر ہم نے سوچا کہ کیوں نہ جنوری ۲۰۱۵ء کا سروے دسمبر ۲۰۱۴ء کا تسلسل ہو۔ اپنے خیال کو عملی تشکیل دیتے ہوئے ہم نے یہ سروے رپورٹ ترتیب دی اور سروے کے شرکا سے معلوم کیا کہ......

۱: ہر نیا آنے والا سال ہمارے لیے کیا پیغام لے کر آتا ہے؟

۲: ۲۰۱۵ء میں اپنی زندگی میں کون سی اہم اور بڑی تبدیلی کی خواہش ہے؟

اس سروے میں التزام ہم نے یہ رکھا ہے کہ صرف نئی نسل کے نمائندوں کو شامل کیا ہے۔



صبا رئیس

صبا رئیس
(عالمہ)

۱: ہر نیا سال یہ پکارتا ہے کہ زندگی کا ایک اور سال کم ہو گیا، نیک عمل میں جلدی کرو، نبی کریم ﷺ کا پیغام عام کرو اور خود بھی اس پر عمل کرو۔ اپنے رب کو راضی کر لو کہیں یہ تمہاری زندگی کا آخری سال نہ ہو۔

۲: ۲۰۱۵ء کے آخر تک انشاء اللہ خواتین کے شرعی مسائل کے حوالے سے کتاب لکھ رہی ہوں شائع کرواؤں گی اور ڈاکٹر فریدہ احمد کے ایصال ثواب کے لیے کتاب لکھ رہی ہوں وہ بھی شائع کرواؤں گی۔ معلّمہ کے قلم سے مصنفہ کے قلم تک کا سفر، ہے ناں ایک بڑی، اہم اور خوشگوار تبدیلی۔ اللہ مجھے میرے نیک مقصد میں کامیاب کرے، آمین!


تابش صبیح


سونیا ممتاز


ایم حامد

تابش صبیح

(طالب علم جامعہ کراچی، نعت خواں)

۱: ایک سال اور تمہارے ہاتھوں سے رخصت ہوچکا اور زندگی بہت مختصر ہے۔

۲: ایک مقدس ترین زبان جس میں قرآن حکیم اتارا گیا یعنی عربی زبان پر کم از کم اس حد تک تو مہارت حاصل کرلوں کہ جب میرے سامنے قرآن حکیم پڑھا جائے تو میں اسے سمجھنے کے قابل ہو جاؤں۔ عربی زبان سے میری یہی لگن اور تڑپ اور قرآن حکیم کا پیغام سمجھنے اور پھر اس پر عمل کرنے سے بڑی تبدیلی اور کیا ہوسکتی ہے! جو میری خواہش ہے۔

سونیا ممتاز

(سوشل ورکر)

۱: گئے وقت کی قدر کرو، اوروں کی مدد کرو، اپنے رویوں اور اعمال سے ایسی مثال چھوڑ جاؤ کہ آئندہ آنے والے برسوں میں بھی لوگ یاد رکھیں۔

۲: جو غلطیاں ۲۰۱۴ء میں کرچکی ہوں جانے انجانے میں ۲۰۱۵ء میں ان کو نہیں دُہراؤں۔ مجھے پوری دنیا گھومنے کا شوق ہے۔ پوری دنیا نہ سہی ایشیائی ممالک کی سیاحت کے لیے جانا چاہتی ہوں۔ ممکن ہے سیاحت کے دوران ہونے والے تجربات سے میری زندگی میں اہم اور مثبت تبدیلی آجائے۔

ایم حامد

(تھیٹر آرٹسٹ، کامیڈین)

۱: "نیا سال کوئی خاص پیغام لے کر نہیں آتا۔" یہ جواب اکثر "ذہین" لوگ دیتے سنائی دیتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ نیا سال ۳۶۵ نئے پیغامات کے ساتھ شروع ہوتا ہے ہر دن ایک نیا پیغام۔ یوں سمجھ لیجیے ہر آنے والا دن گزرے ہوئے دن کی غلطیوں کی نشاندہی اور ان غلطیوں کو سدھارنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ سمجھدار لوگ گزرتے لمحوں سے حاصل ہونے والے پیغامات کو سمجھ کر اپنی غلطیوں کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یوں وہ اپنا ہر نیا سال گزرتے سال کے مقابلے میں مزید بہتر اور روشن بنانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

۲: تعلیم حاصل کرنا چاہوں گا کیونکہ تعلیم ہی میری زندگی میں تبدیلی لاسکتی ہے۔ مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر میں نے وقت پر تعلیم حاصل کی ہوتی تو شاید آج معاشرے میں بہتر مقام جلد حاصل کرلیتا بغیر تعلیم کے دنیا میں کسی بھی اچھے مقام تک نہیں پہنچا جاسکتا۔

آصف الیاس

(آرٹ ٹیچر، اسکرپٹ رائٹر)

۱: ہر نیا سال کامیابی کی امید کا پیغام لاتا ہے۔


مدثر نور خان


نہاں کمال


آصف الیاس

۲: بہنوں کی شادی کردوں تاکہ اپنی شادی کر سکوں۔ ہے ناں اہم بڑی اور خوشگوار تبدیلی!

نہاں کمال
(اسکوائش پلیئر)

۱: مستقبل کی منصوبہ بندی، نئی امیدوں، نئے ارادوں اور بہتر سے بہتر کرنے کے نئے جذبے اور ناممکن کو ممکن بنانے کے جوش وجذبے کا پیغام لاتا ہے۔

۲: ۲۰۱۵ء میں اہم اور بڑی تبدیلی میں اپنی تعلیم اور سپورٹس کے حوالے سے دیکھ رہی ہوں۔ انشاء اللہ تعلیم مکمل کرنے کے ساتھ، ساتھ اپنا اسکوائش کا پروفیشن شروع کروں گی۔

مدثر نور خان
(طالب علم سرسید یونیورسٹی)

۱: سچ تو یہ ہے کہ ہر نیا آنے والا سال ہمارے لیے امن وسلامتی اور پیار ومحبت کا پیغام لاتا ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ ہر نئے سال ہم گزشتہ برس سے زیادہ مشکلات اور پریشانیوں میں الجھ جاتے ہیں، اس سے نجات کا بہترین ذریعہ یہی ہے کہ ہم علامہ اقبال کے اس پیغام

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیں، تب ہی نئے سال کا امن وسلامتی اور پیار ومحبت کا پیغام مؤثر ثابت ہوگا۔

۲: میرے والدین نے جس طرح بہت محنت اور محبت سے ہماری پرورش اور تربیت کی ہے۔ ہمیں اعلیٰ تعلیم دلائی ہے اور اس مقام تک پہنچایا ہے اسی طرح میرا بھی دل چاہتا ہے۔

میں خود سے وابستہ اپنے والدین کی ہر خواہش پوری کروں، نہایت ذمے داری اور سنجیدگی کے ساتھ۔

آمنہ امام
(طالبہ بی ایس، آئی بی اے)

۱: ہر نیا آنے والا سال ہمیں ایک نئے آغاز کا موقع دیتا ہے حالانکہ ہماری زندگی میں نیا کچھ بھی نہیں ہوتا وہی لوگ، وہی عادتیں، وہی ماحول صرف پرانے کی جگہ نیا کیلنڈر آجاتا ہے۔ پھر بھی نئے سال کی صبح کو ہم ایک الگ ہی انداز سے دیکھتے ہیں کہ نیا سال ساتھ امید کی ایک کرن لاتا ہے، ہمارے اندر کچھ نیا کرنے کی نئی جستجو پیدا کرتا ہے۔ ایک انقلاب برپا کرتا ہے زندگی میں مثبت تبدیلی لانے کے لیے۔

۲: ۲۰۱۵ء میں، میں کچھ سیکھ پاؤں اور اوروں کے کام آسکوں۔ آج کل ہمارے معاشرے میں انتہا پسندی، خون خرابہ اور لوٹ مار کی تاریکی کا راج ہے اور اس آفت کی پرکالہ سے بچنے کے لیے سب ہی کوششیں کررہے ہیں۔ میں چاہتی ہوں مجھے ایسا کوئی موقع مل جائے کہ میں ان معاشرتی خرابیوں کو دور کرسکوں اور یہ جب ہی ممکن ہے جب ہماری سوچ آزاد ہوگی، میری خواہش ہے کہ بچے جو ہمارا مستقبل ہیں ان کو بتا سکوں ہماری زندگی میں برداشت بہت


آمنہ امام


فہیم خان


کلثوم عباس

اہم ہے۔ اگر اپنی زندگی کی بڑی تبدیلی کی وجہ سے میں اپنے ساتھ، ساتھ اوروں کی زندگی بھی سنوار دوں تو میری اس تبدیلی کا کوئی فائدہ بھی ہوگا۔

فہیم خان

(طالب علم اقراء یونیورسٹی)

۱: ہر نیا آنے والا سال ہمارے لیے محبت اور یکجہتی کا پیغام لاتا ہے اور ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ ساری پرانی غلطیوں کو بھلا کر نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کریں۔

۲: میں بس یہ تبدیلی چاہتا ہوں کہ ۲۰۱۵ء میں جو پلان میں نے اپنی زندگی کے لیے بنائے ہیں ان پر عمل کرسکوں اور ایسا انسان بن سکوں جو صرف اپنی ہی بھلائی نہ چاہے بلکہ اپنے ملک اور لوگوں کی بھلائی کے لیے بھی کچھ کرسکے۔

کلثوم عباس

(طالبہ جامعہ کراچی)

1: ظاہری بات ہے ہر کوئی اپنے آنے والے اچھے وقت کا منتظر اور خواہاں ہوتا ہے۔ اس کا مزہ دوبالا تب ہوتا ہے کہ جب نیا سال خوشی کا پیغام لے کر آئے لیکن اس کے ساتھ، ساتھ ہمیں اپنے پچھلے سال کی کوتاہیوں کو نہیں بھولنا چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ آئندہ سال ایسی غلطی دوبارہ سرزد نہ ہو۔ ہماری دعا ہے کہ ہر نیا آنے والا سال پاکستان کے لیے خوش آئند ثابت ہو۔ پاکستان زندہ باد!

۲: خواہشات کی فہرست تو نہ ختم ہونے والی ہے۔ ہر خواہش ایک سے بڑھ کر ایک ہے اور یہ بھی ایک خواہش ہے کہ تمام خواہشات تکمیل کو پہنچیں انشاءاللہ اگر اللہ کی رضا ہوئی تو مقاماتِ مقدسہ کی زیارت اور حجِ بیت اللہ کی ادائیگی کی نعمت سے سرفراز ہونے کی تمنا ہے۔

سیدہ وجیہہ

(نعت خواں، طالبہ سرسید گرلز کالج)

۱: یہی پیغام لاتا ہے کہ گزرے ہوئے سال میں ہم نے اپنی آخرت کے لیے کیا، کیا؟ ہر نیا سال ہمیں بتا رہا ہے کہ زندگی جس تیزی سے گزر رہی ہے اسی حساب سے اپنی موت کو یاد رکھ کر آخرت کی تیاری کرنی چاہیے اور یہی دنیا و آخرت میں ہماری بڑی کامیابی ہے۔

۲: میری دعا ہے کہ ۲۰۱۵ء میں اللہ تعالیٰ کی مجھ پر ایسی عنایت ہو جائے کہ میں اپنے اندر اوروں کے کام آنے کا، ان کا خیال رکھنے کا جو جذبہ رکھتی ہوں اس کا عملی مظاہرہ بھی کرسکوں۔

سید اسامہ علی

(کمپیوٹر انجینئر، آئی ٹی کنسلٹنٹ)

۱: ہر نیا آنے والا سال ایک نئی امید اور جدوجہد .... کا پیغام لے کر آتا ہے۔ خاص کر نوجوانوں کے لیے کہ وہ اپنے ایک بہتر مستقبل اور زندگی کے لیے





مزید محنت کریں اور کوشش کریں کہ جیسے بھی ممکن ہو سکے اوروں کے کام آئیں۔
۲: ۲۰۱۴ء میں میں نے بہت سی نئی چیزیں سیکھیں اور اپنے کام کے سلسلے میں بیرونِ ملک سفر بھی کیا وہاں سے بھی میں نے بہت سی اچھی چیزیں سیکھیں ۲۰۱۵ء میں اپنی اس جدو جہد کو پایہ تکمیل تک پہنچاؤں گا، انشاء اللہ!

سیدہ وجیہہ

قارئین کرام!
کیسی خوشی کی بات ہے کہ سروے کے تمام شرکا کی رائے کے مطابق ہر نیا آنے والا سال امن و آشتی، محبت، یکجہتی کا پیغام دیتا ہے، اس پیغام میں ذہنی بیداری اور قوتِ عمل کو شامل کر لیں کہ یہ تمام امور یکجا ہو جائیں تو کسی بھی ملک وقوم اور سب سے بڑھ کر انسانی فلاح و بقا کی ضمانت بن جاتے ہیں۔ نئے سال کے آغاز ہی سے
گئے دنوں کی باتیں بھلا کر
نئے سال میں محبتوں کا نصاب لکھنا
کے مؤثر پیغام پر عمل کر لیا جائے تو سکھ چین، امن و امان سے فضائیں منور و معطر ہو جائیں۔ یقیناً اس کے خوشگوار اثرات ہماری زندگی پر بھی مرتب ہوں گے اور یوں بھی تو ہوتا ہے ناں کہ ہمارے عمل میں آنے والی مثبت تبدیلی ہماری شخصیت ہی نہیں زندگی میں بھی دھنک رنگ بھر دیتی ہے لیکن اس کے لیے ضرورت ہے اخلاصِ نیت اور اخلاصِ عمل کی، جذبۂ دروں اور کاوشِ پیہم کی اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ جب اس سوچ کو حرزِ جاں بنا لیا جائے کہ
تو نیا ہے تو دکھا صبح نئی، شام نئی

سید اسامہ علی

ورنہ ان آنکھوں نے دیکھے ہیں نئے سال کئی
ہمارے لیے بڑے فخر اور انبساط کی بات ہے کہ ہماری نوجوان نسل اس طرز پر نہ صرف سوچتی بلکہ عمل بھی کرتی ہے۔ ہمارے نوجوان، انسان اور انسانیت کی بھلائی کے لیے اپنی زندگی میں تبدیلی کے آرزومند ہیں اور خود سے بڑھ کر اوروں کے لیے سوچتے ہیں بے شک ...
ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا
اوروں کے لیے اچھا سوچنے اور ان کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ رکھنے والی ہماری نوجوان نسل ہمارے لیے بہت قابلِ احترام ہے۔ ہمارا فخر ہی نہیں سرمایہ بھی ہے۔ دلی دعا ہے کہ اپنی زندگی میں مثبت تبدیلی کے جو خواب ان نوجوانوں نے دیکھے ہیں اس کی روشن تعبیر بھی دیکھیں، آمین
میری اور ادارۂ پاکیزہ کی جانب سے نیا عیسوی سال مبارک ہو۔ اس پُر مسرت موقع پر دعاؤں کی سوغات پیشِ خدمت ہے۔
یہ سال تیرے واسطے خوشیوں کا نگر ہو
کیا خوب ہر روز تیری عید اگر ہو
یہ رات مسرت کے نئے گیت سنائے
لمحات کے پیڑوں پہ بھی شبنم کا ثمر ہو
آمین

☆☆☆☆



صحرا میں میڈیکل کیمپ

زاہدہ پروین

دن بھر کی مصروفیت کے بعد تھکی ہاری رات گیارہ بجے سونے کے لیے لیٹی ہی تھی کہ موبائل بج اٹھا۔ ''اُف اتنی رات کو کس کا فون آ گیا؟'' بیزاری سے اسکرین کو دیکھا...... کوئی انجانا نمبر تھا، لیٹے، لیٹے آنکھیں موندے ہیلو کہا مگر دوسری طرف کی بات سن کر نہ صرف آنکھیں پٹ سے کھل گئیں بلکہ ہاتھوں کے طوطے مینا، چڑیاں بھی اڑ گئیں۔

''ای ڈی او آفس سے بات کر رہا ہوں، صبح آپ نے چولستان جانا ہے۔ میڈیکل ٹیم کے ہمراہ...... ساڑھے چھ بجے تک ای ڈی او آفس پہنچ جائیں۔ ٹھیک ہے؟''

''جی......'' بہ مشکل کہا اور فون بند کر دیا۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے تو ڈاکٹرز کی ٹیم چولستان گئی تھی۔ جس میں میری ساتھی ڈاکٹر نائلہ بھی شامل تھی اور اس نے چولستان کا اتنا ہولناک نقشہ کھینچا تھا اور اس کا بیان تھا کہ'' آئندہ مجھے چولستان جانے کو کہا تو میں نوکری چھوڑ دوں گی مگر وہاں نہیں جاؤں گی۔'' مگر حکمِ حاکم' جانا ضروری تھا۔ میاں جی نے حوصلہ بڑھایا۔

''ابھی اتنے کام ہیں کرنے والے۔'' ہم نے روتے ہوئے کہا۔

''آؤ مل کر کر لیتے ہیں۔'' وہ میرے ساتھ کچن میں گھسے۔ میں نے بھی اپنے آپ کو سمجھا لیا۔ ''نوکر کیا تو نخرہ کیا۔''

رات ایک بجے بچوں کے اور اپنے ضروری کام نمٹا کر سونے کے لیے لیٹی مگر صبح کی متوقع پریشانی سے نیند ہی اُڑ گئی تھی۔ بہ مشکل نیند آئی اور خواب میں بھی میں ای ڈی او آفس میں ہی پھرتی رہی۔ صبح چھ بجے آنکھ کھلی۔ ''اٹھیں۔'' میں نے میاں جی جھنجوڑا...... ''دیر ہو رہی ہے۔''

نماز پڑھ کر آیت الکرسی پڑھ کر سب بچوں پر دم کیا (نہ جانے کب واپس آنا نصیب ہو) اللہ سے خیر کی دعا کی۔ ناشتا بنایا مگر کچھ کھانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ صرف چائے پی اور سلائس، انڈا ساتھ رکھ لیا۔ تقریباً ساڑھے چھ بجے گھر سے نکلے۔ راستے سے بسکٹ، ٹافیاں اور پانی کی بوتل خریدی اور دس منٹ بعد ہم ای ڈی او آفس میں موجود تھے مگر وہاں تو کسی ہلچل کے آثار ہی نہیں تھے۔ ایک چوکیدار بیٹھا ہوا تھا۔

''ہم لیٹ ہو گئے ہیں، سب نکل گئے ہوں گے۔''

پہلا سوال یہی ذہن میں آیا۔ چوکیدار سے پوچھا تو وہ حیران ہوا۔ ''کون سی میڈیکل ٹیم؟ یہاں تو کوئی نہیں آیا......''

بہرحال اس نے ای ڈی او صاحب کا آفس کھول دیا کہ یہاں بیٹھ کر انتظار کریں۔ میاں جی رخصت ہوئے اور ہم نے تسلی سے آفس کا جائزہ لیا۔ گاہے بگاہے گھڑی پر نظر ڈال لیتے۔

''کیا پتا کسی نے مذاق کیا ہو؟''

آخر سوا سات بجے ایک اور گاڑی آئی جس میں سے ایک ڈاکٹر صاحبہ...... (میری طرح پریشانی میں گھری) برآمد ہوئیں۔ انہیں بھی چوکیدار نے آفس میں بٹھا دیا۔ علیک

سلیک کے بعد علم ہوا کہ وہ تو مجھ سے بھی زیادہ مظلوم ہیں۔ انہیں تو آج صبح ساڑھے چھ بجے فون آیا کہ 7 بجے تک ای ڈی او آفس پہنچیں، چولستان جانا ہے۔ یہ ڈاکٹر نویدہ تھیں۔ پھر باری باری اور ڈاکٹر آتے گئے۔ یہاں تک کہ کمرا چھوٹا لگنے لگا۔ ڈاکٹر عائشہ چھٹی لے کر بہاول نگر گئی ہوئی تھیں۔ انہیں کل شام کو فون کیا گیا کہ آج کی چھٹی کینسل ہے۔ صبح ای ڈی او آفس پہنچیں۔ سب کی دکھی داستان سن کر دل کو ڈھارس ہوئی کہ صرف ہم پر ظلم نہیں ہوا۔ پر سمجھ نہ آئی کہ چولستان میں ایسی کیا ایمر جنسی ہو گئی ہے کہ راتوں رات میڈیکل ٹیم تشکیل دی جا رہی ہے؟ یہ سوال، سوال ہی رہا۔ آٹھ بجے ای ڈی او صاحب تشریف لائے۔ مختصر سا خطاب فرمایا پھر گاڑیاں تیار کرنے کی ہدایت دی۔ پتا چلا کہ تین پارٹیاں بنیں گی اور مختلف جگہوں پر جائیں گی۔ خدا، خدا کر کے نو بجے گاڑیوں میں بیٹھے میرے ساتھ ڈاکٹر نویدہ، ڈاکٹر منزہ اور ڈاکٹر گل تھیں۔ اگلی گاڑیوں میں پانچ اور ڈاکٹرز اور پیچھے سی، ایم، ایچ کی دو گاڑیاں مع عملے کے۔ سفر کی دعائیں پڑھ لیں، قل پڑھ لیے مگر گاڑیاں وہیں کی وہیں...... ''بھئی چل کیوں نہیں رہے؟''

''سیکرٹری صاحب آ رہے ہیں، وہ خود آپ لوگوں کو رخصت کریں گے۔'' واہ جی عزت افزائی۔

''کسی بیکری پر رکیے گا کچھ کھانے، پینے کو لے لیں۔'' ڈاکٹر منزہ نے ڈرائیور سے کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ای ڈی او صاحب کہہ رہے تھے کہ وہاں کھانا، چائے سب ملے گا۔''

ہمارے منہ میں متوقع ضیافت کا سوچ کر پانی بھر آیا۔

آخر کار ساڑھے نو بجے ہمارا قافلہ روانہ ہوا۔ ڈرائیور سے بات چیت ہوئی تو پتا چلا کہ یہ گاڑی اور ڈرائیور محکمۂ تحفظِ جنگلی حیات کے ہیں (اُف محکمۂ صحت کی غربت) ڈرائیور بھی ناراض تھا کہ راتوں رات ایسا پروگرام بنانے کی کیا تک تھی۔ سارا قصور میڈیا کا ہے۔'' اس نے گویا حتمی فیصلہ دیا...... ''قحط تھر میں ہے، اس کی فکر کریں، چولستان میں تو حالات کافی بہتر ہیں۔ یہاں تو دبئی والوں نے کافی دور تک پانی کے پائپ بچھائے ہیں۔'' ہم اس کے ارشادات سنتے رہے۔

گاڑی تقریباً ایک گھنٹا پختہ سڑک پر رواں دواں رہی پھر موج گڑھ کا بورڈ نظر آیا اور سڑک کو چھوڑ کر ہم دائیں ہاتھ ریت پر اتر آئے۔ ''تو یہ ہے چولستان......'' ہم نے تا حد نگاہ پھیلے ریت کے ٹیلوں کو دیکھ کر سوچا۔ جن پر جا بجا خشک جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ''تھر میں یہ جھاڑیاں بھی نہیں ہیں، بہت خشک صحرا ہے۔'' ڈاکٹر منزہ سندھ میں کام کر چکی تھیں۔ انہوں نے بتایا۔ ہمارا سفر ریت پر جاری تھا۔ جب انکشاف ہوا کہ فون کے سگنل نہیں آ رہے۔ ہم چاروں نے اپنے، اپنے فون چیک کیے اور پریشانی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہم دنیا سے کٹ گئے ہیں۔ ایک تکلیف دہ سوچ ابھری...... اور ڈاکٹر نائلہ کا جملہ یاد آیا'' وہاں تو آپ گم جائیں، مر جائیں تو کسی کو پتا نہیں چلے گا'' اس خیال سے ہی جھرجھری لی اور اللہ کی رحمت کی دعا کی۔

ریت پر ہمارا یہ سفر مختصر رہا اور آدھے، پونے گھنٹے بعد ہی آبادی کے آثار نظر آئے۔ یہ موج گڑھ تھا اور سب سے نمایاں چیز موج گڑھ کا قلعہ تھا مگر مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے بری حالت تھی۔ میاں جی کی نصیحت یاد آئی اور جھٹ تصاویر بنائیں۔ اب موبائل اسی کام تو آنا تھا۔ ایک سرکاری اسکول نظر آیا اور ساتھ ہی رینجرز کا پڑاؤ بھی...... ہمارا بھی وہیں پڑاؤ تھا۔ دو کمرے، ایک باتھ روم اور سامنے برآمدہ...... ''چائے پئیں گی؟'' ایک اہلکار نے آدابِ میزبانی نبھائے۔ ''جی بالکل!'' ہم نے تکلفاً بھی انکار نہ کیا آخر ہمارا ٹی بریک کا ٹائم تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر ہم چائے کے انتظار میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ جب باہر سے ڈاکٹر صاحب نے پکارا۔ ''میڈم آجائیں، آگے بہت سفر ہے۔'' یہ ڈاکٹر صاحب ہم سے اگلی گاڑی میں تھے اور آج کی مہم کے انچارج بھی...... ''سر چائے تو پینے دیں۔'' ہم منمنائے۔

''نہیں رہنے دیں، جلدی چلیں۔'' بادلِ نخواستہ اٹھے اور دوبارہ گاڑی میں آ بیٹھے۔ ہم تو یہ سوچ کر خوش تھے کہ یہیں موج گڑھ میں ہی میڈیکل کیمپ لگا کر موج کریں گے مگر بار، بار ڈاکٹر صاحب کا فقرہ...... ''آگے بہت سفر ہے......'' ذہن میں گونج رہا تھا۔ ذرا آگے بڑھے تو پورا گاؤں آباد تھا۔ ہم گاؤں میں رکے بغیر آگے بڑھتے گئے۔ اب دھوپ تیز ہو رہی تھی۔ ہم پانی کے پائپ کے متوازی چل رہے تھے جو زیرِ زمین بچھائے گئے تھے اور صحرا میں کافی دور تک چلے گئے تھے۔ وقفے، وقفے سے بورڈ نصب کر کے وہاں پائپ کی لمبائی اور چوڑائی ظاہر کی ہوئی تھی۔

''کیا واقعی ابھی بہت سفر ہے؟'' ڈرائیور سے پوچھا۔
''نہیں میڈم، تھوڑا سا فاصلہ ہے۔ ڈرائیور نے تسلی دی۔ وہ پہلے بھی یہاں آ چکا تھا۔ ''اسی صحرا کی سرحد بھارت سے ملتی ہے اور اس طرف اس کا نام راجستھان ہے۔'' اس نے ہماری معلومات میں اضافہ کیا۔ ''مگر وہ بہتر حالت میں ہے کیونکہ بھارت میں ڈیمز کی وجہ سے پانی کا اتنا مسئلہ نہیں ہے۔''
''اللہ ہمارے حکمرانوں کو بھی ڈیم بنانے کی توفیق دے۔'' دل سے دعا نکلی۔

گاہے بگاہے جانوروں کے لیے بنے ہوئے بڑے، بڑے شیڈ نظر آ جاتے۔ ''ارے وہ دیکھو...... اتنا پانی۔'' ڈاکٹر گل نے اشارہ کیا۔ دیکھا تو واقعی دور چمکتا ہوا پانی نظر آیا...... ''یہ تو سراب ہے۔'' ہم نے اس پانی کو اپنے سے فاصلہ قائم رکھتے ہوئے دیکھا تو سمجھ آئی...... ''ہم واقعی صحرا میں ہیں۔ اگر یہاں کوئی بھٹک جائے تو......'' آگے سوچا ہی نہ گیا اور سوچوں کو ایک جھٹکے کے ساتھ بریک لگے کیونکہ ہماری گاڑی ریت میں دھنس گئی تھی اور چلنے سے انکاری تھی۔
''آپ لوگ نیچے اتر جائیں۔'' قدم نیچے اتارے اور ایک دم اٹھا لیے۔ ''اُف......'' تپتی ہوئی ریت جوتوں میں گھس رہی تھی۔ بہ مشکل ریت میں ڈولتے ذرا فاصلے پر جا کر کھڑے ہوئے۔ پیچھے آنے والی آرمی کی گاڑیاں اور اگلی ڈاکٹر صاحبان کی گاڑی بھی رک گئیں۔ شرمندگی ہوئی، کیا یہ گاڑی اتنی ہی ناکارہ تھی کہ صنفِ نازک کا بوجھ نہ سہار سکی۔ بہرحال ہمتِ مرداں (ڈاکٹران و فوجی صاحبان) مددِ خدا...... تھوڑی تگ و دو کے بعد ہم دوبارہ عازمِ سفر تھے۔ حدت بڑھ گئی تھی۔ بوتلوں میں موجود پانی گرم ہو گیا تھا۔ ہماری باتیں بھی ختم ہو گئی تھیں مگر سفر ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ سب اپنی، اپنی جگہ خاموش تھے۔ تاحدِ نگاہ پھیلا صحرا کہیں، کہیں خشک جھاڑیاں، دھوپ برساتا سورج اور دور دور چمکتا سراب...... ''کیا یہ سفر بھی ختم ہوگا؟''

''آخر ہم نے جانا کہاں ہے؟'' تنگ آ کر ڈرائیور سے سوال کیا۔
''طوفانی ٹوبا......''
''ٹوبا''...... پانی کے ذخیرے کو کہتے ہیں۔ یہاں بارش کا پانی جمع ہوتا ہے اسی سے انسان اور جانوروں کی ضرورت پوری ہوتی ہے۔ میلوں کے سفر کے بعد چند جھونپڑیوں پر مشتمل آبادی نظر آتی تو امید بندھتی کہ شاید یہی ہماری منزل ہے مگر افسوس...... ہم آگے بڑھ جاتے۔
''بھائی...... کیا ہمیں بارڈر پر لے کر جانا ہے؟'' ڈاکٹر منزہ کے استفسار پر لبوں پر مسکراہٹ دوڑی۔
''نہیں میڈم، اس سے پہلے ہی رک جائیں گے۔'' ہر گزرتے ٹوبے پر سوال کرتے۔ ''کیا یہی طوفانی ٹوبا ہے؟'' اور نفی میں جواب پاتے۔ تھک ہار کر اپنے آپ کو حالات کے سپرد کر دیا۔ پریشان ہونے سے فائدہ......؟ جو ہونا ہے ہو جائے گا...... پیچھے گھر کی بھی فکر تھی۔ نہ جانے بچوں نے کھانا کھایا ہوگا یا نہیں...... اور کب ان سے ملنا نصیب ہو...... اتنا ہی لمبا سفر واپسی پر بھی تو طے کرنا تھا۔ رات ہی ہو جائے گی۔ گاڑی میں موجود پانچوں نفوس سوچوں میں گم، چپ چاپ بیٹھے تھے۔ جب ہم نے اگلی گاڑی کو رکتے دیکھا۔
''طوفانی ٹوبا آ گیا۔'' خوشی سے اعلان کیا، تھکے ہوئے چہروں پر رونق آئی۔ وہاں گنتی کی چند جھونپڑیاں تھیں جو ایک دوسرے سے قدرے فاصلے پر تھیں ان سب میں مشترکہ چیز ان کے مویشی تھے جو ہر جھونپڑی کے باہر بندھے ہوئے تھے اور سب مویشی کافی کمزور اور نڈھال بیٹھے تھے۔ ان کو دیکھ کر افسوس ہوا۔

ہم گاڑی سے اترے اور متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''بھئی ہمارا میڈیکل کیمپ کہاں لگے گا؟'' ہم کرسی میز کا انتظار کرتے رہے اور ڈاکٹر صاحب نے حکم دیا کہ اندر گھروں میں خواتین سے ملیں اور ادویات فراہم کریں...... نہایت بے تکلفی سے ان کے ساتھ نیچے بچھی دری پر بیٹھے اور جھٹ پانی کی فرمائش کی مگر پانی دیکھ کر اپنی فرمائش پر افسوس ہوا۔ ''اتنا گدلا پانی......'' ہم نے ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھا۔ ''اب کیا کریں؟'' نہ اسے پی سکتے تھے نہ واپس کر سکتے تھے کہ ان کا دل ٹوٹ جاتا جو اتنے خلوص سے جگ میں پانی ڈال کر پیش کر رہے تھے۔ پھر ڈاکٹر گل نے مسئلے کا حل نکالا۔ ''بھئی پانی رہنے دیں، ہمیں تو دودھ پلائیں۔'' اور ان مہمان نواز خواتین نے جھٹ پٹ نہایت لذیذ اور خالص دودھ پیش کر دیا۔ پھر بیماریوں کا پوچھا تو پتا چلا۔ ''یہاں تو کوئی بیمار نہیں ہے۔''
ہم نے ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آخر ڈاکٹر گل نے معاملہ سنبھالا۔ انہوں نے پانی

صاف کرنے والی دوا کے پیکٹ نکالے اور خواتین کو سمجھایا کہ اس سے پانی کیسے صاف کرنا ہے پھر عمل کر کے دکھایا۔ وہی گدلے پانی والا جگ لیا اس میں ایک پیکٹ ڈالا اور رکھ چھوڑا کچھ دیر بعد ساری مٹی اور گند نیچے بیٹھ چکا تھا اور اوپر صاف پانی تھا پھر ہم نے کافی پیکٹ ان کو دیے۔ ساتھ ہی فولاد اور وٹامن کے شربت سب میں بانٹے۔ وہاں سے اٹھنے لگے تو ایک بوڑھی عورت بہت حسرت سے بولی۔ ''ہمارے جانوروں کے لیے کچھ نہیں لائے؟'' ہم نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ ''ان کے لیے بھی کوئی دوا لے آتے، یہ کمزور اور بیمار ہیں۔'' اس کی تشویش بجا تھی۔ یہ جانور ہی ان کا سب کچھ تھے۔ ہم دوائیوں کی ویگن بھر کر لانے کے بجائے چارے کے ٹرک لے آتے تو واقعی ان کی مدد ہو جاتی۔ اس بڑھیا سے نظریں چراتے ہوئے ہم اگلی جھونپڑیوں کی طرف چلے، وہاں بھی پانی صاف کرنے کا طریقہ بتایا۔ ایک بچے نے پیکٹ کھولا اور دوا مزے سے منہ میں ڈال لی، چورن ہے؟'' فوراً اس کے ہاتھ سے جھپٹا۔ ''بے وقوف دوائی ہے۔'' اس کی ماں نے فوراً ڈانٹ کر بھگایا۔ آدھے گھنٹے میں ہمارا طوفانی ٹوبے میں کام ختم ہو چکا تھا۔ افسوس ہوا۔ ''صرف اس لیے اتنا طویل سفر کیا؟'' فراغت ہوئی تو بھوک کا احساس ہوا۔ کھانے کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھا مگر وہاں تو کوئی امید ہی نہیں تھی۔ ہمیں رینجرز کے ایک ''گوپا'' میں ٹھہرایا اور مژدہ سنایا کہ چائے آ رہی ہے۔ ''چائے؟'' دل نے احتجاج کیا۔

''دن کے دو بجے چائے اور کھانا کب ملے گا؟''

''اس کی تو امید نہ رکھیں کھانا گھر جا کر کھایئے گا۔''

گوپا ایک گول کمرا تھا۔ جس کے وسط میں ایک شہتیر نصب تھا جس نے چھت کو سہارا دیا ہوا تھا۔ دیواریں کچی تھیں اور چھت لکڑیوں اور گھاس پھوس سے بنی تھی۔ اس کا قطر 12 فٹ تھا۔ وہیں نماز پڑھی۔ چائے کے ساتھ اپنے لائے ہوئے بسکٹ کھائے اور اللہ کا شکر ادا کیا اور وہاں سے واپسی ہوئی مگر واپسی سے پہلے سب سے اہم کام بھی ہوا۔ جی تصویریں بنائی گئیں تاکہ مستند رپورٹ جائے کہ میڈیکل ٹیم چولستان گئی تھی۔ واپسی پر جہاں آبادی آتی، وہاں رکتے، لوگوں میں دوائیاں بانٹتے اور آگے چل پڑتے۔

جیسے ہی ہمارا قافلہ رکتا لوگ جمع ہو جاتے اور خاص طور پر بچے...... بچوں کے شور میں ہماری آواز ہی نہ سنائی دیتی آخر ڈرائیور نے ایک ڈنڈا اٹھا لیا اور انہیں دھمکایا پھر ہم بات کرنے کے قابل ہوئے۔ بچوں نے نمکول کے پیکٹ کو کیلشیم کے ساشے سمجھا اور جھولی بھر بھر کر لیے۔ ایک بچہ پانی صاف کرنے والی دوا کے ساشوں کی پوری لڑی اٹھا کر بھاگا۔ ''شیمپو ہیں واہ جی۔'' بڑی مشکل سے اس کو قابو کیا اور سمجھایا۔ ''بے وقوف یہ پانی صاف کرنے کے لیے ہیں، بال صاف کرنے کے لیے نہیں۔''

ایک اماں جی لاٹھی ٹیکتے آئیں۔ ''بیٹا بیٹنو ویٹ ہے؟'' کچھ دیر تو سمجھ ہی نہیں آئی پھر ڈاکٹر منزہ کھلکھلائیں۔ ''betnovate کریم کا پوچھ رہی ہیں۔'' شکر ہے وہ ہمارے پاس تھی۔ جیسے، جیسے واپسی کا سفر طے ہو رہا تھا۔ لوگوں کے حالات بہتر نظر آ رہے تھے اور موج گڑھ پہنچے تو محسوس ہوا کہ یہ لوگ تو ان ''گوپے والے'' لوگوں سے کہیں بہتر ہیں۔ ان کے کچے گھروں کی لیپائی ہوئی تھی، صحن صاف ستھرے تھے، خواتین میں لباس کا سلیقہ تھا اور ایک نئی دلہن بھی نفاست سے میک اپ کیے ہوئے ہمیں دیکھنے آئی۔

یہ بٹنو ویٹ والی اماں جی بھی موج گڑھ ہی کی تھیں۔

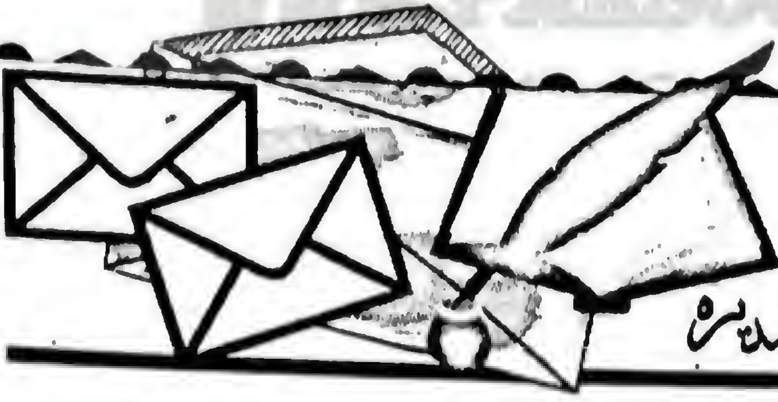
ایک خاتون نے راز داری سے استفسار کیا۔ ''منصوبہ بندی والی گولیاں ہیں۔''

''نہیں اماں......'' ہم نے معذرت کی۔

''تو پھر ہے کیا؟'' وہ غصے سے کہتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔

ایک سفر کی تھکان، دوسرے بھوک اور تیسرے بول، بول کر (دوائیاں استعمال کرنے کا طریقہ سمجھا، سمجھا کر) بہت تھک چکے تھے۔ جب سورج مغرب میں پہنچا تو ہماری بھی واپسی ہوئی۔ سب خاموش بیٹھے تھے۔ بار بار موبائل چیک کرتے کہ شاید سگنلز آ گئے ہوں۔ ڈاکٹر گل کو یاد آیا کہ ان کے پاس ایک گوبھی والا پراٹھا ہے جو صبح ناشتا نہ کرنے کی وجہ سے ان کی بہن نے ساتھ دے دیا تھا۔ چاروں نے وہ پراٹھا مل کر کھایا جو بے انتہا لذیذ لگا۔ شہری حدود میں داخل ہوئے تو سگنلز بھی آئے۔ فوراً گھر فون کر کے اپنی خیریت کی اطلاع دی اور سات بجے لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔ پتا نہیں اس دورے کا حکومت کو یا چولستان کے لوگوں کو کوئی فائدہ ہوا یا نہیں مگر ہمیں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ خدمت کرنے کا جذبہ مزید بڑھا۔

☆☆☆



بہنوں کی محفل

مدیرہ

☆ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ!

☆ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

☆ پیاری بہنو! عید میلاد النبیؐ کی مبارک باد کے ساتھ نئے عیسوی سال کی مبارک باد بھی قبول کریں۔ نئے سال میں قدم رکھتے ہوئے پچھلی سب بری باتیں بھول جائیں، صرف اچھی باتیں یاد رکھیں۔ کوشش کریں کہ آپ کی ذات سے کسی کو اگر کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا تو اسے نقصان بھی نہ پہنچے...... یہ دور اشتہارات کا ہے۔ ہم ان سے بہت متاثر ہوتے ہیں اور اپنی ضروریات زندگی کی بہت سی اشیا ان اشتہارات سے متاثر ہو کر خریدتے ہیں۔ اتنا تو شاید ٹھیک بھی ہے لیکن بات اس سے زیادہ بڑھ جائے تو غلط ہو جاتی ہے۔ جیسے ٹی وی کے کسی چینل پر کسی نوسر باز کی باتوں سے متاثر ہو کر...... اس کے بتائے ہوئے فون نمبر پر ہماری ایک قاری بہن نے فون کر دیا اور اس سے اپنی پریشانیاں شیئر بھی کر لیں اس نے ان سے کہا کہ وہ انہیں آٹھ دس ہزار روپے بھیج دے تو وہ نہ صرف انہیں تعویذ بھیجے گا بلکہ ان کے لیے دعائیں بھی کرے گا۔ انہیں جب کسی نے بتایا کہ یہ انداز صرف پیسے اینٹھنے کے ہوا کرتے ہیں اب آپ ان صاحب کو کبھی فون مت کیجیے گا اور نہ ہی کبھی بات تو اس نوسر باز نے ان کے گھر فون کر کر کے پریشان کر دیا ہر دو گھنٹے کے بعد اس کا فون چلا آتا اور وہ اس لڑکی کا نام لے کر کہتے کہ اس سے بات کروا دیں۔ انہوں نے مجھے دس ہزار روپے دینے ہیں...... اب وہ لڑکی پریشان ہو گئی تو میں نے انہیں بتایا کہ ان حضرت کو فون کر کے سختی سے ڈانٹ دیں ان سے خوف زدہ ہونے یا ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئیں تو ان فون نمبرز پر رابطہ کرنا وہ تمہاری مدد کریں گے...... وہ پولیس کی معتبر شخصیات کے نمبر تھے۔ آپ سے بھی یہی کہنا ہے کہ ٹی وی پر بیٹھا ہوا ہر شخص صرف سچ ہی نہیں بولا کرتا اور آپ کو اشتہارات سے اتنا متاثر ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے کہ آپ شدید ڈپریشن کا شکار ہو جائیں اور اب اہم بات ربیع الاول کے حوالے سے...... آپ اپنے بچوں کو اور گھر میں کام کرنے والے ملازمین کو اس ماہ کم از کم تین حدیثیں ضرور یاد کرائیں گی اور انہیں درود پاک ﷺ پڑھنے کی تلقین کریں گی۔ یہ کوئی مشکل کام تو نہیں ہے۔

اور اب آئیں اپنی سرگرمیوں کی جانب مگر اس سے قبل صرف ایک بار درودِ ابراہیمی پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالمِ اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔ آیتِ کریمہ یہ ہے۔

لاالہ الا انت سبحانك انی کنت من الظالمین

ترجمہ: تیرے سوا کوئی معبود نہیں اور تو ہر عیب اور کمزوری سے پاک ہے، میں قصورواروں میں سے ہوں (نوٹ) یہ حضرت یونسؑ کی مشہور دعا ہے جو انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں اللہ سے کی تھی۔ یہ آیت کریمہ کہلاتی ہے۔ اس کے پڑھنے کے فوائد کثرت سے ہیں اور اب اپنی بہنوں کی سرگرمیوں سے ذرا آگاہ ہوتے ہیں کہ کون کیا کچھ کر رہا ہے۔

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ معروف اسکالر کرن نذیر ان دنوں امریکا سے اسلام آباد آئی ہوئی ہیں۔ (خوش آمدید)

☆ معروف مصنفہ اقبال بانو کا ٹی وی سیریل ان دنوں پی ٹی وی پر خوب دھوم مچا رہا ہے۔ سیریل کا نام ہے

جینا دشوار سہی۔(ماشاء اللہ)

☆ معروف شاعرہ سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا کی ذہین ترین بیٹی حور العین نے اپنے اسکول میں نمایاں کامیابی کے ریکارڈ قائم کیے ہیں۔(بے حد مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ساجدہ ظفر، کمالیہ کے شوہر محمد ظفر اللہ ضیا، ٹی وی کے کوئز شو سے موٹر سائیکل جیت گئے۔(مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز خان، کراچی بہت جلد اپنی نئی کوٹھی میں شفٹ ہونے والی ہیں۔(ماشاء اللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری پروین یوسف، ہالینڈ سے لاہور آئی ہوئی تھیں......اپنے بھائی کی عیادت کے لیے اور اب بفضلِ خدا ان کے چھوٹے بھائی کی طبیعت ٹھیک ہے۔

☆ مصنفہ اور مستقل تبصرہ نگار ام ایمان قاضی، کوٹ چٹھہ کے چھوٹے اور اکلوتے بھائی کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔(مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار عائشہ خالد، میر پور خاص نے اپنا نیا نام ماہا بلوچ رکھ لیا ہے۔(پیارا سا نام ہے)

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار شمسہ الماس، ناروے سے ان دنوں پاکستان آئی ہوئی ہیں، وہ اپنے بھائی عامر کی شادی میں شرکت کے لیے ان دنوں راول پنڈی میں مقیم ہیں۔(ماشاء اللہ)

☆ جنوری میں پیدا ہونے والوں، شادی کی، منگنی کی سالگرہ منانے والیوں کو بے حد مبارک باد......اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ سب کی زندگی کا ہر لمحہ پُر محبت اور پُر سکون گزرے، آمین۔

☆ فریدہ خانم آپ کو اور آپ کی بھانجی کو سالگرہ مبارک۔

☆ معلمہ طاہرہ بیگم، کراچی آپ کو سالگرہ مبارک۔

☆ معلمہ مس ریاض، کراچی آپ کو سالگرہ مبارک۔

☆ مصنفہ خالدہ نسیم، لندن سالگرہ مبارک۔

☆ معروف مصنفہ شاہدہ لطیف، اسلام آباد کا منظوم سفر نامہ آف یہ برطانیہ شائع ہوگیا ہے جس کا انتساب برطانیہ کے پاکستانیوں کے نام ہے۔ کتاب بے حد خوب صورتی سے عمدہ کاغذ پر چھاپی گئی ہے اس لحاظ سے اس کی قیمت صرف دو سو روپے خاصی کم ہے۔ آخری صفحے پر موی مجسموں کے ساتھ شاہدہ کی خوب صورت اور رنگین تصویر بھی موجود ہے، کتاب منگوانے کا ایڈریس، الحمد پبلی کیشنز، رانا چیمبرز سیکنڈ فلور۔(چوک پرانی انار کلی) لیک روڈ، لاہور۔ میل نمبر، 0345.5106220

☆ پاکیزہ کی معروف مصنفہ رفاقت جاوید ان دنوں اپنی نئی کتاب مکمل کر رہی ہیں جس کا عنوان ہے، دھرنا کیوں......؟ یہ کتاب بہت جلد......مارکیٹ میں ہوگی۔

☆ آپ کی باجی انجم انصار کی کتاب کا نیا ایڈیشن ترمیم و اضافے کے ساتھ آ گیا ہے۔ کتاب کا نام ہے انمول خزانے کی دعائیں اور آزمودہ ٹوٹکے۔ نیا ٹائٹل لیے ہوئے یہ ضخیم کتاب اردو بازار میں موجود ہے۔ جس کی قیمت صرف تین سو روپے ہے۔ براہ راست منگوانے کے لیے رابطہ کیجیے۔ القریش پبلی کیشنز، سرکلر روڈ، چوک اردو بازار۔ فون نمبر 042.37668958.042.37652546

☆ آپ کی انجم باجی کے حوالے سے آپ کو یہ بتانا ہے کہ میرے گھر میں نیا ٹیلی فون کنکشن لگا ہے، جس کا نمبر آپ نوٹ کر لیں۔ 021.36964779 پرانا نمبر بھی موجود ہے مگر وہ بار بار خراب ہو جاتا ہے اس لیے یہ نیا نمبر لیا گیا ہے۔

☆ معروف شاعرہ شگفتہ شفیق کا نیا شعری مجموعہ بہت جلد آنے والا ہے۔(پیشگی مبارک باد)

☆ شاعرہ غزالہ جلیل راؤ کی رپورٹ کے مطابق گزشتہ ہفتے پروفیسر رابعہ بتول قریشی کے شعری مجموعے سحر تک دیپ جلاتا ہے، کی تقریب رونمائی گورنمنٹ کالج برائے خواتین میانوالی میں منعقد کی گئی جس کی صدارت ڈاکٹر لبنیٰ آصف نے کی۔ مہمانِ خاص ایم زیڈ کنول اور مہمانِ اعزازی پروفیسر آر کے نیازی تھے۔ بعدازاں محفلِ مشاعرہ کا اہتمام بھی کیا گیا۔ (مبارک باد)

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ مصنفہ سیما مناف تاحال بسترِ علالت پر ہیں۔
☆ شاعرہ، مصنفہ فریدہ جاوید فری، لاہور علیل ہیں۔
☆ پاکیزہ کی قاری ڈاکٹر میمونہ غوری، کراچی ہنوز بیمار ہیں۔
☆ پاکیزہ کی شاعرہ اور تبصرہ نگار امینہ عندلیب، سلانوالی کو تاحال آپ کی دعاؤں کی سخت ضرورت ہے۔
☆ پاکیزہ کی مستقل قاری ہالہ ملک، گاؤں جتوئی شدید بیمار ہیں۔
☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ذکیہ ایوب، کراچی کا ان دنوں بلڈ پریشر بہت ہائی ہے۔
☆ پاکیزہ کی مستقل قاری شیریں ظفر، ملتان شدید ڈپریشن کا شکار ہیں۔
☆ پاکیزہ کی مستقل قاری عذرا بی بی، راولپنڈی علیل ہیں۔
☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مونا، لاہور کے شوہر کی ذہنی اور جسمانی صحت کے لیے دعا کریں۔ ان کے شوہر اسپتال میں داخل ہیں اور ذہنی حالت بہت خراب ہے۔
☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز منظور، حیدرآباد کا بیٹا علیل ہے اس کی ذہنی و جسمانی صحت کے لیے دعا کریں۔

انتقالِ پُرملال

☆ پاکیزہ کی معروف مصنفہ رضوانہ پرنس کی والدہ طاہرہ بیگم لندن میں انتقال کر گئیں۔
☆ ممتاز ادیبہ صغیرہ بانو شیریں لاہور میں انتقال کر گئیں۔
☆ ہماری مصنفات دلشاد نسیم اور نگہت نسیم کی والدہ لندن میں انتقال کر گئیں۔
☆ پاکیزہ کی مستقل قاری عنبرین ندیم کی والدہ معظمہ نیر بیگم چل بسیں۔
☆ ہماری مصنفہ سیما بنت عاصم، کراچی کے بڑے ابو (تایا) کا انتقال ہو گیا ہے۔
نوٹ: تمام مرحومین کی مغفرت کی دعا کے ساتھ صرف تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کے درجات کی بلندی کی دعا کریں۔

✉ تہمیم فضل خالق، پشاور سے۔ ”موت ایک اٹل حقیقت سہی لیکن فوری طور پر نہ دل اسے قبول کرتا ہے نہ ذہن..... خدا فرحانہ ناز ملک کی مغفرت کرے...... بڑے اعلیٰ پائے کی رائٹر تھی۔ وہ اپنی تحریروں میں ہمیشہ زندہ رہے گی اور ہمارے دلوں میں بھی۔ پاکیزہ پر اس ماہ کچھ نہ لکھ سکوں گی کہ فرحانہ کی وفات پر دل بہت افسردہ ہے۔ میرے افسانے، سائبان پر تعریف بھی ہوئی اور تنقید بھی...... تعریف پر شکریہ سب بہنوں کا اور سائبان پر جن بہنوں نے تنقید کی ہے ان سے یہ کہنا ہے کہ یہ افسانہ میں نے خالصتاً دوستی کے خوب صورت جذبے کو مدنظر رکھ کر لکھا تھا اس لیے اس کا یہی اینڈ صحیح تھا میری نظر میں۔ ویسے اپنا، اپنا خیال ہوتا ہے..... خیر تنقید کے لیے بہت شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ بہنیں اتنی باریک بینی سے میری تحریروں کا مطالعہ کرتی ہیں۔“ (ہاں بھئی یہ تو ہے)

✉ رفعت سراج، کراچی سے۔ ”جب سے غزالہ نگار اور کزئی کا انٹرویو پڑھا ہے خط لکھنے کی تڑپ اٹھ اٹھ کر ٹھنڈی ہوتی رہی وجہ شفٹنگ کا بامشقت مرحلہ تھا جو طے ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ آخر کار بیل منڈھے چڑھ ہی گئی۔ میری نگاہ نے ہمیشہ اپنے ہم عصروں میں غزالہ کی تحریر کو بے تابی سے تلاش کیا ہے۔ غزالہ کو اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے اپنی عمر کا پل، پل سچے موتیوں کی طرح محفوظ کیا ہے۔ بحیثیت استاد وہ جس طرح اپنے فرائض ادا کرتی ہوں گی مجھے بخوبی اندازہ ہے۔ وہ خوش قسمت

ہیں جوان کو اپنا استاد دل سے مانتے ہیں۔ غزالہ کے پاس اپنے قارئین کی طرح اپنے اسٹوڈنٹ کو دینے کے لیے بھی بہت کچھ ہے۔ اللہ انہیں صحت وتندرستی، ایمانِ کامل عطا فرمائے دنیا و آخرت میں ان کے درجات بلند ہوں، آمین۔ اب امانت کی بات اور آخری بات، کچھ نے کہا اسے بڑی عجلت میں لپیٹ دیا گیا۔ میں نے دو تین ماہ پہلے ہی عرض کر دیا تھا کہ میں نے تکنیکی لحاظ سے بھی اسے اپنے دوسرے ناولوں سے الگ اختتام دیا ہے۔ ایک سسپنس کا عنصر لیے ہوئے اس کہانی کے جب تمام پردے اٹھ گئے تو کہانی اپنے منطقی انجام کو پہنچ گئی۔ رو ما، کائناز، برہان، احمر، شبینہ، اب یہ پانچ کردار جمع تفریق کے کمیل کے بعد باقی بچے۔ اب وہی صدیوں پرانی کہانی بچی تھی۔ ایک انار سو بیمار میرا مطلب ایک ہیروئن چاہنے والیاں، یا راجہ اندر زرد پھولوں کے ہار اٹھائے، احمق قسم کی دیو داسیاں، سوئمبر کا دھڑن تختہ میرا مطلب ہے منڈپ یا اسٹیج...... پہلے سے سمجھ آ جانے والی ہر بات کو کھینچ کر دامنِ قیامت سے ملانے کی کوشش کرنا پھر لوگوں کا ابجم، عذرا، نزہت سے التجا کرنا کہ آخر ہمارا قصور کیا ہے؟ ہمارے لیے ایک ڈپٹی نذیر احمد کیا بہت نہیں ہیں۔ قارئین سے التماس ہے وہ کہانی کے واقعات کے ساتھ ساتھ اسلوب اور تکنیک کے رموز کی طرف بھی مہربانی سے دیکھا کریں۔ اکثر نو آموز قلمکار کی اگر واقعات پر گرفت مضبوط ہوتی ہے تو ان کے کردار غیر فطری ہو جاتے ہیں۔ دیہاتی ان پڑھ کردار بھی اردو کے وہ الفاظ استعمال کرتے پائے جاتے ہیں جو شہر میں پڑھے لکھے نہیں بولتے، رائٹر نمرہ احمد کو یہ اعزاز حاصل ہے (میری جانب سے) کہ وہ احساسات کو پوری صحت وقوت سے بیان کرنے اور منتقل کرنے کی بہترین صلاحیتیں رکھتی ہیں۔ ایک وقت آئے گا، نمرہ زندگی کی بھٹی میں کندن بن جانے کے بعد مزید خوب صورت تخلیقات رقم کریں گی۔ کچھ ناموں کی حوصلہ افزائی کرنے کا مقصد ہرگز کسی کی دل آزاری کرنا نہیں ہے بلکہ یہ توجہ دلانے کی کوشش ہے کہ ان کے کام وہنر کو غور سے جانچا جائے اور کچھ اچھا کرنے کا جذبہ ایمانداری سے بیدار کیا جائے۔ میں نے وہ وقت دیکھا اور بہت دیر تک دیکھا جب ہر طرف صرف میرا طوطی بولتا تھا۔ مگر ہنر مجھ پر ختم نہیں...... یقیناً مجھ سے بدرجہ بہتر ہنر مند سامنے آئیں گے جن کا ہنر دیکھ کر اللہ کی ہنر مندی پر پیار آئے گا۔ میں خود چاہتی ہوں کہ بہترین سے بہترین کام سامنے آئے اور آگے بڑھ کر شاباش دینے والوں میں میرا پہلا نمبر ہو۔" (ماشاء اللہ، جزاک اللہ)

ڈاکٹر ممتاز ضیا، کراچی سے۔ "مجھے کچھ کہنا ہے حسبِ روایت کمال کا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو خسارے کی زندگی سے بچائے، آمین، دین کی باتیں اور اسما النبیؐ ایمان میں پختگی کا باعث ہیں۔ نگہت سیما کا اعتبارِ وفا کی اٹھان اچھی ہے، اب آگے دیکھتے ہیں۔ ترکِ وفا کے بارے میں کیا کہیں ابھی جرمن زبان ہی نہیں سیکھ پائے تھے کہ اب ٹیلی پیتھی سیکھنی پڑ رہی ہے۔ کہانی تو کھو گئی ہے ندا حسنین کی مختصر با مقصد تحریر اچھی لگی۔ جنگل کا پھول گوارا ہے حقیقت سے ذرا دور لگتی ہے۔ کوئی دستک کوئی خوشبو میں معاشرے کا ظالمانہ رویہ اجاگر کیا گیا ہے، اچھا لگا۔ رنگِ خلش میں عجیب لگا کہ سائرہ نے بغیر بیٹے کی مرضی پوچھے بات اتنی آگے بڑھا دی اور اب بیٹے کے ساتھ کھڑی ہو گئیں اس کے علاوہ عادل کا ہر وقت باپ کے ساتھ رویہ اچھا نہیں لگا آخر وہ باپ ہے اور ماں، باپ سے بے ادبی کی اجازت نہیں۔ نیلی چھتری بے مقصد تحریر ہے مزہ نہیں آیا۔ شیریں حیدر کی تحریر دیکھ کر خوشی، خوشی پڑھنا شروع کیا مگر کچھ اچھا نہیں لگا جس کو ہیروئن دادا سمجھتی رہی اور وہ بھی بیٹی اور پوتی کی طرح خیال کرتے تھے ان سے شادی بہت عجیب سا لگا۔ جبکہ ایک، ایک date وہ ان کے بیٹے اور پوتے کے ساتھ لگا چکی تھی۔ استخارہ تو بلال اور محسن کے لیے تھا دادا کہاں سے آ گئے۔ غلط فہمی پرانا موضوع ہے مگر اچھے انداز میں لکھا۔ آپ لوگوں نے حسبِ روایت فرحانہ ناز ملک کو خراجِ تحسین پیش کیا بہت اچھا لگا۔ ان کی غیر مطبوعہ تحریر یقین بہت اچھی لگی، تم یاد آؤ گی تو واقعی فرحانہ تم بہت یاد آؤ گی۔ فرحانہ کا انٹرویو ریپیٹ کرنا اچھا آئیڈیا تھا۔ ان کی تصویر تصور میں آ گئی۔ عظمیٰ کی عید ملن اس کے بے ساختہ انداز میں لکھی گئی بہت اچھی لگی معصوم کسوٹی کو کاٹنے والی فراک پہنا کر کیوں سزا دی۔ عظمیٰ اب جب تم صاحب ادب لوگوں کی محفل سجاؤ تو کچھ بے ادبوں کو بھی عطیہ عمر کی طرح یاد رکھنا۔ (مذاقاً لکھا ہے) خدا بھلا کرے عذرا پیاری کا جنہوں نے پاکیزہ میں تمہیں بریک دیا ورنہ اماں جان نے تو تمہیں ایک پاسے لگا کر قارئین پر ظلم کر رکھا تھا۔ بہنوں کی محفل خوب بھی ہمیشہ کی طرح تمہارا صائب مشورہ لندن والی قاری بہن کا گھر بسا گیا خوب ثواب کمایا تم نے خدا کرے تم اسی طرح لوگوں کی راہ نمائی کرتی رہو، آمین، جن بہنوں کو خوشیاں ملی ہیں ان کو بہت مبارک جو پریشان اور بیمار ہیں ان کے لیے دلی

دعائیں اور جو لوگ ابدی سفر پر روانہ ہوئے ان کے لیے دعائے مغفرت ہے اللہ تعالیٰ قبول کرے آمین۔ جلترنگ کے رنگ آج کے پُرآشوب بے رنگ زندگی میں رنگ بکھیر دیتے ہیں اور یہ بہت بڑی بات ہے۔" (تفصیلی تبصرے کا شکریہ)

✉ اختر شجاعت، کراچی سے۔ "سب سے پہلے اداریہ پڑھا...... کاش ہر شخص یہ سوچنے لگے تو پورا معاشرہ سنور جائے۔ تم بہت یاد آؤ گی۔ خصوصی مضمون پڑھ کر دل پر اداسی کا منوں بوجھ بڑھ گیا...... بہر حال یہ بہترین کاوش تھی۔ تارے زمین پر۔ ہاں اس خوب صورت محفل کو میں نے واقعی مس کیا۔ بس کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔ عظمیٰ سے بہت معذرت ہاں تصاویر دیکھیں سارے بہت پیارے لگ رہے ہیں۔ خصوصاً عذرا رسول صاحبہ ستاروں کے جھرمٹ میں چاند کی طرح لگ رہی تھیں۔ واقعی میں نے ان کی دلچسپ گفتگو کو مس کیا...... باقی تمام سلسلے زبردست ہیں۔ ان تمام بہنوں کا بہت شکریہ جنہوں نے علم معرفتِ الٰہی بہت پسند کیا...... خصوصاً نزہت اصغر کی رائے کا بہت شکریہ۔ ہاں اقبال بانو کا شکریہ، جزاک اللہ...... شائستہ زریں کا سروے بہت اچھا لگا۔ باقی سب خیر ہے۔" (اختر اس چٹنے منے سے تبصرے کا شکریہ، عذرا رسول شکریہ کہتی ہیں)

✉ فیروزہ بیگم، کراچی سے۔ "میں پاکیزہ میں برسا برس سے تبصرہ لکھ رہی ہوں مگر ہمیشہ مختصر اً بات کہا کرتی ہوں۔ مجھے اعتراض ہے کہ مصنفات یا مستقل تبصرہ نگاروں کے طویل تبصرے شائع ہوں۔ اس سے دیگر بہنوں کا حق ختم ہو جاتا ہے۔ (آپ کا اعتراض بالکل بجا ہے۔ تبصرہ نگار بہنیں اس بات پر ضرور توجہ دیں ورنہ پھر قینچی تو ہے ہی ہمارے پاس) دسمبر کے شمارے میں آپ نے فرحانہ ناز کو جس خوب صورت اور پُرمحبت انداز میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اس کی تعریف ہی نہیں کی جا سکتی۔ تارے زمین پر ایک دلکش، پُرمزاح اور مسکراتی ہوئی تحریر تھی جس میں سب مہمان نظر آ رہے تھے۔ تصاویر اچھی تھیں۔ آج ایک بات بتانا چاہوں گی کہ دعا مانگتے وقت یہ ضرور کہا کریں اے اللہ ہمیں ہمیشہ مظلوموں کے ساتھ شامل کرنا کبھی ظالموں کے ساتھ شامل مت کرنا۔" (تبصرے کے لیے شکریہ...... آپ نے اتنی پیاری دعا بتائی ہے اس کے لیے جزاک اللہ)

✉ شائستہ اعجاز، کراچی سے۔ "عظمیٰ آفاق کے گھر کی تقریب کی کوریج تارے زمین پر بہت اچھی لگی، کیا ہوا کہ وہ ہمیں بلانا بھول گئیں۔ دسمبر کے شمارے میں آپ نے جس طرح اداریہ لکھا...... اس کا ایک، ایک لفظ اہم تھا اور پھر آپ کی بتائی ہوئی دعائیں کہ سالِ گزشتہ کے لیے توبہ اور شکرانے کے نوافل اور آنے والے سال کے لیے دعائیں، ماشاء اللہ بہت خوب صورت پڑھ کر بہت اچھا لگا۔" (عظمیٰ کے گھر میں ایک چھوٹی سی گیدرنگ تھی۔ انشاء اللہ آئندہ تقریب میں بہت سی بہنیں ہوں گی۔ پاکیزہ کی جو چیزیں آپ کو اچھی لگا کریں...... آپ ان کو آگے بھی بتا دیا کریں۔ ماشاء اللہ آپ کا حلقۂ احباب خاصا وسیع ہے اور اچھی بات آگے بڑھنی چاہیے)

✉ حمیرا نوشین، منڈی بہاؤالدین سے۔ "سب سے پہلے تو فرحانہ ناز کی یاد میں تعزیتی مضمون سوگواری سے پڑھا پھر عظمیٰ کے گھر قدم رنجہ فرمایا تو پتا چلا کہ نہ صرف تارے زمین پر تھے بلکہ ان کی روشن، روشن باتوں نے ہمارے ذہن و دل کو بھی جگمگ کر دیا۔ اجیہ کو دیکھ کر حیران و مسرور ہوئی ماں، بیٹی کم بہنوں کا گمان ہوتا ہے۔ ماشاء اللہ باجی آپ لوگ اتنی اچھی تقریبات اور گیٹ ٹو گیدر رکھتی ہیں کہ دل میں ایک خواہش ابھرتی ہے کہ کاش کبھی میں بھی ان مخلص لوگوں سے ملنے کا شرف حاصل کرتی۔ (آپ کراچی آئیں، آپ کے اعزاز میں بھی تقریب ہوگی، انشاء اللہ) نگہت سیما کا ناول دلچسپی برقرار رکھتے ہوئے آگے کی سمت گامزن ہے افسانے سبھی ٹھیک تھے۔ روحانی مشوروں میں میاں، بیوی میں محبت بڑھانے کے وظائف دے کر آپ نے بہت سی بہنوں کے مسئلے حل کر دیے ہوں گے باجی میں ہر ماہ امینہ عندلیب کے بارے میں پڑھتی ہوں کہ وہ بیمار ہیں، میں ان کی ہمت و حوصلے کی داد دیتی ہوں کہ وہ شعبۂ تدریس سے بھی وابستہ ہیں اور ہر ماہ رسالہ پڑھ کر اس پر مفصل تبصرہ لکھتی ہیں۔ بہنوں کی محفل جوائنٹ فیملی سسٹم کی طرح ہے جس میں ہر رشتے داری، چاچی، تائی، پھپو، خالہ، بہن، بیٹی ہمراز و غمگسار سبھی موجود ہیں اور انہی رشتوں کی محبت و اپنائیت کی بدولت یہ گھر مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جا رہا ہے اللہ اس کو ہمیشہ قائم رکھے۔" (اللہ آپ سب کو سلامت رکھے۔ اور باہمی پیار و محبت کو قائم رکھے، آمین)

✉ عنبر وسیم، گوجرانوالہ۔ آپ اپنا انٹرویو دوبارہ بھیج دیں اور دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ سورۂ محمدؐ آپ نمازِ عصر پڑھنے کے بعد صرف ایک بار پڑھیں۔ اول آخر درود شریف کے ساتھ۔

ھ شگفتہ ناصر، فیصل آباد سے۔ ”دسمبر کا شمارہ فرحانہ ناز ملک نمبر تھا۔ آپ لوگوں نے بہت محبت سے سب کی تحریریں لگائیں ہاں فرحانہ کی تصاویر کی کمی بے حد محسوس ہوئی۔ (یہ تو ہے) میری طبیعت اب بفضلِ خدا بہتر ہے، انشاء اللہ کراچی آئی تو آپ سے ضرور ملوں گی۔ (مجھے انتظار رہے گا) اس شمارے میں بہت ساری رائٹرز کو عظمیٰ کے ہاں دیکھ کر خوشی ہوئی اور پھر پُر مزاح انداز میں اس کی کوریج نے اتنا لطف دیا کہ میں نے کئی بار پڑھی۔ سب سے خوب صورت عذرا رسول لگیں۔ (وہ ہیں ہی خوب صورت) اور عظمیٰ کا کوئی سفر نامہ کیا کتابی شکل میں موجود ہے؟“ (ان دنوں عظمیٰ آفاق کا سفر نامہ زیرِ طبع ہے۔ جب کتابی صورت میں آجائے گا تو میں آپ کو بتادوں گی)

ھ مسز نزہت اشفاق، کراچی سے۔ ”سرورق اچھا لگا۔ فرحانہ ناز کا گوشہ بھرپور تھا۔ تحریروں میں شیریں حیدر کا مکمل ناول سب سے زیادہ اچھا لگا۔ فرحانہ ناز کا ناولٹ بھی اچھا تھا۔ زاہدہ پروین سے کہنا ہے کہ جلدی سے سمیٹ لیں۔ نگہت سیما اور رفاقت کے ناولوں کی اقساط اچھی رہیں۔ افسانوں میں نئی مصنفات کے افسانے زیادہ تھے تو بس ٹھیک ہی تھے۔ مستقل سلسلے سب شاندار رہے۔“ (تبصرے کا شکریہ)

ھ مسز شہلا، کراچی سے۔ ”میں پاکیزہ اور آپ کی تحریروں کی عرصے سے فین ہوں، آپ کا پہلا ناول چاندنی میرا پسندیدہ ناول رہا ہے مگر میری بدقسمتی کہ جب اس کا سوپ ٹی وی پر چلا تو میں اسے دیکھ نہیں سکی۔ اب آپ جب بھی ٹی وی کے لیے لکھیں تو ہمیں ضرور بتایئے گا۔“ (فی الحال تو میں کسی بھی چینل کے لیے نہیں لکھ رہی...... مگر میرا سوپ چاندنی ان دنوں بھی ٹائمز چینل پر شام سات بجے پیر سے جمعرات تک چل رہا ہے)

ھ ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ”دسمبر کا پاکیزہ ملا...... اب آپ کو نورین علیم کی تحریریں بھی ضرور ملیں گی وہ آپ کی اور پاکیزہ کی فین ہیں۔ ترکِ وفا کی قسط پڑھی...... اعتبارِ وفا بھی اچھی لگی۔ انجم تمہارا قلم کب تک غیر حاضر رہے گا۔ (میں آپ سب بہنوں کے اصرار پر اس ماہ ناولٹ لے کر حاضر ہوں) شیریں حیدر تو ہیں ہی میری پسندیدہ لکھاری...... ان کی تحریر ہمیں اچھی ہی لگتی ہے۔ میری طبیعت بہت خراب ہے مگر پاکیزہ پڑھ کر بہت اچھا لگتا ہے۔“ (اللہ آپ کو صحت دے...... نورین کا خط تو مل گیا ہے، ان کی غزل کے بارے میں عظمیٰ سے پوچھتی ہوں)

ھ فرزانہ قادر، میانوالی سے۔ ”فرحانہ ناز ملک کے ناولٹ کا اختتام خود ان کی زندگی کی طرح ہی ہوگیا۔ تحریر پڑھ کر یوں لگا...... جیسے انہیں خود پتا ہو کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ باقی تحریروں میں سب سے زیادہ اچھی تحریر عظمیٰ آفاق کی لگی...... مصنفات کو دیکھ کر دلی خوشی ہوئی۔ ہمیں ایسی مزاحیہ اور برجستہ تحریریں ہی پسند آتی ہیں۔ نایاب جیلانی میری پسندیدہ مصنفہ ہیں، ان کا ناول ٹاپ پر رہا ہے اور اس کی اختتامی اقساط اچھی لگ رہی ہیں۔ دیگر ناول بھی ٹھیک جارہے ہیں مگر باجی ہمیں اب آپ کا ناول ہی پڑھنا ہے۔“ (تبصرے کا شکریہ، میں اس ماہ ناولٹ لے کر حاضر ہوں ناں)

ھ مسز رابعہ وقار، راولپنڈی سے۔ ”میں پاکیزہ کے علاوہ دیگر رسائل بھی پڑھا کرتی ہوں اور عرصہ دراز سے پڑھ رہی ہوں مگر اب یہ بات میں آپ سے بالکل سچ کہہ رہی ہوں کہ ان تمام رسائل میں سب سے پہلا نمبر پاکیزہ کا ہے۔ آپ کی محبت، سادگی ایک قاری کو اپنے ساتھ باندھ لیتی ہے۔ پاکیزہ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں فلسفہ نہیں ٹھونسا جاتا۔ معاشرتی موضوعات پر ہلکے پھلکے انداز میں لکھی گئی تحریریں میرے نزدیک زیادہ مؤثر ہوا کرتی ہیں۔ جلترنگ میرا پسندیدہ سلسلہ ہے، کتنی ہی بار پڑھ لوں ہر مرتبہ نیا مزہ ملتا ہے اور اب ہم عظمیٰ آفاق کی تحریریں باقاعدگی سے پڑھنا چاہتے ہیں۔ میں یہ بھی بتانا چاہتی ہوں کہ شیریں حیدر، نگہت سیما اور نایاب جیلانی کی تحریریں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں اور آپ ان کو میری مبارک باد بھی ضرور پہنچائیں۔“ (پیاری رابعہ آپ کی پُر محبت رائے پہنچائی جارہی ہے اور ہماری مصنفات آپ کا شکریہ ادا کررہی ہیں)

ھ عائشہ محمد خان، ٹنڈو محمد خان سے۔ ”پہلی بار شرکت کررہی ہوں اس امید کے ساتھ کہ چھٹی منی سی جگہ ہمیں بھی ملے گی۔ سرورق بہت پیارا لگا۔ خصوصی مضمون تم بہت یاد آؤ گی پڑھا بہت، بہت ہی روئی۔ فرحانہ کی ڈیتھ کے دن سے مسلسل جب

بھی ان کا ذکر آتا ہے میں بہت ہی روتی ہوں نہ جانے یہ رشتہ کیسا رشتہ ہے۔ فرحانہ کو دیکھا تک نہیں مگر انسیت ہے کہ انجم آپی میں نے آپ کو کال بھی کی تھی...... ماشاء اللہ کتنی پولائٹ ہیں آپ، مجھے بات کر کے بہت خوشی ہوئی افسانہ کوئی خوشبو کوئی دستک بہت پسند آیا۔ سویرا نے معاشرے کے بدلتے رویوں کی جانب توجہ مبذول کروائی ہے۔ اس معاشرے کی سفاکی ہے کہ اگر ماں کی زندگی میں کوئی حادثہ رونما ہوا ہے تو اس کا اثر بیٹی کی زندگی پر بھی پڑتا ہے بہت اچھے سویرا ویل ڈن۔ غربت نے تو میرے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ ویل ڈن ریحانہ اُف یہ غربت و افلاس، جلترنگ خوب ہی ہوتا ہے ہاہاہا...... باقی پرچہ زیرِ مطالعہ ہے۔ پچھلے ماہ کرچیاں محبت کی زبردست تحریر تھی۔ ویل ڈن حیا بخاری اللہ کرے اور بھی اچھا، اچھا لکھو...... آمین۔ اور مجھے یہ کہنا ہے کہ پاکیزہ بے قاعدگی سے کبھی کبھی تو میں پڑھ لیتی تھی مگر اب تو میں نے مستقل لگا لیا ہے۔ اچھا لگا پرچہ۔" (سب سے پہلے اس محفل میں خوش آمدید جی ہاں آپ مجھے فون کر سکتی ہیں، میرا نیا نمبر نوٹ کر لیجیے گا (021.36964779

✉ ہالہ ملک، گاؤں جتوئی سے۔ "میں آپ سے اور دیگر بہنوں سے بھی یہ بات کہنا چاہوں گی کہ ہماری مایہ ناز مصنفہ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اپنی ناسازیِ طبیعت کی وجہ سے بہنوں سے فون پر بات نہیں کر سکتی ہیں مگر انہوں نے مجھ سے یہ کہہ دیا ہے کہ وہ اپنی دعاؤں میں سب پاکیزہ بہنوں کو یاد رکھتی ہیں اور اس کے ساتھ وہ اپنی دعاؤں میں سب پاکیزہ بہنوں کے لیے خصوصی دعا بھی کرتی ہیں جنھوں نے دعا کے لیے انجم انصار کے پاس اپنا نام لکھوایا ہوا ہے اس لیے آپ ہرگز پریشان نہ ہوں اور اپنے لیے خود بھی دعا کیا کریں کہ وہ سب کی سنتا ہے۔"

✉ روشانے عبدالقیوم، بونیر۔ پیاری بہن میں نے آپ کو فون پر بھی منع کیا تھا، آپ مجھے کسی قسم کا کوئی تحفہ ارسال نہ کریں۔ اس کے باوجود آپ نے ایک کڑا اور ایک لپ اسٹک اپنے خط کے ساتھ بھیج دی۔ شاید تصویر میں، آپ کو میرا چہرہ میک اپ سے عاری لگا ہوگا۔ پلیز، پلیز، پلیز میں آپ کے توسط سے یہ بات ہر بہن سے کہنا چاہوں گی کہ مجھے آپ کی دعاؤں کی ہمہ وقت ضرورت ہے اور یہ میرے لیے آپ کی جانب سے بے حد قیمتی اور انمول تحائف ہیں۔ بہرحال آپ کا یہ کڑا اور لپ اسٹک میں نے ایک غریب بچی کی شادی میں دے دی۔

✉ فرحین اشفاق، گگو منڈی سے۔ "زندگی بدلتی ہے ناولٹ بہت زبردست لگا۔ افسانے بھی سب ہی اچھے تھے۔ دھجیاں پرانے موضوع پر تھا لیکن لکھا اچھے انداز میں تھا تو اچھا لگا۔ ترکِ وفا اس بار بہت کم صفحات پر لگائی گئی تھی۔ میں اور میرا شہر کاغان پڑھ کر بہت مزہ آیا اور کاغان کی بہت ساری معلومات بھی مل گئیں۔ آخر میں پہنچے بہنوں کی محفل میں جو ہمارے خط کے بغیر بھی اچھی لگ رہی تھی۔ ہالہ احمد نے پھلبہری کے لیے ٹوٹکا مانگا ہمارے پاس ٹوٹکا تو گرمیوں کا ہے اور ہے بھی ابتدائی پھلبہری کے لیے۔ کچی لسی اور شربت بزوری کا استعمال ابتدائی پھلبہری کو ختم کر دیتا ہے۔ روحانی علاج یہ ہے کہ سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۶۹ صبح شام سات بار پڑھنی ہے اول و آخر درود شریف لازم ہے۔" (آپ کے تبصرے اور نسخے کے لیے شکریہ)

✉ نورین علیم، کراچی سے۔ "پاکیزہ میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ اس میں ہر وہ چیز ہے جسے پڑھ کر انسان کی طبیعت سیر ہو جائے۔ اس کے ناول اور کہانیاں اس قدر دلچسپ ہیں کہ ایک بار شروع کریں تو پھر چھوڑ نہ سکیں لیکن اس ماہ کے پاکیزہ نے تو اداس کر دیا ہماری بہت اچھی رائٹر فرحانہ ناز ملک ہم سے جدا ہو گئیں۔ اللہ ان کو کروٹ، کروٹ جنت نصیب کرے اور ان کو بلند درجات عطا کرے، آمین۔ پاکیزہ کو جو خوبی اسے تمام رسالوں سے منفرد کرتی ہے اس میں ہر نئے آنے والے کو اپنائیت دی جاتی ہے جس سے نئے آنے والوں کو حوصلہ ملتا ہے۔ میں نے اپنی بہت پیاری اور ہردلعزیز آنٹی جو پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ذکیہ ایوب سے آپ کی محبت اور نئے آنے والوں کی حوصلہ افزائی کا بہت ذکر سنا ہے جس سے مجھے آج یہ حوصلہ ملا کہ میں بھی اپنی یہ چھوٹی سی کاوش آپ کو پیش کر رہی ہوں۔ اگر میری اس غزل کو عظمیٰ کی ڈائری میں جگہ ملے تو یہ آپ کی عنایت ہوگی۔" (نورین

اس محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی غزل بے حد کمزور ہے شائع نہیں ہو سکے گی آپ نثر میں اپنی تحریریں ضرور بھیجیں)
☆ سنبل ملک، لاہور سے۔ ”آنٹی میری پیاری آنٹی مجھے آج آپ سے دل کی باتیں کرنی ہیں کیونکہ اتنی زیادہ باتیں ذہن میں جمع ہو چکی ہیں کہ دماغ میں اِک ہلچل سی مچی ہوئی ہے۔ میری مما میرے بے حد قریب ہیں وہ قرآن مجید کی بہترین قاری ہیں۔ سمجھدار، سلیقہ شعار، محبت کرنے والی ہیں اور اکثر میرے کہے بغیر میری تکلیف سمجھ لیتی ہیں مگر آج میں آپ سے باتیں کرنا چاہتی ہوں صرف آپ سے۔ امینہ عندلیب بڑی ہمت وجوانمردی سے اپنی بیماری سے نبرد آزما ہیں لیکن ہمیں سبق سیکھنا چاہیے۔ آپ کو اللہ پاک نے اتنی عزت، شہرت، نیک نامی اور رزق عطا کیا ہے آپ کے کہنے کی دیر ہے سب مائیں، بہنیں، آنٹیاں آپ کی آواز پر لبیک کہیں گی۔ ہو سکتا ہے کچھ میری جیسی تیار بیٹھی ہیں کہ کدھر سے آواز آئے اور ہم لپکیں۔ پہلے بارش کے قطرے کی طرح۔ آنٹی، اس بات میں کوئی شک نہیں کہ دعا میں بہت اثر ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ دعا سے موت ٹالی جاسکتی ہے مگر بس دعا پر تکیہ کر کے بیٹھ جانا اور عملی طور پر کوئی تدبیر نہ کرنا کوئی عقل مندی نہیں ہے۔ آنٹی ہم اتنی لڑکیاں ہیں جو بہنوں کی محفل میں شرکت کرتی ہیں تو سب اپنی، اپنی پاکٹ منی سے تھوڑے پیسے چیئر مین خزانہ یا خزانچی کو جمع کروائیں ہر ماہ۔ آپ سب کو ممبر شپ دیں میرا مطلب ہے ایک یونٹی ہو۔ جو ایسی آنٹیوں اور بہنوں کے کام آسکے۔ امینہ عندلیب کے بہن بھائی ان کے لیے بہت کچھ کر رہے ہوں گے مگر ہمارا کچھ فرض نہیں؟ وہ بہنیں جو بیوہ ہیں ان کی مدد کی جاسکتی ہے۔ جو بے کس ہیں وہ غریب بہنیں جو پڑھ نہیں سکتیں مجھے اس تکلیف کا اندازہ ہے میں سو روپے کی کورس کی کتاب بھی نہیں خرید سکتی تھی ایک دکاندار تھا جس سے میں ادھار کتاب لیتی، نوٹس بناتی اور اسے واپس کر کے آتی اور اگلی کتاب لے کر آتی خدا کی قسم آنٹی کبھی کسی نے اتنی مدد نہیں کہ مجھے قلم تک گفٹ کر دے میں سیاہی دانے جو دو روپے کا آتا تھا پانی ملا کر اس کی سیاہی بناتی اور قلم خود کاٹتی اور اس سے لکھتی رہی ہوں بی اے تک۔ ان کے لیے ہم کچھ کر سکتے ہیں آنٹی پلیز آپ قدم تو اٹھائیں ہم جیسے میرا مطلب ہے مجھ جیسے لوگوں پر میری بہنیں، آنٹیاں اعتبار نہیں کریں گی جبکہ آپ کی سب عزت کرتے ہیں، اعتبار کرتے ہیں۔ آنٹی کیا ایسا ہونا ناممکن ہے؟“ (پیاری بیٹی، آپ نے بہت اچھی بات کی ہے مگر یہ بے حد ذمے داری کا کام ہے۔ مجھے جب اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق دی تو اس وقت میں اس کام کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں کروں گی۔ آپ یا دیگر بہنیں کسی کی مدد کرنا چاہیں تو اپنے اردگرد ہی کام کر سکتی ہیں اس کے لیے کوئی کمیٹی بنانے کی ضرورت نہیں ہے)
☆ ثمرین راشد، رحیم یار خان سے۔ ”انجم آنٹی، میری یہ تجویز ہے چند صفحات نئی شاعرات کے لیے مختص کر دیے جائیں اور نئی شاعرات کا کلام اور پھر ان کی اصلاح شدہ کلام شائع کیا جائے لیکن میں مزید یہ بھی کہوں گی کہ نئی شاعرات میں سے صرف وہ جن میں شاعری کے کچھ جراثیم بھی ہوں ان کو موقع دیا جائے اور مجھے پورا یقین ہے کہ پاکیزہ کی پوری مینجمنٹ اس بات پر ضرور غور کرے گی اس سے نہ صرف پاکیزہ کا معیار بلند ہوگا بلکہ صحیح معنوں میں ہماری بہنوں کا ٹیلنٹ پروموٹ ہوگا۔“ (آپ کی تجویز پر ہم عمل کرنے کی کوشش کریں گے)
☆ صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ سے۔ ”فرحانہ ناز ملک کا افسانہ یقین پڑھ کر بس یہی سوچ آرہی تھی کہ وہ اپنا افسانہ چھپنے سے پہلے چلی گئی لکھتے وقت یہ سوچا بھی نہ ہوگا کہ یہ میری آخری تحریر ہے۔ عظمیٰ آفاق کے تارے زمین پر کی روداد پڑھ کر اچھا لگا آپ لوگ ایک ہی شہر میں رہتے ہیں تو ملاقات ہو جاتی ہے۔ کتنا اچھا لگتا ہوگا ناں سب رائٹرز کا مل کر بیٹھنا اپنی تحریریں شیئر کرنا ہم دور رہنے والے ترستے ہی رہ جاتے ہیں۔ کراچی آنا تو بہت دور کی بات ہے وہ جو ایوارڈ ملنے کا سلسلہ تھا وہ بھی ختم۔ شیریں حیدر کی تحریر میں ہیروئن نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا دادا ہی پٹالیا۔ جنگل کا پھول اچھا جا رہا ہے ڈاکٹر کا قصہ خاصا طول پکڑ گیا ہے۔ رنگِ خلش اچھا جا رہا ہے۔ جلترنگ کا مکالمہ مزے کا تھا لگتا ہے لوگ بہت تنگ کرتے ہیں آپ کو (اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں) رابعہ عمران چوہدری نے جو بچی کے ساتھ زیادتی کا واقعہ بتایا بہت افسوس ہوا یہ سن کر کہ اس کی اپنی بچی اتنی ہی ایج کی ہے۔ بے حس انسان نے یہ بھی نہ سوچا کہ میری بچی کے ساتھ بھی یہ سب ہو سکتا ہے۔ میڈیا پر اتنے گھٹیا اور بازاری قسم کے اشتہار چلائے جاتے ہیں جن کو انسان سن نہیں سکتا وہ بچے یاد کر لیتے ہیں اور سارا دن گنگناتے رہتے ہیں۔ ہم

اپنے بچوں کا منہ بند نہیں کر سکتے تو ٹی وی کیا بند کریں گے۔'' (آپ ٹی وی بند کر سکتی ہیں، بچوں کو کارٹون کے چینل دکھائیں)

✿ نسرین جمیل سیال، گجرات سے۔ ''میں نے بہت مرتبہ فون کیا لیکن مایوسی ہوئی۔ کیا بات ہے انجم آپی مجھے یقین نہیں آ کہ آپ اس طرح مجھے نظر انداز کریں گی بلکہ یہ تو آپ پر سوٹ ہی نہیں کرتا۔ کہیں یہ تو نہیں کہ نسرین جمیل آپ کے ذہنوں سے بالکل ہو گئی ہے؟ میں نے 84ء سے لے کر اب تک وقفے، وقفے سے پاکیزہ میں لکھا ہے۔ پاکیزہ کے علاوہ تو کسی اور طرف کبھی توجہ نہیں دی پھر یہ دل دُکھانے والی خاموشی کیوں؟ آپی انسان خطا کا پتلا ہے اور میں بھی ایک گناہ گار انسان ہوں۔ اب اکثر بیمار رہتی ہوں۔ زندگی کا کچھ پتا نہیں، میں چاہتی تھی کہ پاکیزہ سے دوبارہ رابطہ جُڑ جائے تو زندگی میں پھر سے بہار آجائے گی۔ میرے جان سے پیارے پاکیزہ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف کر کے پھر سے دوستی کرلو۔'' (پیاری گڑیا! میرا فون بے حد خراب رہتا تھا اسی لیے دوسرا فون لگوایا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دے اور آپ پاکیزہ سے جڑی رہیں گی انشاءاللہ)

✿ شازیہ الیاس، کراچی سے۔ ''مجھے لاہور سے واپسی سفر کے دوران اپنی کزن کے ساتھ پاکیزہ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ میں ایک اسٹوڈنٹ ہوں اور پہلی بار آپ کی محفل میں شامل ہو رہی ہوں۔ چھوٹی موٹی بچوں کی کہانیاں تو میں لکھ لیتی ہوں مگر ہاں مجھے ابھی خوب صورت افسانے اور ناولٹ لکھنے میں کوئی خاص کمال حاصل نہیں ہے۔ کالج میگزین میں کبھی کبھی لکھ لیتی ہوں۔ پچھلے دنوں میں نے تھر کے بدحال لوگوں پر چھوٹا سا مضمون لکھا تھا۔ فرحانہ ناز کو تو میں نہیں جانتی لیکن ان کی تحریر پڑھ کر ان کی وفات پر افسوس ہوا۔ میں نے آپ کا نام تو سنا تھا تصویر میں پہلی بار دیکھا ہے۔ کیا میں آپ سے مل سکتی ہوں؟ پلیز اپنا فون نمبر ضرور دیجیے گا۔'' (اس محفل میں خوش آمدید۔ آپ مجھے میرے اس نمبر پر 021-36964779 فون کر سکتی ہیں۔ پاکیزہ میں ہر ماہ تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے مجھے خوشی ہوگی)

✿ سیدہ جیا عباس، تلہ گنگ سے۔ ''پاکیزہ کی تمام بہنوں سے پلیز التماس ہے کہ میری صحت یابی اور پریشانیوں کے دور ہونے کی دعا کریں۔ اور میں نے افسانہ بھیجا ہے رجسٹرڈ ڈاک سے واپس آگیا ہے کیوں......؟'' (آپ نے پوسٹ بکس والے ایڈریس پر رجسٹرڈ کیا ہوگا۔ بہنوں کی محفل کے آخر میں خط اور دیگر تحریروں کے لیے جو ایڈریس دیا جاتا ہے وہ لکھا کریں اگر رجسٹری کریں تو ورنہ تو دونوں پتوں پر چیزیں پہنچتی ہیں)

✿ فرحت احمد، کراچی سے۔ ''اعتبارِ وفا، رنگِ خلش اور ترکِ وفا تینوں ہی اچھے جا رہے ہیں، فرحانہ ناز ملک کا یقین پڑھ کر دل ایک بار پھر رو دیا۔ شیریں حیدر کا مکمل ناول کس کی شادی کا اینڈ پڑھ کر لڑکی کی سمجھداری اش اش کر اٹھی۔ زاہدہ پروین کا جنگل کا پھول بہت اچھا لگ رہا ہے مگر پتا نہیں کیوں اینڈ کچھ اچھا ہوتا محسوس نہیں ہو رہا ہے۔ خدارا دل مت دُکھایئے گا۔ افسانے سب ہی اچھے لگے مگر غزالہ عزیز کی نیلی چھتری بازی لے گیا۔ (ویل ڈن) عظمیٰ آفاق سعید کا تارے زمین پر پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ خاص کر کاٹنے والی فراک پڑھ کر بے حد ہنسی آئی اور اپنی اور اپنے بچوں کے اسی قسم کے کچھ واقعات بھی ذہن میں تازہ ہو گئے۔ باقی تمام سلسلے حسبِ معمول اچھے رہے۔'' (بچوں کے مسائل اسی طرح کے ہوا کرتے ہیں۔ غزالہ عزیز کو آپ کی خصوصی مبارک باد پہنچائی جا رہی ہے)

✿ عظمیٰ زہری، اوستہ محمد سے۔ ''ہماری ہر دل عزیز رائٹر اس دنیا میں نہیں رہیں۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں آپی میں کس طرح فرحانہ ناز ملک کی تعزیت کروں بس یہی دعا کروں گی کہ اللہ رب العزت انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین۔'' (پیاری بیٹی اس محفل میں خوش آمدید)

✉ طیب انا البحر، شکر گڑھ۔ پاکیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ...... بیٹا یہ خواتین کا پرچہ ہے اس میں خطوط، افسانے اور ناول صرف خواتین کے لکھے ہوئے شائع ہوتے ہیں۔ آپ ہمارے ادارے سے دیگر شائع ہونے والے ڈائجسٹ، جاسوسی، سسپنس اور سرگزشت میں اپنی کہانیاں بھی بھیج سکتے ہیں اور خطوط بھی۔

✿ نگینہ ضیا بنگش، کراچی سے۔ ''پیاری باجی میں ہر نماز میں آپ کو اور پاکیزہ سے وابستہ ہر فرد کو اپنی دعاؤں میں یاد

رکھتی ہوں اللہ آپ سب کو ہمیشہ خوش و تندرست رکھے، آمین (جزاک اللہ) دسمبر کا شمارہ بہترین ٹائٹل کے ساتھ من کو بھایا۔ مجھے کچھ کہنا ہے آپ کی سبق آموز باتوں سے فیض یاب ہوئے۔ دین کی باتیں، ہمارے علم میں اضافے کا سبب بنیں۔ کچھ تحریریں پڑھی ہیں جو بہت پسند آئیں جس سے بہت کچھ اچھا سیکھنے کو مل سکتا ہے۔ نگہت سیما کا اعتبارِ وفا۔ غربت، ریحانہ حسن۔ نایاب جیلانی کا ناولٹ، ترکِ وفا۔ سنہری موقع، ندا حسنین۔ زاہدہ پروین کا جنگل کا پھول اور فرحانہ ناز ملک کا یقین بہت اچھے لگے۔ تم یاد بہت آؤ گی انجم باجی نے بہت پُرسوز مضمون لکھا اور سب بہنوں نے بھی اتنا اچھا لکھا کہ پڑھتے پڑھتے بے اختیار آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ اللہ پاک فرحانہ کے درجات بلند فرمائے، آمین۔'' (شکریہ)

٭ رعنا کوثر، نیویارک سے۔ ''آپ سے کئی دفعہ فون پر بات ہوئی ہے۔ آپ نے میرے افسانے بھی چھاپے ہیں۔ پچھلے سال میں نیویارک سے پاکستان آئی تھی تو پاکیزہ رسالہ ایک سال کے لیے لگوایا تھا۔ بہت مزہ آیا خوب پڑھا، بہت اچھے افسانے ہوتے ہیں، میں خود چھوٹے افسانے لکھتی ہوں اس لیے مصنفین کی کہانیاں پڑھنے کا مزہ آیا۔ بہت اچھی کہانیاں ہوتی ہیں۔ ایک افسانہ لکھا ہے وہ بھجوا رہی ہوں۔'' (آپ کا افسانہ پڑھ لیا ہے، وہ نا قابلِ اشاعت ہے)

٭ ارم کمال، فیصل آباد سے۔ ''نئے سال کی آمد پر میری طرف سے سالِ نو کی مبارک باد قبول کریں۔ خدا کرے کہ نیا سال ہم سب کے لیے امن و سلامتی کی ٹھنڈی ہوائیں لے کر آئے، (آمین) ٹائٹل کی ماڈل بہت اداس سی لگی، شاید دسمبر کے اثرات ہوں، اداریہ کہیں، بہت دور دل میں اتر گیا۔ اعتبارِ وفا، نگہت سیما کا سلسلے وار ناول اپنی گرفت میں لے رہا ہے۔ ریحانہ حسن کی کہانی غربت نے کئی ساعتوں تک دل و دماغ شل کردیے۔ بھوک واقعی ایک خوفناک عفریت ہے، سنہری موقع رضیہ بیگم نے تو سنہری موقع سے فائدہ اٹھالیا لیکن معاشرے کا عمومی رویّہ اس سے الٹ ہے وہاں تو پھر دوسرے فریق سے گن، گن کر بدلے لیے جاتے ہیں۔ جنگل کا پھول اپنے پورے جوبن پر ہے، رنگِ خلش میں عادل صاحب نے وردہ سے شادی سے انکار کر کے حیران کردیا۔ عجیب طرز کی کہانی ہے لیکن دلچسپیوں سے مزین...... نئے کرداروں کی انٹری بھی مزہ دے رہی ہے۔ نیلی چھتری بس سو سو تھی، شمارے کی دھماکے دار تحریر شیریں حیدر کی کس کی شادی کس کے ساتھ نے حیران کردیا۔'' (شیریں حیدر ہمیشہ ہی حیران کیا کرتی ہیں، پسندیدگی کا شکریہ)

اب آیئے درودِ ابراہیمی پڑھ کر دعا مانگتے ہیں۔ یا اللہ، یا رحمٰن، یا رحیم میرے جسم کو شفا دل کو اپنی ذات کا یقینِ کامل اور آنکھوں کو نورِ بصیرت عطا فرما اور جب تک میں زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرمادے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے۔ یا رب العالمین مجھ سے میری اولاد سے ہمیشہ، ہمیشہ راضی رہنا اور ہر گناہ، ہر غلطی اور ہر کوتاہی کو معاف کرنا اور دونوں جہانوں میں مجھے خیر عطا فرمانا اور میرے عیبوں کی پردہ پوشی کرنا کہ تُو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے اور تیری ثنا سب سے بڑی ہے اور تیری پناہ عزت والی ہے۔ بے شک میرا رب ہر چیز پر قادر ہے اور میرا رب برکت اور بلندی والا ہے۔

یا مجیبُ یا مجیبُ یا مجیبُ

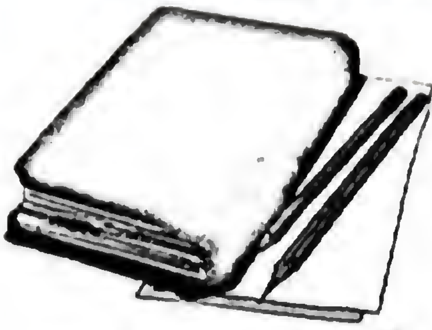
دعا گو

آپ کی اپنی باجی

انجم انصار

پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید



حمدِ باری تعالیٰ

حاضر ہیں تیرے دربار میں ہم، اللہ کرم اللہ کرم
دیتی ہے صدا یہ چشمِ نم، اللہ کرم، اللہ کرم
ہیبت سے ہر اِک گردن خم ہے ہر آنکھ ندامتِ غم ہے
ہر چہرے پہ ہے اشکوں سے رقم، اللہ کرم، اللہ کرم
جن لوگوں پہ ہے انعام تیرا، ان لوگوں میں لکھ دے نام میرا
محشر میں میرا رہ جائے بھرم، اللہ کرم، اللہ کرم
ہر سال طلب فرما مجھ کو، ہر سال یہ شہر دکھا مجھ کو
ہر سال کروں میں طوافِ حرم، اللہ کرم، اللہ کرم
میری آنے والی نسلیں تیرے گھر آئیں تیرا در دیکھیں
اسباب ہوں ان کو ایسے بہم، اللہ کرم، اللہ کرم
اللہ کٹے اسی وِرد میں عمر، ہونٹوں پہ صبیح رہے جاری
اللہ کرم، اللہ کرم، اللہ کرم، اللہ کرم

کلام: سید صبیح رحمانی

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

حسرت ہے نبیؐ جی ترا دیدار ہو نصیب
مرقد پہ حاضری مری ہر بار ہو نصیب
شہرِ نبیؐ کے موسم ہیں حسیں سب جہاں سے
جا کے وہاں پہ روح ہو سرشار یا نصیب
دنیا کے جھمیلوں سے فرصت جو پاؤں میں
پھر حاضری وہاں کی ایک بار ہو نصیب
نظروں سے لوں میں گنبدِ خضریٰ کی بلائیں
حسرت مری ہو جائے ثمر بار یا نصیب
پنچھی اڑان بھرتے ہیں گنبد کے آس پاس
میری اڑان بھی ہو پروانہ وار یا نصیب
عشقِ نبیؐ میں ہوش نہ آئے کبھی مجھے
مجذوب کا سا رقص ہو دیوانہ وار یا نصیب

شاعرہ: فریدہ افتخار، اسلام آباد

مدینے سے لوٹ کر آنے والی خاتون سے میرا سوال اور اس کا جواب

کیا، کیا نظر آیا تھا مدینے کی گلی میں؟
کچھ پھول کھلے ہوں گے تمناؤں کے در پر
سکھ چین ملا ہو گا مدینے کی گلی میں
کچھ دورد پڑھے ہوں فرشتے بھی صف آرا
اِک نور ملا ہو گا مدینے کی گلی میں
کیا دیکھ رہی تھی مجھے کچھ یاد نہیں ہے
آنسو بھری آنکھیں تھیں مدینے کی گلی میں
کیوں اشک بہائے تھے زباں سوکھ رہی تھی
جلوہ نظر آیا تھا مدینے کی گلی میں
ڈرتی ہوں کہیں آنکھ نہ کھل جائے اچانک
چہرہ (مبارکؐ) نظر آیا تھا مدینے کی گلی میں
میں آبلہ پا جاؤں گی ہے دید کی حسرت
کچھ نیر بہاؤں گی مدینے کی گلی میں
میں کون ہوں مدہوش ہوں کچھ ہوش نہیں ہے
کھل جائے گا یہ راز مدینے کی گلی میں
یہ عشقِ نبیؐ عشقِ نبیؐ عشقِ نبیؐ ہے
جاگا ہے مرا بھاگ مدینے کی گلی میں
میں اڑ کے پہنچ جاؤں جو ہو طاقتِ پرواز
اِک بوریا بچھ جائے مدینے کی گلی میں
اب نیند کسے آئے گی ہر سو ہے اجالا
یوں عمر گزر جائے مدینے کی گلی میں
کیوں پوچھ رہی ہو دلِ مضطر کی کہانی
سب چین و سکوں چھوڑا مدینے کی گلی میں

اک دردِ جدائی جو ملا سہہ نہ سکوں گی
پھر لوٹ کے آؤں گی مدینے کی گلی میں
کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی
مرسلہ: عالیہ ضیا، کراچی

یارسول اللہ

بسر ہو زندگی تو یوں بسر ہو یا رسول اللہ
حرم میں شب مدینے میں سحر ہو یارسول اللہ
اگر ہم پہ کرم کی اِک نظر ہو یارسول اللہ
ہماری زندگی بھی معتبر ہو یا رسول اللہ
کبھی یوں بھی تمنا بارور ہو یا رسول اللہ
کہ ہم ہوں اور مدینے کا سفر ہو یارسول اللہ
مرسلہ: شازیہ محبوب، کراچی

ایک آرزو، ایک حسرت

دیدار کو ترسی ہوں
دیدار کرادو
جاؤں مدینے پھر سے
یہ ایک بار کرادو
عشقِ نبیؐ میں مجھے
مرنا بھی ہے قبول
اچھا جو ہو بیمار
تو بیمار کرادو
آنکھوں سے لگالوں
میں خاک پائے محمدؐ
مٹ جاؤں انہی قدموں میں
سو بار کرادو
جو دل پہ گزرتی ہے
اسے خوب وہ جانیں
جذبوں کے چمن کو
ذرا گلزار کرادو

شاعرہ: فریدہ افتخار
مرسلہ: کوثر خالد، جڑانوالہ

فرمانِ رسول ﷺ

جس گھر میں فرحت و سرور زیادہ ہوگا وہاں اس کے بعد تکبر بھی آئے گا اور جس کو تکبر ہوا وہ جہنمی ہوگا۔ بس تم جب بدی کا ہونا محسوس کرو تو اس کے بعد جلد کوئی نیکی کرو کہ وہ اس کو محو کردے اور نیکیاں کرنا لازم سمجھو... کہ وہ بدی کی خرابیوں کو دور کرتی ہیں۔

مرسلہ: لاریب، ماہ زیب، چونیاں

دعا

ترستی ہیں آنکھیں اور جلتا ہے سینہ
کرم کر تو مجھ پر دکھا دے مدینہ
مرسلہ: ام ایمان قاضی، کوٹ چھٹہ

رونے کی وجہ

ایک آدمی کا اونٹ رات کو بہت روتا تھا۔ وہ آدمی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور سارا حال بتایا۔ آپؐ نے اونٹ سے رونے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا۔ یہ رات کو عشا کی نماز پڑھے بغیر سو جاتا ہے تو میں اس کے بستر کے نیچے جلنے والی آگ دیکھ کر روتا ہوں۔

مرسلہ: مصباح رضا سعید، فیصل آباد

ایک اہم نکتہ

زندگی سے آپ جو بھی بہتر سے بہتر لے سکتے ہو لے لو مگر مثبت انداز میں کیونکہ جب زندگی کچھ لینا شروع کردے تو سانس تک نہیں چھوڑتی۔
مرسلہ: شہزادی، فیصل آباد

پیار کے رنگ

تمہیں پیار ہوگیا ہے، ایسا ہے ناں
ماں نے پوچھا۔
ہاں! مگر آپ کو کیسے پتا چلا؟
وہ حیران ہوا
تم نے جب پانی میں انگلی ڈالی تو اس میں سے رنگ پھوٹنے لگے اور صرف

یہ پیار ہی میں ہوتا ہے کہ انسان جس
چیز کو چھوتا ہے تو اس میں سے قوسِ قزح
جیسے رنگ پھوٹنے لگتے ہیں
گبریل گارسیا مارکیز کے ناول سے اقتباس
مرسلہ: سیما ممتاز عباسی، لاڑکانہ

غزل

نغمہ سرا پرند تھے بادِ صبا کے ساتھ
خاموش ہو گئے ہیں اپنی ادا کے ساتھ
عجب تھا شخص وہ بھی عجب مزاج تھا اس کا
بھرپور عمر جی گیا ساری سزا کے ساتھ
جس کا شباب اداس سے آنگن میں کٹ گیا
نفرت ہی ہو کے رہ گئی رنگِ حنا کے ساتھ
جہاں پہ تھک کر سو گئی ہیں منتظر آنکھیں
لڑتے ہیں پھر چراغ وہیں پر ہوا کے ساتھ
تو اپنی ذات کا سر ہمیشہ یوں ہی اٹھا کر رکھ
پاس اس کے جا ضرور مگر اپنی انا کے ساتھ
کوئی بھی بن سکا نہ میرا ہم سفر کبھی
گرچہ میں پھر رہی ہوں دل کی دعا کے ساتھ
شاعرہ: نصرت جبیں ملک، پنجاب

وائرس

ایک غمگین کالی کلوٹی لڑکی نے کمپیوٹر سے پوچھا۔
"کیا مجھ جیسی سانولی سلونی لڑکی کے لیے کسی خوب صورت، گورے چٹے لڑکے کا رشتہ مل سکتا ہے؟"
"بالکل مل سکتا ہے۔" کمپیوٹر نے جواب دیا۔ "بس میری طرح اس کی آنکھ میں وائرس کا ہونا ضروری ہے۔"

پریشانی

ماں نے بیٹی کو نصیحت کی۔ "جب بھی سہیلیوں کی محفل میں بیٹھو تو جو کچھ بھی بولو سوچ سمجھ کے بولو۔"
"لیکن امی اگر میں سوچنے لگوں گی تو اتنی دیر میں تو موضوع ہی بدل جائے گا۔" بیٹی نے پریشانی سے کہا۔
مرسلہ: سامعہ تبسم، ملتان

غزل

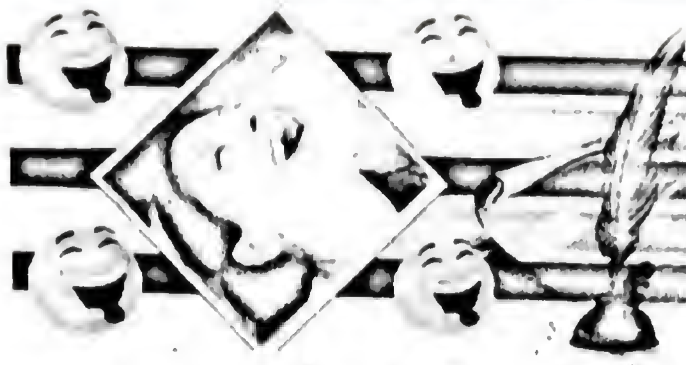
محبت سے جی اب بھر گیا ہے
نشہ تھا جو اتر گیا ہے
پھر آنسوؤں کے بین اٹھے
خواب آنکھ میں مر گیا ہے
دھڑکنوں کے شور میں
درد کا ساز بکھر گیا ہے
سنسان دل دریچے میں
یاد کا موسم ٹھہر گیا ہے
میں نے تو نبھائی پریت
جانے کیوں وہ مکر گیا ہے
چلتی رہی سنگریزوں پر
بیکار میرا سفر گیا ہے
میرا دامن اور زرد پھول
گلاب موسم کدھر گیا ہے
شاعرہ: فصیحہ آصف خان، ملتان

کچھ کھٹا کچھ میٹھا

ایک صاحب جو ماہرِ فلکیات تھے۔ ایک رات وہ دوربین آنکھوں سے لگائے تاروں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے چوکیدار نے آسمان پر ایک ستارے کو ٹوٹتے ہوئے دیکھا تو بولا۔ "واہ صاحب! کیا نشانہ ہے۔"

☆☆

پاگل خانے کا معائنہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے ایک کمرے میں داخل ہوتے ہوئے نرس سے پوچھا۔ "یہ کمرا کون سے مریضوں کا ہے؟"
نرس بولی۔ "یہ کمرا ان ذہنی مریضوں کا ہے جو آٹو موبائل انجینئر اور مکینک ہیں۔"
ڈاکٹر صاحب بولے۔ "لیکن یہ لوگ کہاں گئے؟ بستر پر تو کوئی بھی نظر نہیں آ رہا؟"
نرس بولی۔ "سب کے سب بستر کے نیچے ہیں اور گاڑیوں کی مرمت کر رہے ہیں۔"
مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر



جلترنگ

انجم انصار

نئے سال کی پیش گوئیاں

چچا کرامت کی پورے خاندان میں ویلیو جنوری کے مہینے میں خوب بڑھ جاتی ہے۔ کہاں تو یہ عالم کہ کوئی انہیں رغبت سے چائے کو نہ پوچھے (کہ کہیں پینے نہ بیٹھ جائیں) اور کہاں ایسا کہ ان کی دعوتیں کی جاتی ہیں اور وہ انکار کریں تو خفگی کے ٹریلر دکھائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جنوری میں خوب دعوتیں اڑاتے ہیں اور ان دنوں بن جانے والی صحت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ ان کا لاغر سا چہرہ بھی بھر جاتا ہے اور وزن میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

چچا کرامت جنے ستاروں کی چال دیکھتے ہیں یا لوگوں کے گھر کا احوال مگر پیش گوئیاں خوب کرتے ہیں جو بقول ان کے وہ ایک سال کے لیے ہوتی ہیں۔ چچا کرامت ہماری فیملی میں اس لیے بھی ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں کہ ان کی پچاس فیصد پیش گوئیاں تو فوراً ہی پوری ہو جاتی تھیں اور بقیہ پچاس فیصد دسمبر تک پوری ہو جاتیں۔

اب جیسے انہوں نے بڑے خالو کی بہوؤں کو دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ سسرال میں رہنے والی نہیں لگتیں۔ بہت جلد ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنالیں گی۔ ایسا ہی ہوا دو مہینے میں ایسی، ایسی جنگیں ہوئیں...... بڑے خالو نے دونوں بہوؤں کا جہیز ان کے میکے بھجوا دیا۔ ظاہر ہے انہوں نے بھی وہیں جانا تھا جہاں وہ جانا ہی چاہتی تھیں۔

چچا کرامت ایک دن شاداب خالہ کے ہاں گئے تو ان کی ساس نے بتایا۔ ''ایک تو مجھے بھوک نہیں لگتی۔ کھانے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ دوسرے تمہاری خالہ اتنا بدمزہ پکاتی ہے کہ جو رہی سہی بھوک ہے وہ بھی ختم ہو جاتی ہے۔''

''آپ کی ساس بچیں گی نہیں۔'' چچا نے شاداب خالہ سے رازداری سے چلتے وقت کہا۔

''اللہ کیا واقعی......؟'' خالہ کے تو مارے خوشی کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

''یہ میری پیش گوئی ہے آپ کی ساس اب گئیں کہ تب گئیں۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

''چچا جان......! میں بھی دیکھوں گی کہ آپ کی پیش گوئیاں کتنی سچی ہوتی ہیں۔''

صرف دو مہینے بعد شاداب خالہ، چچا کے گھر مٹھائی لے کر پہنچ گئیں۔ چچا کو ان کے اس اقدام پر خاصا تاسف بھی تھا مگر اپنی پیش گوئی کی کامیابی کی اتنی خوشی تھی کہ وہی چہرے پر غالب رہی۔

چچا کرامت کی بعض پیش گوئیاں تو محکمۂ موسمیات والوں کی طرح بھی ہوتی تھیں۔

آج گرمی زیادہ ہوگی۔

آج کوئٹہ کی ہوا چلے گی تو کراچی میں سردی بڑھ جائے گی۔

بارش نہیں ہوگی تو بیماریاں پھیلیں گی۔

آج عید کا چاند دکھائی نہیں دے گا وغیرہ وغیرہ......

مگر 2015ء کے لیے جو انہوں نے پیش گوئیاں کی ہیں وہ سوچنے اور سمجھنے والی ہیں۔

☆ نفسا نفسی کا سال ہوگا۔ کسی کو بھی کسی کی پروا نہیں ہوگی۔

☆ بیویاں اپنے شوہروں پر حاوی رہیں گی.....اب گھروں سے بیویوں کے ڈکرانے کی آوازیں آئیں گی۔

☆ زیادہ تر بچے ناخلف رہیں گے، والدین کی اطاعت اور فرمانبرداری سے بے بہرہ ہوں گے...... اورانہیں اس پر کوئی شرمندگی بھی نہیں ہوگی۔

☆ اس سال مہنگائی کی رفتار تیز ترین رہے گی، ہوا اور آواز کی رفتار سے زیادہ تیز...... بے حیائی اور فحاشی دگنی ہو جائے گی...... بلکہ بے حیائی کا ہی راج ہوگا۔

☆ ہر ایک کو اپنی بات سچی اور دوسرے کی جھوٹی لگے گی...... بھروسا اور اعتماد ناپید ہوگا۔

☆ اعتبار، بھروسا اور مروت کے اوصاف بطور لالچ استعمال ہوں گے۔

☆ نفسیاتی عوارض اور نفسیاتی مریضوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا بلکہ ہر گھر میں کوئی پاگل ہوگا۔

☆ طلاق کی شرح بڑھ جائے گی...... شادیاں کم اور طلاقیں زیادہ ہوا کریں گی۔

☆ ناچ، گانا بڑھ جائے گا...... ہر شعبے میں ناچنے اور نچانے والے ہوں گے۔

☆ فلمی اداکاروں کی ڈیمانڈ میں بہت زیادہ اضافہ ہوگا۔ فلمیں ہر جگہ پسند کی جائیں گی۔

☆ ایماندار لوگوں کو بزدل کہا جائے گا...... شریف لوگوں کا مذاق اڑایا جائے گا۔ اپنے، اپنے شعبوں میں محنت سے کام کرنے والوں کو پاگل کہا جائے گا حد تو یہ ہے کہ ان اداروں کے مالکان بھی یہی سمجھیں۔

☆ بے ایمانوں اور نکمے لوگوں کی مدح سرائی ہوگی...... اور خوشامد کا سکہ سب سے اونچا جائے گا۔

☆ کسی کی خوشی اپنا دکھ ٹھہرے گا...... بلکہ کامیاب اور خوشحال لوگوں کو دیکھ کر خون کھولے گا۔

☆ 2015ء میں میرا اور ریشم کی منگنیاں ہو جائیں گی۔

☆ بجلی کی آنکھ مچولی مزید بڑھ جائے گی...... زیادہ جائے گی اور کم، کم آئے گی۔

☆ بارشیں زیادہ ہوں گی، ماسوائے کراچی کے۔

☆ انٹرنیٹ اور موبائل کا استعمال مزید بڑھے گا اور اس کے منفی اثرات نمایاں ہوں گے۔

☆ طالب علم پڑھنے کے بجائے دیگر دلچسپیوں میں اپنا دل لگائیں گے اور گھر والے اس پر فخر کریں گے۔

☆ لڑکوں کی لڑکیوں کے ساتھ دوستیاں ہوں گی اور لڑکیوں کی سہیلیاں لڑکے بنیں گے۔

☆ ایسے فیشن منظرِ عام پر آئیں گے جنہیں دیکھ کر سر پیٹ لینے کو دل چاہے گا...... مگر کوئی پیٹے گا نہیں۔

☆ کم عمر لڑکیوں کے ساتھ کم عمر لڑکوں کی شادیوں کا رواج بڑے شہروں میں بھی بڑھ جائے گا...... اور بعض بدقسمت گھرانے شادی کرنے کو پیسے کا زیاں سمجھیں گے۔

کیا چچا کرامت کی پیش گوئیاں غلط ہیں؟ اگر صحیح ہیں تو ایسی پیش گوئیاں ہمارے معاشرے کی کون سی تصویر کی عکاسی کر رہی ہیں۔ ذرا سوچیے تو سہی۔

دولھا بھائی

رشتے داری تو ان سے پتا نہیں کیا تھی اور کیوں تھی؟ مگر ان کو چھوٹے بڑے سب ہی دولھا بھائی کہتے، حالانکہ وہ دولھا دکھائی دیتے تھے اور نہ بھائی...... ساٹھ، پینسٹھ کے لگ بھگ ہوں گے۔ چندیا گنجی ضرور تھی مگر بالوں کی جھالر پوری چندیا کے اطراف گھومی ہوئی تھی۔ پان اور سگریٹ میں ان کا کوئی مقابل نہیں تھا اس لیے ہر وقت منہ چلتا

رہتا تھا۔

''دولھا بھائی کی اپنی بیگم سے بالکل نہیں بنتی تھی ان کے گھر میں کوئی چلا جائے یا وہ کہیں جائیں ان کے لبوں پر گفتگو کا آغاز اپنی بیوی کی برائی سے شروع ہوتا تھا۔

''آپ میرے صبر کی داد دیجیے، کشور جیسی عورت کو میں برداشت کر رہا ہوں، کوئی برداشت نہیں کر سکتا۔''

''دولھا بھائی اتنی اچھی تو ہیں کشور تائی......''
(پتا نہیں ان کی بیوی کو کس رشتے سے اور کس وجہ سے پورا خاندان تائی کہتا تھا)

''خاک اچھی ہیں پچیس سال تو شادی کو ہو گئے، آج تک پکانا نہیں آیا، نہ سینا آتا ہے اور نہ کاڑھنا۔''

''دولھا بھائی کیسی باتیں کرتے ہیں آپ! سلائی، کڑھائی تو جن کو آتی ہے وہ بھی نہیں کرتیں اور رہی بات کھانا پکانے کی تو کشور تائی اچھا خاصا کھانا پکاتی ہیں۔''

''تم لوگوں کو کیا پتا بڑی کام چور عورت سے پالا پڑا ہے۔ صبح ہوتے ہی محلے میں گھومنے کے لیے نکل جاتی ہے دوپہر کو بازار سے نہاری منگائی، لپ جھپ الٹی سیدھی روٹی ڈالی لو بھئی کھانا پک گیا۔''

''روزانہ تو کوئی نہاری نہیں کھا سکتا کبھی تو گھر میں کھانا پکاتی ہوں گی۔''

''کاش تم لوگ اپنی تائی کے ہاتھ کا کھانا بھی کھا لو تو انعام دے دوں گا۔'' وہ ہنس کر بولے۔

''یہ دولھا بھائی اول نمبر کے جھوٹے ہیں بیکار میں تائی کو بدنام کرتے رہتے ہیں کسی دن ان کے ہاں جا کر کھانا کھائیں گے اور دولھا بھائی کو باور کرائیں گے کہ کشور تائی بہت اچھی ہیں۔'' ہم چاروں بہنوں نے پروگرام بنایا اور ان کے ہاں جانے سے دو گھنٹے پہلے فون کر دیا کہ آپ کے ہاں آ رہے ہیں اور کھانا بھی وہیں کھائیں گے۔

جب وقتِ مقررہ ہم ان کے ہاں پہنچے تو کشور تائی صاف ستھری سی بیٹھی تھیں۔ ہلکا پھلکا سا میک اپ بھی کر رکھا تھا گھر بھی صاف ستھرا سا تھا۔

کھانا میز پر آیا تو مزے دار تھا مٹر چاول تھے، کباب تھے، کڑاہی گوشت اور میٹھے میں گلاب جامن۔

''دولھا بھائی آپ تو بڑے لکی ہیں، کشور تائی کتنے مزے کا کھانا پکاتی ہیں۔'' کھانا کھا کر اندازہ ہو گیا تھا کہ ساری ڈشز گھر کی بنی ہوئی تھیں۔

''ہاں بہت ذائقہ ہے۔'' وہ غصے سے بولے۔

''کیا یہ کباب، چاول اور سالن مزے دار نہیں ہے۔'' آپا نے حیرت سے پوچھا۔

''مزیدار ضرور ہے مگر ان کے ہاتھ کا کہاں ہے؟''

''تو کیا آپ نے پکایا ہے؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

''جس فلیٹ میں ہم رہتے ہیں یہاں مانگنے تانگنے کا طریقہ بہت رائج ہے کسی کے ہاں کوئی مہمان آ جائے تو سب گھومنے پھرنے والیاں ایک، ایک ڈش اپنے گھر سے بھجوا دیتی ہیں۔''

''اچھا یہ تو بڑی بات ہے کہ کوئی اس حد تک بھی دوستی رکھتا ہے مگر ان معاملوں میں کبھی کشور تائی کی بھی تو باری آتی ہو گی آج اگر وہ کسی سے لیں گی تو کل کسی کو دینا بھی تو ہو گا ورنہ آج کل کسی کے دل اتنے بڑے کہاں ہیں کہ وہ دیتے رہیں اور لیں کبھی نہیں۔''

''اس کا جواب بھی ہے میرے پاس......''
انہوں نے ڈیپ فریزر کا ڈھکنا کھول کر دکھایا جس میں بازار کی نہاری اور بازار کے حلیم کی پندرہ پندرہ تھیلیاں رکھی ہوئی تھیں۔

''یہ تیں تھیلیاں کیوں رکھی ہیں؟'' ہم بہنوں

نے اجتماعی آواز میں کشور تائی سے پوچھا۔
''میں ہر کام پہلے سے کرنے کی عادی ہوں۔ کھانا بھی ہمیشہ ٹائم پر کھاتی ہوں اور کھلاتی بھی ہوں پورے مہینے کی تیاری ایک ساتھ کر لیتی ہوں اس سے مجھے سکون بھی رہتا ہے اور تمہارے دولھا بھائی کو بھی مزیدار چیزیں کھانے کو مل جاتی ہیں۔'' وہ تفخر بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔
اور ہم سب دولھا بھائی کو ترحم سے دیکھ رہے تھے۔

بس اتنا کافی ہے

وہ وقت کوئی اور تھا جب بچے ماؤں سے لپٹا کرتے تھے اور ماں کے آگے انہیں کوئی دوسرا نظر ہی نہیں آتا تھا۔ اب تو جس گھر میں دیکھ لو سب کے ہی بچے، باپوں کے زیادہ لاڈلے ہوتے ہیں۔
مائیں بے شک صبح سے شام تک ان کی خدمتیں کرتے، کرتے نڈھال ہو جائیں۔ شام کو باپ کو دیکھ کر وہ ماں کو ذرا لفٹ نہیں کراتے۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ باپ سے چمٹے بیٹھے رہیں۔
پہلے شاید یہ بھی بات تھی۔ بچوں کے کام کرنا صرف ماں کا ہی فرض گردانا جاتا تھا باپ اگر بچے کو گود میں بھی اٹھا لیا کرتا تھا تو اس کی ماں بہن زن مریدی کے طعنے تک دے دیا کرتی تھیں۔ (کم بخت بہو نے اپنے بچوں کا نوکر بنا کر رکھ دیا ہے)
اُس دور میں وہ باپ جو اپنے بچوں کو ٹائم دیتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ بیوی بہت تیز ملی ہے۔ ایسے، ایسے کام کرواتی ہے جو شرفا نہ کر سکیں۔
ماں، بہنوں کے سامنے اپنے بچوں کو پیار کرتے ہوئے انہیں شرم آتی تھی اور اب تو ایسے گھرانے بھی دیکھنے میں آتے ہیں کہ ممی کے تمام کام ڈیڈی کرتے ہیں۔ ایک تقریب میں یہ دیکھ کر بالکل اچنبھا نہیں ہوا کہ رفیق صاحب نہ صرف اپنے دونوں بچوں کو سنبھال رہے تھے بلکہ ان کو بوتل بنا کر بھی دے رہے تھے، ان کے پیمپر بھی چینج کر رہے تھے اور ان کی بیگم سہیلیوں اور کزنز کے درمیان بڑے، بڑے قہقہے لگا رہی تھیں۔
اور ان کی ساس کو یہ کہنے کی قطعی ہمت نہیں تھی کہ میرے بیٹے کو پاگل بنا کر رکھا ہوا ہے۔ مگر پھر بھی حالات کی تبدیلی کے باوجود بھی آج بھی ایسے گھرانے پائے جاتے ہیں جہاں باپ ہلا کو خان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے آتے ہی بچے کونوں کھدروں میں چھپ جاتے ہیں۔ باپ کے سامنے جانا، وہ ایسے ہی سمجھتے ہیں جیسے کسی روبوٹ کی پیشی میں جا رہے ہوں۔ ایسے بچے مارے خوف کے بات بھی نہیں کر سکتے۔ باپ کو دیکھ کر لرزنے اور کانپنے لگتے ہیں، تب وہ ڈکٹیٹر شخصیت ان کو اس حال میں دیکھ کر خوش ہوتی ہے اور سوچتی ہے۔
میرے بچوں پر میرا بے حد رعب ہے، میرے سامنے وہ چوں نہیں کر سکتے۔ میرے بچے میرا بہت احترام کرتے ہیں، عزت کرتے ہیں۔ (ہائے ری خوش فہمیاں)
حالانکہ ایسے بچوں میں سے بہت سے بچے یہاں تک سوچ لیتے ہیں۔ والد کے مرنے کے بعد کتنا مزہ آئے گا۔
اس لیے......اب بھی سوچ لیں۔ وقت آپ کی مٹھی میں ہے۔ اپنے بچوں سے محبت کیجیے۔ اپنے بچوں کو اپنا دوست بنائیں اور یہ بالکل مت سوچیں کہ کوئی آپ کو کیا کہتا ہے کہ آپ کے بچے تو آپ سے پیار کرتے ہیں۔ کیا اتنا آپ کے لیے کافی نہیں۔

☆☆☆



میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆شگفتہ سحر فیروز......سیالکوٹ

کیا خوب ہوتا اگر یادیں ریت ہو جاتیں
ہاتھوں سے گرا دیتے پاؤں سے اڑا دیتے

☆حیفہ ملک......ڈی جی خان

اس شہر کے انداز عجیب ہیں صاحب
گونگوں سے کہا جاتا ہے بہروں کو پکارو

☆عظمیٰ عنبرین......ڈیرا غازی خان

غیروں سے پوچھتی ہے طریقہ نجات کا
اپنوں کی سازشوں سے پریشان زندگی

☆نفیسہ آرا......راس الخیمہ

رات کھولے تھے کچھ پرانے خط
پھر محبت دراز میں رکھ دی

☆حمیرا نوشین......منڈی بہاؤالدین

بچپن کے جب دُور زمانے ہو جاتے ہیں
وعدے، قسمیں سب افسانے ہو جاتے ہیں
سب اخلاص دلوں سے رخصت ہو جاتا ہے
پڑھ لکھ کر جب لوگ سیانے ہو جاتے ہیں

☆فردوس شاہی......لاڑکانہ

اجڑا گھر تو اُسی ایک کی نشانی ہے
جو اپنے نام کی تختی لگا کے چھوڑ گیا

☆ارم کمال......فیصل آباد

وہ اچھا ہے تو بہتر، برا ہے تو بھی ٹھیک
مزاجِ عشق میں عیب و ہنر دیکھے نہیں جاتے

☆کوثر خالد......جڑانوالہ

دشمنِ جاں بن گیا حسنِ سلوک
کر گئیں گھائل تری انگڑائیاں
جانے کیا گزری ہے شہرِ حُسن پر
چھن گئیں چہروں سے کیوں رعنائیاں

☆سیما ممتاز عباسی......لاڑکانہ

جو سود و زیاں کی فکر کرے
وہ عشق نہیں مزدوری ہے
میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں
یہ کہنا غیر ضروری ہے

☆شازیہ محبوب......مقام نامعلوم

ہر اِک خوشی کو تو دامن میں بھر سکے اپنے
خدا کرے کہ تیری زندگی ہو اتنی طویل

☆مہک نورین......برنالی

دیوانگیِ دل میں اتنا تو کیا میں نے
آنکھوں کو کھلا رکھا ہونٹوں کو سیا میں نے
امید کی راہوں پہ ہر بار جلایا ہے
طوفان میں نفرت کے، چاہت کا دیا میں نے

☆جبیں نیاز......ملتان

کون روتا ہے کسی اور کی خاطر اے دوست
سب کو اپنی ہی کسی بات پہ رونا آیا

☆سامعہ تبسم......ملتان

جن کو سورج میری چوکھٹ سے ملا کرتا تھا
اب وہ خیرات میں دیتے ہیں اجالے مجھ کو

☆ سیدہ حیا عباس......تلہ گنگ

دل بہت اداس ہے محبتوں کے موسم میں
کیسی پیاس ہے محبتوں کے موسم میں
آنکھیں خواب، خواب ہیں ہر طرف گلاب ہیں
معاملہ حساس ہے محبتوں کے موسم میں

☆ نرگس نسیم......صابہ موہڑہ

ہمارے پرتوِ حُسنِ خیال کے باعث
دیارِ شوق کے منظر سنور، سنور سے گئے

☆ ڈاکٹر نفیسہ نہال......لاہور

بہتے دریاؤں میں بے سود ہے گوہر کی تلاش
اب صدف دل کے سمندر سے نکالا جائے

☆ امینہ مشیر......نئی دہلی

اس کا کیا ہے تم نہ سہی تو چاہنے والے اور بہت
ترکِ محبت کرنے والوں تم خود تنہا رہ جاؤ گے

☆ فاطمہ بلال......کینیڈا

مفت میں احسان نہ لینا محسنؔ
دل ابھی اور بھی سستے ہوں گے

☆ رابعہ عمران چوہدری......رحیم یار خان

زندگی، لوگ جسے خوشیوں کا صنم جانتے ہیں
جس طرح ہم نے گزاری ہے وہ ہم جانتے ہیں
درد کچھ اور عطا کر کہ تیرے درد نواز
یہ سخاوت تیرے معیار سے کم جانتے ہیں

☆ نیلوفر......بہارہ کہو

اُن کو اداس دیکھ کر ہوتا ہے یہ گماں
جیسے کوئی بہار کا لمحہ اداس ہو

☆ غزالہ طارق......سرگودھا

ذرا سی دیر ٹل کے جائے گی یہ بادِ خزاں
اداس، اداس نگاہوں سے گلستاں نہ دیکھ

☆ نگہت آصف......اسلام آباد

سچے لفظوں کی کرامت ہے یہی
سن سکو تو وہ دل پہ اثر کرتے ہیں

☆ ثوبیہ ظہور......اٹک

امید بھی، تغافل بھی، بے نیازی بھی
ستم شعار، تیرے پیار کی نظر ہے عجیب

☆ فضہ بتول......بہارہ کہو

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

☆ شازیہ مہک......ٹوبہ ٹیک سنگھ

دل و جگر ہیں کہ گرمی سے پگھلے جاتے ہیں
کوئی چراغِ تمنا جلا کے بھول گیا

☆ ریحانہ......کراچی

کبھی جو دل میں رہتا تھا ہمارے
پرائی آنکھ میں اب بس گیا ہے

نہ اس سے تم کوئی امید رکھو
سحر دنیا بڑی ہی بے وفا ہے

☆ نگینہ ضیا......کیماڑی، کراچی

ستارے، پھول، جگنو، رنگ ہر اک شے ہے بے معنی
تمہارے ہجر کی شب، میں رخِ مہتاب کیا دیکھوں
سحرؔ معلوم ہے مجھ کو نتیجہ دل لگانے کا
محبت کے صحیفے میں وفا کے باب کیا دیکھوں

☆ خدیجہ مومن......پشاور

میرے لفظوں پہ حاوی ہے تمہارے ہجر کا موسم
میری غزلیں میری نظمیں میرے اشعار روتے ہیں
دسمبر کی حسیں شامیں زمیں پر جب اترتی ہیں
چھوٹے چھوٹے سے کمرے میں تیرے اقرار روتے ہیں

☆ صائمہ سجاد بنگش......کوہاٹ

کچھ تو ہے جو کھٹک گیا ہے ہمیں
آپ کو جو ہمارا نہیں ہونے دیتا

☆☆☆

پاکیزہ بہنیں



تندوری فش تکہ بریانی

اشیا: فش کے قتلے بغیر کانٹے کے، ایک کلو۔ ادرک، لہسن پیسٹ، ایک کھانے کا چمچ۔ سرکہ، ایک سے ڈیڑھ کھانے کا چمچ۔ لال مرچ پاؤڈر، ایک کھانے کا چمچ۔ باربی کیو مسالا، ایک کھانے کا چمچ۔ گرم مسالا پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ کارن فلور، ایک کھانے کا چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ تیل، فرائی کے لیے۔

بریانی بنانے کے لیے

اشیا: چاول، آدھا کلو۔ ٹماٹر، کیوب کرلیں دو سے تین عدد۔ پیاز سلائس میں کٹی ہوئی، دو عدد۔ ہرا دھنیا، آدھی گڈی۔ پودینہ، آدھی گڈی۔ ہری مرچیں ثابت، چار سے پانچ عدد۔ کالا زیرہ ثابت، آدھا چائے کا چمچ۔ دار چینی، دو سے تین عدد۔ بڑی الائچی، دو سے تین عدد۔ لونگ، تین سے چار عدد۔ لال مرچ پاؤڈر، ایک کھانے کا چمچ۔ گرم مسالا پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ گھی، آدھا کپ۔

ترکیب: مچھلی کے درمیانے سائز کے قتلے ایک مکسنگ باؤل میں ڈالیں پھر اس میں لال مرچ پاؤڈر، سرکہ، کارن فلور، ادرک، لہسن پیسٹ، نمک اور باربی کیو مسالا ڈال کر میرینیٹ کرلیں۔ اب ان کیوبز کو اسٹکس پر لگائیں۔ فرائنگ پین میں تیل گرم کر کے اس فش تکہ کو دونوں طرف سے فرائی کرلیں۔

بریانی بنانے کا طریقہ: چاول، نمک اور کالا زیرہ شامل کر کے بوائل کرلیں اور ان کو تھار لیں۔ ایک پین میں گھی ڈال کے لونگ، دار چینی، بڑی الائچی کڑکڑائیں۔ اب اس میں پیاز شامل کر کے پیاز کو ہلکا براؤن کرلیں پھر اس میں ٹماٹر، لال مرچ، نمک، گرم مسالا پاؤڈر، ہری مرچیں ڈال کے اچھی طرح بھون لیں۔ قورمہ تیار ہے اب دیگچی میں تھوڑا سا تیل لگالیں کہ چاول چپکیں نہیں سب سے پہلے چاول کی تہ لگائیں پھر درمیان میں قورمہ ڈالیں پھر باقی چاول ڈالیں اور اوپر ہرا دھنیا، پودینہ ڈال دیں۔ آخر میں فش تکہ رکھ کے ان کو دس سے بارہ منٹ تک دم پر لگادیں۔ مزیدار فش تکہ بریانی تیار ہے۔

مرسلہ: بنین عباس، کراچی

فرائی فش

اشیا: مچھلی، ایک کلو فرائی کرنے کے لیے ٹکڑے بنوالیں۔ لال مرچ پسی ہوئی، ایک کھانے کا چمچ یا حسبِ ذائقہ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ پسا ہوا لہسن، دو کھانے کے چمچ۔ سرکہ، تین سے چار کھانے کے چمچ۔ اجوائن، ایک چائے کا چمچ۔ بیسن لیں.... ..... بیسن، آدھا پاؤ۔ تیل، حسبِ ضرورت۔

ترکیب: سب سے پہلے مچھلی کو نمک اور سرکہ لگا کر پندرہ سے بیس منٹ کے لیے رکھ دیں اور پھر اچھی طرح دھولیں۔ اب لہسن، اجوائن، نمک اور مرچ کو اچھی طرح مچھلی کے ٹکڑوں پر لگادیں اور دو گھنٹے کے لیے فریج میں میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ

دیں تا کہ مچھلی کا زائد پانی نکل جائے۔ اب بیسن میں حسبِ ذائقہ نمک اور تھوڑی سی پسی ہوئی لال مرچ ملا کر آمیزہ بنالیں۔ زیادہ گاڑھا آمیزہ نہ ہو۔ آئل گرم کر کے مچھلی کے ٹکڑوں کو بیسن میں ڈبو کر درمیانی آنچ پر دونوں طرف سے گولڈن براؤن فرائی کرلیں۔ ہری چٹنی اور کیچپ کے ساتھ کھائیں۔

شوربے دار پسندے

اشیا﴿ پسندے، (بکرا، گائے یا مرغی) آدھا کلو۔ دہی، ایک پیالی۔ پیاز، دو درمیانی۔ ناریل پسا ہوا، تین کھانے کے چمچ۔ خشخاش، سفید تل، پیس لیں دونوں ملا کر چار کھانے کے چمچ پیسٹ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ سرخ مرچ، حسبِ ذائقہ۔ لہسن، ادرک پیسٹ، دو کھانے کے چمچ۔ لیموں کا رس، دو کھانے کے چمچ۔ ہرا دھنیا، پودینہ، ہری مرچ بقدرِ ضرورت۔ تیل، حسبِ پسند۔

ترکیب﴿ پسندے دھو کر ادرک، لہسن اور نمک لگا کر دو گھنٹے کو رکھ دیں۔ دوسرے مسالے پیاز اور دہی سمیت پیس لیں۔ ایک دیگچی میں آئل گرم کر کے گوشت ڈال کر بھونیں پھر دس منٹ بعد دوسرے پسے مسالے ڈال کر ایک کپ پانی کا اضافہ کر کے ڈھکن لگا کر ہلکی آنچ پر پکنے دیں جب پانی خشک ہونے لگے تو بھون لیں۔ اب اس میں گرم پانی کا اضافہ کر کے حسبِ پسند شوربا رکھ لیں اور پانچ منٹ بعد چولھا بند کر دیں۔ ہرا مسالا باریک کاٹ کر چھڑکیں اور کھانے کے لیے پیش کریں۔

نوٹ﴿ بیف اور بکرے کا گوشت کچھ زیادہ وقت لے گا جبکہ مرغی کا گوشت جلد تیار ہو جائے گا۔

مرسلہ: زرمینہ خان، بہارہ کہو

جھٹ پٹ سوپ

آج کل موسمِ سرما کے حساب سے خوب سبزیاں آئی ہوئی ہیں۔ اس موسم میں ہر قسم کے سوپ و یخنی کا الگ ہی مزہ ہے۔ اب جب چاہیں اس ترکیب کے ذریعے جلدی، جلدی سوپ بنائیں اور سردی کا زور کم کریں۔

اشیا﴿ مختلف سبزیاں، کرم کلہ، شملہ مرچ، پارسلے، بروکلی، ہری پیاز، گاجر، شلجم، مٹر، آلو، ٹماٹر، ایک، ایک کپ۔ لہسن، ادرک، پیاز کل ملا کر آدھا کپ۔ مرغی کی ہڈیاں بازو اور گردن، آدھا کلو۔ نمک، کالی مرچ، حسبِ ذائقہ۔ سویا سوس، چلی سوس، لیموں کا رس، حسبِ پسند۔

ترکیب﴿ تمام سبزیاں، مرغی، نمک اور ثابت کالی مرچ ڈال کر ڈھیر سارے پانی میں خوب ابال لیں کہ سب چیزوں کا عرق نکل آئے پھر اس سب کو چھان لیں خالی یخنی جیسا سوپ نکل آئے گا اب اس میں چلی، سویا اور لیمن کے فلیور ڈال کر مزے لے، لے کر پیش کریں بوڑھوں اور بچوں کو ڈبل روٹی یا کھچڑی کے ساتھ پیش کریں یہ ایک مکمل Meal ہے۔

گڑ کے چاول

اشیا﴿ باسمتی کے ٹوٹا چاول، ایک پاؤ۔ گھی، دو ٹیبل اسپون۔ گڑ، ایک پاؤ۔ (کوٹ کر دو کپ پانی میں پگھلا کر شیرہ سا بنالیں) چھوٹی الائچی دو سے چار عدد..... لونگ، پانچ عدد۔ عرقِ کیوڑا، دو تین قطرے۔ بالائی دار دودھ، ایک کپ۔

ترکیب﴿ چاول صاف کر کے دھو کر خوب نرم ابال لیں۔ اب اس میں گڑ کا شیرہ شامل کر کر خوب پکائیں۔ یکجان ہو جائے تو اوپر سے گھی میں الائچی اور لونگ کڑکڑا کر بھگار لگائیں اگر پسند ہو اور ڈائٹنگ کا مسئلہ نہ ہو تو بالائی دار دودھ کے ساتھ تناول فرمائیں۔ یہ چاول فریج میں پندرہ دن کے لیے محفوظ کیے جا سکتے ہیں۔

مرسلہ: رضوانہ سمیع، کراچی

☆☆☆

سندیسے

پاکیزہ بہنیں







پوری قوم کے نام

اللہ کے ذکر کے ساتھ ذکرِ نبیؐ ضروری ہے
اندھیری گلیوں میں یہ روشنی ضروری ہے
بندوں کا دل نہ توڑیں، اخلاق کی مالا بنیں
ایمان کی کم از کم یہ پختگی ضروری ہے
مہر و توکل کی ہم اعلیٰ مثال قائم کریں
رب کی فضاؤں پر آمادگی ضروری ہے

از: کوثر خالد، جڑانوالہ

میری زندگی کا مقصد

اپنے درِ اقدس کا جلوہ تو دیجیے
مجھ خطاکار کو اِک موقع تو دیجیے
آپؐ کے در کی خاک کو ہونٹوں سے چوم لوں
اپنے در کی خاک کا ذرہ تو دیجیے
میری ہر سانس کرے سدا یہ دعا
اپنے در کی خاک میں جگہ تو دیجیے

از: مسز فرح امجد، لاہور

ماؤں کے جگر گوشوں کے نام

تا عمر خوشیوں کے ہنڈولوں میں تم جھولو
اپنی ہر اک خواہش کو ہاتھ بڑھا کر چھولو
درد کی ہر لہر تم سے کنارہ کیے رہے
محبتوں کے آنگن میں تم سدا پھلو پھولو

شاعرہ: حمیرا نوشین، منڈی بہاؤالدین

میں اور تم

کہاں تم اور کہاں میں
تم آسماں، میں زمیں
تم ٹھنڈا بادل، میں بنجر دھرتی
تم چاندی اور میں تھل کے تپتے کا حقیر ذرہ
تم ہواؤں میں بسی خوشبو
میں خزاں رسیدہ پتا
حرفِ آخر یہ ہے کہ
تم سب کچھ ہو
اور میں کچھ بھی نہیں

از: اقبال بانو، بورے والا

عزیز

اچھے وقت سے زیادہ اچھے دوست کو عزیز رکھا کرو کیونکہ اچھا دوست برے وقت کو بھی اچھا بنا دیتا ہے۔

از: سنبل ملک اعوان، لاہور

زندگی اور خوشی

چھوٹی سی زندگی ہے، ہر بات میں خوش رہو۔ جو چہرہ پاس نہ ہو اس کی آواز میں خوش رہو۔ کوئی روٹھا ہو تم سے، اس کے اس انداز میں خوش رہو۔ جو لوٹ کے نہیں آنے والے ان لمحوں کی یاد میں خوش رہو۔ کل کس نے دیکھا ہے، اپنے آج میں خوش رہو۔ خوشیوں کا انتظار کس لیے، دوسروں کی مسکان میں خوش رہو۔ چھوٹی سی تو زندگی ہے ہر حال میں خوش رہو۔

از: مصباح رضا سعید، فیصل آباد

☆☆☆



روحانی مشورے

ادارہ

رسول اکرم ﷺ کی قرآنی دعائیں

رسولِ اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس منتہائے نبوت تھی۔ آپ عبادت اور اطاعتِ الٰہی میں اس حد تک اکمل تھے جس حد تک نہ آپ ﷺ سے پہلے اور نہ ہی بعد میں تا قیامت کوئی ہوگا۔ اس لیے آپ ﷺ کی قبولِ دعا کی وہ شان تھی کہ آپ ﷺ کی آرزو ابھی دل میں ہوتی کہ اللہ اسے پورا کرنے کے اسباب پیدا کر دیتا لیکن آپ کی حیاتِ طیبہ میں کچھ کٹھن مرحلے ایسے آئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ ان الفاظ میں میرے حضور دعا کیجیے لہٰذا آپ نے ویسے ہی کیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو قبول کر کے نتیجہ لوگوں کے سامنے کر دیا۔ اس لیے رسولِ اکرم ﷺ نے وقت کی مناسبت کے لحاظ سے جو دعائیں مانگیں وہ قرآن پاک میں مذکور ہیں اور قرآن پاک میں ان دعاؤں کے بیان ہونے کا مقصد بھی یہی ہے کہ آپ کی امت کو جب اس جیسے حالات درپیش ہوں جن میں وہ دعائیں کی گئیں تو وہ بھی اللہ کے حضور انہی الفاظ سے دعا مانگیں جس طرح رسول اکرم ﷺ نے مانگی ہیں۔ لہٰذا آج ابھی اگر کوئی شخص ان دعاؤں کو خلوصِ دل کے ساتھ پڑھے تو فوراً اثرات ظاہر ہوں گے۔

یہ ایک عام اصول ہے کہ قرآن پاک کی ہر آیت کے پیچھے ملائکہ اور مؤکلین پابند ہیں تو جس وقت کوئی شخص قرآن پاک کی کسی بھی آیت کو کوئی مقصد سامنے رکھ کر پڑھتا ہے اور جب وہ ورد لاکھوں کی تعداد میں ہو جاتا ہے تو آیت کا مؤکل حاضر ہو کر پڑھنے والے کے اس مقصد کو حل کر دیتا ہے جس قسم کے آیت میں خواص مذکور ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی طرف اور دوسرے پیغمبروں کی طرف جو قرآنی دعائیں منسوب ہیں جب ان کا ورد کیا جاتا ہے تو ان کے اثرات بہت جلد ظاہر ہوتے ہیں۔ آج ہم اس لیے خصوصی طور پر بتا رہے ہیں تاکہ قارئین کو آسانی سے معلوم ہو جائے کہ یہ دعا رسول اکرم ﷺ نے فلاں موقع اور وقت کی مناسبت سے پڑھی تاکہ عملی زندگی میں اس کا ویسے ہی ورد کیا جائے۔ آپ ﷺ کی دعائیں حسبِ ذیل ہیں۔

رضائے الٰہی حاصل کرنے کی دعا

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَاشَرِیْکَ لَہٗ ج وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝

ترجمہ: میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہے کہ جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلمانوں میں سے پہلا مسلم ہوں۔ (پ ۸، الانعام آیت ۱۶۴)

رسول اکرم ﷺ کی یہ دعا رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لیے ہے لہٰذا اس دعا کے پڑھنے سے انسان میں تسلیم و رضا کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں اور عزت میں اضافہ ہوتا ہے۔

شیطانی خطرات سے بچنے کی دعا

رَبِّ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ ھَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ وَاَعُوْذُ بِکَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ ۝

ترجمہ: اے میرے پروردگار! میں تیری پناہ چاہتا ہوں، شیطانی خطرات سے اور اے میرے رب! اس سے بھی میں تیری پناہ چاہتا ہوں کہ شیطان میرے پاس آئیں۔ (پ ۱۸، مومنون،

آیت ۹۷) شیطان کے حملوں اور وسوسوں سے بچنے کے لیے یہ دعا ہے۔ رسول اکرم ﷺ یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

اضافۂ علم کی دعا

رب زدنی علما

اے میرے پروردگار! میرے علم کو زیادہ کر (پ ۱۶، طہ، آیت ۱۱۴)

یہ دعا رسول اکرم ﷺ کی علم کے اضافہ کے لیے ہے لہٰذا جو شخص اس دعا کو پڑھے اس کے علم میں اضافہ ہو جاتا ہے اور خاص کر جو شخص باطنی علم حاصل کرنا چاہے تو اس دعا کا کثرت سے ورد کرے۔

نصرتِ الٰہی اور تائیدِ ربانی

اَللّٰھُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَیْبِ وَ الشَّھَادَۃِ اَنْتَ تَحْکُمُ بَیْنَ عِبَادِكَ فِیْمَا کَانُوْا فِیْہِ یَخْتَلِفُوْنَ ٥

ترجمہ: اے اللہ زمینوں اور آسمانوں کے پیدا کرنے والے، پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والے، یہ بندے جن باتوں میں اختلاف رائے کا شکار ہوئے تو ہی ان کے درمیان فیصلہ کرے گا (پ ۲۴، زمر، آیت ۴۶)

حضورِ پُرنور ﷺ کو اللہ تبارک تعالیٰ نے یہ دعا سکھائی۔ خدا کی ربوبیت کا اقرار اور زمین و آسمان کی پیدائش کا ذکر ہے اور ساتھ ہی خدا کو اعلیٰ ترین حاکم ماننے کی تعلیم بھی ہے۔ ایک مبلغ کو یہ دعا اس وقت پڑھنی چاہیے جب اس کے مقابل دشمن باطل پر بضد ڈٹے ہوئے ہوں۔ اس دعا کے پڑھنے سے اللہ حق کو غالب کرتا ہے اور باطل کو مٹا دیتا ہے۔

حصولِ عزت کی دعا

اَللّٰھُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِكَ الْخَیْرُ اِنَّكَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ٥ تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَ تُوْلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیْلِ وَ تُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ٥

ترجمہ: اے خدا! ملک کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے۔ جسے چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کرے۔ کُل بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے، تو ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں۔ زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے اور مردہ سے زندہ کو اور جسے چاہے بغیر حدو حساب کے رزق دیتا ہے۔

یہ رسول اکرم ﷺ کی اس وقت کی دعا ہے جس میں اللہ کی صفاتِ قیومیت اور حی کا اقرار ہے جب کسی کو ملک اور حکومت عطا ہو تو اس دعا کو پڑھنا چاہیے۔

اللہ کی زمین اور مخلوق پر اقتدار کا حاصل ہونا اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ عزت اور شوکت کی دلیل ہے اور اللہ تعالیٰ جسے حکومت یا سلطنت عطا کرتا ہے تو اس پر دنیاوی نقطۂ نظر سے یہ بہت بڑے فضل کی دلیل ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ لہٰذا جب انسان ملک میں، معاشرے میں، گھر میں حتیٰ کہ زندگی کے ہر شعبے میں عزت اور اقتدار حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ یہ دعا پڑھے کیونکہ اقتدارِ حقیقی اور عزت کا عطا کرنے والا تو اللہ ہی ہے لہٰذا اسی سے حکومت اور اقتدار طلب کرنا چاہیے۔ کسی کو حاکم بنانا یا اس سے حاکیت واپس لینا قبضۂ قدرت میں ہے کیونکہ حاکم کی ذاتی حیثیت کچھ نہیں ہوتی۔ عزت اور حاکیت دو طرح کی ہے ایک تو دنیاوی ہے اور دوسری روحانی ہے...... روزانہ درود شریف پڑھیے...... اور ہر دعا سے پہلے اور آخر میں لازمی پڑھیے...... اور اپنی دعاؤں میں ہم سب کو یاد رکھیے۔

☆☆☆



شوابے ہومیو کلینک













اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں۔ ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

بچے کی پیدائش کے بعد پیٹ کا بڑھنا

سارہ ....ملتان

میری عمر 32 سال ہے، دو بچے ہیں۔ چھوٹے بچے کی عمر دو ماہ ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھے کوئی بیماری نہیں ہے۔ چھوٹے بچے کی پیدائش کے بعد اب پیٹ بڑھ گیا ہے اور کولہے بھاری ہوگئے ہیں۔ اب میں گھر کے اندر چلنے پھرنے سے بھی تھک جاتی ہوں اور رنگ بہت پیلا ہوگیا ہے۔

جواب: سب سے پہلے آپ اپنی غذا کو متوازن بنائیں اور اس میں ایسی اشیا استعمال کریں جو خون کی افزائش میں معاون ہوں...... مثلاً لال گوشت، ٹماٹر، سیب، گاجر، کیلا، ہری سبزیاں وغیرہ۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی PhytolaccaebaccisQFucus VesQ کے 10,10 قطرے ½ گلاس پانی میں دن میں تین مرتبہ لیں اور ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی CalcareaCarb 3X کی ایک گولی بھی دن میں تین مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے دوبارہ

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

فروری 2015

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________

پتا: ____________

____

مطلع کریں۔

قد نہیں بڑھ رہا

شاہین.........بھاولپور

محترم! میری بیٹی کا قد بہت چھوٹا رہ گیا ہے۔ مہربانی فرما کر کوئی اچھی سی دوا لکھ دیں جس کے استعمال سے میری بیٹی کا قد تھوڑا سا اور بڑھ جائے آپ کے لیے زندگی بھر دعا گو رہوں گی۔ میری بیٹی کو مینسز ٹھیک طرح سے نہیں آتے۔ میں اپنی بیٹی کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔

جواب: ویسے تو قد کے بڑھنے میں بہت سارے عوامل کارفرما ہوتے ہیں جن میں خاندانی ہسٹری، ہارمونز وغیرہ ہیں۔ ٹین ایج تک بڑھنے کی گنجائش ہوتی ہے لہٰذا اپنی بیٹی کو ہر روز صبح ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc.Carb200 کے تین قطرے ایک گھونٹ پانی میں دیں اور اسی کمپنی کی Baryta Carb30,Pulsatilla30 کے پانچ، پانچ قطرے صبح، شام اور رات کو دیں۔ 3 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

☆......☆......☆......☆

چہرے پر دانے اور سیاہ رنگت

نائلہ.........گوجرانوالہ

میں جسمانی طور پر بے حد کمزور ہوں۔ تیرہ چودہ سال کی لگتی ہوں، جبکہ 20 سال کی ہوں، بچپن میں ایک بار یرقان ہوا تھا۔ کمزوری بہت ہے، کبھی کبھی چکر آتے ہیں اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ چہرے پر دانے نکلے تو ایک اسکن اسپیشلسٹ کو دکھایا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ وقتی طور پر دانے ٹھیک ہوئے مگر بعد میں اور زیادہ بڑھ گئے۔ جہاں نکلتے ہیں وہاں کالے داغ چھوڑ جاتے ہیں۔ پہلے رنگ اچھا تھا اب سیاہی مائل ہوتا جارہا ہے۔



آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ہیں، اچھی خوراک اور موسم کے لحاظ سے پھل کھانے کے باوجود ختم نہیں ہو رہے۔ آپ میرے لیے کوئی ایسا نسخہ تجویز کریں جس سے سیاہ حلقے اور کمزوری ختم ہوجائے اور جسم سڈول ہوجائے اور رنگ نکھر جائے۔

جواب: بی بی نائلہ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ان میں نیند کا پورا نہ ہونا، کھانا جسمانی ضرورت کے مطابق نہ کھانا، لیکوریا وغیرہ کا ہونا۔ آئندہ خط لکھتے ہوئے اس بات کا بھی خیال رکھیے گا۔ فی الحال ایک ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Kali bromide 30 Ferrum ، Met30 Sarsaparilla 30 کے 5,5 قطرے دن میں تین مرتبہ آدھا گلاس پانی ڈال کر لیں۔ دو ماہ بعد اپنی کیفیت سے مطلع کریں۔

☆......☆......☆......☆

آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے

کوثر پروین.........خضدار

میں شادی شدہ ہوں، عمر تقریباً 28 سال ہے۔ ماشاءاللہ تین بچے ہیں، مجھے لیکوریا کی بیماری ہے، میں جسامت میں کمزور ہوں اور آنکھوں کے گرد حلقے ہیں، بیماری کی وجہ سے ہر نماز کے لیے وضو کرنا پڑتا ہے اور کپڑے چینج کرنے پڑتے ہیں۔ برائے مہربانی کوئی ایسی دوا تجویز کردیں کہ میری صحت بھی بہتر ہوجائے اور اس مرض سے ہمیشہ کے لیے



چھٹکارا مل جائے۔ برائے مہربانی اچھی سی دوا تجویز کر کے ممنون فرمائیں۔

جواب: کوثر پروین صاحبہ آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Ova tosta 4x کی دو گولیاں دن میں تین مرتبہ استعمال کریں اور اُسی کمپنی کی Hydrastis Q کے سات قطرے دن میں تین مرتبہ آدھا گلاس پانی میں استعمال کریں۔ ایک ماہ بعد کیفیت بتائیں۔

☆......☆......☆......☆

ماہانہ ایام اور چہرے پر بال

کوکب............لاہور

میری عمر 22 سال ہے۔ میری شادی ہونے والی ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا ماہانہ نظام خراب ہے۔ ایک ماہ ہوتا ہے تو دو ماہ ناغہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے میرے جسم خاص طور پر چہرے پر بہت زیادہ بال ہیں، جب نکالوں تو خون نکلتا ہے اور جگہ کالی ہونا شروع ہوجاتی ہے۔ چہرہ بدنما ہوگیا ہے۔ مہربانی کر کے کوئی اچھی دوائی بتادیں جس سے یہ مسئلہ حل ہوجائے۔

جواب: اللہ آپ کو صحت دے آمین۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc.Carb 200 کے 5 قطرے ہفتے میں ایک دفعہ لیں جبکہ روزانہ Pulsatilla 30 اور Oleum Jec30 کے 5 قطرے دن میں تین مرتبہ ایک گھونٹ پانی میں لیں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

☆......☆......☆......☆

قد اور جسم پر بال

جیسمین مسیح............راولپنڈی

مسئلہ میری بچی کا ہے جس کی عمر ساڑھے نو سال ہے۔ میری بچی کے پورے جسم پر بال ہیں۔ پیدائش کے وقت رُواں تھا، جوں جوں بڑی ہوتی گئی کالے اور لمبے بال بن گئے۔ ٹانگوں پر رانوں تک اور کمر پر بھی ہیں لیکن ذرا چھوٹے۔ بازوؤں پر کلائی سے لے کر کاندھے تک آدھا آدھا انچ لمبے بال ہیں۔ زیادہ بازو پر ہیں اور گھنے بھی جو کہ بچی بھی اب محسوس کرتی ہے۔ میری بچی کا دوسرا مسئلہ قد کا ہے جو بہت چھوٹا ہے۔

جواب: جیسمین صاحبہ آپ اپنی بچی کی غذا کا خیال رکھیں، اس کو متوازن غذا دیں، ورزش کرائیں یا کھیل کود کرائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc.Carb 200 کے 4 قطرے تھوڑے سے پانی میں ایک دن چھوڑ کر دیں اور اسی کمپنی کی Acid Phos 30 کے 5 قطرے تھوڑے سے پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں۔ 3 ماہ بعد دوبارہ حال بتائیں۔

☆......☆......☆......☆

قد چھوٹا ہے

فاطمہ نور............نور آباد

میری عمر 15 سال ہے اور قد 5 فٹ ہے۔ جسامت درمیانی ہے، نہ بہت پتلی نہ بہت موٹی۔ برائے مہربانی یہ بتائیں کہ قد کتنی عمر تک بڑھ سکتا ہے۔ کیا اب میرا قد بڑھ سکتا ہے اگر جواب ہاں ہے تو پلیز کوئی دوا تجویز کردیں۔

جواب: فاطمہ بیٹی اپنا خاندانی پس منظر بھی لکھیں کہ آپ کے خاندان میں ماں باپ کی طرف سے لوگوں کا قد کتنا ہے؟ اپنی غذا کا خاص خیال رکھیں۔ متوازن غذا لیں، چکنی اور میٹھی چیزیں زیادہ نہ لیں، ورزش یا کھیل کود ضرور کریں۔ بھاری وزن نہ اُٹھائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Baryta

Carb 200 کے 5 قطرے ہر صبح لیں اور اسی کمپنی کی Calc.Phos 30 کے 5 قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ لیں۔ تین ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

☆......☆......☆......☆

دل، جوڑوں کا درد اور پراسٹیٹ

عبدالکریم..............عمان

میں پاکیزہ کا دیرینہ قاری ہوں اور بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ شوابے ہومیو کلینک میں ایک Expert Panel ہومیو فزیشن پر مشتمل ہے جس میں انتہائی تجربہ کار ڈاکٹرز شامل ہیں تاکہ وہ لوگوں کو ہر وقت صحیح رہنمائی کر سکیں۔ تشخیص صحیح ہو سکے اور صحیح ادویات انہیں میسر آسکیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کی کاوش کو کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرے۔ آمین! میرے بھی صحت کے کچھ مسائل ہیں جو آپ کو بتانا چاہ رہا ہوں، تاکہ آپ بیماری کی صحیح تشخیص کر سکیں اور صحیح ادویات تجویز کر سکیں جس کے لیے میں تہ دل سے ممنون ہوں گا۔ مجھے پراسٹیٹ کی تکلیف ہے۔ میں عمان میں رہتا ہوں۔ میری دوسری بیماری Arterioscle rosis ہے۔ ایک اور بیماری یہ ہے کہ مجھے جوڑوں کا درد ہے۔ گردوں کے اطراف میں اور کندھوں میں۔ یہ درد جگہ بدلتا رہتا ہے اور کولہوں کی طرف بھی جاتا ہے۔ کلائیوں کے جوڑوں میں بھی درد اور اینٹھن ہوتی ہے۔

جواب: محترم کریم صاحب ورزش کو معمول بنائیں۔ ایسی غذا کا استعمال کریں جو مرغن نہ ہوں اور کم نشاستہ والی اور پروٹین بھی کم ہوں۔ سبزیاں اور فروٹس بہتر رہیں گے۔ دالیں اور چاول بھی لے سکتے ہیں، پانی کا استعمال بھی کم از کم 8 گلاس روزانہ کریں۔ جو ادویات آپ استعمال کر رہے ہیں وہ کرتے رہیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی یہ ادویات ایک ماہ استعمال کرنے کے بعد دوبارہ حال بتائیں۔



Prostakan کی ایک گولی دن میں تین مرتبہ تھوڑے سے پانی کے ساتھ لیں جبکہ Bryonia 30, Belladona 30 کے 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں ڈال کر دن میں ۳ مرتبہ لیں اور Rhustox 200 کے 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں ڈال کر روزانہ صبح لیں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

☆......☆......☆......☆

بچیوں میں لیکوریا

سفینہ کریم..............فیصل آباد

مسئلہ میری بیٹی کا ہے جو ساڑھے چھ سال کی ہے اسے تقریباً دو تین سال قبل گرمیوں میں پیشاب کے مقام پہ جلن کی شکایت ہوئی تھی ڈاکٹر کی اینٹی بائیوٹک دوائیوں سے وقتی افاقہ ہو جاتا تھا لیکن پھر وہی صورت حال ہو جاتی تھی۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ بچی جلن کی شکایت تو نہیں کرتی لیکن زردی مائل رطوبت خارج ہوتی ہے۔ بچی دیکھنے میں کمزور نہیں ہے۔ صحت اُس کی اچھی ہے لیکن چہرے کی رنگت زرد اور مرجھائی ہوئی رہتی ہے۔

جواب: اپنی بیٹی کو ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Kreosote30 اور Calc.Carb 30 کے 5,5 قطرے آدھا کپ پانی ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔ 15 دن بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

☆......☆......☆......☆

نزلہ وکھانسی

محمد شریف .... سرگودھا

میری بیوی اور بچوں کو نزلہ اور کھانسی کی شکایت آج کل بہت زیادہ ہو رہی ہے۔ ایلو پیتھک علاج کرا کر تھک چکا ہوں لیکن خاطر خواہ فائدہ نہیں ہو رہا ہے۔ برائے مہربانی کوئی اچھی دوا تجویز کریں اور کوئی پرہیز بھی بتادیں۔

جواب: ٹھنڈا پانی، ٹھنڈی اور کھٹی چیزوں سے پرہیز کریں۔ گرم کے بعد ٹھنڈا نہ کھائیں اور نہ پئیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی دوا KALOBA کے بچوں کو 5 قطرے اور بڑوں کو 10 قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر استعمال کرائیں۔ 15 دن بعد سب کی کیفیت سے مطلع کریں۔

☆......☆......☆......☆

Cratex کا استعمال بند کردوں؟

زاہد رشید اسلام آباد

اپنی یادداشت کو بہتر بنانے کے لیے میں نے شوابے کی cratex کا استعمال شروع کیا تھا۔ میری یادداشت کافی بہتر ہوگئی ہے، جسمانی صحت بھی بہت اچھی ہوگئی ہے اور کارکردگی بھی بہت اچھی ہوگئی ہے۔ اب آپ میری رہنمائی فرمائیں کہ یہ دوا مزید لوں یا روک دوں؟

جواب: cratex شوابے کی بڑی بہترین اور کامیاب دوا ہے۔ ۹۵ فیصد لوگوں میں جن میں عورتیں، بچے اور مرد شامل ہیں، کامیابی کے ساتھ استعمال کی جا رہی ہے۔ ابھی آپ دن میں ایک مرتبہ اسے استعمال کریں۔ ایک ماہ بعد پھر بتایئے گا۔

☆......☆......☆......☆

چہرے پر بال

عشرت شیخ۔ چیچہ وطنی

آج میں اپنا ایک مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب میرے چہرے پر بہت زیادہ بال ہوگئے ہیں، گالوں اور ٹھوڑی پر بھی۔ میرے لیے اچھی سی دوا تجویز کردیں تاکہ میرے چہرے کے بال ختم ہو جائیں اور دوبارہ کبھی نہ ہوں۔ چہرے کے بالوں کی وجہ سے میں بہت زیادہ پریشان ہوں۔ پہلے چہرے پر بالوں کا رُواں تھا لیکن اب لمبے اور زیادہ ہوگئے ہیں۔ تیل اور دوا کے ساتھ پرہیز بھی لازمی بتادیں۔ ایک اور بات یہ کہ مجھے خون کی کمی کی شکایت بھی ہے۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی اچھی سی دوا میرے لیے تجویز کردیں۔

جواب: آپ نے علاج کروانے میں اتنا عرصہ کیوں لگایا؟ ابتدا سے ہی اس کا علاج کرلینا چاہیے تھا۔ غذا کا خاص خیال رکھیں۔ پھل اور سبزیوں کا استعمال زیادہ کریں۔ ورزش بھی کیا کریں۔ Iodium-30، Pulsatilla-30 اور Calc Phos-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ یاد رکھیں کہ یہ تمام ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ہی استعمال کریں۔

☆☆☆